حجۃ الاسلام فضل اللہ کمپانی



جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان
پوسٹ بکس ۵۴۲۵ - کراچی - پاکستان

حجۃ الاسلام فضل اللہ کمپانی

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان

پوسٹ بکس ۵۴۲۵ - کراچی - پاکستان

| | | |
|---|---|---|
| کتاب فارسی | ................................ | علیؑ کیست (علیؑ کون ؟) |
| اردو ترجمہ | ................................ | علیؑ مظہر کبریا |
| تالیف | ................................ | فضل اللہ کمپانی |
| ترجمہ | ................................ | منیر الحسن جعفری |
| تہذیب | ................................ | رضا حسین رضوانی |
| ہمکار | ................................ | علی محمد رحمانی |
| کمپوزنگ | ................................ | عبدالرزاق جعفرانی |
| طبع اول | ................................ | سنہ ۱۴۳۱ھ - سنہ ۲۰۱۰ء |
| مطبع | ................................ | محراب پریس کراچی |
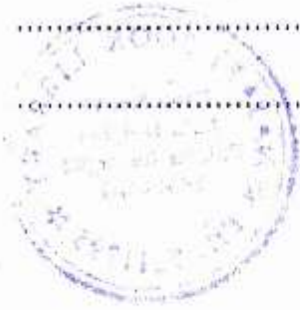
# علی بن ابی طالب علیہ السلام کے نام

— جو مولود کعبہ ہے
— جو شہید کوفہ ہے
— جو نور الہدیٰ ہے
— جو شاہ لافتیٰ ہے
— جو مصداق انما ہے
— جو تاجدار ہل اتیٰ ہے
— جو انصاف کی صدا ہے
— جو علم کا دروازہ ہے
— جو امت کا ناخدا ہے
— جو رسول پاکؐ کی دعا ہے
— جو کبریا نہیں ، مظہر کبریا ہے

## حضرت علی علیہ السلام کی دعا

اِلٰهِیْ کَفٰی بِیْ عِزًّا

اَنْ اَکُوْنَ لَکَ عَبْدًا

وَکَفٰی بِیْ فَخْرًا

اَنْ تَکُوْنَ لِیْ رَبًّا

اَنْتَ کَمَا اُحِبُّ

فَاجْعَلْنِیْ کَمَا تُحِبُّ

# حضرت علی علیہ السلام کی دعا کا ترجمہ

الٰہی ! میری عزت کے لیے یہی کافی
ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں
اور میرے فخر کے لیے یہی کافی
ہے کہ تو میرا پروردگار ہے
تو ویسا ہی ہے جیسا میں چاہتا ہوں
پس مجھے ویسا بنا لے جیسا تو چاہتا ہے

# کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیت اللہ العظمیٰ آقائے خوئی رضوان اللہ علیہ کا قائم کردہ یہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامی اب حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی حسینی سیستانی دام ظلہ الوارف کی سرپرستی میں دنیا بھر میں معتبر اسلامی لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔ اس ادارے کا مقصد دور حاضر کی روحانی ضروریات کو پورا کرنا، لوگوں کو محکم اسلامی علوم کی طرف متوجہ کرانا ہے جو اہلبیت رسولؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک اردو اور انگریزی زبانوں میں متعدد کتابیں شائع کرچکا ہے جو الحمد للہ اپنے مشمولات، اسلوب بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوس کتب میں نمایاں مقام حاصل کرچکی ہیں۔ نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاء اللہ انسانیت کو صراط مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

اس کے علاوہ ادارہ ہذا تقریباً ۵۰۰ مدارس و مکاتب میں زیر تعلیم طلباء کو اسلامی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

دعوت اسلام ایک ایسا نیک کام ہے جس کو فروغ دینے کے لیے ہم سب کو باہمی تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اس کار خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اسلامی تعلیمات کو دنیا بھر میں عام کیا جاسکے۔

خداوند منان بحق محمدؐ و آل محمدؐ ہم سب پر اپنی برکتیں نازل فرمائے۔

**شیخ یوسف علی نفسی**

وکیل آیت اللہ العظمیٰ سیستانی دام ظلہ العالی

# فہرست موضوعات

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

# حرف آغاز

تعریف اس خدائے عزوجل کی جس نے پیکر ہستی کو کائنات سے ہم آہنگ لباس عطا فرمایا اور اپنی تجلیات کو آثار فطرت میں آشکار فرمایا تاکہ فرد دانا و بینا چشم بصیرت سے اس ذات بے ہمتا کا مشاہدہ کر سکے جس کی جبروت کے بے کنار افق پر طائر فکر و خیال پر نہیں مار سکتا اور جس کی ابدیت کے بے پایاں صحرا میں عقل و خرد جولانیاں نہیں کر سکتی۔ اسی خدائے عزوجل نے نوع انسانی کی ہدایت کے لیے اپنے بنائے ہوئے ہادیوں کو شمع ہدایت قرار دیا اور ان کے وسیلے سے انسانوں کو معاشرتی نظام اور اس کے احکام عطا کر کے ان احکام کی پابندی کا حکم دیا ہے۔

اَن گنت درود و سلام ہوں کاشانۂ نبوت و ولایت کی ان پاک باز ہستیوں پر جو بنی نوع انسان کی تربیت کرنے والی اور ان کے لیے راہ توحید کو روشن کرنے والی ہیں۔

اما بعد!

زیر نظر کتاب اس عظیم کرشماتی شخصیت کی زندگی کے بارے میں ہے جس کے علاوہ صفحۂ روزگار پر اس قدر فضائل کا حامل کوئی اور دکھائی نہیں دیتا کیونکہ اس عالم رنگ و بو میں خود مصور نے اس جیسی کوئی دوسری تصویر نہیں بنائی۔

اگرچہ حضرت علی علیہ السلام کی حیات طیبہ پر کافی تحقیقی کام ہو چکا ہے اور کئی تصانیف چھپ چکی ہیں تاہم زیر نظر کتاب میں امام عالی مقام کے تعارف کو عام فہم بنانے کے لیے نہایت سادہ اسلوب اپنانے کے ساتھ ساتھ فاضل مصنف نے درج ذیل نکات کو مدنظر رکھا ہے۔

(۱) کتاب کے جملے سادہ ہوں۔ پیچیدہ اور غیر مانوس عبارتیں نہ ہوں۔

(۲) حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بلافصل کے اثبات میں جذبات و تعصبات کی بجائے اہلسنت کی معتبر کتابوں کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔

(۳) جانبداری سے دور رہتے ہوئے صرف حقائق پیش کیے گئے ہیں اور مروجہ علوم کے مطابق ضعیف روایتوں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

(۴) حضرت علی علیہ السلام کی امامت سے متعلق برادران اہلسنت کے نزدیک قابل قبول احادیث کے علاوہ عقلی اور اصولی دلائل سے استدلال کیا گیا ہے۔

(۵) جن شیعہ عقائد کا اثبات لازمی ہے ان کو برادران اہلسنت کی معتبر کتب سے ثابت کیا گیا ہے اور ان کے حوالہ جات بھی درج کئے گئے ہیں۔

یہ کتاب آج سے تقریباً پچاس سال پہلے یعنی ۱۹۵۸ء میں فارسی زبان میں شائع ہوئی تھی اور عوام میں مقبول ہونے کی بنا پر اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

اس کتاب کے مصنف جناب حجۃ الاسلام فضل اللہ کمپانی کے اسلوب تحریر کو برقرار رکھتے ہوئے صاحبان ذوق کے لیے اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ علیؑ، مظہر کبریا کی کچھ معرفت حاصل کی جاسکے کیونکہ ان کی پوری معرفت حاصل کرنا ہم جیسے ناچیز انسانوں کے لیے ممکن نہیں۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد اقدس ہے:

**يَا عَلِيُّ! مَا عَرَفَكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ غَيْرُ اللّٰهِ وَغَيْرِيْ**

اے علیؑ! تم کو میرے اور اللہ کے سوا کسی اور نے پوری طرح نہیں پہچانا۔

امید ہے کہ آپ اس سوانح حیات کے مطالعہ سے حضرت علی علیہ السلام کی پہلو دار شخصیت کے کسی ایک پہلو کے بارے میں کچھ نہ کچھ جان سکیں گے اور اسے اپنی زندگی میں مشعل راہ بنائیں گے اور اپنے آپ کو ان کی پیروی کے لیے تیار کریں گے کیونکہ وہ ہمارے امام ہیں اور ہم ان کے ماموم۔
ان کا اتباع کر کے ہم دنیا میں شادکام ہو سکتے ہیں اور آخرت میں بھی کوثر کا جام پی سکتے ہیں۔

یکے از غلامان علی مرتضیٰؑ
رضا حسین رضوانی

# حضرت علی علیہ السلام ــــ زمانۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں

## (۱) حضرت علی علیہ السلام کی ولادت

مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کی ولادت باسعادت ۱۳ ر رجب ۳۰ عام الفیل[۱] بروز جمعۃ المبارک خانۂ کعبہ کے اندر ہوئی جو تاریخ کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ اس واقعے کی مثال کسی زمانے میں نہیں ملتی۔ آپ کے والد ماجد حضرت ابو طالبؑ جناب عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف کی نسل سے تھے اور آپ کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہؑ، اسد بن ہاشم بن عبد مناف کی بیٹی تھیں اس لحاظ سے حضرت علی علیہ السلام ہاشمی الطرفین ہیں۔[۲]

اس مولود کعبہ کی ولادت عام بچوں کی طرح نہیں تھی بلکہ اس میں حیرت انگیز اور معنوی تغیرات بھی دیکھنے میں آئے۔ جناب فاطمہ بنت اسدؑ ایک خدا پرست خاتون تھیں۔ آپ دین حنیف کی پیروکار تھیں۔ آپ مسلسل یہ دعا کرتی تھیں کہ اللہ آپ کے لیے وضع حمل کا مرحلہ آسان فرمائے۔ جب تک یہ بچہ آپ کے شکم مبارک میں تھا آپ خود کو نور الٰہی میں مستغرق پاتی تھیں گویا ملکوت اعلیٰ کی طرف سے آپ کو یہ الہام ہوگیا ہو کہ یہ بچہ دیگر بچوں سے مختلف ہے۔

---

۱۔ ابو یکسوم ابرہہ حبشی (ابرھۃ الاشرم) واقعہ غدر کے ۲۱۶ سال بعد ۱۷ رمحرم کو ہاتھیوں پر سوار فوج لیکر یمن سے مکہ پر قبضہ کرنے اور خانہ کعبہ کو تباہ کرنے کے لیے آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب ''اصحاب فیل'' کو ہلاک کردیا تھا۔ ابرہہ ہلاک ہونے والا آخری فرد تھا۔ قرآن مجید میں اس واقعے کا بیان سورۂ فیل میں ہوا ہے۔ عربوں نے اس سال کو مبارک قرار دیتے ہوئے اس کا نام عام الفیل رکھا اور غدر کے سال کی بجائے اب عام الفیل کا سال رائج کیا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت اسی سال ہوئی اور اس واقعہ کے بعد ۷۰ سال تک یعنی ۱۸ھ تک عام الفیل ہی مسلمانوں میں رائج سن تھا مگر ۱۸ھ میں حضرت عمرؓ نے حضرت علی علیہ السلام کے مشورے پر اس سن کی جگہ ہجرت کے سال سے اسلامی تقویم کا آغاز کیا۔ (رضوانی)

۲۔ حضرت علی علیہ السلام جناب ابو طالبؑ کے سب سے چھوٹے اور چوتھے بیٹے تھے۔ اس سے قبل ان کے تین بڑے بیٹے طالب، عقیل اور جعفر تھے۔

شیخ صدوق اور فتال نیشاپوری روایت کرتے ہیں کہ یزید بن قعنب نے کہا:

میں، عباس بن عبدالمطلبؓ اور قبیلۂ عبد العزیٰ کے چند افراد خانۂ کعبہ کے قریب بیٹھے ہوئے تھے کہ فاطمہ بنت اسدؓ جن کے حمل کے نو ماہ پورے ہو چکے تھے خانۂ کعبہ کے پاس آئیں اور کہنے لگیں:

''خدایا! میں تجھ پر، تیرے رسولوں اور تیری کتابوں پر اور جو کچھ تیری طرف سے نازل ہوا ہے ان سب پر ایمان رکھتی ہوں۔ میں اپنے دادا ابراہیم خلیلؑ کے قول کی تصدیق کرتی ہوں، انھوں نے ہی اس گھر کی بنیاد رکھی تھی، پس اے اس گھر کو تعمیر کرانے والے! جو بچہ میرے شکم میں ہے اس کے طفیل اس کی ولادت کو میرے لیے آسان فرما دے۔''

یزید بن قعنب کہتا ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کعبہ کی پچھلی دیوار شگافتہ ہوئی اور فاطمہؓ اندر چلی گئیں۔ وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئیں اور کعبہ کی دیوار برابر ہوگئی۔ پھر جب ہم نے کعبہ کے دروازے کے تالے کو کھولنا چاہا تو ہم اسے کھول نہ سکے چنانچہ ہم سمجھ گئے کہ یہ سب خدا کے حکم سے ہوا ہے۔ فاطمہؓ جب چار دن کے بعد کعبہ کے اندر سے باہر آئیں تو انھوں نے ہاتھوں میں اپنے بچے کو اٹھایا ہوا تھا اور کہہ رہی تھیں:

''مجھے تمام سابقہ عورتوں پر برتری حاصل ہے کیونکہ آسیہؑ بنت مزاحم زوجہ فرعون نے جہاں اللہ کی عبادت سوائے مجبوری کے صحیح نہ تھی وہاں چھپ کر عبادت کی۔ مریمؑ بنت عمران نے کھجور کے خشک درخت کو اپنے ہاتھوں سے ہلایا تاکہ اس سے تازہ کھجوریں گریں اور وہ کھائیں لیکن جب بیت المقدس میں انھیں دردِ زہ شروع ہوا تو غیب سے آواز آئی کہ اے مریم! یہاں سے چلی جاؤ۔ یہ عبادت گاہ ہے زچہ خانہ نہیں لیکن میں خانۂ کعبہ میں داخل ہوئی، وہاں میں نے بہشتی پھل کھایا اور جب میں باہر آرہی تھی تو میں نے ہاتف غیبی کی یہ آواز سنی:

اے فاطمہ! اس کا نام علی رکھنا کیونکہ خدائے بزرگ و برتر نے فرمایا ہے کہ میں ''علیٌّ اعلیٰ'' ہوں اور میں نے اس کا نام اپنے نام پر رکھا ہے۔ میں نے اسے اپنے ادب سے مؤدب بنایا ہے۔ میں نے اسے اپنے علم کی گہرائیوں کا جاننے والا بنایا ہے۔ یہی میرے گھر میں بت شکنی کرے گا، یہی میرے گھر کی چھت پر اذان دے گا اور میری تسبیح کرے گا۔ خوش نصیب ہے اسے دوست رکھنے اور اس کے حکم پر عمل کرنے والا اور بدنصیب ہے اسے دشمن رکھنے والا اور اس کی نافرمانی کرنے والا۔''

(امالی صدوق، مجلس ۲۷، حدیث ۹۔ روضۃ الواعظین ج ۱، ص ۷۶۔ بحار الانوار ج ۳۵، ص ۸۔ کشف الغمہ ص ۱۹)

خانۂ کعبہ کے اندر ولادت، حضرت علی علیہ السلام کا وہ شرف ہے جو کسی بھی انسان کو حاصل نہیں ہوا ہے اور نہ ہو سکے گا۔ اس حقیقت کا اعتراف اہلسنت نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ ابن صباغ مالکی لکھتے ہیں:

وَلَمْ یُوْلَدْ فِی الْبَیْتِ الْحَرَامِ قَبْلَهٗ اَحَدٌ سِوَاهُ وَهِیَ فَضِیْلَةٌ خَصَّهُ اللّٰهُ تَعَالٰی بِهَا اِجْلَالًا لَهٗ وَ اِعْلَاءً لِمَرْتَبَتِهٖ وَاِظْهَارًا لِتَكْرِمَتِهٖ یعنی حضرت علی علیہ السلام سے پہلے کسی کی بھی خانۂ کعبہ میں ولادت نہیں ہوئی اور یہ وہ فضیلت ہے جو خدا نے ان کے لیے مخصوص فرمائی تاکہ لوگوں پر آپ کی جلالت، عظمت اور مرتبت کو ظاہر کرے اور آپ کے احترام کا اظہار ہو۔ (فصول المہمہ ص ۱۴)

بحار الانوار کی نویں جلد میں آپ کا نام علیؑ ہونے کے بارے میں لکھا ہے کہ حضرت ابو طالبؑ نے بیٹے کو ماں کی آغوش سے لے کر اپنے سینے سے لگایا، پھر حضرت فاطمہؑ کا ہاتھ پکڑ کر صحن کعبہ میں تشریف لائے اور یوں عرض پرداز ہوئے:

یَا رَبَّ هٰذَا الْغَسَقِ الدُّجِیّ     وَالْقَمَرِ الْمُبْتَلِجِ الْمُضِیّ
بَیِّنْ لَنَا مِنْ حُكْمِكَ الْمُقْضِیّ     مَا ذَا تَرٰی فِیْ اسْمِ ذَا الصَّبِیّ

اے رات کو تاریکی اور چاند کو روشنی بخشنے والے رب! ہمیں بتا کہ ہم اس بچے کا کیا نام رکھیں؟

غیب سے آواز آئی:

خُصِّصْتُمَا بِالْوَلَدِ الزَّكِیّ     وَالطَّاهِرِ الْمُنْتَجَبِ الرَّضِیّ
فَاِسْمُهٗ مِنْ شَامِخٍ عَلِیّ     عَلِیٌّ نِ اشْتُقَّ مِنَ الْعَلِیّ

تمھیں پاک، پاکیزہ، برگزیدہ اور اقبال مند فرزند عطا ہوا ہے۔ اس کا نام بلند ناموں میں سے علی ہے جو خداوند علیٰ اعلیٰ کے نام سے مشتق ہے۔

اکابر علمائے اہلسنت نے بھی اپنی کتابوں میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ محمد بن یوسف گنجی شافعی نے تغیر لفظی کے ساتھ **کفایۃ الطالب** میں لکھا ہے کہ حضرت ابو طالبؑ کے سوال کے جواب میں یہ آواز آئی تھی:

یَا اَهْلَ بَیْتِ الْمُصْطَفَی النَّبِیّ     خُصِّصْتُمْ بِالْوَلَدِ الزَّكِیّ
اِنَّ اسْمَهٗ مِنْ شَامِخٍ الْعَلِیّ     عَلِیٌّ نِ اشْتُقَّ مِنَ الْعَلِیّ

اے مصطفیٰ نبی کے گھر والو! تمھیں پاک و نہاد فرزند نصیب ہوا ہے۔ بلند مرتبہ پروردگار کی جانب سے اس کا نام علیؑ ہے جو پروردگار کے نام علی سے مشتق ہے۔ (ینابیع المودۃ، باب ۵۶، ص ۲۵۵)

بعض روایات میں ہے کہ جناب فاطمہ بنت اسدؓ نے وضع حمل سے پہلے بچے کا نام حیدر رکھا تھا۔ اسی لیے جب انھوں نے بچے کو کپڑے میں لپیٹ کر اپنے شوہر نامدار کے سپرد کیا تو فرمایا تھا: خُذْہُ فَاِنَّہٗ حَیْدَرَۃ یعنی اسے لیجئے! یہ حیدر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزوۂ خیبر میں یہودی سورما مرحب کے سامنے رجز پڑھتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا تھا:

اَنَا الَّذِیْ سَمَّتْنِیْ اُمِّیْ حَیْدَرَۃ  ضِرْغَامُ آجَامٍ وَ لَیْثٌ قَسْوَرَۃ

میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے۔ میں نیستان کا شیر نر ہوں۔

پھر جب آپ کا نام علیؑ رکھا گیا تو حیدر آپ کے جملہ القابات میں شمار ہونے لگا۔ آپ کے مشہور ترین القابات حیدر، اسد اللہ، مرتضیٰ، امیر المومنین اور برادر رسولؐ (اخو رسول اللہؐ) ہیں جبکہ آپ کی کنیت ابو الحسن اور ابو تراب ہے۔

حضرت ابو طالبؑ اور جناب فاطمہ بنت اسدؓ کے اسلام قبول کرنے سے متعلق روایات سے یہ پتا چلتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی وہ موحد تھے اسی لیے بیٹے کے نام کے تعین کے لیے انھوں نے اللہ سے مناجات کی تھی۔ جناب فاطمہ بنت اسدؓ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ کا درجہ حاصل تھا۔ آپ کا شمار ان خواتین میں ہوتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بالکل ابتدائی زمانے میں ایمان لائی تھیں اور جنھوں نے مدینہ ہجرت کی تھی۔ ان کی وفات کے موقع پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا پیراہن ان کے کفن کے لیے عطا فرمایا تھا اور ان کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود ان کی قبر میں لیٹے تاکہ وہ فشار قبر سے محفوظ رہیں۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی تلقین پڑھی اور دعا فرمائی۔

(اصول کافی، ج ۲۔ ابواب تاریخ۔ اعلام الوریٰ۔ امالی صدوق مجلس ۵۱، ح ۱۴)

حضرت ابو طالبؑ بھی موحد تھے۔ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد ایمان لے آئے تھے مگر چونکہ قریش کے سردار تھے اس لیے انھوں نے مصلحت کے تحت اپنا ایمان مخفی رکھا تھا۔

امالی شیخ صدوق میں مرقوم ہے کہ ایک شخص نے ابن عباسؓ سے کہا: اے رسول خداؐ کے ابن عم! کیا ابو طالبؑ مسلمان تھے؟ انھوں نے کہا: وہ کیونکر مسلمان نہ تھے جبکہ وہ کہا کرتے تھے:

وَقَدْ عَلِمُوْا اَنَّ ابْنَنَا لَا مُکَذَّبٌ  لَدَیْنَا وَلَا یَعْبَأُ بِقَوْلِ الْاَبَاطِلِ

یعنی مشرکین مکہ جانتے ہیں کہ ہمارا فرزند (حضرت محمد مصطفیٰؐ) ہمارے نزدیک جھٹلایا ہوا نہیں ہے اور وہ بیہودہ باتوں کی پروا نہیں کرتا۔

حضرت ابو طالبؑ کی مثال اصحاب کہف کی مثال ہے۔ انھوں نے اپنے ایمان کو مخفی رکھا اور اللہ نے انھیں دگنا ثواب عطا فرمایا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے کہ حضرت ابو طالبؑ کی مثال اصحاب کہف کی سی ہے جن کا دل ایمان سے لبریز تھا مگر وہ ظاہری طور پر مشرک نظر آتے تھے اور اللہ نے انھیں دگنا ثواب عطا فرمایا (ایک ایمان رکھنے کا اور دوسرا تقیہ کرنے کا)۔ (امالی شیخ صدوق، مجلس ۸۹، ح ۱۲۔ ۱۳۔ روضۃ الواعظین ج ۱، ص ۱۳۹)

سرکار رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں حضرت ابو طالبؑ کے کہے ہوئے بہت سے اشعار موجود ہیں جن سے ان کا مسلمان ہونا بالکل واضح ہے۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا تھا:[۱]

وَ دَعَوْتَنِیْ وَ عَلِمْتُ اَنَّكَ نَاصِحِیْ     وَ لَقَدْ صَدَقْتَ وَ كُنْتَ قَبْلُ اَمِیْنَا

وَ ذَكَرْتَ دِیْنًا لَا مُحَالَةَ اَنَّهٗ     مِنْ خَیْرِ اَدْیَانِ الْبَرِیَّةِ دِیْنَا

آپ نے مجھے اپنے دین کی طرف بلایا اور میں جان گیا کہ یقیناً آپ میرے خیر خواہ ہیں۔ بے شک آپ کی دعوت سچی ہے اور آپ نے اپنی دعوت میں امانت برتی ہے۔ آپ نے لوگوں کے سامنے وہ دین پیش کیا ہے جو سب سے بہترین دین ہے۔ (بحار الانوار، ج ۳۵، ص ۱۲۴)

امام جعفر صادق علیہ السلام سے کہا گیا کہ اہلسنت سمجھتے ہیں کہ حضرت ابو طالبؑ نعوذ باللہ کافر تھے۔ امام نے فرمایا: یہ لوگ جھوٹ کہتے ہیں۔ حضرت ابو طالبؑ کیونکر کافر تھے جبکہ وہ کہا کرتے تھے:

اَلَمْ تَعْلَمُوْا اَنَّا وَجَدْنَا مُحَمَّدًا

نَبِیًّا كَمُوْسٰی خُطَّ فِیْ اَوَّلِ الْكُتُبِ

کیا تمھیں معلوم نہیں کہ ہم نے محمدؐ کو موسیٰؑ کی طرح نبی پایا ہے اور اگلی آسمانی کتابوں میں آپ کا نام لکھا ہوا ہے۔ (اصول کافی ج ۲، باب، ابواب التاریخ)

---

۱۔ ابن واضح یعقوبی کی تاریخ یعقوبی، جلد اول، صفحہ ۳۸۸، مطبوعہ شرکت انتشارات علمی و فرہنگی، تہران ۱۹۸۷ء میں ہے کہ جب حضرت ابو طالب کو یہ خبر ملی کہ قریش رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل پر تل گئے ہیں تو آپ نے یہ اشعار کہے تھے۔ ذیل میں ہم ان اشعار کا پہلا شعر لکھ رہے ہیں جو فاضل مصنف نے نقل نہیں کیا۔ باقی شعروں میں ذرا سا لفظی فرق ہے۔

وَاللّٰهِ لَنْ یَصِلُوْا اِلَیْكَ بِجَمْعِهِمْ     حَتّٰی اُوَسَّدَ فِی التُّرَابِ دَفِیْنَا

وَ دَعَوْتَنِیْ وَ زَعَمْتَ اَنَّكَ نَاصِحٌ     وَ لَقَدْ صَدَقْتَ وَ كُنْتَ ثَمَّ اَمِیْنَا

وَ عَرَضْتَ دِیْنًا قَدْ عَلِمْتُ بِاَنَّهٗ     مِنْ خَیْرِ اَدْیَانِ الْبَرِیَّةِ دِیْنَا

خدا کی قسم! میری لاش پر سے گزرے بغیر وہ سب مل کر بھی آپ کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ (رضوانی)

شیخ سلیمان قندوزی لکھتے ہیں : وَحَامِي النَّبِيِّ وَمُعِيْنُهُ وَمُحِبُّهُ اَشَدُّ حُبًّا وَ كَفِيْلُهُ وَ مُرَبِّيْهِ وَالْمُقِرُّ بِنُبُوَّتِهٖ وَالْمُعْتَرِفُ بِرِسَالَتِهٖ وَالْمُنْشِدُ فِيْ مَنَاقِبِهٖ اَبْيَاتًا كَثِيْرَةً وَ شَيْخُ قُرَيْشٍ اَبُوْ طَالِبٍ یعنی ابو طالبؑ جو قریش کے سردار تھے رسول خداؐ کے حامی و مددگار اور آپ سے بے پناہ محبت کرنے والے تھے۔ وہی آپ کی کفالت و تربیت کرنے والے تھے۔ انھوں نے آپ کی رسالت کا اقرار کیا اور آپ کی مدح میں بہت سے ابیات کہے۔[1] (ینابیع المودۃ باب ۵۲، ص ۱۵۲)

جی ہاں ! خانہ کعبہ کے اندر حضرت علی علیہ السلام کی ولادت نے بنی ہاشم کے سینے پر ایک اور پُر افتخار تمغہ سجا دیا اور ان کے اعزازات میں ایک اور اعزاز کا اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ عرب وعجم کے شعراء نے اس بارے میں اشعار کہے ہیں مثلاً سید حمیری کہتے ہیں :

وَلَدَتْهُ فِيْ حَرَمِ الْاِلٰهِ اُمُّهٗ ۔۔۔ وَالْبَيْتُ حَيْثُ فِنَائُهٗ وَالْمَسْجِدُ
بَيْضَاءُ طَاهِرَةُ الثِّيَابِ كَرِيْمَةٌ ۔۔۔ طَابَتْ وَطَابَ وَلِيْدُهَا وَالْمَوْلِدُ
فِيْ لَيْلَةٍ غَابَتْ نُحُوْسُ نُجُوْمِهَا ۔۔۔ وَبَدَتْ مَعَ الْقَمَرِ الْمُنِيْرِ الْاَسْعَدُ
مَا لُفَّ فِيْ خِرَقِ الْقَوَابِلِ مِثْلُهٗ ۔۔۔ اِلَّا ابْنُ اٰمِنَةَ النَّبِيُّ مُحَمَّدُ

ان کی والدہ نے ان کو حرم الٰہی میں جنم دیا۔ پس گھر اور مسجد الحرام دونوں ان کے گھر ہیں۔ وہ نورانی ماں جو پاک پوشاک پہنے ہوئے تھیں خود بھی پاک تھیں اور ان کا بچہ اور اس کا مولد بھی پاک تھا وہ رات جس میں نحس ستاروں کی نحوست مٹ گئی اور چاند کے ساتھ سعید ترین ستارے نظر آرہے تھے اس رات میں دنیا کی کسی دایہ نے کسی نومولود بچے کو اس طرح لباس نہیں پہنایا تھا (یعنی اس طرح کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا) سوائے فرزند آمنہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو ہمارے نبی ہیں۔ (روضۃ الواعظین ج ۱، ص ۸۱)

---

۱۔ اس موضوع پر سعودی عرب کے جناب عبداللہ خنیزی کی کتاب **ابو طالب مومن قریش** اور پاکستان کے جناب صائم چشتی کی کتاب **ایمان ابو طالب** نیز علامہ امینی کی کتاب **ابو طالب مظلوم تاریخ** مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان چھپ چکی ہیں

# (۲) حضرت علی علیہ السلام کی ابتدائی تربیت

حضرت ابو طالبؑ قریش کے انتہائی محترم بزرگ تھے۔ آپ اپنے قبیلے کے شیخ تھے۔ آپ نے اپنے بیٹوں کی تربیت پر پوری توجہ دی اور انھیں تقویٰ اور فضیلت کے ساتھ پروان چڑھایا۔ آپ نے اپنی اولاد کو بچپن سے ہی عربوں میں رائج گھڑسواری، کشتی اور تیراندازی کے فنون سکھائے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بچپن میں جب یتیم ہوئے تو آپ کے دادا جناب عبدالمطلب نے آپ کی پرورش کی اور دادا کی وفات کے بعد حضرت ابو طالبؑ نے آپ کو پالا پوسا۔ حضرت علی علیہ السلام کی والدہ اور حضرت ابو طالبؑ کی زوجہ جناب فاطمہ بنت اسدؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایک شفیق اور مہربان ماں کی طرح تھیں چنانچہ ان کی وفات ہوئی تو حضرت علی علیہ السلام کی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی بہت اداس تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور ان کے کفن کے لیے اپنا پیراہن عطا فرمایا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ حضرت ابو طالبؑ کے گھر میں پلے بڑھے تھے اس لیے اپنے چچا کی مہربانیوں اور فداکاریوں کا شکریہ ادا کرنے اور چچا کے شایان شان احترام بجا لانے کے لیے آپ اس کوشش میں رہتے تھے کہ کوئی ایسا کام کریں جس سے چچا کے حق کی شناخت ہو۔ چنانچہ جب حضرت علیؑ چھ سال کے تھے اس وقت مکہ میں شدید قحط پڑا۔ حضرت ابو طالبؑ کے لیے قحط سالی کے دوران ایک بڑے کنبے کے اخراجات پورے کرنا بڑا مشکل تھا چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کی پرورش کی ذمے داری اٹھاتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام کو اپنے چچا سے لے لیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی زوجہ جناب خدیجہ سلام اللہ علیہا نے شفیق ماں باپ کی طرح حضرت علی علیہ السلام کی ویسے ہی پرورش کی جیسے حضرت ابو طالبؑ اور جناب فاطمہؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرورش کی تھی۔

ابن صباغ مالکی نے **فصول المهمه** اور علامہ باقر مجلسی نے بحار الانوار میں لکھا ہے:

ایک سال مکہ میں سخت قحط پڑا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب سے

جو بے حد مالدار تھے فرمایا کہ آپ کے بھائی حضرت ابو طالبؑ جو کثیر العیال ہیں اس وقت کافی پریشان ہیں۔ آپ کے قبیلے میں وہ سب سے زیادہ امداد کے مستحق ہیں اس لیے آئیں ان کے پاس چلیں اور ان کا بوجھ بٹائیں۔ ہم میں سے ہر ایک ان کے بیٹوں میں سے ایک بیٹے کو اپنے گھر لے آئے اور اس کی کفالت کرے۔ اس طرح حضرت ابو طالبؑ کی گزر اوقات آسان ہوجائے گی۔ حضرت عباسؓ نے کہا: خدا کی قسم! یہ بہترین نیکی بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔ اس کے بعد انھوں نے حضرت ابو طالبؑ سے ملاقات کی اور انھیں اس خواہش سے آگاہ کیا۔ حضرت ابو طالبؑ نے کہا: طالب اور عقیل کو (ایک روایت میں ہے کہ عقیل کو) میرے پاس رہنے دیں باقی جسے چاہیں لے جائیں۔ چنانچہ عباسؓ نے جعفرؓ کو، حمزہؓ نے طالبؓ کو اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو منتخب کیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔

(فصول المہمہ ص ۱۵۔ بحار الانوار ج ۳۵، ص ۱۱۸)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کا اپنے بھائیوں سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام کو ان کے والد گرامی سے لے کر اپنے بیت الشرف میں لائے اس وقت بھی کفالت اور رشتے داری کے علاوہ ان کے درمیان ایک قریبی تعلق موجود تھا اور ایسے لگتا تھا جیسے سورج کی ایک کرن تھی جو سورج سے مل گئی یا یہ کہ پانی کا ایک قطرہ تھا جو سمندر میں شامل ہوگیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حسن انتخاب حضرت علی علیہ السلام سے آپ کے گہرے لگاؤ اور ان کی شناخت کا آئینہ دار بھی تھا۔

بقول شاعر

علیؑ را قدر پیغمبرؐ شناسد
بلے! قدر گہر زرگر شناسد

یعنی علیؑ کا مرتبہ پیغمبرؐ جانتے ہیں۔ جی ہاں! ہیرے کی قدر جوہری ہی جان سکتا ہے۔

اللہ کے رسولؐ جیسا مربی و معلم جس کی شان میں عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى (سورۂ نجم: آیت ۵) کی آیت اتری ہو اور جس نے مکتب ربوبیت میں تربیت پائی ہو (اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ) ایسے مربی اور معلم کے شاگرد علیؑ جیسے ہی ہوسکتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کو بچپن ہی سے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفقت حاصل رہی جس کی وجہ سے ان کا تعلق نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس قدر مستحکم تھا کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ آپ سائے کی طرح نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہتے اور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم براہ راست ان کی تربیت فرماتے۔ خود حضرت علی علیہ السلام بھی اپنے تمام

معاملات میں نبیؐ کریم ﷺ کا اتباع کرتے تھے اسی لیے حضرت علی ؑ نے مختصر سی مدت میں نبیؐ کریمؐ کے طور طریقے اور اخلاق و عادات کو سیکھ لیا۔[۱]

انسانی زندگی کو چند حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور زندگی کے ہر حصے میں انسان اپنی عمر کے مطابق کام کرتا ہے۔ اگرچہ بچپن کا زمانہ کھیل کود کا زمانہ ہوتا ہے لیکن حضرت علی ؑ عام بچوں کی طرح کھیل کود کی طرف مائل نہیں تھے۔ آپ بچپن ہی سے عظیم سوچ کے حامل رہے اور آپ کا اسلوب زندگی روحانی تکامل کا مظہر تھا۔

حضرت علی ؑ آٹھ سال کی عمر تک رسول اکرم ﷺ کے گھر میں رہنے کے بعد اپنے آبائی گھر واپس آ گئے مگر یہ واپسی ان کو رسول اللہ ﷺ کی ہم نشینی سے دور نہ کرسکی بلکہ ظاہری طور پر بھی اس میں ایک نئی کیفیت نظر آنے لگی۔ جب بھی حضرت علی ؑ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آتے تو قلب مصطفیٰؐ میں اپنے عظیم باپ کے لیے محبت کے والہانہ جذبات موجزن پاتے۔ رسول اکرم ﷺ حضرت ابو طالبؑ کے لیے تشکر و امتنان کے جو جذبات رکھتے تھے اس کا اظہار حضرت علی ؑ کے ساتھ آپ کے حسن سلوک میں نظر آتا تھا۔ حضرت علی ؑ رسول اکرم ﷺ کے اخلاقی فضائل اور روحانی کمالات کے عملی اظہار کا وسیلہ قرار پاتے۔ اس طرح حضرت علی ؑ کے بچپن کے دس سال رسول اکرم ﷺ کے سایۂ شفقت میں گزرے اور اس عرصے کی تعلیم و تربیت اس بات کا موجب بن گئی کہ حضرت علی ؑ سب سے پہلے رسول اکرم ﷺ پر ایمان لائے اور زندگی بھر اسلام کی خاطر ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار رہے۔

---

۱۔ حضرت علی ؑ خطبہ قاصعہ میں فرماتے ہیں:

میں بچہ ہی تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے گود لے لیا۔ وہ مجھے اپنے سینے سے چمٹائے رکھتے تھے اور بستر میں اپنے پہلو میں سلاتے تھے۔ اپنے جسم مبارک کو مجھ سے مس کرتے تھے اور مجھے اپنی خوشبو سنگھاتے تھے۔ پہلے آپ کسی چیز کو چباتے پھر اس کے لقمے بنا بنا کر میرے منہ میں دیتے تھے۔ آپ نے نہ تو کبھی میری کسی بات میں جھوٹ کا شائبہ پایا اور نہ کبھی میرے کسی کام میں لغزش و کمزوری دیکھی ... میں آپ کے پیچھے پیچھے یوں لگا رہتا تھا جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ آپ ہر روز میرے لیے اخلاق حسنہ کے پرچم بلند کرتے تھے اور مجھے ان کی پیروی کا حکم دیتے تھے۔

(نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۰) رضوانی

# (۳) حضرت علی علیہ السلام اور اعلان بعثت

اس باب کو شروع کرنے سے پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے حالات و واقعات کی طرف مختصر اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ اس کے ذیل میں حضرت علی علیہ السلام کی حیات مبارکہ کے بارے میں گفتگو کو آگے بڑھایا جائے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بچپن سے ہی سماجی برائیوں سے دور رہتے اور نظام کائنات اور راز حیات کے بارے میں غور وفکر کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ عبادت میں مصروف رہنا آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ جب آپ کا سن مبارک چالیس سال ہوا تو غار حرا میں جہاں آپ عبادت کیا کرتے تھے نور ابدیت کی کرنوں نے آپ کے ضمیر کو منور کردیا اور تخلیق کائنات کے اسرار آپ پر کھلنے لگے اور آپ نے افشائے حقیقت کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے قوت گویائی حاصل کرلی اور رب کریم نے آپ کو لوگوں کی ہدایت پر مامور کردیا۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس چیز کو بھی دیکھتے اس سے خوشبوئے حقیقت کشید کرتے۔ آپ جہاں بھی جاتے حقیقت کی جستجو میں رہتے۔ آپ کے دل میں جوش کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجزن تھا جبکہ آپ کی زبان خاموش تھی گویا آپ کی شان ملکوتی اس بات کی ترجمان تھی کہ

در اندرون من خستہ دل ندانم چیست

کہ من خموشم و او در فغان و در غوغا است

مجھ خستہ دل کے اندر نہ جانے کیا چیز ہے کہ میری زبان چپ ہے مگر دل نالہ کناں ہے۔

کبھی کبھی آپ راز کی باتیں جناب خدیجہؑ کو بتا دیا کرتے تھے مگر دوسروں سے مخفی رکھتے تھے۔ وہ بھی آپ کی حوصلہ افزائی اور دلجوئی فرماتی تھیں۔ کچھ عرصہ یہی صورت حال جاری رہی یہاں تک کہ ایک دن غار حرا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک آواز سنائی دی۔ اِقْرَاْ یعنی پڑھو!

آپ نے پوچھا: کیا پڑھوں؟

جواب ملا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ○

الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ پڑھو اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑی عزت والا ہے جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ جس نے انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ (سورہ علق : آیت ۱ تا ۵)

جب آنحضرت ﷺ پر عالم غیب سے نور الٰہی کا نزول اجلال ہوا تو اس نور کی ہیبت سے آپ پر لرزہ طاری ہوگیا۔ آپ غار حرا سے باہر تشریف لائے اور جدھر دیکھتے ادھر اسی نور کا جلوہ نظر آتا چنانچہ حیرت و اضطراب کے عالم میں آپ اپنے گھر پہنچے اور جناب خدیجہؑ سے فرمایا کہ مجھے چادر اُڑھا دو۔ جناب خدیجہؑ نے آپ کو چادر اڑھائی تو آپ سو گئے۔ جب آپ جاگے تو آپ پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝ اے چادر اوڑھ کر سونے والے! اٹھو اور خبردار کرو اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو اور گندگی سے دور رہو اور اس نیت سے احسان نہ کرو کہ زیادہ حاصل کرو۔ اپنے رب کی خاطر صبر و استقلال سے کام لو۔ (سورۂ مدثر : آیت ۱ تا ۷)

اس نوعیت کا تبلیغی پیغام پہنچانا کوئی آسان کام نہ تھا اس لیے کہ یہ پیغام عربوں اور دیگر قوموں کے اعتقاد کے منافی تھا۔ اس سے پوری دنیا کے سماجی اور دینی مقدسات خاص کر عرب قوم کی تحقیر ہو رہی تھی اس لیے جہاں بھی کسی نے اس کو سنا اس نے اسلام کے خلاف علم بغاوت بلند کیا یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ کے اپنے خاندان والوں نے بھی آپ کا مذاق اڑایا اور آپ کو طعنے دیئے۔

اس وقت آنحضرت ﷺ کے وجود مبارک کو ایک حیرت انگیز کرشمۂ قدرت نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ آپ خدائے ذوالجلال کی اس عظیم عطا پر اس کے حضور اظہار تشکر میں مصروف رہتے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کی نظریں بڑی دلچسپی کے ساتھ آپ پر مرکوز تھیں چنانچہ اسی ابتدائی لمحے سے آپ کو رسول اکرم ﷺ کی بعثت کے متعلق آگہی حاصل ہوئی اور آپ پہلے سے زیادہ رسول اکرم ﷺ کے فرماں بردار بن گئے۔ آپ مردوں میں پہلے فرد ہیں جو دس سال[۱] کی عمر میں آنحضرت ﷺ پر

۱۔ اس سلسلے میں روایات میں کچھ اختلاف ہے۔ عبد ربہ اندلسی (۲۴۶ھ۔ ۳۲۸ھ) عقد الفرید جلد ۴، صفحہ ۳۱۱ پر لکھتے ہیں کہ ابوالحسن نے کہا: جب حضرت علی علیہ السلام اسلام لائے تو آپ کی عمر پندرہ سال تھی۔

حسن بصری اور محدثین کی ایک جماعت نے بھی یہی کہا ہے۔ ابوجعفر اسکافی کہتے ہیں کہ آپ کی عمر اس سے بھی زیادہ تھی۔ شیخ کلینی (۲۵۰ھ۔ ۳۲۹ھ) نے کافی میں لکھا ہے کہ اسلام لانے کے وقت حضرت علی علیہ السلام کی عمر دس اور تیرہ سال کے درمیان تھی۔ (علامہ سید ہاشم معروف، سیرت مصطفیٰ ﷺ، مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی) رضوانی

ایمان لائے جیسا کہ اہلسنت مؤرخین اور محدثین نے بھی لکھا ہے۔ محب الدین طبری نے **ذخائر العقبیٰ** میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ کُنْتُ اَنَا وَ اَبُوْ عُبَیْدَۃَ وَ اَبُوْ بَکْرٍ وَ جَمَاعَۃٌ اِذْ ضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰہِ مَنْکِبَ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ فَقَالَ یَا عَلِیُّ اَنْتَ اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا وَ اَنْتَ اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ اِسْلَامًا وَ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی یعنی میں ابو عبیدہ اور ابو بکر و دیگر افراد کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی بن ابی طالب علیہ السلام کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: اے علیؑ! تم ایمان لانے والے پہلے مومن ہو۔ نیز اسلام میں داخل ہونے والے تم پہلے مسلمان ہو۔ تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی۔ (نیز دیکھئے: ابن صباغ، فصول المہمہ ص ۱۲۵۔ اسد الغابہ ج ۲)

محب الدین طبری مزید لکھتے ہیں کہ بُعِثَ النَّبِیُّ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَاَسْلَمَ عَلِیٌّ یَوْمَ الثُّلَاثَاءِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوموار کے دن اعلان نبوت فرمایا اور حضرت علی علیہ السلام نے منگل کے دن اسلام قبول کیا۔

(ذخائر العقبیٰ ص ۵۹۔ ینابیع المودۃ ص ۶۰۔ سیرت ابن ہشام ج ۱، ص ۲۴۵)

سلیمان قندوزی نے انس بن مالک سے نقل کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

صَلَّتِ الْمَلَآئِکَۃُ عَلَیَّ وَعَلٰی عَلِیٍّ سَبْعَ سِنِیْنَ وَذَالِکَ اَنَّہٗ لَمْ تُرْفَعْ شَھَادَۃُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اِلَی السَّمَآءِ اِلَّا مِنِّیْ وَمِنْ عَلِیٍّ فرشتوں نے سات سال تک مجھ پر اور علیؑ پر درود بھیجا ہے کیونکہ اس عرصے میں آسمان کی طرف لا الٰہ الا اللہ کی آواز بلند نہیں ہوئی سوائے میری اور علیؑ کی آواز کے۔

(ینابیع المودۃ، باب ۱۲، ص ۱۶۔ ارشاد مفید ج ۱، باب ۲، ح ۲)

جب معاویہ نے حضرت علی علیہ السلام کے نام اپنے خط میں بے جا فخر و مباہات کیا تو حضرت علی علیہ السلام نے جواب میں قبول اسلام میں اپنی سبقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے لکھا:

سَبَقْتُکُمْ اِلَی الْاِسْلَامِ طِفْلًا

صَغِیْرًا مَا بَلَغْتُ اَوَانَ حِلْمِیْ

میں سب سے پہلے طفلی میں اسلام لایا جبکہ میں ابھی بچہ تھا اور حد بلوغ کو نہیں پہنچا تھا۔

(فصول المہمہ ص ۱۶)

علاوہ ازیں جس دن سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے حکم سے اپنے قریبی رشتے داروں کو جمع کر کے انھیں باقاعدہ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی اسی روز سوائے دس سال کے حضرت علی علیہ السلام کے کسی نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر لبیک نہیں کہا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے

ایمان کو قبول کرتے ہوئے مدعوین سے حضرت علی علیہ السلام کا اپنے جانشین کے طور پر تعارف کرایا تھا۔

اس واقعے کی تفصیل اس طرح ہے کہ جب خدا نے آیۂ مبارکہ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ۝ (سورۂ شعراء: آیت ۲۱۴) نازل فرمائی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اولاد عبدالمطلب کے چالیس افراد کو حضرت ابو طالبؑ کے گھر دعوت پر بلایا تاکہ اپنے دعوے کی سچائی ثابت کرنے کے لیے انھیں معجزہ دکھائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ ان تمام افراد کے لیے دنبے کی ایک ران، دس کلو گندم اور تین لیٹر دودھ سے کھانا تیار کیا جائے حالانکہ ان میں بعض افراد ایسے بھی تھے جو اس سے کئی گنا زیادہ کھانا ایک وقت میں کھاتے تھے۔ جب کھانا تیار ہوگیا تو وہ لوگ ہنسے اور کہا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تو صرف ایک آدمی کے لیے کھانا پکوایا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: كُلُوْا بِسْمِ اللهِ اللہ کا نام لے کر کھانا شروع کریں۔ چنانچہ جب اسی کھانے سے سب کا پیٹ بھر گیا تو ابولہب کہنے لگا: هٰذَا مَا سَحَرَكُمْ بِهِ الرَّجُلُ اس آدمی نے اس کھانے کے ذریعے تم سب پر جادو کردیا ہے۔

اس کے بعد اللہ کے رسولؐ کھڑے ہوئے اور فرمایا: يَا بَنِيْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اِنَّ اللهَ بَعَثَنِيْ اِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً وَبَعَثَنِيْ اِلَيْكُمْ خَاصَّةً فَقَالَ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ وَاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلٰى كَلِمَتَيْنِ، خَفِيْفَتَيْنِ عَلَى اللِّسَانِ وَثَقِيْلَتَيْنِ فِي الْمِيْزَانِ، تَمْلِكُوْنَ بِهِمَا الْعَرَبَ وَالْعَجَمَ وَ تَنْقَادُ لَكُمْ بِهِمَا الْاُمَمُ، وَتَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَتَنْجُوْنَ بِهِمَا مِنَ النَّارِ: شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَنِّيْ رَسُوْلُ اللهِ، فَمَنْ يُّجِيْبُنِيْ اِلٰى هٰذَا الْاَمْرِ وَيُوَازِرُنِيْ عَلَيْهِ وَ عَلَى الْقِيَامِ بِهٖ يَكُنْ اَخِيْ وَ وَصِيِّيْ وَ وَزِيْرِيْ وَ وَارِثِيْ وَ خَلِيْفَتِيْ مِنْ بَعْدِيْ۔

اے اولاد عبدالمطلب! اللہ نے مجھے تمام لوگوں کی طرف اور خاص کر تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنے قریبی رشتے داروں کو اللہ کے عذاب سے خبردار کروں۔ چنانچہ میں تمھیں دو ایسی باتوں کی طرف بلاتا ہوں جن کا زبان سے کہنا تو آسان ہے مگر وہ میزان عمل میں بہت بھاری ہیں۔ ان دو باتوں کے ذریعے تم عرب وعجم کے فرماں روا بن سکتے ہو اور اقوام عالم تمہاری تابع فرمان بن سکتی ہیں۔ ان کے اقرار سے تم جنت میں جاسکو گے اور جہنم کی آگ سے بچ جاؤ گے۔ وہ دو باتیں یہ ہیں کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور میں اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ پس تم میں سے جو بھی میری اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے کار رسالت میں میری مدد کا وعدہ کرے گا وہی میرے بعد میرا بھائی، میرا وصی، میرا وزیر، میرا وارث اور میرا خلیفہ ہوگا۔

اس بہت بڑے خاندان میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا سوائے حضرت علی علیہ السلام کے جن کی

عمر مبارک صرف دس سال تھی۔ جی ہاں ! جب رسول اکرم ﷺ خطاب فرما رہے تھے اس وقت حضرت علی علیہ السلام کی حقیقت بین آنکھیں آپ کے ملکوتی چہرے پر مرکوز تھیں اور وہ دل کی گہرائیوں سے رسول اکرمؐ کا کلام سن رہے تھے۔ چنانچہ اس اعلان کے بعد آپ نے کھڑے ہوکر فرمایا: **اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّكَ عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ** میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور آپ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اے اللہ کے رسولؐ ! میں آپ کی دعوت قبول کرتا ہوں اور آپ کی مدد کے لیے دل و جان سے حاضر ہوں۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: تم بیٹھ جاؤ۔ اس کے بعد تین دفعہ آنحضرت ﷺ نے اپنی بات دہرائی مگر تینوں دفعہ حضرت علی علیہ السلام کے سوا کوئی کھڑا نہ ہوا۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

اے اولاد عبدالمطلب ! تمہارے درمیان یہ علیؑ میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین ہے۔

بعض کتابوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا: **يَا عَلِيُّ ! اَنْتَ اَخِيْ وَ وَزِيْرِيْ وَ وَارِثِيْ وَ خَلِيْفَتِيْ مِنْ بَعْدِيْ** اے علیؑ ! تم میرے بھائی، میرے وزیر، میرے وارث اور میرے بعد میرے خلیفہ ہو

یہ سن کر سب لوگ اٹھ گئے۔ کچھ لوگوں نے رسول اکرم ﷺ کی بعثت کا مذاق بھی اڑایا۔ کچھ لوگوں نے حضرت ابو طالبؑ سے کہا کہ اب آج کے بعد تم بھی اپنے بھتیجے اور بیٹے کی اطاعت کرنا !!!

جس دن رسول اکرم ﷺ نے آیت انذار کے مطابق اولاد عبدالمطلب کو اللہ کی وحدانیت اور عبودیت کے اقرار کی دعوت دی تھی اس دن کو "یوم انذار" کہا جاتا ہے۔

(تاریخ طبری ج ۲، ص ۲۱۷۔ ارشاد مفید ج ۱، باب ۲، فصل ۷۔ کفایۃ الطالب، باب ۵۱، ص ۲۰۵۔ شواہد التنزیل ج ۱، ص ۴۲۱۔ ینابیع المودۃ ص ۱۰۵۔ تاریخ ابی الفداء ج ۱، ص ۲۱۶۔ تفسیر کبیر، فخر رازی)

بعض اہلسنت حضرت علی علیہ السلام کے یوم انذار اور اس سے پہلے ایمان لانے کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ یہ درست ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کو ایمان لانے میں سبقت حاصل ہے یعنی حضرت ابو بکرؓ اور دیگر اصحاب ان کے بعد ایمان لائے مگر حضرت علی علیہ السلام بچوں میں سب سے پہلے ایمان لائے تھے اور شرعی لحاظ سے آپ پر کوئی ذمے داری عائد نہیں ہوتی تھی لہٰذا آپ کا ایمان عقل اور منطق کی بنا پر نہیں تھا بلکہ یہ بچگانہ تقلید تھی جبکہ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر اصحاب سن و سال اور عقل و شعور کے لحاظ سے پختہ عمر کو پہنچ چکے تھے اور سوچ بچار کے بعد ایمان لائے تھے۔ ظاہر ہے کہ شعوری ایمان لانے کو بچگانہ تقلیدی ایمان لانے پر برتری حاصل ہے۔

اس بات کا جواب یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کا دوسروں کے ساتھ موازنہ کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ وہ لوگ ایسی بات اس لیے کہتے ہیں کہ بقول مولانا رومؒ انھوں نے نفوس قدسیہ کو اپنے اوپر قیاس کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ بلوغ کا معاملہ شرعی احکام سے متعلق ہے نہ کہ عقلی امور سے۔ خدا کی وحدانیت اور حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ کی رسالت کی تصدیق کا تعلق عقلی امور سے ہے۔ یہ شرعی تکلیف نہیں ہے۔ نیز انسان کی قوت تمیز اور عقل کا سن و سال سے بڑھنا کلی قاعدہ نہیں ہے۔ ایسے بچے بھی ہوئے ہیں جو کم سنی میں بھی عقل کے لحاظ سے پختہ تھے خصوصاً پاکیزہ روح کے حامل وہ افراد جنھیں خدا کی تائید حاصل تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو پیدا ہونے کے فوراً بعد فرمایا تھا: اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ○ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنا کر بھیجا ہے۔ (سورۂ مریم: آیت ۳۰)

نیز قرآن حکیم میں آپ کو یہ ارشاد بھی ملے گا: یٰیَحْیٰی خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ وَاٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا اے یحییٰ! (ہماری) کتاب کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ اور ہم نے ان کو بچپن ہی میں دانائی عطا کی تھی۔ (سورۂ مریم: آیت ۱۲)

شاعر اہلبیتؑ سید حمیریؒ نے مدح مولا میں اسی بات کو یوں کہا ہے:

وَقَدْ اُوْتِیَ الْهُدٰی وَالْحُكْمُ طِفْلًا　　كَیَحْیٰی یَوْمَ اُوْتِیَهُ الْحُكْمُ صَبِیًّا

آپ کو لڑکپن میں ہدایت اور دانائی اسی طرح ملی تھی جس طرح یحییٰؑ کو لڑکپن میں عطا ہوئی تھی۔

قرآن حکیم میں حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں ارشاد ہوا ہے: وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا یعنی اس عورت کے کنبہ والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی۔ (سورۂ یوسف: آیت ۲۶)

وہ گواہ جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کی بیگناہی ثابت کرنے کے لیے قرینے کی گواہی پیش کی تھی وہ مفسرین کے مطابق زلیخا کے کسی رشتے دار کا کم سن بچہ تھا۔

حضرت علی علیہ السلام کا ایمان لانا دوسروں کی طرح نہ تھا کیونکہ آپ کے ایمان کا سرچشمہ آپ کی فطرت تھی جبکہ دوسروں کا ایمان کفر سے ایمان کی منزل میں قدم رکھنا تھا اور حضرت علی علیہ السلام پوری زندگی میں ایک لمحے کے لیے بھی توحید کے منکر نہیں رہے۔ آپ اعلان رسالت سے قبل بھی فطری طور پر موحد تھے۔ آپ فرماتے ہیں: فَاِنِّیْ وُلِدْتُ عَلَی الْفِطْرَةِ وَسَبَقْتُ اِلَی الْاِیْمَانِ وَالْهِجْرَةِ میں فطرت توحید پر پیدا ہوا ہوں اور مجھے ایمان اور ہجرت میں دوسروں پر سبقت حاصل ہے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۵۷)

امام حسین علیہ السلام نے روز عاشور لشکر عمر بن سعد کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

فَاطِمُ الزَّهرَآءُ اُمّیْ ، وَاَبِیْ      قَاصِمُ الْکُفْرِ بِبَدْرٍ وَحُنَیْنٖ
عَبَدَ اللّٰہَ غُلَامًا یَافِعًا      وَ قُرَیْشٌ یَعْبُدُوْنَ الْوَثَنَیْنٖ

(مجھے فخر ہے کہ) فاطمہ زہرا میری ماں ہیں اور بدر وحنین میں کفر کی گردن توڑنے والے علیؑ میرے باپ ہیں۔ وہ اس وقت بھی اللہ کی عبادت کیا کرتے تھے جب ابھی نوخیز طفل تھے جبکہ قریش لات وعزیٰ کی پوجا کرتے تھے۔

محمد بن یوسف گنجی شافعی ، ابن ابی الحدید معتزلی اور محب الدین طبری وغیرہ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: سُبَّاقُ الْاُمَمِ ثَلَاثَةٌ لَمْ یُشْرِکُوْا بِاللّٰہِ طَرْفَةَ عَیْنٍ۔ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ وَصَاحِبُ یَاسِیْنَ وَمُؤْمِنُ اٰلِ فِرْعَوْنَ فَهُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ تمام امتوں میں ایک لمحے کے لیے بھی اللہ کا شریک نہ ٹھہرانے والے تین افراد ہیں۔ علی بن ابی طالبؑ ، مومن آل یاسین اور مومن آل فرعون (حزقیل) یہی لوگ صدیق ہیں۔ (کفایۃ الطالب ، باب ۲۴ ، ص ۱۲۳)

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول وفعل ہمارے لیے حجت ہے۔ اس میں کسی چون و چرا کی گنجائش نہیں اس لیے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ○ رسولؐ اپنی خواہش نفس سے کوئی بات نہیں کہتے بلکہ آپ وہی فرماتے ہیں جو وحی ہوتی ہے۔ (سورۂ نجم: آیت ۳۔۴)

پس اگر حضرت علی علیہ السلام کا ایمان بچگانہ تقلید ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضرور فرماتے کہ اے علیؑ! تم کمسن ہو اور ابھی حد بلوغ کو نہیں پہنچے اس لیے تمہارے ایمان کی اہمیت نہیں لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اور نہ صرف یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی بلکہ آپ نے حضرت علی علیہ السلام کے ایمان کو قبول فرماتے ہوئے تمام حاضرین کے سامنے حضرت علی علیہ السلام کے خلیفہ اور وارث ہونے کا اعلان بھی فرمایا لہٰذا وہ لوگ جنھوں نے حضرت علی علیہ السلام کی ایمان میں سبقت کو گھٹانے کی کوشش کی ہے انھوں نے درحقیقت نہ تو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچانا ہے اور نہ حضرت علی علیہ السلام کو۔

حضرت علی علیہ السلام کے ایمان کی قدر و اہمیت کو خدا سب سے بہتر جانتا ہے چنانچہ اس نے قرآن میں آپ کی مدح فرمائی ہے۔ شیعہ اور سنی مورخین و مفسرین لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ عباس بن عبدالمطلبؓ اور شیبہ دستور عرب کے مطابق ایک دوسرے پر اپنی برتری جتانے میں مصروف تھے کہ اتفاق سے حضرت علی علیہ السلام وہاں پہنچے۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ تم دونوں کس بات پر فخر جتا رہے ہو؟

عباس نے کہا: میں حجاج بیت اللہ کا ساقی ہوں۔ شیبہ نے کہا: میں بیت اللہ کا کلید بردار اور

اس کا خدمت گزار ہوں۔ یہ سن کر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: فخر و مباہات کا حق دار تو میں ہوں کیونکہ میں تم لوگوں سے بہت پہلے ایمان لایا اور میں نے اس گھر کو قبلہ قرار دے کر نماز پڑھی۔ چنانچہ جب تینوں نے کسی کی فضیلت کو قبول نہ کیا تو تینوں ثالثی کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس موقع پر جبرئیل امینؑ یہ آیت لے کر نازل ہوئے اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد الحرام کو آباد کرنا اس شخص کے اعمال جیسا خیال کیا ہے جو خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور خدا کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔ (سورۂ توبہ: آیت ۱۹)

(فصول المہمہ ص ۱۲۳۔ شواہد التنزیل ج ۱، ص ۲۴۸۔ ینابیع المودۃ، باب ۲۲، ص ۹۳ تفسیر قمی ص ۲۶۰)

تمام مورخین تصدیق کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت علی علیہ السلام تھے۔ نیز شیعہ اور سنی تاریخ کے مطابق اسی موقع پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: جو بھی سب سے پہلے میری دعوت کو قبول کرے گا وہی میرے بعد میرا وصی اور جانشین ہوگا۔

بہر حال حضرت علی علیہ السلام کے ایمان اور اسلام لانے کا دوسروں کے ایمان اور اسلام لانے سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ حضرت علی علیہ السلام صرف ظاہری طور پر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرابت داری کی وجہ سے ایمان نہیں لائے تھے بلکہ وہ بالغ ہونے سے کہیں پہلے ہی حق اور حقیقت تک رسائی اور رسول خداؐ سے گہرے لگاؤ کے جذبے سے سرشار تھے اور اس کے مقابلے میں ہر چیز کو ہیچ سمجھتے تھے لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس کی معرفت حاصل کر کے آپ نے دین اسلام کی ترویج کے لیے ایثار کے اعلیٰ ترین مرحلے تک رسائی حاصل کی تھی اور بلا مبالغہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس علی علیہ السلام سے بڑا کوئی جاں نثار نہ تھا۔ اسلام کی سربلندی کے لیے حضرت علی علیہ السلام کی جاں نثاری سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ ہر کٹھن اور ہمت شکن موقع پر حضرت علی علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سپر بن کر حفاظت کی اور کبھی کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔

ظہور اسلام کے آغاز سے ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قریش کی طرف سے مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو طرح طرح سے تکلیفیں پہنچائیں۔ بعثت کے بعد ۱۳ سال تک کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش اور ابولہب جیسے اپنے ہی رشتے دار کے طعنوں اور اذیتوں سے محفوظ رہے ہوں۔ اس تمام عرصے میں حضرت علی علیہ السلام سائے کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہے اور

آپ نے آنحضرت ﷺ کو مکہ کے بت پرستوں کی اذیتوں سے بچانے کے لیے بھرپور کردار ادا کیا۔ جب تک حضرت علی علیہ السلام آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہوتے تو کسی کی مجال نہ ہوتی کہ وہ آپ کو اذیت پہنچا سکے۔ مخفی اور علانیہ طور پر جاری دعوت اسلام کے دوران حضرت علی علیہ السلام نے کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کیا یہاں تک کہ رسول اکرم ﷺ روز بروز تبلیغ کی ذمے داری نبھانے میں پہلے سے زیادہ پُرعزم ہوتے چلے گئے اور آپ نے علانیہ لوگوں کو توحید کی دعوت کی دینی شروع کردی جس کے نتیجے میں قریش کے بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے۔ قریش کو ان لوگوں کا ایمان لانا اتنا گراں گزرا کہ انھوں نے رسول اکرم ﷺ کو اذیتیں دینے کا سلسلہ مزید تیز کردیا۔

رسول اکرم ﷺ کے مخالفوں اور دشمنوں میں ابوجہل، ابولہب، ابوسفیان، اخنس بن شریق، عمرو بن عاص اور عمر بن خطاب[۱] سرفہرست تھے۔ انھوں نے حضرت ابو طالبؑ سے مطالبہ کیا کہ وہ رسول اکرم ﷺ کی حمایت چھوڑ دیں اور آنحضرت ﷺ کو قریش کے حوالے کردیں لیکن حضرت ابو طالبؑ نے نہ صرف یہ کہ اپنی پوری زندگی رسول اکرم ﷺ کی حمایت جاری رکھی بلکہ آپ کو خدا پرستی کی تبلیغ کے لیے درکار سہولتیں اور وسائل بھی فراہم کیے۔

سخت دباؤ کی وجہ سے رسول اکرم ﷺ کو اپنے رشتے داروں اور کچھ صحابہ[۲] کے ہمراہ تین

---

۱۔ اسد الغابۃ فی تمیز الصحابۃ جلد ۴، صفحہ ۵۳ میں ہے کہ اسلام لانے سے پہلے حضرت عمر بن خطابؓ بڑے ہی سخت قسم کے رسول اکرم ﷺ کے دشمن تھے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ نہایت درشت تھا۔

۲۔ علامہ سید علی نقی نقوی (نقن صاحب) اپنی کتاب "تاریخ اسلام" میں شعب ابی طالبؑ میں محصوری کے ذیل میں لکھتے ہیں: مشرکین نے اس محصور جماعت پر آب و دانہ بند کر رکھا تھا اس لیے کہ مکہ کے تو سب آدمی خود یہ عہد کیے ہوئے تھے کہ ان کے ہاتھ کوئی چیز فروخت نہ کریں گے اور جو باہر کے آدمی تھے وہ ان کے خوف سے بنی ہاشم کے ہاتھ کوئی چیز فروخت نہ کرتے تھے اور اگر کوئی کچھ فروخت کردیتا تھا تو مکہ والے اس کا مال و متاع لوٹ لیتے تھے اور اس میں اتنی زبردست سرگرمی سے کام ہو رہا تھا کہ ابوجہل، عاص بن وائل، نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط ایسے بڑے سرغنہ لوگ خود ان راستوں پر جو مکہ معظمہ میں داخل ہوتے ہیں گشت کرتے تھے اور جسے دیکھتے کہ اس کے پاس کوئی غلہ وغیرہ تجارتی ہے اسے کہہ دیتے تھے کہ وہ بنی ہاشم کے ہاتھ کوئی چیز فروخت نہ کرے ورنہ نقصان اٹھائے گا۔ (اعلام الوریٰ) اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کئی کئی وقت کھانا پانی نہیں ملتا تھا اور بعض وقت بھوک پیاس سے چھوٹے بچوں کے رونے اور بلبلانے کی آواز گھاٹی کے باہر تک سنائی دیتی تھی۔ (ابن سعد ج ۱، ص ۱۴۰) پھر یہ کہ ہر شب کو یہ خطرہ تھا کہ مشرکین رسالت مآب ﷺ کی زندگی کا خاتمہ نہ کردیں اس لیے جناب ابو طالبؑ پوری رات جاگ کر بسر کرتے تھے اور جب رسول اللہ ﷺ آرام فرماتے تھے تو وہ تلوار لیے ہوئے پیغمبر ﷺ کے بستر کے پاس کھڑے رہتے تھے۔ پھر یہ رات میں کئی دفعہ حفاظت کے لیے جگہ بدل بدل کر آپ کو لٹاتے تھے اور اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کو آپ کے پاس

سال تک شعب ابی طالب میں محصور رہنا پڑا۔ ان مشکل دنوں میں حضرت علی علیہ السلام نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کا بھرپور ساتھ دیا اور ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے یہ دونوں ایک جان دو قالب ہیں، ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

مکہ میں دین اسلام کو اتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ ۱۳ سال کے عرصے میں اسے کوئی خاص فروغ حاصل نہ ہوسکا اور وہ جمود کی سی کیفیت میں مبتلا رہا چنانچہ یہ ضروری ہوگیا کہ اسلام کے لیے مناسب ماحول تلاش کیا جائے جہاں اس کی نشوونما ہوسکے۔ یہی وہ سوچ اور تلاش تھی جس نے رسول اکرمؐ کے لیے ہجرت کی راہ ہموار کی جس کی تفصیل ہم اگلے باب میں بیان کریں گے۔

---

رکھتے تھے ... یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس ابتلاء میں صرف بنی ہاشم تھے اور باقی مسلمان جو دوسرے قبائل کے تھے ان سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور یہ انتہائی حیرت کی بات ہے کہ ان لوگوں نے اس طویل عرصے میں جو تین برس کا ہے کسی قسم کی ہمدردی کا بھی حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ سے ثبوت نہیں دیا یہاں تک کہ یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ انھوں نے مخفی ذرائع سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ تک آب وغذا پہنچانے کا کبھی بندوبست کیا ہوتا یا یہ بھی نہیں ملتا کہ انھوں نے اپنے اثرات یا تعلقات سے جو ان کے اور رؤسائے مشرکین کے درمیان تھے گفت وشنید ہی کرکے ان کو محاصرے کے اٹھانے یا اس کے نرم کرنے پر آمادہ کیا ہوتا ... بڑے دعویداران وفاداری و جاں نثاری کا کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی نام نہ آنا کہ انھوں نے کوئی اس طرح کی غمگساری کی ہو ہزار در ہزار عبرتوں کا سرمایہ ہے اور یہ معمہ ہے جو کسی صورت سے تاریخ وحدیث کے مطالعے سے حل نہیں ہوتا۔ (رضوانی)

# (۴) حضرت علی علیہ السلام اور شب ہجرت

وہ عوامل جو حضرت نبیؐ کریم ﷺ کی مدینہ ہجرت کا باعث بنے ان میں سے ایک اس شہر میں اسلام کا فروغ تھا۔ عرب قبائل جب تجارت کے لیے مدینہ سے مکہ آتے تو حضرت نبیؐ کریم ﷺ ان سے ملاقات فرماتے اور ان کو دین اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے۔ اس دعوت کے خاطر خواہ نتائج نکلے۔ چنانچہ حضرت ابو طالبؑ کی وفات کے بعد قبیلۂ اوس کا ایک گروہ مدینہ سے مکہ آیا اور آپ سے ملا۔ اس گروہ کے چھ افراد مسلمان ہوگئے اور انھوں نے مدینہ واپس جا کر اسلام کی تبلیغ شروع کی۔

پھر کچھ عرصہ بعد مدینہ کے ۷۰ مرد و زن مکہ آئے اور انھوں نے حضرت نبیؐ کریم ﷺ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل کیا۔ اس واقعے کے بعد مدینہ میں اسلام کی اشاعت تیز ہوگئی۔ مدینے کا ماحول چونکہ کفار قریش کی ایذا رسانیوں سے محفوظ تھا اس لیے نبیؐ کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ وہ کفار مکہ کے شر سے بچنے کے لیے مدینہ ہجرت کر جائیں چنانچہ انھوں نے ہجرت کی۔ اہل مدینہ نے مہاجرین کا پُرتپاک استقبال کیا جبکہ دوسری طرف خود نبیؐ کریم ﷺ کی خواہش تھی کہ آپ بھی مدینہ تشریف لے جائیں مگر اللہ کی اجازت کے بغیر وہ خود کو سونپی گئی رسالت کے مقام اور ذمے داری کو تبدیل نہیں فرما سکتے تھے چنانچہ اس وقت ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے آنحضرتؐ کی مدینہ ہجرت کے لیے راہ نکل آئی لہٰذا اسے ہجرت کا اصل سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔

قریش کو جب پتا چلا کہ مسلمان مدینہ ہجرت کر رہے ہیں اور مدینہ میں اسلام پھیل رہا ہے تو انھیں خوف محسوس ہوا کہ مبادا اسلام کو ایسی طاقت حاصل نہ ہو جائے جو بعد میں ان کے لیے خطرہ بن جائے۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے پیش بندی کے طور پر قریش نے فیصلہ کیا کہ نعوذ باللہ نبیؐ کریم ﷺ کو ہی قتل کر دیا جائے لیکن آپ کو قتل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا کیونکہ آپ کا تعلق بنی عبدالمطلب سے تھا۔ اگر آپ کو گنے چنے چند افراد قتل کرتے تو وہ لوگ بنی ہاشم کی تلواروں سے بچ نہ سکتے۔ بنی ہاشم ضرور

آنحضرت ﷺ کے خون کا بدلہ لیتے۔ چنانچہ قریش کے سردار ایک خفیہ اجلاس میں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ کافی غور و خوض کے بعد انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر ہر قبیلے سے ایک آدمی چنا جائے اور وہ سب مل کر یکبارگی آنحضرت ﷺ کے گھر پر حملہ کردیں اور سوتے میں آپ کو قتل کر ڈالیں تاکہ آپ کا خون تمام قبائل میں تقسیم ہوجائے اور بنی ہاشم کی سمجھ میں نہ آئے کہ وہ کس کس سے اس خون کا بدلہ لیں۔ قتل کے اس منصوبے کو خفیہ رکھا گیا مگر خدا نے اپنے رسولؐ کو اس منصوبے سے آگاہ کردیا اور آپ کو اجازت دی کہ آپ راتوں رات مدینہ ہجرت کرجائیں جیسا کہ سورۂ انفال کی آیت ۳۰ میں بیان ہوا ہے۔

قریش کو مغالطہ دینے کے لیے آنحضرت ﷺ ایسے فرد کا انتخاب کرنا چاہتے تھے جو تلواروں کی چھاؤں میں آپ کی جگہ آپ کے بستر پر سو جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اس واقعہ کا ہیرو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ یہ ساری تمہید اسی کا تعارف کرانے کے لیے باندھی گئی ہے۔ شب ہجرت کا وہ ہیرو کوئی اور نہیں حضرت علی علیہ السلام ہیں جن کی نظیر دنیا قیامت تک پیش نہیں کرسکتی۔

نبیٔ کریم ﷺ حضرت علی علیہ السلام کو خوب جانتے تھے۔ آپ کو ان کے ایمان و اخلاص کا بخوبی علم تھا چنانچہ آپ نے فرمایا: اے علیؑ! اللہ کا حکم ہے کہ میں مدینہ ہجرت کر جاؤں مگر یہ کوئی عام سفر نہیں ہے۔ اس سفر کو مخفی رکھنا ہے تاکہ قریش کو پتا نہ چل سکے کیونکہ انھوں نے آج رات مجھے بستر پر قتل کردینے کا منصوبہ بنایا ہے۔ انھیں مغالطہ دینے کے لیے تم میرے بستر پر سو جاؤ تاکہ وہ میرا تعاقب نہ کرسکیں۔ یہ سن کر حضرت علی علیہ السلام نے بس اتنا پوچھا: یا رسول اللہؐ! کیا میرے سو جانے سے آپ کی جان بچ جائے گی؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ہاں! یہ سن کر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہوسکتی ہے کہ میں آپ پر اپنی جان نچھاور کردوں؟

نبیٔ کریم ﷺ نے جب حضرت علی علیہ السلام کو جان دینے پر آمادہ دیکھا تو آپ کی آنکھیں نمناک ہوگئیں اور آپ نے حضرت علی علیہ السلام کے سر اور چہرے کے بوسے لینے شروع کردیے۔

پھر آپ نے ان کو الوداع کہا اور گھر سے روانہ ہوگئے۔

حضرت علی علیہ السلام نے جو اس وقت ۲۳ سال کے جوان تھے نبیٔ کریم ﷺ کا شب خوابی کا لباس زیب تن فرمایا اور بڑے اطمینان سے چادر اوڑھ کر بستر رسولؐ پر سو گئے۔

**فصول المهمه** اور **كفاية الطالب** میں لکھا ہے کہ جب حضرت علی علیہ السلام نبیٔ کریم ﷺ کے بستر پر سو گئے تو خدائے عزوجل نے جبرئیلؑ اور میکائیلؑ سے فرمایا کہ میں نے تم دونوں کو ایک دوسرے کا بھائی

قرار دیا اور ایک کی عمر دوسرے سے زیادہ مقرر کی۔ بتاؤ کہ تم میں سے کون اپنی عمر عزیز کا ایک حصہ اپنے بھائی کو دینے پر تیار ہے؟ انھوں نے پوچھا: پروردگار! اس معاملے میں ہم مجبور ہیں یا مختار؟ خدائے عزوجل نے فرمایا: تمھیں اختیار حاصل ہے۔ یہ سن کر دونوں میں سے کسی نے بھی اپنی عمر دوسرے کو نہ بخشی چنانچہ رب العزت نے فرمایا: میں نے اپنے نبی محمدؐ کو اور اپنے ولی علیؑ کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا ہے۔ دیکھو! آج علیؑ بستر رسولؐ پر سوگئے ہیں تاکہ اپنی جان ان پر قربان کردیں۔ زمین پر جاؤ اور علیؑ کو دشمنوں کے شر سے بچاؤ چنانچہ دونوں فرشتے حضرت علی علیہ السلام کے پاس آئے۔ جبرئیلؑ نے ان کے سرہانے جبکہ میکائیلؑ نے پائنتی کھڑے ہوکر کہا: بَخٍ بَخٍ يَا ابْنَ اَبِي طَالِبٍ مَنْ مِّثْلُكَ وَقَدْ بَاهَى اللهُ بِكَ الْمَلَآئِكَةَ مبارک ہو آپ کو اے فرزند ابو طالبؑ! کون ہے جو آپ کی مثل بن سکے کیونکہ اللہ فرشتوں کے سامنے آپ پر فخر و مباہات کرتا ہے۔

(فصول المہمہ ص ۳۳۔ کفایۃ الطالب ص ۲۳۹۔ ینابیع المودۃ، باب ۲۱، ص ۹۲۔ کشف الغمہ ص ۹۱۔ تفسیر رازی)

رات ہوتے ہی دارالندوہ میں جمع ہونے والے قریش کے جوان ننگی تلواریں لے کر نکلے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیت الشرف کا محاصرہ کرلیا۔ جب رات کا سناٹا گہرا ہوا تو وہ اپنے شیطانی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیت الشرف میں داخل ہوگئے۔ جونہی انھوں نے چادر کھینچی تو حضرت علی علیہ السلام نے تکیے سے سر اٹھا کر بلند آواز سے فرمایا: تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ قریش نے جب حضرت علی علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر میں دیکھا تو حیرت اور خوف کے مارے ان کی جان ہی نکل گئی۔ انھوں نے پوچھا: محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہاں ہیں؟ حضرت علی علیہ السلام نے نہایت سکون سے جواب دیا: میں ان کا نگران نہیں ہوں۔ کیا تم ان کو میرے سپرد کرگئے تھے جو مجھ سے پوچھ رہے ہو؟ ان میں سے ایک بولا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا پشت پناہ ہے اس لیے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جگہ اسی کو قتل کردو۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: افسوس کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لڑنے کی اجازت نہیں دی ورنہ میں ان کے بیت الشرف میں اس طرح داخل ہونے کے جرم میں تمہاری گردنیں کاٹ ڈالتا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: دور ہوجاؤ! تم لوگ گمراہ ہو اور قبول حق کی سعادت تمہارے مقدر میں نہیں۔

کفار قریش کو جب نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کا علم ہوا تو وہ آپ کے تعاقب میں غار ثور کے دہانے تک جا پہنچے جہاں آپ حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ چھپے ہوئے تھے مگر اللہ نے آپ کو اپنی پناہ میں رکھا اور کفار آپ تک نہ پہنچ سکے۔

ہجرت کے موقع پر حضرت علی علیہ السلام نے اسلام کی اشاعت اور رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کے لیے ایک ۲۳ سالہ حق شناس مرد شجاع کی حیثیت سے خود کو موت کے یقینی خطرے میں ڈال کر جس ایثار کا ثبوت دیا تھا اس کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ خود حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا تھا:

وَقَيْتُ بِنَفْسِيْ خَيْرَ مَنْ وَطأَ الْحِصٰى وَمَنْ طَافَ بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ وَ بِالْحَجَرِ

رَسُوْلُ اِلٰهِ الْخَلْقِ اِذْ مَكَرُوْا بِهٖ فَنَجَّاهُ ذُو الطَّوْلِ الْكَرِيْمِ مِنَ الْمَكْرِ

میں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اس عظیم ہستی کو بچایا جو تمام مخلوقات سے اور طواف کعبہ کرنے والوں سے برتر ہے۔ جب قریش نے رسول اللہؐ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تو اللہ نے اپنے کرم سے آپ کو ان کے خطرناک منصوبے سے بچالیا۔ (بحار الانوار ج ۳۶، ص ۴۶)

اسی ایثار و فدویت کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے آیت وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللهِ یعنی کوئی شخص ایسا ہے کہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان بیچ ڈالتا ہے۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۰۷) نازل فرمائی۔ شیعہ اور سنی مفسرین و مؤرخین کے مطابق یہ آیت صرف حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

(شواہد التنزیل ج ۱، ص ۹۶۔ ارشاد مفید ج ۱، باب ۲، فصل ۹۔ کفایۃ الطالب ص ۲۳۹۔ تفسیر قمی، ص ۶۱)

حضرت علی علیہ السلام کا یہ ایثار شب ہجرت بستر رسولؐ پر سو جانے تک ہی محدود نہیں بلکہ رسول اللہؐ کی غیر موجودگی میں مکہ میں رہ جانے والے مسلمانوں کی دیکھ بھال اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لوگوں کی رکھی امانتوں کو واپس ان کے مالکوں تک پہنچانے کی ذمے داری بھی آپ نے انجام دی۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدینہ آمد کے چند دن بعد حضرت علی علیہ السلام اپنی والدہ ماجدہ نیز حضرت فاطمہ زہراؑ، دو دیگر خواتین اور چند مسلمانوں کے ہمراہ مدینہ روانہ ہوئے[1] اور جب آنحضرتؐ نے پیدل سفر کی وجہ سے حضرت علی علیہ السلام کے زخمی پاؤں دیکھے تو فرط جذبات سے انھیں گلے لگایا اور آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

مدینہ میں بھی حضرت علی علیہ السلام ہر وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہے۔ ہجرت کے پہلے سال جب مہاجرین اور انصار کے درمیان مؤاخات کا رشتہ قائم کیا گیا تو اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

---

۱۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبا کی بستی میں حضرت علی علیہ السلام کے انتظار میں رکے رہے تا کہ ان کے ساتھ مدینہ میں داخل ہوں۔

حضرت علی علیہ السلام کو اپنا بھائی قرار دیا۔ (فصول المہمہ ص ۲۲)

۲ھ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اکلوتی بیٹی کا عقد حضرت علی علیہ السلام سے کر دیا اور فرمایا: یَا عَلِیُّ! إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى أَمَرَنِي أَنْ أُزَوِّجَكَ فَاطِمَةَ وَإِنِّي قَدْ زَوَّجْتُكَهَا عَلَى أَرْبَعِ مِائَةِ مِثْقَالِ فِضَّةٍ فَقَالَ عَلِيٌّ قَدْ رَضِيتُهَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَرَضِيتُ بِذَالِكَ عَنِ اللّٰهِ الْعَظِيمِ وَرَسُولِهِ الْكَرِيمِ ثُمَّ إِنَّ عَلِيًّا خَرَّ سَاجِدًا لِلّٰهِ شُكْرًا اے علیؑ! خدا نے مجھے فاطمہؑ کی شادی تمہارے ساتھ کرنے کا حکم دیا ہے اور میں چار سو مثقال چاندی کے عوض ان کا نکاح تمہارے ساتھ کرتا ہوں۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: یا رسول اللہؐ! مجھے قبول ہے، میں خداوند عظیم اور اس کے رسول کریمؐ کے اس فیصلے پر بہت خوش ہوں۔ اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام خدا کے حضور سجدۂ شکر بجا لائے۔ (ینابیع المودۃ ص ۱۷۶)

اسی سال مشرکین کے خلاف جنگ کا حکم نازل ہوا چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے خلاف جنگ کی تیاری کرنے لگے۔ ان جنگوں میں فتح کا سہرا حضرت علی علیہ السلام کے سر بندھا۔ اسی کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا جسے ہم ان کی عسکری خدمات کے عنوان سے بیان کریں گے۔

# (۵) حضرت علی علیہ السلام کی عسکری خدمات

جب عرب کے بت پرست قبائل پر رسول اللہ ﷺ کی چودہ سالہ تبلیغ کا کچھ اثر نہ ہوا تو آپ کو جہاد کا حکم ملا چنانچہ ۲ھ سے ۱۱ھ تک ۹ سال کے دوران آپ نے عرب کے کافروں اور یہودیوں کے خلاف تقریباً ۸۰ لڑائیاں لڑیں۔ ان میں سے وہ لڑائیاں جن میں رسالت مآب ﷺ بنفس نفیس شریک رہے انھیں غزوات کہا جاتا ہے۔

ان تمام جنگوں میں شیر کردگار علی مرتضیٰ علیہ السلام کا کردار سب سے نمایاں تھا۔ آپ نے جس دلاوری اور ثابت قدمی کا مظاہرہ فرمایا اس کی وجہ سے آپ کو ضیغم جنگ اور قتال العرب کہا جانے لگا۔ آپ ہر جنگ میں شریک رہے ماسوائے جنگ تبوک کے۔ جنگ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ آپ کو عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لیے مدینہ میں ہی چھوڑ گئے تھے۔

رسول اکرم ﷺ نے مشرکوں اور یہودیوں کے خلاف جو غزوات لڑے ان میں بدر، احد، خندق، خیبر اور حنین قابل ذکر ہیں۔ ان غزوات میں حضرت علی علیہ السلام نے بڑے بڑے عرب سورماؤں کو قتل کیا۔ چونکہ اس باب میں ہمارا مقصود حضرت علی علیہ السلام کی عسکری خدمات کا جائزہ لینا ہے اس لیے ہم ان جنگوں کے اسباب کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف حضرت علی علیہ السلام کے جنگی کارناموں کا مختصر خاکہ پیش کر رہے ہیں کیونکہ اس کے بغیر ان کی حیات مبارکہ کا تذکرہ ادھورا ہے۔

## غزوۂ بدر

مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان غزوۂ بدر سے پہلے بھی کچھ جھڑپیں ہو چکی تھیں لیکن بدر کبریٰ وہ پہلی باقاعدہ جنگ ہے جس میں مسلمانوں کو ایسی صورتحال کا سامنا تھا کہ وہ مشرکین سے خوفزدہ تھے۔ وہ ان سے مقابلے کے لیے میدان میں جانے سے ہچکچا رہے تھے۔ قرآن مجید فرماتا ہے: کَمَآ اَخْرَجَكَ

رَبُّكَ مِنۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ○ (ان لوگوں کو اپنے گھروں سے اسی طرح نکلنا چاہیے تھا) جس طرح تمہارے پروردگار نے تم کو تدبیر کے ساتھ تمہارے گھروں سے نکالا اور اس وقت مومنوں کی ایک جماعت ناخوش تھی۔ (سورۂ انفال: آیت ۵) کیونکہ چاق و چوبند گھوڑوں اور اسلحہ سے لیس ایک ہزار مشرکین مکہ ابوسفیان کی آواز پر ابوجہل کی سرکردگی میں مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے جمع ہوگئے تھے جبکہ مسلمانوں کی تعداد صرف ۳۱۳ تھی اور ان میں سے اکثر کے پاس اسلحہ بھی نہیں تھا۔ مسلمانوں کے پاس ۷۰ اونٹ اور دو یا تین گھوڑے تھے۔ بہرحال ۱۷ ؍رمضان المبارک ۲ھ کو فریقین کا مکہ اور مدینہ کے درمیان بدر کے میدان میں آمنا سامنا ہوا اور اللہ نے فرشتوں کے ذریعے مومنوں کی مدد فرمائی۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ اللہ نے جنگ بدر میں تمہاری مدد کی تھی جبکہ اس وقت تم بے سر و سامان تھے۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۱۲۳)

حق و باطل کے اس پہلے معرکے میں مشرکین کی طرف سے تین آدمی عتبہ بن ربیعہ، اس کا بیٹا ولید بن عتبہ اور اس کا بھائی شیبہ میدان میں آئے اور مبارز طلب ہوئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عبیدہ تم آگے بڑھو۔ حمزہؓ! تم آگے بڑھو۔ علیؑ! تم آگے بڑھو۔ حضرت علی علیہ السلام کا مقابلہ ولید سے ہوا جسے آپ نے ایک ہی وار میں جہنم رسید کردیا۔ ادھر عبیدہ بن حارث بن مطلبؓ اور حمزہ بن عبدالمطلبؓ نے بھی عتبہ اور شیبہ کو جہنم رسید کردیا۔[1] ان کے مارے جانے سے مشرکین کے حوصلے پست ہوگئے اور ان کے دلوں پر مسلمانوں کا رعب بیٹھ گیا۔ پھر دوسرے مشرکین جب مقابلے کے لیے نکلے تو اکثر کو حضرت علی علیہ السلام نے اپنی تلوار سے قتل کردیا۔ اس طرح حضرت علی علیہ السلام کی بہادری کے نتیجے میں مسلمانوں نے یہ جنگ جیت لی۔ اس جنگ میں ۷۰ سے زائد مشرکین ہلاک ہوئے اور اتنے ہی قیدی بنا لیے گئے۔ عباس بن عبدالمطلبؓ اور عقیل بن ابی طالبؓ بھی ان قیدیوں میں شامل تھے جنھوں نے فدیہ دے کر رہائی حاصل کی اور مسلمان ہوگئے۔ مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ مشرکین کے مقتولین کی نصف تعداد کو حضرت علیؑ نے جبکہ باقی نصف کو مسلمانوں اور مدد کے لیے آئے ہوئے فرشتوں نے قتل کیا۔ حضرت علیؑ نے جن کو قتل کیا ان میں قریش کے سرغنہ افراد میں سے عاص بن سعید، معاویہ کا بھائی حنظلہ بن ابی سفیان

---

۱۔ حضرت حمزہؓ نے شیبہ کو قتل کیا تھا اور جناب عبیدہؓ کا مقابلہ عتبہ سے ہوا تھا۔ جناب عبیدہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے مگر کافی کبیر السن تھے۔ آپ نے لڑائی کے دوران عتبہ کو گھائل کردیا تھا اور اس نے بھی آپ کے پیر پر تلوار ماری تھی جس سے آپ میدان میں گر گئے تھے چنانچہ حضرت حمزہؓ اور حضرت علی علیہ السلام نے آگے بڑھ کر عتبہ کو قتل کردیا جیسا کہ آپ نے نہج البلاغہ میں فرمایا ہے۔ (رضوانی)

اور طلحہ کا چچا عمیر بن عثمان شامل تھے۔ (کشف الغمہ ص ۵۳۔ ارشاد مفید، باب ۲، فصل ۱۸)

بہر حال یہ جنگ مسلمانوں کی فتح اور مشرکوں کی شکست پر ختم ہوئی اور مسلمان فاتح بن کر مدینہ لوٹے۔ اس جنگ کے بعد حضرت علی علیہ السلام ایک بے مثال مرد میدان کی حیثیت سے عربوں میں شہرت پانے لگے۔

## غزوۂ اُحُد

مدینہ سے تقریباً چھ کلومیٹر دور ایک پہاڑی کا نام احد ہے۔ اس کے دامن میں شوال ۳ھ میں غزوۂ احد ہوا تھا۔ غزوۂ بدر میں شکست کھا جانے کے ساتھ قریش اپنے نامور سپوتوں سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ ذلت آمیز شکست کا یہ احساس جنگ احد کا بنیادی سبب تھا اس لیے کہ عکرمہ بن ابو جہل اور صفوان بن امیہ کے خاندان والے ان کا انتقام لینے کے لیے اہل مکہ کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر اکسانے لگے۔ ابو سفیان جو کفار قریش کا سرغنہ تھا اس نے لوگوں کو جمع کر کے انھیں اپنی سابقہ حیثیت بحال کرنے کے لیے دوبارہ جنگ کرنے پر آمادہ کیا یہاں تک کہ اس نے جنگی اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنا مال و متاع بھی ان لوگوں کے حوالے کر دیا۔ (تاریخ طبری)

ابو سفیان کی بیوی (اور عتبہ کی بیٹی) ہند بھی دیگر عورتوں کے ساتھ ڈھول پیٹ کر مقتولین بدر کا بدلہ لینے کے لیے لوگوں کو اکسانے لگی تھی۔ ابو سفیان نے تقریباً پانچ ہزار سوار اور پیادہ افراد کو کیل کانٹے سے لیس کرنے کے بعد مدینہ کا رخ کیا۔ اس لشکر کی قیادت وہ خود کر رہا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب یہ خبر ملی تو آپ نے اپنے اصحاب کو جمع کر کے صورتحال سے آگاہ فرمایا اور یہ تجویز دی کہ شہر میں رہتے ہوئے شہر کا دفاع کیا جائے لیکن کچھ مسلمانوں نے یہ مشورہ دیا کہ شہر سے باہر نکل کر حملہ کیا جائے۔ آخر کار مسلمانوں نے جنگ کی تیاری کر لی۔ خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی جنگی لباس زیب تن فرمایا اور تقریباً سات سو مہاجرین و انصار کے ہمراہ مدینہ سے نکلے۔ حضرت علی علیہ السلام کو لشکر کا علم دار مقرر کیا گیا کیونکہ پچھلی جنگ میں بھی اسلام کا علم آپ ہی کے ہاتھ میں تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احد پہنچے تو آپ نے عقب سے دشمن کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے عبداللہ بن جبیرؓ کی سربراہی میں پچاس تیر اندازوں کے ایک دستے کو درّے کے کنارے مورچہ بند رہنے کا حکم دیا اور آپ کا یہ حفاظتی اقدام بالکل درست تھا کیونکہ ابو سفیان نے بھی اسی درّے پر مسلمانوں سے چار گنا زیادہ سپاہیوں کو

خالد بن ولید کی کمان میں تعینات کیا تھا تاکہ جب طرفین برسرپیکار ہوں تو وہ مسلمانوں پر عقب سے حملہ کردیں۔ بہر حال جنگ شروع ہوئی اور کفار قریش کے کئی جنگجو حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں مارے گئے۔ لشکر کفار کا علمبردار طلحہ بن ابی طلحہ ایک بہادر آدمی تھا۔ اسے **کَبشُ الکَتیبہ** یعنی شہسوار لشکر کہا جاتا تھا۔ وہ جب حضرت علی علیہ السلام کے مقابلے پر آیا تو آپ نے اس کے سر پر اس زور کا وار کیا کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں، اس نے زوردار چیخ ماری اور وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اس کے بعد اس کا بھائی علم ہاتھ میں لے کر آگے بڑھا اور وہ بھی مارا گیا۔

ادھر حضرت حمزہؓ نے نہایت بے جگری سے کفار قریش کے کئی سورماؤں کو قتل کردیا۔ ان کے مارے جانے سے قریش کے قدم اکھڑ گئے اور مسلمان تعداد میں کم ہونے کے باوجود ان پر غالب آنے لگے۔ اس طرح اسلام کی فتح کی نوید سنانے والی پرکیف ہوائیں چلنے لگیں اور مشرکین بھاگنے لگے۔ مسلمانوں کی ایک جماعت ان کے تعاقب میں چل پڑی جبکہ ایک اور جماعت مال غنیمت جمع کرنے لگ گئی۔ یہ دیکھ کر درّے پر تعینات مسلمانوں میں بدنظمی پیدا ہوگئی اور وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم اور عبد اللہ بن جبیر کے منع کرنے کے باوجود مسلمانوں کی فتح کا خیال کرکے اپنی جگہ چھوڑ کر میدان میں اتر آئے۔ ان کا کہنا تھا کہ اب حفاظت کی ضرورت نہیں رہی۔ چنانچہ درّے پر اکا دکا افراد باقی رہ گئے۔ خالد بن ولید ایسے ہی موقع کی تاک میں تھا۔ وہ اپنے سپاہیوں کے ہمراہ درّے کے راستے آگے بڑھا اور وہاں موجود مسلمانوں کو قتل کرنے کے بعد عقب سے حملہ آور ہوا۔ ادھر بھاگنے والے مشرکین نے جب میدان سے خالد کی آواز سنی تو واپس پلٹے اور دیکھتے ہی دیکھتے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ کفار نے مسلمانوں پر دونوں اطراف سے حملہ کردیا۔ مسلمانوں کو جن کی تعداد پہلے ہی کم تھی اور وہ منتشر بھی ہوچکے تھے شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس جنگ میں حضرت حمزہؓ شہادت کے عظیم مرتبے پر فائز ہوئے۔ معاویہ کی ماں، ہند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ کی لاش پر آئی اور اس نے ان کا کلیجہ نکال کر چبایا مگر اسے نگل نہ سکی۔ اس جنگ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی مبارک پر زخم آیا اور آپ کے دندان مبارک بھی شہید ہوئے۔ حضرت علی علیہ السلام اور دیگر دو افراد کے سوا کوئی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پرسان حال نہ تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نہایت بہادری سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کررہے تھے۔

جنگ احد میں اپنی بے مثال جاں نثاری کے ذریعے حضرت علی علیہ السلام نے اپنی نورانی حیات میں ایک اور سنہرے باب کا اضافہ فرمایا جس کی تابندگی کو جبریلؑ کی اس آواز نے چار چاند لگادیے:

لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار وَ لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ

یعنی ذوالفقار جیسی کوئی تلوار نہیں اور علیؑ جیسا کوئی جواں مرد نہیں۔

(سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۱۰۰ ۔ تاریخ طبری)

شیخ مفید نے عکرمہ سے اور انھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ

''جب غزوۂ احد میں لوگ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے بھاگ گئے تو مجھے آپ کے بارے میں بہت تشویش ہوئی کیونکہ آپ کی زندگی خطرے میں تھی۔ میں آپ کے سامنے اپنی تلوار سے دشمنوں پر حملے کر رہا تھا۔ اچانک میں نے مڑ کر دیکھا تو آپ کو نہ پایا۔ میں نے دل میں سوچا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میدان سے بھاگنے والے نہیں ہیں اور شہیدوں میں بھی نظر نہیں آرہے، کہیں وہ ہمارے درمیان سے اٹھ کر عالم بالا تشریف نہ لے گئے ہوں؟ یہ سوچ کر میں نے تلوار کی نیام کو توڑ ڈالا اور اپنے آپ سے کہا: میں اس تلوار کے ذریعے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دفاع میں اس وقت تک لڑوں گا جب تک قتل نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ میں نے دشمنوں پر بھرپور حملہ کر دیا۔ دشمن میری تلوار سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اچانک میں نے دیکھا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زمین پر بیہوش پڑے ہیں۔ میں فوراً آپ کے سرہانے پہنچا۔ آپ نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا: اے علیؑ! لوگوں نے یہ کیا کیا؟ میں نے کہا: یا رسول اللہؐ! وہ کافر ہو گئے، انھوں نے دشمن کو پیٹھ دکھائی اور آپ کا ساتھ چھوڑ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دشمن کی ایک جماعت کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر فرمایا: ان لوگوں کو مجھ سے دور کرو۔ چنانچہ میں نے ان لوگوں پر دائیں اور بائیں سمت سے حملہ کر دیا یہاں تک کہ وہ بھاگ گئے۔ اس موقع پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے علیؑ! آسمان پر تمہارا جو قصیدہ پڑھا جا رہا ہے کیا تم اسے سن رہے ہو؟ رضوان پکار پکار کر کہہ رہا ہے:

لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار وَ لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ

یہ سن کر میری آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے اور میں اس نعمت پر خدا کا شکر بجا لایا۔

(اعلام الوریٰ)

حضرت علی علیہ السلام کی شہامت و استقامت اور معدودِ چند صحابہ کی ثابت قدمی اس امر کا موجب بنی کہ کفار کو مدینہ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ واپس مکہ لوٹ گئے۔ ادھر حضرت علی علیہ السلام شدید زخمی ہونے کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دور نہیں ہوئے۔ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے پانی لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منہ ہاتھ دھونے کے بعد فرمایا: اللہ کا غضب ہے ان لوگوں پر جنھوں نے اپنے

رسولؐ کے رخسار کو خون آلود کیا۔ (تاریخ یعقوبی)

جب جنگ کی آگ بجھی تو معلوم ہوا کہ ۷۰ مسلمان شہید ہوگئے ہیں اور اکثر بھاگ گئے ہیں۔ وہ بہادر جس نے فداکاری و جاں سپاری کے جذبے سے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا وہ حضرت علی علیہ السلام ہی تھے۔ انھوں نے اپنے جسم پر ایسے متعدد زخم کھائے تھے جن میں سے ایک زخم ہی بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ آپ کے جسم پر زخموں کی کثرت دیکھ کر لوگ حیران تھے کہ ایک ۲۶ سالہ جوان اتنے زخم کھا کر کیسے زندہ ہے لیکن شاید انھیں معلوم نہ تھا کہ اس جوان کے وجود میں ایسی عظیم روح ہے جو ہر طرح کے گھاؤ برداشت کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ پہنچے تو حضرت فاطمہؑ اپنے پدر بزرگوار کے ہاتھ دھلانے کے لیے پانی کا برتن لیے کھڑی تھیں۔ حضرت علی علیہ السلام بھی زخمی حالت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ آپ نے ذوالفقار حضرت فاطمہؑ کو دیتے ہوئے فرمایا: خُذِيْ هٰذَا السَّيْفَ فَقَدْ صَدَّقَنِي الْيَوْمَ یہ تلوار سنبھالو! اس نے آج میرے ایمان کی تصدیق کی ہے۔ پھر فرمایا:

أَفَاطِمُ هَاكِ السَّيْفَ غَيْرَ ذَمِيْمِ     فَلَسْتُ بِرِعْدِيْدٍ وَلَا بِمُلِيْمِ

لَعَمْرِيْ لَقَدْ أَعْذَرْتُ فِيْ نَصْرِ أَحْمَدَ     وَ طَاعَةِ رَبٍّ بِالْعِبَادِ عَلِيْمِ

أَمِيْطِيْ دِمَاءَ الْقَوْمِ عَنْهُ فَإِنَّهُ     سَقَى آلَ عَبْدِ الدَّارِ كَأْسَ حَمِيْمِ

فاطمہؑ! یہ تلوار سنبھالو جو شرمندہ نہیں اور نہ ہی میں ملول ہوں۔ اپنی جان کی قسم! میں نے رسول کی نصرت اور اس خدا کی اطاعت کی ہے جو بندوں کے اعمال سے خوب واقف ہے۔ اس تلوار سے مشرکوں کا خون دھو ڈالو کیونکہ اس نے بنی عبد الدار کو موت کا جام پلایا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا:

خُذِيْهِ يَا فَاطِمَةُ فَقَدْ أَدّٰى بَعْلُكِ مَا عَلَيْهِ وَقَدْ قَتَلَ اللّٰهُ بِسَيْفِهِ صَنَادِيْدَ قُرَيْشٍ.

اے فاطمہؑ! اس تلوار کو سنبھالو۔ آج تمہارے شوہر نے اپنا فرض ادا کردیا ہے اور خدا نے اس کی تلوار سے قریش کے سورماؤں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

(کشف الغمہ ص ۵۶۔ ارشاد مفید ج ۱، باب ۲، فصل ۲۲۔ اعلام الوریٰ)

اس جنگ میں مسلمانوں کی شکست ایک لاپروائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنگی حکمت عملی کی مخالفت کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ یہ شکست مسلمانوں کے لیے تلخ تجربہ اور باعث عبرت ثابت ہوئی۔ یہ آیہ مبارکہ اسی کے بارے میں ہے وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ

وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَآ اَرٰكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ○ خدا نے (مدد کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے مگر جب تم نے بزدلی دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا اور جونہی وہ چیز خدا نے تمھیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے تب خدا نے تمھیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تا کہ تمھاری آزمائش کرے اور حق یہ ہے کہ خدا نے پھر بھی تمھیں معاف ہی کر دیا کیونکہ خدا مومنوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

(سورۂ آل عمران : آیت ۱۵۲)

## غزوۂ بنو نضیر

مدینہ میں رہنے والے بنو نضیر اور بنو قریظہ جیسے یہودی قبائل جنگ احد میں مسلمانوں کی شکست سے بہت خوش ہوئے۔ وہ قبائل بھی جنھوں نے رسول خدا ﷺ کے ساتھ جنگ نہ کرنے کے معاہدے کر رکھے تھے انھوں نے بھی یہودیوں کی دیکھا دیکھی اپنے معاہدے توڑ دیئے لہٰذا شدت سے یہ بات محسوس ہونے لگی کہ کفار قریش کے ساتھ جنگ سے قبل مدینہ میں اثر و رسوخ بڑھانا اور امن و امان کو مکمل طور پر بحال کرنا ضروری ہے لہٰذا غزوۂ احد اور غزوۂ خندق کے درمیانی عرصے میں مسلمان بنو نضیر کے خلاف جنگ کے لیے تیار ہوئے اور ان کے محاصرے کے لیے ربیع الاول ۴ھ میں مدینہ سے باہر نکلے۔ اس لشکر کے سپہ سالار حضرت علی علیہ السلام تھے جنھوں نے اپنی مدبرانہ حکمت عملی اور بہادری کے ذریعے انھیں سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا اور معاہدہ طے پایا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق مدینہ سے نکل کر شام کی طرف جلاوطن ہو جائیں گے۔ (تاریخ طبری)

رسول اللہ ﷺ نے ان شرائط کو قبول فرماتے ہوئے انھیں اجازت دی کہ تین آدمی ایک اونٹ پر اپنا مال و اسباب لاد کر لے جا سکتے ہیں۔ بنو نضیر کی مدینہ سے بے دخلی کے بعد ان کے اموال اور زرعی اراضی مسلمانوں کے قبضے میں آ گئیں۔ یہ واقعہ جو غزوۂ احد کے بعد پیش آیا تھا مسلمانوں کی حیثیت کو مزید مستحکم کرنے کے لیے بے حد مؤثر ثابت ہوا اور رسول اللہ ﷺ نے نہایت مدبرانہ انداز میں مختصر سے عرصے میں مسلمانوں کے اثر و رسوخ میں اضافہ کر کے اسلام کے فروغ اور دشمنان اسلام کو سرنگوں کرنے کی راہ ہموار کر دی۔

## غزوۂ خندق

بنو نضیر اور بنو قریظہ جیسے یہودی قبائل کو مدینہ سے بے دخل کردینے کے بعد مسلمانوں خصوصاً رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف یہودیوں کا بغض مزید بڑھ گیا۔ مذکورہ قبائل کے اکابرین نے مکہ جاکر صنادید قریش کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف جنگ کے لیے اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ صنادید قریش نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہودیوں کی پیشکش کا خیر مقدم کیا۔ اس کے نتیجے میں مکہ کے تمام بت پرست قبائل نے یہودیوں کے ساتھ مل کر دس ہزار کا ایک لشکر تیار کیا جس کا سپہ سالار ابوسفیان کو بنایا گیا۔ یہ لشکر یہودیوں کی مدد سے شجر اسلام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے ارادے سے مدینے کی طرف روانہ ہوا۔ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی روانگی کی خبر ملی تو آپ نے مسلمانوں کو جمع کیا تاکہ حملہ آوروں کے مقابلے کے لیے باہمی مشاورت سے دفاعی حکمت عملی طے کی جائے۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے تجویز پیش کی کہ مدینے کے چاروں طرف خندق کھودی جائے اور رکاوٹیں کھڑی کردی جائیں تاکہ دشمن کے لیے خندق پار کرنا مشکل اور ناممکن ہوجائے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلمان فارسیؓ کی اس تجویز کو قبول کرتے ہوئے حکم دیا کہ تمام مسلمان خندق کھودنے کی تیاری کریں۔ چنانچہ مسلمانوں نے خندق کھودنی شروع کردی۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی بنفس نفیس مسلمانوں کے ساتھ خندق کھودنے میں شریک ہوگئے۔ دشمن کے پہنچنے سے پہلے پہلے خندق تیار ہوگئی اور جونہی دشمن خندق کے قریب پہنچا تو دنگ رہ گیا کیونکہ عربوں میں دفاع کے لیے خندق کھودنے کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی تھی چنانچہ انھوں نے کہا: وَاللّٰهِ اِنَّ هٰذِهٖ لَمَكِيْدَةٌ مَا كَانَتِ الْعَرَبُ تَكِيْدُهَا اللہ کی قسم! یہ ایک ایسی حکمت عملی ہے جسے عرب نہیں جانتے تھے۔

(ارشاد مفید ج ۱، باب ۲، فصل ۲۵)

تقریباً تین ہزار مسلمان خندق کے دوسری طرف مورچہ زن تھے۔ دونوں طرف کے لشکر کئی روز تک آمنے سامنے موجود رہے اور ان کے درمیان سنگ باری اور تیر اندازی ہوتی رہی۔ ایک دن پھرتے پھراتے عمرو بن عبد وَد[۱] اور اس کے چند ساتھیوں کو خندق میں ایسی جگہ مل گئی جو ذرا تنگ تھی چنانچہ انھوں نے اپنے گھوڑوں کو چابک مارے تو گھوڑے جست لگا کر خندق کے اس پار پہنچ گئے۔

---

۱۔ عمرو بن عبدوَد بدر کے معرکے میں موجود تھا مگر اس دن جنگ میں بہت زخمی ہوگیا تھا لہٰذا وہ احد میں شریک نہیں ہوا۔ جنگ خندق میں وہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ شریک ہوا اور اس نے اپنے سر پر ایک نشان لگا رکھا تھا جس سے اس کا امتیاز نمایاں رہے۔ (تاریخ طبری، طبع مصر ۱۹۶۱ء، جلد ۲، صفحہ ۵۷۴) رضوانی

عمرو نے آتے ہی مبارز طلب کیا۔ جب اس کی آواز مسلمانوں کے کانوں سے ٹکرائی تو ان کی سانسیں سینوں میں رک گئیں اور چہرے فق ہو گئے کیونکہ سب اس کو پہچانتے تھے۔ وہ عرب کا مانا ہوا بہادر تھا اور پورے عرب میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ جنگی ماہر اور تنہا ایک ہزار افراد کا مقابلہ کرنے والا مشہور تھا۔

هَلْ مِنْ مُبَارِزٍ ؟ کی آواز ایک بار پھر سنائی دی مگر سارے اصحاب اس طرح بے حس و حرکت بیٹھے رہے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ کسی میں عمرو کو جواب دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ مسلمانوں کی غیرت کو چیلنج کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا: مسلمانو! تمہارا کہنا ہے کہ تم میں سے جو قتل ہو جائے وہ جنت میں جاتا ہے۔ کیا تم میں کوئی ایسا نہیں جو جنت میں جانا چاہتا ہو؟ یکا یک رسول خدا ﷺ کی آواز ابھری: تم میں سے کون ہے جو اس بت پرست کو ٹھکانے لگا دے؟

سب صحابہ خاموش بیٹھے رہے۔[۱] صرف حضرت علی علیہ السلام اٹھے اور فرمایا: اَنَا لَهٗ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! یا رسول اللہؐ! میں حاضر ہوں۔ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: جانتے ہو وہ عمرو ہے۔ آپ نے کچھ دیر توقف کیا کہ شاید کوئی اور بھی کھڑا ہو جائے مگر کوئی عمرو کے مدمقابل آنے پر آمادہ نہ ہوا۔ رسول خدا ﷺ نے اپنا سوال پھر دہرایا: دوبارہ حضرت علی علیہ السلام نے ہی جواب دیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اے علیؑ! یہ عمرو بن عبدوَد ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: یا رسول اللہؐ! میں بھی تو ابو طالبؑ کا بیٹا ہوں۔

یہ سن کر رسول خدا ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کو جنگ کی اجازت دیدی۔ آپ نے اپنے ہاتھوں سے حضرت علی علیہ السلام کے سر پر عمامہ باندھا اور ان کی کمر میں تلوار حمائل کی اور فرمایا: جاؤ! تمھیں اللہ کی پناہ میں دیا۔ جب حضرت علی علیہ السلام میدان کی طرف چلے تو رسول خدا ﷺ نے فرمایا: بَرَزَ الْاِيْمَانُ كُلُّهٗ اِلٰى

---

۱۔ اللہ نے سورۂ احزاب میں صحابہ کی اس حالت کا یوں ذکر فرمایا ہے: ... جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیجی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں۔ اللہ وہ سب دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے۔ جب دشمن اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے تو خوف کے مارے تمہاری آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے منہ کو آ گئے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ اس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے۔ اور جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دل بیمار تھے صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو وعدے ہم سے کئے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب کے لوگو! تمہارے لیے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں، پلٹ چلو اور ان میں کا ایک گروہ یہ کہہ کر نبیؐ سے رخصت طلب کر رہا تھا کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں حالانکہ وہ کھلے نہیں تھے۔ دراصل وہ محاذ جنگ سے بھاگنا چاہتے تھے۔ (رضوانی)

الشِّرْكِ كُلِّهٖ کل ایمان کل شرک کے مقابلے پر جا رہا ہے۔

حقیقت بھی یہی تھی۔ حضرت علی علیہ السلام صرف اور صرف صاحب ایمان نہیں بلکہ کل ایمان تھے۔ اگر اس روز حضرت علی علیہ السلام نہ ہوتے تو اسلام کا نام ونشان مٹ جاتا جبکہ عمرو بھی کفر وشرک کی نمائندگی کر رہا تھا اور قریش کی آنکھوں کا تارا شمار ہوتا تھا۔

ادھر عمرو یہ رجز پڑھ کر مسلمانوں کو چیلنج کر رہا تھا ؎

وَلَقَدْ بَحَحْتُ مِنَ النِّدَاءِ ۔۔۔ بِجَمْعِكُمْ هَلْ مِنْ مُبَارِزٖ

وَ وَقَفْتُ اِذْ جَبُنَ الْمُشَجَّعُ ۔۔۔ مَوْقِفَ الْبَطَلِ الْمُنَاجِزِ

اِنِّیْ كَذَالِكَ لَمْ اَزَلْ ۔۔۔ مُتَسَرِّعًا نَحْوَ الْهَزَاهِزِ

اِنَّ الشُّجَاعَةَ فِی الْفَتٰی ۔۔۔ وَالْجُوْدَ مِنْ خَيْرِ الْغَرَائِزِ

مسلمانوں کو پکار پکار کر میری آواز بیٹھ گئی کہ ہے کوئی میرے مقابلے پر آنے والا۔ میں شجاعت کے ساتھ وہاں ڈٹا رہا جہاں بڑے بڑے بہادر میدان چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ سختیوں اور مشکلوں کی طرف تیزی سے قدم بڑھایا ہے کیونکہ جوانی میں شجاعت اور جود وسخا بہترین اوصاف ہیں۔

اس موقع پر حضرت علی علیہ السلام بپھرے ہوئے شیر کی مانند عمرو کی طرف بڑھے اور آپ نے اس کے رجز کے ردیف و قافیہ میں جواب دیتے ہوئے یہ رجز پڑھا ؎

لَا تَعْجَلَنَّ فَقَدْ اَتَاكَ ۔۔۔ مُجِيْبُ صَوْتِكَ غَيْرَ عَاجِزِ

ذُوْنِيَّةٍ وَ بَصِيْرَةٍ ۔۔۔ وَالصِّدْقُ مُنْجِیْ كُلَّ فَائِزِ

اِنِّیْ لَاَرْجُوْ اَنْ اُقِيْمَ ۔۔۔ عَلَيْكَ نَائِحَةَ الْجَنَائِزِ

مِنْ ضَرْبَةٍ نَجْلَاءَ يَبْقٰی ۔۔۔ ذِكْرُهَا بَعْدَ الْهَزَاهِزِ

اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ تجھے جواب دینے والا تیری طرف آ رہا ہے۔ تیرے مقابل وہ آ رہا ہے جو تجھ سے ٹکرانے میں کمزوری نہیں دکھائے گا۔ وہ راہ حق میں حسن نیت اور بصیرت کے ساتھ نبرد آزما ہوتا ہے۔ یاد رکھ کہ سچائی میں ہر نیکوکار کی نجات ہے۔ میں عورتوں کو تیری لاش پر رونے کے لیے تجھ پر ایسا شدید وار کروں گا کہ ہر معرکے کے بعد اس کی یاد تازہ کی جائے گی۔

عمرو نے جو عرب کا مانا ہوا جنگجو اور گھڑ سوار تھا حقارت سے حضرت علی علیہ السلام کو دیکھا اور کہنے لگا: کیا تمہارے سوا کوئی جنت کا طلبگار نہ تھا؟ میں تمہارے والد ابو طالبؑ کا پرانا شناسا ہوں۔ وہ میرے

دوست تھے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمھیں اپنے سامنے مرغ بسمل کی طرح تڑپتا دیکھوں۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ میں عرب کا مانا ہوا گھڑسوار اور تیغ زن ہوں؟

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: سب سے پہلے میں تجھے اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر تو اسے قبول نہیں کرنا چاہتا تو میرا مشورہ یہ ہے کہ اسی راستے سے واپس چلا جا جس راستے سے یہاں آیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جنگ سے دستبردار ہوجا۔

عمرو نے کہا: میں اپنے آباؤ اجداد کے طور طریقے نہیں چھوڑ سکتا اور اگر جنگ کے بغیر واپس جاؤں گا تو قریش کی عورتیں مجھے طعنہ دیں گی۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا تو پھر تجھے گھوڑے سے اتر کر لڑنا ہوگا کیونکہ میں تجھے پا پیادہ اللہ کی راہ میں قتل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر عمرو کو سخت غصہ آگیا۔ وہ بے تحاشا گھوڑے پر سے کود پڑا اور غصے میں اپنے گھوڑے کے پیروں پر تلوار ماری تو اس کے چاروں پیر کٹ گئے۔ پھر وہ حضرت علی علیہ السلام کی طرف بڑھا۔ دونوں بہادر میدان میں جولانی کرتے رہے جس کی وجہ سے میدان غبار سے اٹ گیا اور دونوں غبار کی شدت کی وجہ سے نظر نہیں آ رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے پر شدید وار کر رہے تھے۔ عمرو نے حضرت علی علیہ السلام پر اتنا زور کا وار کیا کہ آپ کی زرہ کے دو ٹکڑے ہوگئے اور آپ کے سر مبارک پر ہلکا سا زخم آیا۔ پھر حضرت علی علیہ السلام نے ایسا بھرپور وار کیا کہ عمرو کا سر دو پارہ ہوگیا۔ آپ نے تکبیر بلند کی تو سب کو معلوم ہوگیا کہ عمرو کا کام تمام ہوگیا ہے اور اس کے قتل سے کفار قریش کی شکست یقینی ہوگئی ہے۔

اس جنگ کے موقع پر عمرو بن عبدود کی بہن نے کہا تھا:

أَسَدَانِ فِي ضِيقِ الْمَكَرِّ تَصَاوَلَا ‏ ‏ ‏ ‏ وَكِلَاهُمَا كُفْوٌ كَرِيْمٌ بَاسِلٌ

فَاذْهَبْ عَلِيُّ فَمَا ظَفِرْتَ بِمِثْلِهِ ‏ ‏ ‏ ‏ قَوْلٌ سَدِيْدٌ لَيْسَ فِيْهِ تَحَامُلٌ

ذَلَّتْ قُرَيْشٌ بَعْدَ مَقْتَلِ فَارِسٍ ‏ ‏ ‏ ‏ فَالذُّلُّ مُهْلِكُهَا وَخِزْيٌ شَامِلٌ

یعنی وہ دونوں بہادر شیر تھے جو ایک تنگ میدان میں ایک دوسرے پر حملہ کر رہے تھے۔ وہ دونوں ہی عزت اور شجاعت میں برابر تھے۔ جاؤ علیؑ! آج تک کسی نے اس کی طرح وار نہیں کیا ہے۔ میری یہ بات بالکل درست ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ اس جیسے شہسوار کے قتل ہوجانے سے قریش ذلیل ہوگئے اور یہ ذلت انھیں جیتے جی مار ڈالے گی۔ یہ شرمندگی ان کے لیے عمر بھر کا روگ ہے۔

جب حضرت علی علیہ السلام عمرو کا سر لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے فرمایا:

ضَرْبَةُ عَلِيٍّ يَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْنِ خندق کے دن علیؑ کا ایک وار انسانوں اور جنوں کی عبادت سے افضل ہے۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ آپ نے فرمایا تھا: لَضَرْبَةُ عَلِيٍّ لِعَمْرِو بْنِ عَبْدِوَدٍّ اَفْضَلُ مِنْ عَمَلِ اُمَّتِيْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ یعنی علیؑ نے عمرو بن عبدود پر جو وار کیا تھا وہ قیامت تک میری امت کے اعمال سے افضل ہے یا یہ کہ روز قیامت تک میری امت کے اعمال کی جو جزا ہوگی اس سے علیؑ کی ایک ضربت افضل ہے۔ (ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ۔ بحار الانوار ج ۳۹، ص ۲۔ کشف الغمہ ص ۵۶)

اس لیے کہ یہ حضرت علی علیہ السلام کی تلوار ہی تھی جس نے عمرو کو قتل کر کے اسلام کو مشرکین کے شر سے نجات دلائی تھی۔ اگر اس دن حضرت علی علیہ السلام نہ ہوتے تو مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے عمرو اکیلا ہی کافی تھا جیسا کہ عمرو نے خود کہا تھا کہ وہ اسلام کا نام ونشان مٹا دے گا۔ لہٰذا قیامت تک امت مسلمہ کے اعمال حضرت علی علیہ السلام کی ضربت کے مرہون منت ہیں جو عمرو کو قتل کرنے نیز عکرمہ اور اس کے ساتھیوں کو بھاگنے پر مجبور کرنے کا باعث بنی۔ وہ لوگ بھی جو عمرو کے ہمراہ خندق کے اس پار آئے تھے، عمرو کے قتل ہوتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد کفار و مشرکین کی صفوں میں خوف و ہراس پھیل گیا اور ان کے حوصلے پست ہوگئے۔ پھر اللہ کے حکم سے ایسی شدید آندھی چلی کہ چھولداریاں زمین پر آگریں۔ یہ دیکھ کر قریش سراسیمہ ہوگئے اور ابو سفیان رات کی تاریکی میں اپنے لشکر کے ساتھ مکہ واپس چلا گیا۔[1]

مرحوم شیخ کاظم ازری علیہ الرحمہ اپنے ''قصیدہ ہائیہ'' میں حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں عمرو کے قتل ہوجانے کے بارے میں کہتے ہیں:

يَالَهَا ضَرْبَةٌ حَوَتْ مَكْرُمَاتٍ     لَمْ يَزِنْ ثِقْلَ اَجْرِهَا ثَقَلَاهَا

هٰذِهٖ مِنْ عُلَاهُ اِحْدَى الْمَعَالِيْ     وَ عَلٰى هٰذِهٖ فَقِسْ مَا سِوَاهَا

وہ ایک وار کتنا عظیم اور کس قدر خوبیوں کا حامل ہے کہ جن و انس کا ثواب بھی اس کے اجر کے برابر نہیں ہوسکتا۔ یہ وار تو اس ہستی کے اعلیٰ مقام کی صرف ایک مثال ہے۔ اسی سے ان کے دیگر کارناموں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

غزوۂ خندق کے بعد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کے ایک طاقتور قبیلے بنو قریظہ کی تادیب کا فیصلہ کیا کیونکہ انھوں نے جنگ خندق کے نازک حالات میں عہد و پیمان توڑ کر مشرکین کی مدد کی تھی اور اس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کو پریشانی میں مبتلا کیا تھا۔ اس عہد شکنی کی سزا دینے کے لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ چند صحابہ کو ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ پچیس دن کے محاصرے اور قبیلے کے مردوں کے قتل کیے جانے کے بعد ان کی عورتوں کو قیدی بنا لیا گیا اور مال غنیمت

مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ اس طرح بنو قریظہ بھی حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کو مدینہ کے نواح میں بسنے والے یہودیوں کے شر سے نجات مل گئی۔

## غزوۂ خیبر

خیبر عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں مضبوط حصار۔ مدینہ کے شمال میں ۱۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قصبہ تھا جہاں یہود سات مضبوط قلعوں میں زندگی بسر کر رہے تھے اسی لیے اسے خیبر کہا جاتا تھا۔ خیبر کی زمین بہت زرخیز تھی۔ یہاں نخلستانوں اور پانی کے چشموں کی بہتات تھی۔ ان سات قلعوں کے الگ الگ نام تھے۔[۱] ناعم اور قموص اپنی مضبوطی کے لحاظ سے زیادہ مشہور تھے۔

مؤرخین نے خیبر کی آبادی کے بارے میں مختلف باتیں لکھی ہیں۔ تاریخ یعقوبی میں اس کی آبادی بیس ہزار جبکہ سیرت حلبیہ کے مطابق بعض مؤرخین نے چار اور بعض نے دس ہزار لکھی ہے۔ بہرحال یہ بات مسلم ہے کہ مسلمانوں کے مقابلے میں یہودیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار چار سو یا بقول دیگر ایک ہزار چھ سو تھی۔

۷ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر مسلمانوں نے خیبر کی طرف پیش قدمی کی۔ دو یا تین دن پیدل چلنے کے بعد مسلمان خیبر کے نواح میں پہنچ گئے اور مذکورہ قلعوں کے نزدیک پڑاؤ ڈال دیا۔ صبح جب یہودیوں نے دیکھا کہ مسلمان قلعوں کے نزدیک آگئے ہیں تو ان میں کھلبلی مچ گئی۔ یہودی مسلمانوں کو دیکھتے ہی قلعہ بند ہوگئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے پچیس دن تک قلعوں کا محاصرہ کئے رکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دن حضرت ابوبکرؓ اور دوسرے دن حضرت عمرؓ کو علم دے کر خیبر فتح کرنے کے لیے بھیجا لیکن وہ یہودی سورماؤں خاص کر مرحب کو دیکھ کر ہی خوف کے مارے واپس بھاگ آئے۔ (ارشاد مفید ج ۹، باب دوم، فصل ۱۶۔ تاریخ طبری ج ۳، ص ۹۳)

ابن ابی الحدید اس فرار کے متعلق کہتے ہیں:

وَاِنْ اَنْسَ لَا اَنْسَ اللَّذَیْنِ تَقَدَّمَا　　وَفَرَّهُمَا وَالْفَرُّ قَدْ عَلِمَا حَوْبٌ

میں سب کچھ بھول سکتا ہوں مگر ان دونوں کے بھاگنے کو نہیں بھول سکتا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ میدان جنگ سے بھاگنا گناہ ہے۔ (القصائد السبع العلویات، قصیدہ فتح خیبر)

---

۱۔ قلاع خیبر کے نام یہ تھے: (۱) قلعہ ناعِم (۲) قلعہ قَموص (۳) قلعہ صَعب بن مَعاذ (۴) قلعہ وطیح (۵) قلعہ سلالم (۶) قلعہ شِق (۷) قلعہ نِزار (رضوانی)

شیخین کے علاوہ دیگر صحابہ بھی خیبر فتح کرنے گئے مگر وہ بھی ناکام لوٹے۔ جب ان صحابہ کی ناکامی کے ساتھ واپسی سے مسلمانوں کے حوصلے پست ہونے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو یہ مژدہ سنایا: لَأُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلًا يُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَيُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ كَرَّارًا غَيْرَ فَرَّارٍ لَا يَرْجِعُ حَتّٰى يَفْتَحَ اللّٰهُ عَلٰى يَدَيْهِ میں کل علم اس مرد کو دوں گا جس سے اللہ اور اس کا رسول محبت کرتے ہیں اور وہ بھی اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔ وہ بڑھ بڑھ کر حملہ کرنے والا ہے اور میدان سے بھاگنے والا نہیں۔ وہ اس وقت تک واپس نہیں آئے گا جب تک اللہ اس کے ہاتھوں فتح عطا نہ فرما دے۔[1]

(اسد الغابہ ج ۴، ص ۲۸۔ فصول المہمہ ص ۲۱۔ ذخائر العقبیٰ ص ۷۲۔ کفایۃ الطالب ص ۹۸۔ ینابیع المودۃ ص ۴۸)

حضرت نبیٔ کریم ﷺ کی اس بات نے سب صحابہ کو بے چین کر دیا۔ ہر کوئی سوچنے لگا کہ وہ خوش نصیب کون ہوگا جس کے سر پر کل فتح وظفر کا سہرا سجے گا؟ ہر ایک اپنی اپنی رائے دے رہا تھا اور ہر کوئی سمجھ رہا تھا کہ یہ اعزاز اسی کے حصے میں آئے گا۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہ اعزاز حضرت علی علیہ السلام کو ملے گا کیونکہ وہ آشوب چشم میں مبتلا تھے۔ جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ علیؑ کہاں ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! ان کی آنکھیں دکھتی ہیں۔ آپ نے فرمایا: انھیں بلا لائیں۔ چنانچہ ایک صحابی نے جا کر حضرت علی علیہ السلام سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو طلب فرمایا ہے۔ وہ فوراً اٹھے اور سرکار رسالت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے احوال پرسی فرمائی تو بولے: یا رسول اللہؐ! میری آنکھیں دکھ رہی ہیں اور میں صحیح طور پر دیکھ نہیں سکتا۔ سرکار رسالت ﷺ نے ان کا سر اپنے زانوئے مبارک پر رکھا اور اپنا لعاب مبارک لگایا اور دعا فرمائی جس کے بعد وہ اس طرح شفایاب ہو گئے گویا انھیں کوئی تکلیف تھی ہی نہیں۔ پھر زندگی بھر ان کو آشوب چشم لاحق نہیں ہوا۔[2]

---

۱۔ صحیح بخاری جلد ۲، صفحہ ۶۶۲، رقم ۱۳۵۹، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور میں یہ حدیث یوں آئی ہے: لَأُعْطِيَنَّ هٰذِهِ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلًا يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلٰى يَدَيْهِ، يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ، وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ میں کل ایسے شخص کو جھنڈا دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ فتح قرار دے گا۔ وہ اللہ اور رسولؐ سے محبت رکھتا ہے اور اللہ اور رسولؐ اس سے محبت رکھتے ہیں۔
صحیح مسلم جلد ۳، صفحہ ۶۳۴، رقم ۶۲۲۳، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور میں بھی یہ حدیث آئی ہے مگر اس میں لفظ "غدًا" نہیں ہے یہ حدیث اسد الغابہ فی معارفۃ الصحابہ جلد ۲ میں بھی موجود ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ "علم غیب" سے جانتے تھے کہ کل حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں خیبر فتح ہو جائے گا۔ (رضوانی)

۲۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ بات ماننا مشکل ہو مگر قطع نظر اس سے کہ یہ ایک معجزہ ہے آج یہ ثابت ہو گیا ہے کہ انسان کے اندر ایسی روحانی قوت پوشیدہ ہے جو بہت سی بیماریوں کا دوا کے بغیر علاج کر دیتی ہے۔ اس لحاظ سے پیغمبر اکرم ﷺ کی روحانی قوت سب سے زیادہ اس بات کی سزاوار ہے۔

حسان بن ثابت انصاریؓ نے اس واقعے کو یوں نظم کیا ہے:

وَكَانَ عَلِيٌّ اَرْمَدَ الْعَيْنِ يَبْتَغِيْ ۔۔۔ دَوَاءً فَلَمَّا لَمْ يُحِسَّ مُدَاوِيَا
شَفَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ مِنْهُ بِتَفْلَةٍ ۔۔۔ فَبُوْرِكَ مَرْقِيًّا وَ بُوْرِكَ رَاقِيَا
وَقَالَ سَأُعْطِي الرَّايَةَ الْيَوْمَ صَارِمًا ۔۔۔ كَمِيًّا مُحِبًّا لِلرَّسُوْلِ مُوَالِيَا
يُحِبُّ اِلٰهِيْ وَالْاِلٰهُ يُحِبُّهُ ۔۔۔ بِهٖ يَفْتَحُ اللّٰهُ الْحُصُوْنَ الْاَوَابِيَا
فَاَصْفٰى بِهَا دُوْنَ الْبَرِيَّةِ كُلِّهَا ۔۔۔ عَلِيًّا وَ سَمَّاهُ الْوَزِيْرَ الْمُوَاخِيَا

اس روز علیؑ آشوب چشم میں مبتلا تھے۔ انھیں دوا کی تلاش تھی مگر کوئی چیز نہیں ملی۔ رسول اللہؐ نے اپنے لعاب دہن سے انھیں شفایاب کر دیا۔ شفا پانے والے اور شفا بخشنے والے دونوں کو مبارک ہو۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: آج میں علم اسے دوں گا جو بہادر بھی ہے اور رسول کا محب اور دوست بھی ہے۔ وہ اللہ کو دوست رکھتا ہے اور اللہ بھی اسے دوست رکھتا ہے۔ اسی کے ہاتھوں ان محکم قلعوں پر اللہ فتح عطا فرمائے گا۔ پھر اس کام کے لیے رسول اللہؐ نے سب لوگوں میں سے علیؑ کو چن لیا اور انھیں اپنا وزیر اور بھائی قرار دیا۔

بہرحال آشوب چشم سے شفایابی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: اے علیؑ! ہمارے صحابہ سے خیبر کے قلعے ابھی تک فتح نہیں ہوئے۔ اس کام کو تمہارے سوا کوئی اور انجام نہیں دے سکتا۔ حضرت علی علیہ السلام نے عرض کیا: میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا: ان کو اسلام کی دعوت دو۔ تمہارے ذریعے سے اللہ اگر ایک آدمی کو بھی ہدایت دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ پھر آپ نے پوچھا: یا رسول اللہؐ! ان لوگوں سے کب تک لڑوں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا: ان کے لیے شرط امان بس یہ ہے کہ وہ اللہ کی وحدانیت اور میری رسالت کی گواہی دیں۔

یہ سن کر شیر کردگار نے اپنے مرکب کو ایڑ لگائی اور خیبر کے قلعوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ قلعے کے سامنے پہنچ کر آپ نے یہود کو اسلام کی دعوت دی مگر انھوں نے اس دعوت کو ٹھکرا دیا اور لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حضرت علی علیہ السلام نے حیدرانہ حملوں میں یہودیوں کو تتر بتر کر دیا تو وہ بھاگ کر قلعہ قموص میں پناہ گزین ہو گئے۔ جب حضرت علی علیہ السلام قلعے کی طرف بڑھے تو قلعے کے سردار حارث[1] نے آپ کو قلعے میں داخل ہونے سے روکنا چاہا تو آپ کی شمشیر خارا شگاف نے اس کا کام تمام کر دیا۔ یہ دیکھ کر اس

---

۱۔ بعض کتب تاریخ میں لکھا ہے کہ مرحب قلعہ قموص کا سردار اور حارث کا بڑا بھائی تھا۔ (رضوانی)

کا بھائی مرحب آگے بڑھا۔ مرحب بڑا مشہور پہلوان تھا۔ اس نے کمر پر دو تلواریں لٹکائی ہوئی تھیں اور دو زرہیں پہن رکھی تھیں۔ فولادی خود پر اس نے کئی عمامے باندھ رکھے تھے جن پر پتھر کی سل رکھی تھی تاکہ تلوار کے وار سے اس کا سر محفوظ رہ سکے۔

حضرت علی علیہ السلام اور مرحب کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالبؑ نے مرحب کے سر پر اس زور کا وار کیا کہ تمام تر حفاظتی تدابیر کے باوجود ذوالفقار اس کے کاسۂ سر کو دو نیم کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں تک آگئی۔ مرحب زمین پر گرا۔ وہ خاک و خون میں غلطاں تھا کہ مسلمانوں کی طرف سے نعرہ تکبیر بلند ہوا۔ یہودی اپنی شکست کے احساس سے بہت پریشان ہوگئے۔

مرحب کے قتل کے بعد اس کا ایک اور بھائی یاسر[1] ہتھیار سجائے قلعے سے باہر آیا۔ یاسر بھی بہادری میں اپنے دونوں بھائیوں سے کم نہ تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر حملہ کیا مگر حضرت علی علیہ السلام کی شمشیر آہن گداز نے اس کا بھی کام تمام کردیا۔ یہ دیکھ کر یہودیوں نے قلعے کا دروازہ مقفل کردیا۔

حضرت علی علیہ السلام نے قلعے کے دروازے کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اس طرح یہودیوں کے مضبوط قلعے ناعم اور قموص حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں فتح ہوگئے۔ یہودیوں نے دوسرے قلعوں میں محصور ہوکر مسلمانوں سے مقابلے کی کوشش کی مگر مسلمانوں نے کہیں بھی ان کے قدم جمنے نہ دیئے۔ یہودی اس قلعے سے نکل کر چپکے چپکے دوسرے قلعے میں چلے گئے۔ اس قلعے کے سامنے بھی مسلمانوں اور یہودیوں میں بڑا زور دار مقابلہ ہوا جس میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ پھر یہودی ایک دوسرے قلعے میں جمع ہوگئے۔ یہاں بھی انھوں نے شکست کھائی۔ اس طرح اس علاقے کے سارے قلعے ایک ایک کر کے فتح ہوگئے۔

شیخ مفیدؒ نے عبد اللہ جدلی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا:

میں نے حضرت علی علیہ السلام سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ جب میں نے قلعہ خیبر کا دروازہ اکھاڑا تو میں نے اسے اپنی سپر بنا لیا اور یہودیوں کے ساتھ لڑتا رہا یہاں تک کہ خدائے عزوجل نے انھیں شکست سے دوچار کردیا۔ پھر میں نے اس دروازے کو قلعے کے گرد جو خندق تھی اس پر رکھ دیا تاکہ مسلمان لشکر خندق کو عبور کر کے قلعے کی طرف آجائے۔ اس کے بعد میں نے دروازے کو خندق میں پھینک دیا۔ خیبر سے واپسی پر ۷۰ مسلمان مل کر بھی اس دروازے کو اپنی جگہ سے اٹھا نہ سکے۔

إِنَّ امْرَءً حَمَلَ الرِّتَاجَ بِخَيْبَرَ     يَوْمَ الْيَهُوْدِ بِقُدْرَةٍ لَمُؤَيَّدٌ

---

۱۔ بعض کتب تاریخ میں عنتر اور دیگر یہودی بہادروں کے نام بھی آئے ہیں۔ (رضوانی)

حَمَلَ الرِّتَاجَ رِتَاجَ بَابِ قَمُوصِهَا وَالْمُسْلِمُوْنَ وَ اَهْلُ خَيْبَرَ حُشَّدُ

فَرَمٰی بِهٖ وَلَقَدْ تَكَلَّفَ رَدَّهٗ سَبْعُوْنَ كُلُّهُمْ لَهٗ يَتَشَدَّدُ

رَدُّوْهُ بَعْدَ تَكَلُّفٍ وَ مَشَقَّةٍ وَ مَقَالِ بَعْضِهِمْ لِبَعْضٍ اُرْدُدُوْا

علیؑ نے اس دن جب وہ یہودیوں سے برسرپیکار تھے خیبر کے بہت بھاری اور مضبوط دروازے کو خدا کی مدد اور طاقت سے اٹھایا تھا۔ وہ بھاری دروازہ جو کوہ قموص کے برابر تھا اسے آپ نے مسلمانوں اور خیبر کے یہودیوں کے سامنے اٹھا کر دور پھینکا تھا جبکہ ۷۰ طاقتور آدمی مل کر بھی اسے اپنی جگہ سے اٹھا نہ سکے۔ (ارشاد مفید ج ۱، باب ۲، فصل ۳۱)

جنگ خیبر میں حضرت علی علیہ السلام نے یہودی سورماؤں کو قتل کرنے اور خصوصاً قلعے کے پتھر کے دروازے کو اکھاڑ کر اپنے ہاتھوں پر اٹھانے کا جو حیرت انگیز مظاہرہ کیا تھا وہ آپ کی مجاہدانہ زندگی کا ایک یادگار باب ہے۔ بقول اقبالؔ

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

(بانگ درا۔ میں اور تو)

اس واقعے پر بہت سے شعراء نے اشعار کہے ہیں۔ ابن ابی الحدید کہتے ہیں:

يَا قَالِعَ الْبَابِ الَّذِیْ عَنْ هَزِّهَا عَجَزَتْ اَكُفُّ اَرْبَعُوْنَ وَ اَرْبَعُ

اے اس دروازے کو اکھاڑ کر پھینکنے والے جسے ۴۴ آدمی مل کر بھی ہلا نہ سکتے تھے۔

(القصائد السبع العلویات، قصیدہ ششم)

جنگ خیبر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کی درخواست پر ان سے صلح کرلی۔ اس کے ساتھ فدک بھی فتح کرلیا گیا اور وہاں کے یہودیوں نے نصف آمدنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بھجوا دی۔ فدک کا علاقہ وہاں کے یہودیوں نے برضا و رغبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد کردیا تھا اس لیے وہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی ملکیت تھا جبکہ خیبر کی زمین تمام مسلمانوں کی مشترکہ ملکیت تھی۔

خیبر سے واپسی پر بعض باغی یہودی قبائل کو بھی تنبیہ کی گئی اور انھوں نے آئندہ مسلمانوں کے خلاف اقدام نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ اس طرح مسلمانوں کو یہودیوں کی فتنہ پروری سے نجات مل گئی اور مدینہ میں امن وسکون ہوگیا۔

# فتح مکہ

۸ھ میں جب متعدد چھوٹی بڑی جنگوں سے رسول اللہ ﷺ کو فرصت ملی اور مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تو آپ نے ضروری سمجھا کہ مکے کا رخ کیا جائے۔ مکہ وہ شہر تھا جہاں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی تھی اور کفار قریش کے سازشی منصوبے کی وجہ سے آپ کو ہجرت کرنا پڑی تھی۔

سرکار ختمی مرتبت ﷺ ۱۳ سال تک مکہ میں مشرکین قریش کو توحید کی دعوت دیتے رہے تھے اور نہ صرف یہ کہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا بلکہ آپ کو ہر طرح سے ستایا گیا تھا۔ علاوہ ازیں جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں ہجرت کے بعد بھی مشرکین نے مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں کا سلسلہ برابر جاری رکھا تھا۔ ہجرت کرنے والے مسلمان جنھوں نے ڈر اور خوف کے عالم میں راتوں رات مکہ سے مدینہ کا رخ کیا تھا اب اس قابل تھے کہ فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہوں۔

بعض مسلمان اگرچہ اب بھی خوفزدہ تھے تاہم رسول اللہ ﷺ نے انھیں فتح کی نوید سنائی کیونکہ اللہ نے آپ سے فتح کا وعدہ فرمایا تھا جسے آپ نے اس آیت سے استنباط فرمایا تھا: لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ... یقیناً اللہ نے اپنے رسولؐ کے خواب کو سچ کر دکھایا۔ اللہ نے چاہا تو آپ ضرور مسجد حرام میں امن کے ساتھ داخل ہوں گے۔

اسی طرح سورۂ نصر میں بھی جو کہ فتح مکہ سے قبل نازل ہوئی تھی فتح مکہ اور وہاں کے لوگوں کے قبول اسلام کی بشارت دی گئی تھی۔

رسول اکرم ﷺ خانۂ خدا کے احترام کے پیش نظر چاہتے تھے کہ خونریزی کے بغیر مکہ فتح ہو اسی لیے ابتدا میں آپ نے مکہ روانگی کا پروگرام مسلمانوں سے مخفی رکھا تا کہ کہیں مشرکین تک اس کی اطلاع نہ پہنچ پائے۔ رسول اکرم ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کے سوا جو آپ کے قابل اعتماد ساتھی تھے کسی اور سے اس بارے میں مشورہ نہیں کیا تاہم روانگی سے کچھ پہلے آپ نے اپنے چند اصحاب کو اس امر سے آگاہ کر دیا تھا۔ حاطب ابن بلتعہ جس کے کچھ رشتے دار مکہ میں تھے جب اس پر مطلع ہوا تو اس نے قریش کو خط کے ذریعے اس کی اطلاع دینی چاہی۔ اس نے یہ خط ایک عورت کے ذریعے مکہ بھیج دیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبؐ کو حاطب کی اس حرکت سے آگاہ کر دیا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام اور زبیر بن عوّام کو اس عورت کے تعاقب میں روانہ فرمایا جنھوں نے راستے میں ہی اس عورت سے وہ خط برآمد کر لیا۔ (تاریخ طبری۔ سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۳۹۸۔ ارشاد مفید۔ اعلام الوریٰ)

رسالت مآب ﷺ نے رمضان المبارک ۸ھ کے اوائل میں بارہ ہزار مہاجرین و انصار پر مشتمل ایک لشکر تیار فرمایا۔ یہ لشکر فتح مکہ کے قصد سے روانہ ہوا۔ جب یہ لشکر مکہ کے قریب پہنچا تو عباس بن عبدالمطلب ؓ لشکر اسلام کی کثرت اور ان کے مکمل مسلح ہونے کی خبر مشرکین مکہ کو دے کر انھیں خوفزدہ کرنے کی غرض سے تیزی کے ساتھ مکہ کی طرف بڑھے۔ ادھر مکہ کے لوگوں کو بھی رسول اللہؐ کی آمد کی خبر ہوچکی تھی اسی لیے ابوسفیان مزید معلومات حاصل کرنے مکہ سے باہر نکلا تو راستے میں حضرت عباسؓ سے اس کی ملاقات ہوئی۔ حضرت عباسؓ نے اسے مسلمانوں کی کثرت خصوصاً ان کے مضبوط ایمان اور جرأت و استقامت کے بارے میں بتایا اور لشکر اسلام سے جنگ کرنے کے ہولناک نتائج سے خبردار کیا۔ نیز اسے اس بات پر راغب کیا کہ وہ بھی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر اسلام قبول کرلے۔

ابوسفیان نے چار و ناچار اضطراری حالت میں ان کی بات مان لی اور ان کے ساتھ شوکت اسلام کے مظہر مسلمانوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر جیسے لشکر کے درمیان سے گزرتے ہوئے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور مختصر سی گفتگو کے بعد اسلام قبول کرلیا۔

ابوسفیان لشکر اسلام کے جاہ و جلال کو دیکھ کر دنگ رہ گیا اور آخرکار ۲۱ سال تک رسول اللہ ﷺ کے خلاف لڑنے، قریش کو لڑنے پر اکسانے اور انھیں ہر طرح سے مسلح کرنے کی کوششوں کے بعد اس نے اسلام کی عظمت کے سامنے سر جھکا دیا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے ماضی سے درگزر کی التجا کی۔ رسول اللہ ﷺ نے جو قرآن حکیم کے مطابق صاحب خلق عظیم اور رحمت للعالمین[1] ہیں ابوسفیان کی درخواست قبول کرلی اور اس کو مکہ روانہ فرمایا تاکہ جو لوگ اسلام قبول کرچکے ہیں ان کے لیے امن کا پیغام پہنچائے۔

رسول اکرم ﷺ نے اسلام کا پرچم حضرت سعد بن عبادہؓ سے لے کر حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ میں دے دیا اور مسلمانوں کے لشکر جرار کے ہمراہ اس طرح مکہ میں داخل ہوئے کہ ہر شخص لشکر اسلام کی شوکت و ہیبت دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ آنحضرت ﷺ نے خانۂ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہوکر فرمایا:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ صَدَقَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ... کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے۔ وہ یکتا ہے۔ اس نے اپنا وعدہ سچ کردکھایا اور اپنے بندے (محمد ﷺ) کی مدد فرمائی۔

وہ پہلا دن تھا جب مکہ مکرمہ میں بلا روک ٹوک لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے۔

---

۱۔ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ○ (سورۂ قلم: آیت ۴) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ (سورۂ انبیاء: آیت ۱۰۷)

حضرت بلالؓ نے خانۂ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر جب اذان دی تو اس کی آواز مکہ کے در و بام سے ٹکرا کر ایک وجد کی سی کیفیت پیدا کر دیتی تھی۔ لشکر اسلام نے رسول خدا ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھی۔ نماز کے بعد آپ نے اہل مکہ سے جو اپنی سزا اور انتقام سے خوفزدہ تھے پوچھا مَاذَا تَقُوْلُوْنَ وَمَاذَا تَظُنُّوْنَ ؟ تم لوگ اپنے بارے میں کیا کہتے ہو اور مجھ سے کیسے سلوک کی امید رکھتے ہو؟

سب نے کہا: نَقُوْلُ خَیْرًا وَنَظُنُّ خَیْرًا اَخٌ کَرِیْمٌ وَابْنُ اَخٍ کَرِیْمٍ وَقَدْ قَدَرْتَ ہم بھلائی کی بات کرتے ہیں اور آپ سے بھلائی کی امید رکھتے ہیں۔ آپ عفو و درگزر کرنے والے بھائی اور صاحب کرم بھائی کے بیٹے ہیں۔ آج ہم آپ کے رحم و کرم پر ہیں۔

رسول کریم ﷺ پر ان کا جواب سن کر رقت طاری ہوگئی۔ آپ نے فرمایا: میں بھی وہی بات کہوں گا جو میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے کہی تھی: لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ آج کے دن تم پر کوئی عتاب نہیں ہوگا۔ (سورۂ یوسف: آیت ۹۲)

اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ جاؤ! تم سب آزاد ہو۔

(تاریخ طبری۔ منتہی الآمال)

عام معافی کے اعلان نے اہل مکہ کے دل و دماغ پر بہت مثبت اثرات مرتب کئے اور سب کے دلوں میں رسول کریم ﷺ کی محبت گھر کر گئی۔

اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے خانۂ کعبہ میں رکھے تمام بتوں کو بھی توڑنے کا حکم دیا۔ آپ حضرت علی علیہ السلام کے ہمراہ خانۂ کعبہ میں داخل ہوئے اور ان سے فرمایا کہ میرے کاندھے پر چڑھ کر ان بتوں کو توڑ دو اور کعبہ کو ان کی نجاست سے پاک کر دو۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے جو کسی صورت میں لوگوں میں شرک کے آثار دیکھنا پسند نہیں فرماتے تھے رسول اللہ ﷺ کے دوش مبارک پر چڑھ کر ہُبل جیسے بڑے بتوں کو جو اونچائی پر نصب تھے توڑ دیا۔ اسی لیے آپ کا ایک لقب بت شکن بھی ہے۔

## غزوۂ حنین اور طائف

فتح مکہ کے بعد اہل مکہ جوق در جوق اسلام قبول کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کرنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ کچھ عرصے تک مکہ میں مقیم رہے۔ آپ نے اس شہر کے نظم و نسق اور امن و امان کے لیے ضروری اقدامات کئے اور پھر لشکر اسلام کے ہمراہ مدینہ واپسی کا فیصلہ فرمایا۔ واپسی پر آپ نے

دو ہزار نو مسلم اہل مکہ کو بھی اپنے لشکر میں شامل کر لیا۔ لشکر اسلام کی کثرت دیکھ کر مسلمانوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ ہمارے سپاہیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اب ہم ہرگز مغلوب نہیں ہوسکتے۔ شاید ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ سپاہیوں کی کثرت اہمیت نہیں رکھتی بلکہ اللہ پر توکل اور اس کی مدد ہی مسلمان کا اثاثہ ہے چنانچہ جنگ حنین کے موقع پر غزوۂ احد جیسی صورتحال پیدا ہوگئی۔ جنگ حنین میں مسلمان بھاگ گئے۔ خود حضرت ابوبکرؓ بھی بھاگنے والوں میں شامل تھے جبکہ بنی ہاشم کے نو افراد اور ام ایمن کے فرزند ایمن رسول اللہ ﷺ کا دفاع کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے ان کی مدد فرمائی۔ بھاگ جانے والے واپس پلٹ آئے اور دوبارہ دشمن پر حملہ آور ہوئے جس سے فتح ان کا مقدر بنی جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے: لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوۂ حنین کے دن (اس کی دستگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو)۔ اس روز تمھیں اپنی کثرت تعداد کا گھمنڈ تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی۔ (سورۂ توبہ: آیت ۲۵)

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے مکہ سے مدینہ واپسی کا ارادہ فرمایا تو ہوازن اور ثقیف نامی قبیلوں نے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کا منصوبہ بنایا۔ ان کے لشکر کے سپہ سالار مالک بن عوف نے جب سنا کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ واپس جا رہے ہیں تو وہ اپنے لشکر کے ہمراہ جس کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ تھی وادی حنین کے دہانے پر مورچہ زن ہو کر بیٹھ گیا تاکہ لشکر اسلام پر اچانک حملہ کیا جاسکے۔

خالد بن ولید کی زیر کمان دستہ اسلامی لشکر میں سب سے آگے تھا۔ جب رات کو یہ دستہ ایک تنگ درّے سے گزرا تو دشمن نے حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے سے لشکر والے بوکھلا کر پیچھے ہٹ گئے۔ ابوسفیان جیسے افراد جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اس صورتحال سے بہت خوش ہوئے اور بھاگ گئے۔ صرف بنی ہاشم کے نو آدمی رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کر رہے تھے اور دشمنوں پر کاری ضربیں لگا رہے تھے۔ وہ کسی دشمن کو رسول اللہ ﷺ کے قریب پھٹکنے نہ دیتے تھے۔ شیخ مفید رقمطراز ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کی وجہ سے یہ نو آدمی میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔ نیز دیگر مسلمان بھی حضرت علی علیہ السلام ہی کی وجہ سے واپس پلٹ آئے تھے۔ (ارشاد مفید ج ۱، باب ۲، فصل ۴۰)

رسول خدا ﷺ نے حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ سے جن کی آواز پاٹ دار تھی فرمایا کہ سب

لوگوں کو واپس بلائیں چنانچہ انھوں نے پکار کر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحیح سلامت ہمارے درمیان موجود ہیں۔ یہ سن کر بھاگا ہوا لشکر واپس پلٹا اور مل کر دشمن پر زبردست حملہ کر دیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے قبیلہ ہوازن کے سردار مالک بن عوف اور لشکر کے علمبردار ابو جرول کو تہہ تیغ کر دیا جس سے دشمن کی صفیں درہم برہم ہوگئیں اور وہ بھاگنے لگے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کر کے بہت سے لوگوں کو قتل کر دیا اور کچھ کو قیدی بنالیا۔ (سیرت ابن ہشام۔ اعلام الوریٰ۔ ارشاد مفید ج ۱، باب فصل ۳۸)

اس کے بعد مسلمانوں نے طائف کا رخ کیا جہاں قبیلہ ثقیف آباد تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے بھیجے جانے والا ابوسفیان بن حارث وہاں سے شکست کھا کر واپس آیا تھا اس لیے آنحضرتؐ خود صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ طائف روانہ ہوئے اور طائف کا محاصرہ کر لیا جو ۲۰ دنوں تک جاری رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طائف کے گرد و نواح میں موجود بتوں کو توڑنے کے لیے حضرت علی علیہ السلام کو روانہ فرمایا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس دوران قبیلہ خشعم کے نامور جنگجو شہاب کو قتل کر دیا جو آپ کی راہ میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ پھر آپ آگے بڑھے اور طائف کے گرد و نواح کے سب بت توڑ ڈالے۔ اس مہم کے دوران نافع بن غیلان نامی شخص جو ایک گروہ کے ہمراہ مسلمانوں سے لڑنے کے لیے آیا تھا آپ کی شمشیر خارا شگاف سے مارا گیا اور اس کے ساتھی کچھ مشرکین بھاگ گئے اور کچھ اسلام لے آئے۔ حضرت علیؑ فتح کا علم اٹھائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں واپس تشریف لائے۔ اس طرح قبیلہ ہوازن اور قبیلہ ثقیف سے جنگ اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئی۔

جنگ طائف کو مسلمانوں اور عرب مشرکین کے درمیان لڑی جانے والی آخری جنگ شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے بعد پورے عرب میں کسی کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہ ہوئی اور سارا عرب سرنگوں ہوگیا اس لیے اب ضروری تھا کہ اسلام کی تبلیغ کا دائرہ دوسرے ملکوں تک پھیلایا جائے اور انھیں بھی اسلام کی دعوت دی جائے۔ اسی فیصلے کی وجہ سے غزوۂ تبوک وقوع پذیر ہوا۔ یہ غزوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری جنگی سفر تھا۔ اس غزوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو مدینہ میں ہی رکنے کا حکم دیا تھے اس لیے ہم اس کا تذکرہ نہیں کر رہے۔

یہ تھا حضرت علی علیہ السلام کی عسکری خدمات کا ایک مختصر جائزہ جس کی وجہ سے اسلام کو سربلندی نصیب ہوئی جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: اگر علیؑ کی تلوار نہ ہوتی تو اسلام نہ پھیلتا۔

# (۶) حضرت علی علیہ السلام کی امامت کے دلائل

۱۰ھ میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج ادا کرنے کے لیے مکہ روانہ ہوئے تو کئی ہزار مسلمان آپ کے ہمراہ تھے۔ اس حج کو حجۃ الوداع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حج کے بعد مکہ سے مدینہ واپسی کے دوران ۱۸/ ذی الحجہ کے دن جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غدیر خم کے مقام پر ٹھہر گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اہم پیغام لوگوں تک فوراً پہنچانے کا حکم نازل ہوا تھا چنانچہ جبریل امینؑ یہ آیت لے کر نازل ہوئے: يَآيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اے رسولؐ! جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دیجیے۔ اگر آپ نے یہ نہ پہنچایا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔ اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔ (سورۂ مائدہ: آیت ۶۷)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ تمام حجاج وہاں جمع ہو جائیں۔ جو آگے بڑھ چکے تھے انھیں واپس بلا لیا گیا اور جو پیچھے رہ گئے تھے ان کا انتظار کیا جانے لگا۔

ماجرا کیا ہے؟ ہر کوئی ایک دوسرے سے پوچھ رہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شدید گرمی میں بے آب و گیاہ میدان میں سب مسلمانوں کو جمع ہونے کا حکم کیوں دیا ہے؟ زمین اتنی زیادہ گرم تھی کہ بعض افراد اپنے پاؤں کو اپنے دامن میں لپیٹے اونٹوں کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آخرکار انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ تمام حجاج جمع ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پالان شتر کا منبر تیار کرایا اور اس منبر پر تشریف لے گئے اور سب سے اونچے زینے پر جلوہ افروز ہوئے تاکہ سب لوگ آپ کو دیکھ سکیں اور آپ کی آواز سن سکیں۔ حضرت علی علیہ السلام کو آپ نے اپنی دائیں سمت کھڑا کیا ہوا تھا۔

ایک طویل خطبہ دینے اور قرآن و عترت کے بارے میں وصیت کرنے کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَلَسْتُ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ؟ قَالُوْا بَلٰى: قَالَ: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ

اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاہُ وَعَادِ مَنْ عَادَاہُ وَانْصُرْ مَنْ نَصَرَہُ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَہٗ کیا میں تمہاری جانوں پر تم سے زیادہ حق تصرف نہیں رکھتا؟[1] سب نے عرض کیا: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: پس جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ مولا ہے۔ بارالہا! اسے دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور اسے دشمن رکھ جو علیؑ سے دشمنی رکھے۔ اس کی مدد فرما جو علیؑ کی مدد کرے اور جو علیؑ کو چھوڑ دے اسے ذلیل کردے۔

(عقد الفرید ج ۴، ص ۳۱۱۔ مناقب ابن مغازلی ص ۲۴۔ شواہد التنزیل ج ۱، ص ۱۹۰۔ فصول المہمہ ص ۲۷)

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ مسلمان ایک ایک کرکے حضرت علی علیہ السلام کے خیمے میں جائیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیمے کے ساتھ ہی نصب تھا اور حضرت علی علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین ہونے کی مبارک باد دیں اور امیر المومنین کہہ کر سلام کریں۔ سب سے پہلے حضرت عمر بن خطابؓ نے یہ کہہ کر مبارکباد دی بَخٍ بَخٍ لَکَ یَا عَلِیُّ اَصْبَحْتَ مَوْلَایَ وَمَوْلٰی کُلِّ مُؤْمِنٍ وَ مُؤْمِنَۃٍ مبارک ہو مبارک ہو اے علیؑ! آج آپ میرے اور ہر مومن اور مومنہ کے مولا بن گئے۔

(ارشاد مفید ج ۱، باب دوم، فصل ۵۰۔ الغدیر ج ۱ ص ۴، ۱۵۶۔ مناقب ابن مغازلی ص ۱۹)

اس طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر فرمایا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ یہ بات ان لوگوں کو بھی بتائیں جو یہاں غدیر خم میں موجود نہیں تھے۔

حسانؔ بن ثابت نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت طلب کی کہ وہ غدیر خم میں حضرت علی علیہ السلام کے منصب ولایت و امامت پر فائز ہونے کے بارے میں قصیدہ سنانا چاہتے ہیں۔ اجازت ملنے پر انھوں نے یہ قصیدہ سنایا:

یُنَادِیْھِمْ یَوْمَ الْغَدِیْرِ نَبِیُّھُمْ ۔۔۔ بِخُمٍّ وَاَسْمِعْ بِالنَّبِیِّ مُنَادِیَا

وَ قَالَ فَمَنْ مَوْلَاکُمْ ؟ فَقَالُوْا ۔۔۔ وَلَمْ یُبْدُوْا ھُنَاكَ التَّعَادِیَا

اِلٰھُكَ مَوْلَانَا وَ اَنْتَ وَلِیُّنَا ۔۔۔ وَلَنْ تَجِدَنَّ مِنَّالَكَ الْیَوْمَ عَاصِیَا

فَقَالَ لَہٗ قُمْ یَا عَلِیُّ وَ اِنَّنِیْ ۔۔۔ رَضِیْتُكَ مِنْ بَعْدِیْ اِمَامًا وَھَادِیَا

فَمَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا وَلِیُّہٗ ۔۔۔ فَکُوْنُوْا لَہٗ اَنْصَارَ صِدْقٍ مُوَالِیَا

ھُنَاكَ دَعَا اللّٰھُمَّ وَالِ وَلِیَّہٗ ۔۔۔ وَکُنْ لِلَّذِیْ عَادٰی عَلِیًّا مُعَادِیَا

(روضۃ الواعظین ج ۱ ص ۱۰۳۔ احتجاج طبرسی ج ۱ ص ۱۶۱۔ ارشاد مفید)

---

۱۔ آپ کا اشارہ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ سورۂ احزاب: آیت ۶ کی طرف ہے۔

اس قصیدے کا ترجمہ یہ ہے: غدیر خم کے دن مسلمانوں کو ان کے نبیؐ نے پکارا۔ وہ فرما رہے تھے: کون ہے تمہارا مولا؟ سب بغیر کسی مخالفت کے بولے کہ آپ کا پروردگار ہمارا مولا ہے اور آپ ہمارے ولی اور حاکم ہیں اور آج ہم میں سے کوئی بھی آپ کا نافرمان نہیں ہے۔ پھر آپ نے حضرت علیؑ سے فرمایا: اے علیؑ! اٹھو کہ میں نے اپنے بعد تمھیں لوگوں کی ہدایت اور رہبری کے لیے منتخب کیا ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں سے فرمایا: جس کا میں مولا اور حاکم ہوں اس کا یہ علیؑ مولا اور حاکم ہے۔ پس تم لوگ اس کے سچے مددگار اور دوست بن کر رہنا۔ اس کے بعد آپ نے دعا فرمائی: بار الٰہا! اسے دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور اسے دشمن رکھ جو علیؑ سے دشمنی کرے۔

یہ قصیدہ سن کر پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا:

اے حسان! جب تک تم اپنی زبان سے ہماری حمایت کرتے رہو گے اس وقت تک تمھیں روح القدس کی تائید حاصل رہے گی۔

اس روایت کا متواتر ہونا فریقین کے درمیان اس قدر واضح ہے کہ کسی انکار یا ابہام کی گنجائش نہیں۔ اہلسنت مؤرخین اور مفسرین نے اپنی کتب میں تغیر لفظی کے ساتھ لکھا ہے کہ آیت بلّغ ۱۸ / ذی الحجہ کو غدیر خم میں حضرت علی علیہ السلام کے متعلق نازل ہوئی تھی اور آنحضرت ﷺ نے اپنے خطبہ میں فرمایا تھا:
مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ (فصول المہمہ ص ۲۵۔ شواہد التنزیل ج ۱، ص ۱۹۰۔ مناقب ابن مغازلی، ص ۱۲، ۲۷ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۳۶۲۔ ذخائر العقبیٰ ص ۶۷۔ ینابیع المودۃ ص ۳۷۔ فخر رازی، تفسیر کبیر)

لیکن لفظ مولیٰ کے چونکہ کئی معانی ہیں اس لیے ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ اس حدیث میں لفظ مولا اولیٰ بالتصرف کے معنی میں نہیں بلکہ دوست کے معنی میں ہے۔ چنانچہ ابن صباغ مالکی نے **فصول المہمہ** صفحہ ۲۸ پر لفظ مولا کے چند معانی لکھنے کے بعد کہا ہے کہ **فَيَكُونُ مَعْنِي الْحَدِيثِ مَنْ كُنْتُ نَاصِرَهُ أَوْ حَمِيمَهُ أَوْ صَدِيقَهُ فَإِنَّ عَلِيًّا يَكُونُ كَذَالِكَ** یعنی اس حدیث کے معنی ہیں کہ جس کا میں مددگار، عزیز اور دوست ہوں علیؑ بھی اس کے لیے وہی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایسے متعصب حضرات کے جواب میں ہم ابتدا میں کتب لغت سے لفظ مولا کے معانی پیش کرتے ہیں تاکہ جائزہ لیا جاسکے کہ ان معانی میں سے کون سا معنی سرکار ختمی مرتبت ﷺ کا مقصود تھا۔ لغت میں لفظ مولا کے یہ معنی آئے ہیں: (۱) اولیٰ بالتصرف (۲) صاحب اختیار (۳) غلام (۴) ہمسایہ (۵) آزاد کنندہ (۶) آزاد کردہ (۷) باہم عہد و پیمان کرنے والے (۸) شریک (۹) داماد (۱۰) چچا زاد

(۱۱) عزیز رشتے دار (۱۲) مددگار۔

سورۂ دخان کی آیت ۴۱ میں ہے کہ یَوْمَ لَا یُغْنِیْ مَوْلًی عَنْ مَّوْلًی شَیْئًا وہ دن جب کوئی عزیز اپنے کسی عزیز رشتے دار کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔

سورۂ محمد کی آیت ۱۱ میں اس کے معنی مددگار کے ہیں۔ وَاَنَّ الْکٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰی لَھُمْ بیشک کافروں کا کوئی مددگار نہیں۔

سورۂ نساء کی آیت ۳۳ وَلِکُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ اور سورۂ احزاب کی آیت ۵ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَھُمْ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ وَمَوَالِیْکُمْ (عُتَقَائُکُمْ) میں مولا کا مطلب آزاد کردہ ہے۔

(دیکھیے وجوہ قرآن ص ۲۷۸)

ان میں سے بعض معانی کا رسول خدا ﷺ پر اطلاق کرنا درست نہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ غلام یا کسی کے آزاد کردہ نہیں تھے۔ اسی طرح بعض معانی ایسے ہیں جو اس فرمان رسولؐ میں قطعاً مراد نہیں لیے جاسکتے مثال کے طور پر رسول خدا ﷺ کا چلچلاتی دھوپ میں صحرا کے بیچوں بیچ لوگوں کو جمع کرکے فرمانا کہ جس کسی کا میں چچا زاد ہوں علیؑ بھی اس کے چچا زاد ہیں یا جس کسی کا میں ہمسایہ ہوں علیؑ بھی اس کے ہمسایہ ہیں۔ ایسی بات کہنا رسول اعظم ﷺ کی شان کے خلاف ہے۔

اسی طرح حالات اور مقام بھی اس امر کے متقاضی نظر نہیں آتے جن کے پیش نظر دوست اور مددگار کے معانی مراد لینے والوں کی بات کو معتبر قرار دیا جاسکے کیونکہ آیۂ بلغ کا لب ولہجہ خود اس امر کا غماز ہے کہ معاملہ تمام لوگوں کو جمع کرکے یہ بتانے سے کہیں زیادہ اہم ہے کہ میں جس کسی کا دوست اور مددگار ہوں علیؑ بھی اس کے دوست اور مددگار ہیں۔ وہ بھی شدید گرمی کے عالم میں ایک بے آب وگیاہ صحرا میں! اگر بالفرض آپ کا مقصد یہی تھا تو اس صورت میں ضروری تھا کہ آپ لوگوں کے بجائے حضرت علی علیہ السلام سے فرماتے کہ اے علیؑ! جس کا میں دوست اور مددگار ہوں تم بھی اس کے دوست اور مددگار رہنا۔ اور اگر آنحضرت ﷺ لوگوں کو حضرت علی علیہ السلام کی دوستی کی ترغیب دلانا چاہتے تھے تو اس صورت میں آپ یہ فرماتے کہ جو کوئی مجھے دوست رکھتا ہے وہ علیؑ کو بھی دوست رکھے لیکن اس طرح کی کوئی بات مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ کے جملے میں نہیں پائی جاتی۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کو دوست اور مددگار کہنے کا معاملہ ایسا نہ تھا کہ اس حوالے سے رسول خدا ﷺ کو کوئی خوف اور ڈر لاحق ہو حالانکہ حکم الٰہی میں اس امر کی ضمانت بھی ہے کہ اے رسولؐ! ہم تمھیں لوگوں کے شر سے بچائیں گے۔

نیز قانون تخصیص بلامخصص (یعنی بغیر کسی وجہ کے کسی معنی کو ترجیح دینا) کے مطابق لفظ مولا کے مختلف معانی سے قرینے کے بغیر دوست اور مددگار کے معانی مراد لینا علم اصول کے خلاف اور غلط ہے۔ لہٰذا ان دلائل کے بعد مولا کے معنی صرف اولیٰ بالتصرف اور صاحب اختیار کے رہ جاتے ہیں اور یہ تخصیص بلامخصص نہیں بلکہ اس ضمن میں درج ذیل واضح قرائن موجود ہیں :

(۱) اس مطلب کی اہمیت خود اس دعوے کی دلیل ہے اور خدا نے اپنے رسول کو خبردار بھی کیا ہے کہ اگر آپ نے یہ بات نہ پہنچائی تو درحقیقت آپ نے ہمارا پیغام ہی نہیں پہنچایا۔ یہ انداز تخاطب بتا رہا ہے کہ کسی شرعی حکم کو پہنچانے کی بات نہیں ہو رہی بلکہ یہ آیت ایسے معاملے سے متعلق ہے جو نہایت اہم ہے۔ اس صورت میں ضروری ہے کہ مولا کے معنی ولی الامر اور صاحب اختیار ہو تاکہ تمام مسلمان یہ جان سکیں کہ رسول اکرم ﷺ کے بعد کون آپ کے بعد مسلمانوں کے امور سنبھالے گا۔ خصوصاً اس آیت کا جحفہ کے نزدیک غدیر خم کے مقام پر نازل ہونا اس بات کی تاکید کے لیے تھا کہ رسول اکرم ﷺ حاجیوں کے مختلف راستوں اور علاقوں کی طرف جانے سے پہلے پہلے سب تک یہ پیغام پہنچا دیں کیونکہ جحفہ سے مختلف علاقوں کو جانے والے راستے جدا ہو جاتے تھے اور پھر سب حاجیوں کو ایک مقام پر اکٹھا کرنا ناممکن ہو جاتا۔ اگرچہ یہ حکم رسول اکرم ﷺ کو وحی کے ذریعے چند روز قبل ہی دیا گیا تھا تاہم اسے پہنچانے کا وقت طے نہیں ہوا تھا۔ نیز رسول اکرم ﷺ کو حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں جنگوں میں قتل ہونے والے کافروں کے مسلمان رشتے داروں کی حضرت علی علیہ السلام سے کدورت کا علم تھا اس لیے آپ کو خوف تھا کہ کہیں حضرت علی علیہ السلام کی جانشینی کا پیغام سننے کے بعد وہ لوگ اسے قبول نہ کریں اسی لیے خدا نے آپ کو غدیر خم میں رکنے اور حضرت علی علیہ السلام کی جانشینی کا اعلان کرنے کا حکم دیا اور آپ کو تسلی دینے کے لیے اس بات کی ضمانت دی کہ اے رسولؐ! گھبرایئے مت۔ خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

(۲) رسول خدا ﷺ نے **مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ** سے پہلے **اَلَسْتُ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ** ؟ یا **اَلَسْتُ اَوْلٰى بِكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ** ؟ کا جملہ ارشاد فرمایا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ کیا میں تم پر تمہاری جانوں سے زیادہ اختیار نہیں رکھتا ؟ سب نے بیک زبان اقرار کیا تب آپ نے فرمایا تھا **مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ** اس سے پہلے والا سوال لفظ مولا کے معنی اولیٰ بالتصرف اور صاحب اختیار ہونے کے لیے بالکل واضح قرینہ ہے۔ کلام کا سیاق خود بتا رہا ہے کہ یہاں مولا سے مراد وہی اولیٰ بالتصرف کا حق ہے جو خود رسول خداؐ کو حاصل ہے اور رسول خدا ﷺ اس حق کو اپنے بعد حضرت علی علیہ السلام کے لیے مختص کرنا چاہتے ہیں۔

(۳) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کی جانشینی سے متعلق فرمان الٰہی کو پہنچانے کے لیے تمام مسلمانوں سے فرمایا تھا: سَلِّمُوْا عَلَیْهِ بِاِمْرَةِ الْمُؤْمِنِیْنَ یعنی حضرت علی علیہ السلام کو امیرالمومنین کہہ کر سلام کرو۔ (بحار الانوار ج ۳۷، ص ۱۱۹ منقول از تفسیر قمی ص ۲۷۷۔ ارشاد مفید)

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد لفظ مولا سے دوست اور مددگار ہوتا تو آپ فرماتے کہ انھیں دوست کہہ کر سلام کرو۔ علاوہ ازیں حضرت عمرؓ نے مبارک باد دیتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام سے کہا تھا کہ یا علیؑ! آج سے آپ میرے نیز ہر مومن اور مومنہ کے مولا ہوگئے۔ ان کا یہ قول خود بتاتا ہے کہ یہاں لفظ مولا کے معنی ولایت اور امارت ہے۔

(۴) شیعہ کتابوں کے علاوہ برادران اہلسنت کی معتبر کتابوں میں لکھا ہے کہ سرکار رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیہ بلغ پہنچانے کے بعد جب یہ دعا کی اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ وَانْصُرْ مَنْ نَصَرَهُ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَهُ تو یہ آیت اتری تھی اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا آج ہم نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کردیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کردی اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کرلیا۔ (سورۂ مائدہ: آیت ۳)

(شواہد التنزیل ج ۱، ص ۱۹۳۔ مناقب ابن مغازلی شافعی۔ الغدیر ج ۱)

چنانچہ یہ بات مسلم ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی ولایت اور امامت کا اعلان ہی اکمال دین اور اتمام نعمت کا موجب بنا ہے۔ چنانچہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَللّٰهُ اَكْبَرُ! عَلٰی اِكْمَالِ الدِّیْنِ وَاِتْمَامِ النِّعْمَةِ وَرَضَی الرَّبِّ بِرِسَالَتِیْ وَوِلَایَةِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْطَالِبٍ بَعْدِیْ اللہ اکبر! اکمال دین اور اتمام نعمت نیز میری رسالت اور میرے بعد علیؑ کی ولایت پر پروردگار کے راضی ہونے پر میں اس کا شکر بجا لاتا ہوں۔

(بحار الانوار ج ۳۷، ص ۱۵۶۔ شواہد التنزیل ج ۱، ص ۱۵۷)

(۵) اکمال دین اور اتمام نعمت والی آیت سے قبل ارشاد الٰہی ہے: اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِیْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ یعنی کافر جو تمہارے دین کے نابود ہوجانے کے انتظار میں تھے آج مایوس ہوگئے ہیں۔ پس ان سے نہ ڈرو بلکہ اللہ سے ڈرو اس لیے کہ کافر یہ گمان کررہے تھے کہ رسول خداً کی کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے اس لیے ان کا کوئی جانشین نہیں ہوگا اور ان کے بعد یہ دین خودبخود مٹ جائے گا کیونکہ اس دین کو امیر اور قائد میسر نہیں آئے گا لیکن غدیر خم میں جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین اور امت کا قائد مقرر فرمایا کافروں کا گمان غلط ثابت ہوا اور انھیں معلوم

ہوگیا کہ یہ دین باقی رہنے والا ہے۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ والی آیت اور یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ والی آیت سورۂ مائدہ میں ہیں اور باہم مربوط ہیں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ کلام رسول ﷺ میں لفظ مولا سے حضرت علی علیہ السلام کی ولایت ہی مراد تھی۔

(۶) لفظ مولا کے تمام معانی میں سے صرف اولیٰ بالتصرف ہی اس کا حقیقی معنی ہے جبکہ دوسرے تمام معانی اس کے فروعی اور مجازی مطالب ہیں۔ اس لفظ سے اولیٰ بالتصرف کے سوا کوئی اور معنی مراد ہو تو اس کے لیے اضافت اور قرینے کی قید لازمی ہے۔ علم اصول کے مطابق حقیقی معنی ہمیشہ مجاز پر مقدم سمجھا جاتا ہے اس بنا پر اس حدیث میں لفظ مولا کے معنی صاحب اختیار اور اولیٰ بالتصرف ہیں۔

(۷) جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے غدیر خم کے اس اجتماع کے بعد صحابیٔ رسولؐ حسانؓ بن ثابت نے ایک قصیدہ کہا تھا جس میں انھوں نے لفظ مولا کے معنی کی اس طرح وضاحت کی ہے کہ کسی چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ وہ کہتے ہیں:

فَقَالَ لَهُ قُمْ يَا عَلِيُّ وَ اِنَّنِيْ رَضِيْتُكَ مِنْ بَعْدِيْ اِمَامًا وَهَادِيًا

رسولؐ نے فرمایا اے علیؑ اٹھو! میں نے تم کو اپنے بعد امت کی امامت اور ہدایت کے لیے پسند کرلیا ہے۔

اگر کلام نبیؐ میں مولا کے معنی دوست اور مددگار ہوتے تو آپ یقیناً حسان سے فرماتے کہ میں نے کب کہا ہے کہ علیؑ امام اور ہادی ہیں؟ میں نے تو یہ کہا ہے کہ وہ دوست اور مددگار ہیں مگر ہم جانتے ہیں کہ نبیؐ کریم ﷺ نے نہ صرف ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ ان کو یہ مژدہ سنایا کہ جب تک تم ہماری حمایت میں حق و حقیقت پر مبنی اشعار کہتے رہوگے تمھیں روح القدس کی تائید حاصل رہے گی۔

حسان اور دیگر شعراء نے اس حوالے سے جو اشعار کہے ہیں وہ اہلسنت کی معتبر کتب میں درج ہیں۔

اہلسنت کے بعض انصاف پسند علماء جو اس حوالے سے الجھن کا شکار تھے انھوں نے مجبور ہوکر یہ اعتراف کیا ہے کہ غدیر خم میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا۔ چنانچہ سبط ابن جوزی نے اپنی کتاب ''تذکرہ'' میں اَلَسْتُ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ کو قرینہ تسلیم کرتے ہوئے لفظ مولا سے اولیٰ بالتصرف ہی مراد لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وَھٰذَا نَصٌّ صَرِیْحٌ فِیْ اِثْبَاتِ اِمَامَتِهٖ وَقَبُوْلِ طَاعَتِهٖ یعنی علیؑ کی امامت اور ان کی اطاعت واجب ہونے کے لیے یہ واضح نص ہے۔ (تذکرہ، ابن جوزی، طبع قدیم، باب دوم، ص ۲۰)

# حضرت علی علیہ السلام رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد

## (۱) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت

حجۃ الوداع سے مدینہ واپسی کے بعد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زید بن حارثہ کے فرزند اسامہ بن زید کی سرکردگی میں رومیوں سے جنگ کے لیے ایک لشکر تیار فرمایا اور بڑے بڑے مہاجرین و انصار جیسے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، سعد بن ابی وقاص اور ابوعبیدہ بن جراح وغیرہ کو اس لشکر میں اسامہ کے ساتھ شام جانے کا حکم دیا لیکن جیسا کہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ لوگ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے باوجود جیش اسامہ میں شامل نہیں ہوئے۔ چونکہ آنحضرتؐ جانتے تھے کہ وہ عنقریب اپنے رفیق اعلیٰ سے ملاقات کرنے والے ہیں اس لیے آپ چاہتے تھے کہ غدیر خم میں علیؑ کی ولایت کے اعلان کو مستحکم رکھنے کے لیے مدینہ میں آپ کی وفات کے وقت کوئی شخص ایسا نہ رہے جو اس امر میں اختلاف کرے۔

انہی ایام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیمار ہوگئے۔ ابتدا میں آپ جناب ام سلمہؓ کے گھر میں اور بعد میں جناب عائشہؓ کے گھر میں صاحب فراش رہے۔ مسلمان آپ کی عیادت کے لیے آتے تو رسول خداؐ انھیں نصیحتیں فرماتے خاص کر ان کو اپنی عترت اور قریبی رشتے داروں کے بارے میں وصیت کرتے۔

ایک دن بیماری کی حالت میں آپ نماز پڑھانے مسجد میں تشریف لے گئے تو آپ کی نظر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ پر پڑی۔ آپ نے ان دونوں سے وضاحت طلب فرمائی کہ وہ لشکر اسامہ میں شامل کیوں نہیں ہوئے؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہؐ! میں لشکر میں شامل تھا لیکن آپ کی خیریت پوچھنے واپس آگیا ہوں اور حضرت عمرؓ نے کہا کہ مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ میں مدینہ سے آنے والے سواروں سے آپ کی خیریت پوچھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے قریب رہ کر آپ کی دیکھ بھال کروں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم دونوں لشکر اسامہ میں شامل ہوجاؤ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ یہ حکم دیا مگر یہ حضرات نہیں گئے۔ (ارشاد مفید ج ۱، باب دوم، فصل ۵۲۔ اعلام الوریٰ)

آنحضرت ﷺ کی علالت میں روز بروز شدت آرہی تھی۔ سب مسلمان اس صورتحال سے بہت پریشان تھے۔ ایک دن صحابہ کی ایک جماعت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں موجود تھی کہ آپ نے فرمایا: میرے لیے قلم و دوات لے کر آؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایسی دستاویز لکھ دوں جس سے تم کبھی گمراہ نہ ہوسکو۔[۱] حضرت عمرؓ نے کہا: آنحضرت ﷺ (معاذ اللہ) ہذیان بول رہے ہیں، ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ اس موقع پر حاضرین میں شور وغل بلند ہوا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔ میرے سامنے ہنگامہ آرائی مناسب نہیں۔

(البدایہ والنہایہ ج ۵، ص ۲۲۷۔ تاریخ طبری ج ۲، ص ۴۳۶۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۱۳۳)

---

۱۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں اس واقعے سے متعلق حدیثیں آئی ہیں۔ امام مسلم نے اس واقعے کی روداد **کتاب الوصیة** میں لکھی ہے جبکہ امام بخاری نے اسے **کتاب المغازی** اور **کتاب المرضی** میں لکھا ہے۔ نیز علامہ وحید الزماں اور مولانا عزیز الرحمان نے بھی ان احادیث کے ترجمے کا حق ادا نہ کرتے ہوئے نہایت پھسپھسا ترجمہ کیا ہے۔ اہل علم عربی متن سے ترجمے کا موازنہ کرسکتے ہیں۔ مکتبہ رحمانیہ لاہور کی مطبوعہ صحیح بخاری ج ۲، ص ۶۰۷، کتاب المغازی، باب مرض النبی ووفاته، حدیث رقم ۱۵۵۱ اور ۱۵۵۲ میں ہے کہ

— ابن عباسؓ کہتے تھے: جمعرات کا دن (ہائے) جمعرات کا دن! اسی دن آنحضرت ﷺ کی بیماری سخت ہوگئی۔ آپ نے فرمایا لکھنے کا سامان لاؤ، میں تم کو ایک کتاب (وصیت نامہ) لکھوا جاؤں۔ تم اس پر چلو تو کبھی خراب نہ ہوگے۔ یہ سن کر صحابہ نے جھگڑنا شروع کیا حالانکہ پیغمبرؐ کے سامنے جھگڑا کرنا درست نہیں۔ کوئی کہنے لگا کہ کیا آپ (بیماری کی شدت سے) بڑبڑا رہے ہیں، پھر تو پوچھو اور لگے آپ سے پوچھنے۔ آپ نے فرمایا: جاؤ بھی میں جس کام میں مشغول ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کے لیے تم کہہ رہے ہو اور آپ نے (زبانی) تین باتوں کی وصیت کی، فرمایا: مشرکوں کو عرب کے جزیرے سے باہر کردینا (کوئی مشرک عرب میں نہ رہنے پائے) اور ایلچی لوگوں کی اس طرح خاطر کرنا جس طرح میں کیا کرتا تھا اور تیسری بات ابن عباسؓ نے (یا سعید نے) بیان نہیں کی یا سعید بن جبیر نے (یا سلیمان) نے کہا میں تیسری بات بھول گیا ہوں۔

— ابن عباسؓ نے کہا: جب آنحضرت ﷺ کی وفات ہونے لگی اس وقت گھر میں کئی صحابہ بیٹھے تھے۔ آپ نے فرمایا: ادھر آؤ میں تم کو ایک کتاب (وصیت نامہ) لکھوائے دیتا ہوں۔ تم اس پر چلتے رہو تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ یہ سن کر کوئی (حضرت عمرؓ) کہنے لگے، آنحضرت ﷺ پر تو بیماری کی سختی ہو رہی ہے اور تم لوگوں کے پاس قرآن (اللہ کی کتاب) موجود ہے، ہم کو اللہ کی کتاب بس کرتی ہے۔ اب گھر والوں میں جھگڑا ہونے لگا۔ کوئی کہتا تھا لکھنے کا سامان لاؤ اور کتاب لکھوا لو۔ اچھا ہے تم اس پر چلو تو گمراہ نہ ہوگے کوئی اور کچھ کہتا تھا (کہ کتاب لکھوانے کی ضرورت نہیں)۔ جب جھگڑا بہت ہوگیا، بکواس ہونے لگی تو آپ نے فرمایا: چلو اٹھو، عبید اللہ نے کہا: ابن عباسؓ کہتے تھے، ہائے مصیبت وائے مصیبت، آنحضرت ﷺ کو بک بک اور اختلاف کرکے یہ کتاب لکھوانے نہ دی۔

اسی مکتبہ کی مطبوعہ صحیح بخاری ج ۳، ص ۳۱۵، کتاب المرضی، باب قول المریض قوموا عنی، حدیث رقم ۶۲۹ میں ہے

حضرت عمرؓ کو معلوم تھا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے بارے میں دوبارہ کوئی بات لکھوانا چاہتے ہیں اسی وجہ سے انھوں نے قلم اور دوات لانے سے روکا کیونکہ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے خود اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ میں سمجھ گیا تھا کہ رسول خدا ﷺ حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے بارے میں دستاویز لکھوانا چاہتے ہیں لہٰذا میں نے مصلحت کے تحت ایسا نہیں ہونے دیا۔

(ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۱۳۴)

---

— ابن عباسؓ نے کہا: جب آنحضرت ﷺ کی حالت غیر ہوگئی (وفات کی نوبت آن پہنچی) تو اس وقت کوٹھری میں کئی آدمی بیٹھے ہوئے تھے، ان میں حضرت عمرؓ بھی تھے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: آؤ میں تمہارے لیے ایک وصیت نامہ لکھوں اور جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو، اس پر حضرت عمرؓ (دوسرے حاضرین سے) کہنے لگے آنحضرت ﷺ پر بیماری کی شدت ہے اور تم لوگوں کے پاس عمل کرنے کے لیے قرآن (اللہ کی کتاب) موجود ہے۔ ہم لوگوں کو اللہ کی کتاب کافی ہے۔ کوٹھری میں جو لوگ تھے انھوں نے اس رائے سے اختلاف کیا اور جھگڑنے لگے، کوئی کہتا تھا لکھنے کا سامان لاؤ (دوات، قلم، کاغذ وغیرہ) آنحضرت ﷺ ایک وصیت نامہ لکھوا دیں گے جس کے بعد (اچھا ہے) تم گمراہ نہ ہوگے۔ اور کوئی حضرت عمرؓ کے ساتھ متفق ہوا، (انہی کی رائے دینے لگا) جب بہت گلچپ ہونے لگی اور جھگڑا بڑھ گیا تو آپ نے (ان لوگوں سے جو حجرے میں موجود تھے) فرمایا: چلو اٹھو جاؤ (پیغمبرؐ کے پاس لڑائی جھگڑا مناسب نہیں) عبیداللہ اس حدیث کے راوی کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ (یہ حدیث بیان کرکے) کہا کرتے تھے افسوس صد افسوس ان لوگوں نے گلچپ اور بک بک کرکے آنحضرت ﷺ کو یہ وصیت نامہ لکھوانے نہ دیا۔

مکتبہ رحمانیہ لاہور کی مطبوعہ صحیح مسلم، مترجمہ مولانا عزیز الرحمان ج ۲، ص ۶۰۲، کتاب الوصیۃ، حدیث رقم ۴۲۳۲، ۴۲۳۳، ۴۲۳۴ میں ہے کہ

— حضرت سعید بن جبیرؓ سے روایت ہے کہ ابن عباسؓ نے جمعرات کے دن فرمایا: جمعرات کا دن کیا ہے؟ پھر رو دیئے یہاں تک کہ ان کے آنسوؤں نے کنکریوں کو تر کر دیا۔ میں نے عرض کیا: اے ابن عباسؓ! جمعرات کا دن کیا ہے؟ فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے درد میں شدت ہوئی تو آپ نے فرمایا: میرے پاس (قلم وغیرہ) لاؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایسی کتاب لکھ دوں کہ تم میرے بعد گمراہ نہ ہوگے۔ لوگوں نے جھگڑا کیا حالانکہ نبی کریم ﷺ کے سامنے جھگڑا مناسب نہ تھا اور صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: آپ کا کیا حال ہے، کیا آپ جدا ہو رہے ہیں؟ پھر آپ سے سمجھ لو۔ آپ نے فرمایا: مجھے چھوڑ دو اور جس امر میں میں مشغول ہوں وہ بہتر ہے۔ میں تمھیں تین باتوں کی وصیت کرتا ہوں: مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دو اور وفود کو پورا پورا اسی طرح دو جس طرح میں انھیں پورا پورا ادا کرتا ہوں اور ابن عباسؓ تیسری بات سے خاموش ہوگئے یا آپ نے فرمایا لیکن میں اسے بھول گیا۔

— حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے جمعرات کے دن کہا: جمعرات کا دن کیا ہے؟ پھر ان کے آنسو جاری ہوگئے یہاں تک کہ میں نے آنسو ان کے رخساروں پر موتیوں کی لڑیوں کی طرح دیکھے اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

حضرت عمرؓ کی اس جسارت کے بارے میں یہ سوالات ذہن میں آتے ہیں :

(۱) انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی طرف ہذیان کی نسبت کیونکر دی حالانکہ آنحضرت ﷺ عصمت خداوندی کے تحت ایسی بات سے محفوظ ہیں۔ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے : وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى ۝

(۲) کیا حضرت عمرؓ عوام کی مصلحت کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ بہتر جانتے تھے جس کی وجہ سے انھوں نے لوگوں کو قلم اور دوات پیش کرنے سے روک دیا ؟

حضرت عمرؓ کے اس قول سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ملکوتی اور روحانی

---

میرے پاس ہڈی اور دوات یا تختی اور دوات لاؤ تاکہ میں تمھیں ایسی کتاب لکھ دوں کہ اس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ صحابہؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ (دنیا) چھوڑ رہے ہیں۔

— حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کے وصال کا وقت آیا تو آپ کے گھر میں کئی صحابہؓ موجود تھے۔ ان میں سے عمر بن خطابؓ بھی تھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا : آؤ میں تمھیں ایسی کتاب لکھ دوں کہ تم اس کے بعد گمراہ نہ ہوگے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ پر تکلیف کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس قرآن ہے اور ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے تو اہل بیت میں اختلاف اور جھگڑا ہوا ان میں سے بعض وہ تھے جو کہتے تھے کہ نزدیک کرو (قلم وغیرہ) تاکہ رسول اللہ ﷺ تمہارے لیے ایسی کتاب لکھ دیں کہ اس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہ ہوگے اور ان میں سے بعض نے وہی کہا جو حضرت عمرؓ نے کہا۔ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس بحث اور اختلاف زیادہ ہوگیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : کھڑے ہوجاؤ (چلے جاؤ)۔ عبیداللہ نے کہا کہ ابن عباسؓ کہتے تھے کہ پریشانیوں میں سب سے بڑی پریشانی کی بات جو رسول اللہ ﷺ اور اس کتاب کے لکھنے کے درمیان حائل ہوئی وہ بحث اور اختلاف تھا۔

اہل سنت کی ان دو معتبر ترین کتب احادیث میں مرقوم ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ

— بعض صحابہ نے جن میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کی۔

— انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی بھی خلاف ورزی کی کہ " اے اہل ایمان ! اپنی آوازیں پیغمبرؐ کی آواز سے اونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور زور سے بولتے ہو اس طرح ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو (ایسا نہ ہو) کہ تمہارے اعمال ضائع ہوجائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ " (سورۂ حجرات : آیت ۲)

— کتنے تعجب کی بات ہے کہ ابن عباسؓ جن کے آنسوؤں سے سنگریزے تر ہوگئے اور جن کو اس بات کا قلق تھا کہ رسول اللہ ﷺ اپنی وصیت نہ لکھوا سکے ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ تیسری بات بھول گئے حالانکہ وہ اسی تیسری بات کا رونا رو رہے تھے کیونکہ اس سے پہلی والی دو باتوں میں رونے والی کوئی بات نہیں۔

— روایت کا یہ جملہ کہ " آپ کے گھر میں کئی صحابہ موجود تھے " بھی معنی خیز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ بستر علالت پر تھے اور آپ کے پاس آپ کے سسر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور خاندان کے لوگ تھے۔ (رضوانی)

مقام سے آگاہ نہیں تھے۔ نیز وہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی نافرمانی کے بھی مرتکب ہوئے۔ چنانچہ معروف سنی عالم قطب الدین شافعی شیرازی اپنی کتاب ''کشف الغیوب'' میں لکھتے ہیں:

چونکہ رہنما کے بغیر راستا طے نہیں ہوسکتا اس لیے مجھے حضرت عمرؓ کے اس قول پر حیرت ہے کہ ہمارے لیے قرآن کافی ہے۔ یہ تو ایسی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ ہمارے پاس طب کی کتاب موجود ہے چنانچہ ہمیں کسی طبیب کی ضرورت نہیں؟ بلاشبہ یہ بات غلط اور ناقابل قبول ہے کیونکہ محض طب کی کتاب سے بیماری کا علاج نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے اس علم کے ماہر طبیب کے پاس جانا ضروری ہے۔

قرآن مجید بھی اسی طرح ہے۔ ہر شخص جیسے چاہے اس سے مستفید نہیں ہوسکتا بلکہ ضروری ہے کہ ان اہل علم کی طرف رجوع کیا جائے جو قرآن اور علوم قرآن کے عالم ہیں چنانچہ ارشاد باری ہے: وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ اگر وہ یہ بات رسولؐ اور اپنے صاحبان امر تک پہنچاتے جو اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ ٹھیک نتیجہ اخذ کرسکیں۔

(سورۂ نساء: آیت ۸۳)

حقیقی قرآن تو اہل علم کا سینہ ہی ہے جیسے کہ اس آیت میں ارشاد ہے: بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ بلکہ یہ روشن آیتیں ان لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہیں جن کو علم دیا گیا ہے۔

(سورۂ عنکبوت: آیت ۴۹)

یہی وجہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا: اَنَا كِتَابُ اللهِ النَّاطِقُ وَهٰذَا (هُوَ) الصَّامِتُ میں بولتا قرآن ہوں اور یہ خاموش قرآن ہے۔ (شب ہائے پشاور، ص ۶۶۷)

بہرحال رسول خدا ﷺ کا مرض شدت اختیار کرتا چلا گیا یہاں تک کہ ۲۸ رصفر یا ۱۲ رربیع الاول ۱۱ھ کو آپ ایک مجاہدانہ زندگی گزارنے کے بعد ۶۳ سال کی عمر میں دار بقا کی طرف کوچ فرما گئے۔

حضرت علی علیہ السلام نے ابن عباسؓ اور دیگر بنی ہاشم کے ساتھ مل کر آپ کے جسد مبارک کے غسل و کفن دینے کے بعد اسی مقام پر سپرد خاک کیا جہاں آپ نے رحلت فرمائی تھی۔

# (۲) سقیفہ کا جھگڑا

جب حضرت علی علیہ السلام اور بنی ہاشم کے چند افراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غسل وکفن دینے میں مصروف تھے عین اسی وقت مہاجرین و انصار کے کچھ افراد مدینہ کے اندر قبیلۂ بنی ساعدہ کے باغ میں ایک سائبان کے نیچے جمع ہوئے۔ اس جگہ کو جسے اس وقت تک کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی مگر اس اجتماع کے بعد یہ جگہ مسلمانوں کی تاریخ کا دھارا بدلنے کا باعث بنی۔

ثابت بن قیس انصار کا مانا ہوا خطیب تھا۔ وہ سعد بن عبادہ اور قبیلۂ اوس اور قبیلۂ خزرج کے چند معززین کے ساتھ سقیفہ بنی ساعدہ پہنچا جہاں دونوں قبائل میں خلیفہ کے انتخاب پر اختلاف ہوگیا جس کے نتیجے میں خلافت مہاجرین کے ہاتھ آ گئی۔ کسی مہاجر نے جاکر حضرت عمرؓ کو انصار کے اس اجتماع کی اطلاع دی۔ انھوں نے فوراً یہ خبر حضرت ابوبکرؓ تک پہنچائی۔ حضرت ابوبکرؓ نے ابو عبیدہ جرّاح کو بھی بلا بھیجا۔ پھر یہ تینوں صاحبان چند افراد کو لے کر سقیفہ پہنچے۔ اس وقت انصار کی ایک جماعت زمانۂ جاہلیت کی رسم کے مطابق سعد بن عبادہ کی تعریفیں کر رہی تھی۔ (ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۱۴۲)

سقیفہ چونکہ اہلسنت کی جنم بھومی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کچھ تفصیل بیان کردی جائے تاکہ اصل موضوع کو سمجھنے میں آسانی رہے۔

اس اجتماع کے نمایاں افراد میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، ابو عبیدہ بن جراح، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن عبادہ، ثابت بن قیس، حارث بن ہشام، حسان بن ثابت، بشر بن سعد، حباب بن منذر، مغیرہ بن شعبہ اور اسید بن حضیر شامل تھے۔

جب حضرت ابوبکرؓ دیگر مہاجرین کے ساتھ وہاں پہنچے تو ثابت بن قیس نے خطاب کرتے ہوئے کہا: ہمارے نبیؐ جو بہترین نبیؐ اور اللہ کی رحمت تھے ہمارے درمیان سے اٹھ گئے ہیں اس لیے ضروری ہوگیا ہے کہ ہم اپنے لیے ایک خلیفہ چن لیں۔ یہ خلیفہ انصار میں سے ہونا چاہیے کیونکہ انصار کو رسول خداؐ

کی خدمت کے لحاظ سے مہاجرین پر برتری حاصل ہے۔ رسول خدا ﷺ پہلے مکہ میں تھے۔ آپ کے لوگوں نے ان کے معجزات دیکھنے کے باوجود جب ان کو اذیتیں دیں تو رسول خدا ﷺ کو مجبوراً ہجرت کرنا پڑی لیکن جب انھوں نے مدینہ میں قدم رنجا فرمایا تو ہم انصار نے ان کا والہانہ استقبال کیا۔ رسول خداؐ کی حمایت کرتے ہوئے ہم نے اپنے شہر اور گھروں کو آپ مہاجرین کے حوالے کردیا۔ قرآن اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ اگر اس استدلال کے بارے میں آپ مہاجرین کے پاس کوئی اعتراض ہو تو پیش کریں اور اگر ایسا نہیں تو پھر ہماری قربانیوں اور برتری کو تسلیم کرلیں اور ہمارے درمیان اتحاد اور اخوت کا جو رشتہ قائم ہے اسے ٹوٹنے نہ دیں۔

حضرت عمرؓ اس گفتگو کو سننے کے بعد شدید غصے کے عالم میں اٹھے۔ وہ ثابت بن قیس کو جواب دینا چاہتے تھے مگر حضرت ابوبکرؓ نے ان کو روک دیا اور خود جواب دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور بولے اے فرزند قیس! خدا تم پر اپنی رحمت نازل کرے۔ تم نے جو کچھ کہا وہ سچ ہے اور ہم سب تمہارے خیالات سے اتفاق کرتے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے فضائل بھی فراموش نہ کرو اور مہاجرین کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو یاد رکھو۔ اگر تم لوگوں نے ہمیں پناہ دی تو ہم بھی رسول اللہؐ اور دین خدا کی خاطر اپنے گھر بار چھوڑ کر تمہارے شہر میں آئے تھے چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ یہ بے سروسامان مہاجرین جنھوں نے اللہ کے لیے اپنے مال و متاع اور گھر بار کو چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسولؐ کی مدد کی یہی لوگ سچے ہیں۔ (سورۂ حشر: آیت ۸) اس بنا پر اللہ بھی یہی چاہتا ہے کہ تم انصار ہمارے تابع بن کر رہو۔ علاوہ ازیں عرب، قریش کے سوا کسی کے سامنے سر نہیں جھکائیں گے اور خود رسول اللہ ﷺ نے سب لوگوں کو قریش کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے: اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ[1] میں اگر تمھیں قریش کی اطاعت کے لیے کہہ رہا ہوں تو میرا مقصد خلافت پر قبضہ کرنا نہیں بلکہ میں تمام مسلمانوں کے مفاد اور مصلحت کے لیے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ اس وقت حضرت عمرؓ اور ابوعبیدہ دونوں تمہارے درمیان موجود ہیں۔ تم ان میں سے جس کی چاہو

---

۱۔ یہ حدیث بارہ اماموں کے بارے میں ہے۔ اس کا خلافت ابوبکرؓ سے کوئی تعلق نہیں۔
رسول اکرم ﷺ کی حدیث مبارکہ ہے: ''خلافت اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک ان میں بارہ خلفاء گزر نہ جائیں۔'' نیز یہ کہ ''دین ہمیشہ قائم و باقی رہے گا یہاں تک کہ قیامت قائم ہوجائے یا تم پر بارہ خلفاء حاکم ہوجائیں اور وہ سب کے سب قریش سے ہوں۔'' (صحیح مسلم ج ۳، رقم ۴۷۰۵ تا ۴۷۱۱، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور) رضوانی

بیعت کرلو۔

ثابت بن قیس نے جب یہ گفتگو سنی تو مہاجرین سے کہا: کیا آپ لوگ بیعت کے متعلق ابوبکر کے خیال سے متفق ہیں یا آپ ابوبکر کو ہی خلافت کے لیے منتخب کرتے ہیں؟ مہاجرین نے مل کر جواب دیا کہ ابوبکر جو بات کہیں گے اور جو رائے دیں گے ہمیں قبول ہے۔

یہ سن کر ثابت بن قیس نے کہا: آپ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوبکرؓ کو مسلمانوں کا خلیفہ بنایا تھا اور اپنی علالت کے ایام میں ابوبکرؓ کو مسجد میں نماز پڑھانے کے لیے بھیجا تھا۔ اگر یہ بات درست ہے تو ابوبکرؓ نے کسی شرعی جواز کے بغیر رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے خلافت عمر اور ابوعبیدہ کو کیوں پیش کی؟ اور اگر رسول اللہ ﷺ نے انھیں اپنا خلیفہ نہیں بنایا تھا تو وہ کیوں رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ باندھ رہے ہیں۔

ثابت بن قیس نے جب یہ جواب دیا اور مہاجرین کا دباؤ قبول نہیں کیا تو انصار کا حوصلہ بڑھ گیا اور انھوں نے اپنی بات پر اصرار جاری رکھا۔ گروہ انصار میں سے حباب بن منذر نے اٹھ کر کہا: انصار کی خدمات سب پر واضح ہیں، ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اگر مہاجرین ہمیں قبول نہیں کرتے تو ہم ان کی پیروی نہیں کریں گے۔ اس صورت میں مِنَّا اَمِيْرٌ وَمِنْكُمْ اَمِيْرٌ ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر تم میں سے مقرر کرنا پڑے گا۔ قبیلۂ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ نے زور دے کر کہا کہ ایک دین اور ایک حکومت میں دو امیروں کا تقرر معقول نہیں ہے۔ یہیں سے انصار کے دونوں قبیلوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوا۔ بشر بن سعد اور قبیلۂ اوس نے سعد بن عبادہ کو امیر بننے سے روکنے کے لیے مہاجرین کی حمایت کردی مگر قبیلۂ خزرج کے افراد بھی ڈٹ گئے۔ اس طرح ماحول کشیدہ ہوگیا اور انصار کے درمیان تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہوا اور تلواریں بے نیام کرنے کے لیے ہاتھ بڑھے۔ ایک بہت بڑے فساد کے شروع ہونے میں لمحہ بھر کی دیر تھی کہ قبیلۂ اوس کے سردار اُسید بن حضیر نے قبیلۂ خزرج کے ساتھ قطع تعلق کا اعلان کردیا۔

حضرت عمرؓ نے انصار کے اس اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا:

لوگو! بشر بن سعد اور اسید بن حضیر نے اتفاق کیا ہے کہ خلافت کا قریش ہی میں رہنا ضروری ہے تاکہ مختلف عرب قبائل اتفاق و اتحاد سے رہ سکیں جبکہ حباب بن منذر نے دو امیروں کے انتخاب کی جو تجویز دی ہے وہ صحیح نہیں۔ اس سے سوائے فتنہ و فساد کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ

آپ سب لوگ مہاجرین کی اطاعت کریں تا کہ مسلمانوں کے درمیان فتنہ و فساد کی بجائے وحدت و اتحاد کی راہ ہموار کی جائے۔

حضرت عمرؓ کی تقریر نیز قبیلہ اوس اور خزرج کے باہمی اختلافات کی وجہ سے انصار کے حوصلے پست جبکہ مہاجرین کے حوصلے بلند ہوگئے۔ اس کے باوجود انصار کے چند افراد یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ اے گروہ انصار! عمر کی باتوں سے ہرگز متاثر نہ ہونا۔

حضرت عمرؓ نے ایک بار پھر مہاجرین کی فضیلت بیان کی اور حضرت ابوبکرؓ کا ہاتھ پکڑ کر انصار سے کہا: لوگو! یہ ہیں رسول اللہؐ کے یار غار اور صاحب اسرار! ان کی بیعت میں سبقت کرو تا کہ خدا و رسولؐ کی خوشنودی حاصل کرسکو۔ انصار کے کچھ افراد نے بھی (جو سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنانا نہیں چاہتے تھے) اپنی قوم سے کہا کہ عمرؓ نے انصاف کی بات کی ہے اس لیے ان کی مخالفت مناسب نہیں۔ اس موقع پر انصار کو یقین ہوگیا کہ اقتدار کا ہما مہاجرین کے سروں پر بیٹھ گیا ہے اس لیے ان کی اکثریت نے بیعت کے معاملے میں مہاجرین سے اتفاق کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔[1]

## اختلاف کا انجام

حضرت عمرؓ نے مزید بات کرنا مناسب نہ جانا اور حضرت ابوبکرؓ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: مسلمان آپ کی خلافت پر راضی ہیں اس لیے ہاتھ بڑھایئے تا کہ میں آپ کی بیعت کروں۔ حضرت ابوبکرؓ نے تکلف کا مظاہرہ کیا مگر حضرت عمرؓ نے ان کا ہاتھ کھینچ کر ان کی بیعت کرلی۔ قبیلہ اوس نے قبیلہ خزرج کی مخالفت میں حضرت عمرؓ کی موافقت کرتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی اور یوں یہ اجتماع حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے اعلان اور بیعت کی کارروائی کے بعد برخاست ہوگیا۔ (تاریخ طبری اور دیگر کتب تاریخ)

اہلسنت جس اجماع کا دعویٰ کرتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کو شوریٰ اور تاریخی انقلاب کا نتیجہ سمجھتے ہیں اس میں مدینہ کے قبیلہ خزرج، قبیلہ بنی ہاشم، اکابر صحابہ جیسے سلمانؓ، ابوذرؓ، مقدادؓ، عمارؓ، خزیمہ بن ثابتؓ، سہل بن حنیفؓ، عثمان بن حنیفؓ اور ابو ایوب انصاریؓ وغیرہ شریک نہیں تھے نیز مکہ،

---

۱۔ غدیر خم میں سرکار رسالت ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کی ولایت و امامت کو رضائے خداوندی کا باعث قرار دیا تھا نہ کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کو۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا: اَللّٰهُ اَكْبَرُ عَلٰى اِكْمَالِ الدِّيْنِ وَاِتْمَامِ النِّعْمَةِ وَرِضَى الرَّبِّ بِرِسَالَتِيْ وَوِلَايَةِ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ بَعْدِيْ۔ ابھی اعلان غدیر کو ستر روز سے زیادہ نہیں ہوئے تھے کہ اصحاب سقیفہ نے اس اعلان رسولؐ کو بھلا دیا۔

یمن، نجران اور صحرائی علاقوں کے بدو مسلمانوں کو اس شوریٰ کی مطلق خبر نہ تھی۔

حضرت عمرؓ نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر لوگوں کو حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی دعوت دینی شروع کردی۔ سقیفہ سے نکلنے کے بعد وہ کوچہ و بازار میں جا کر لوگوں کو مسجد نبوی بھجوا رہے تھے تا کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرسکیں۔ بے خبر لوگ آہستہ آہستہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس جا کر ان کی بیعت کرنے لگے۔

حضرت ابوبکرؓ مسجد کے منبر پر گئے اور کہا: لوگو! میری خلافت تم لوگوں پر میری فضیلت کی دلیل نہیں ہے۔ میں تم لوگوں سے بزرگ تو ہوں مگر بہتر نہیں۔ مجھے ہر کام میں تم لوگوں کے مشورے اور مدد کی ضرورت ہے۔ میں سنت رسولؐ پر عمل کروں گا۔ اگر تم دیکھو کہ میں سیدھی راہ سے منحرف ہوگیا ہوں تو تم مجھے ہٹا کر کسی دوسرے کی بیعت کرسکتے ہو اور اگر میں انصاف سے کام لوں تو تم میری حمایت جاری رکھنا۔

قاعدۂ علیت کے مطابق ہر علت ایک معلول کو جنم دیتی ہے نیز علت اور معلول کے درمیان مشابہت بھی ہوتی ہے چنانچہ غلط بنیاد سے کبھی بھی صحیح نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کیونکہ

خشت اول چون نہد معمار کج

تا ثریا می رود دیوار کج

یہی وجہ ہے کہ سقیفہ کا جھگڑا پیکر اسلام پر ایک ایسی کاری ضرب لگا گیا کہ بعد میں رونما ہونے والے واقعات کا اصل سبب یہی تھا۔ حضرت علی علیہ السلام کی مشکلات جو آپ کی شہادت کا باعث بنیں، واقعہ کربلا، اہلبیتؑ کا قیدی بنایا جانا اور اسی طرح کے دیگر تمام سانحات کی بنیادی علت سقیفہ کا اجتماع تھا۔

حجۃ الاسلام نیر نے کہا ہے:

آنکہ طرح بیعت شوریٰ فکند    خود ہمانجا طرح عاشورا فکند

جس نے شوریٰ کے ذریعے بیعت کا منصوبہ بنایا تھا اس نے اسی جگہ عاشورا کی بنیاد رکھدی تھی۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

دانی چہ روز دختر زہراؑ اسیر شد    روزی کہ طرح بیعت منا امیر شد

جانتے ہو حضرت زہراؑ کی بیٹی کس دن قیدی بنائی گئی؟ اسی دن جب مِنّا امیر کی آواز بلند کر کے بیعت لی گئی تھی۔

# (۳) خلافت ابوبکرؓ

حضرت علی علیہ السلام ابھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غسل وکفن سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ کسی نے آکر کہا: یا علیؑ! جلدی کیجیے۔ مسلمان سقیفہ میں خلیفہ کے انتخاب کے لیے جمع ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: سبحان اللہ! یہ لوگ کیسے مسلمان ہیں کہ ابھی حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جنازہ دفن نہیں ہوا اور انھیں جاہ و ریاست کی فکر لے ڈوبی ہے؟ ابھی حضرت علی علیہ السلام کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک اور شخص نے آکر بتایا کہ خلافت کا معاملہ طے پا گیا ہے، شروع میں مہاجرین و انصار میں اختلاف ہوا مگر آخرکار ابوبکر کو خلیفہ چن لیا گیا ہے اور چند خزرجیوں کے علاوہ باقی سب نے ان کی بیعت کرلی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے پوچھا: انصار نے اپنے حق میں کیا دلیل دی تھی؟ اس نے کہا کہ نبوت چونکہ قریش میں تھی اس لیے اب خلافت انصار کے پاس ہونی چاہیے۔ اس ضمن میں انھوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مہاجرین کی حمایت اور ان کے لیے اپنے ایثار و فداکاری کو دلیل بنایا۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: مہاجرین، انصار کو قانع کرنے والا جواب کیوں نہیں دے سکے؟

عرض کیا: یا علیؑ! انصار کو قائل کرنے والا جواب کیا ہوسکتا ہے؟

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: کیا انصار بھول گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی بار مہاجرین سے فرمایا تھا کہ وہ انصار کو اپنا بھائی سمجھیں اور ان کی غلطیوں سے درگزر کریں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ سفارش اس امر کی دلیل ہے کہ آپ نے انصار کو مہاجرین کے سپرد کیا ہے اور اگر وہ خلافت کے اہل ہوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے بارے میں وصیت نہ فرماتے بلکہ آپ انھیں مہاجرین کا خیال رکھنے کی تاکید فرماتے۔ اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے پوچھا: مہاجرین نے کیا استدلال پیش کیا تھا؟ آپ کو بتایا گیا کہ باتیں تو بہت ہوئیں مگر مختصر یہ کہ مہاجرین چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نسب سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے

انصار سے کہیں زیادہ خلافت کے حق دار ہیں۔ یہ سن کر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: پھر مہاجرین اپنی بات پر ثابت قدم کیوں نہیں رہے؟ اگر وہ اس لیے خلافت کے حق دار ہیں کہ ان کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے نسب سے ہے تو میں اس شجرۂ نسب کا ثمر ہوں اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سے قرابت خلافت کی دلیل ہے تو میں ہر لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سے قریب ہوں۔

حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے بارے میں کئی آیات اور احادیث موجود ہیں۔ نیز حضرت علی علیہ السلام کا مذکورہ بالا جواب ہی سقیفہ میں جمع ہونے والے مہاجرین و انصار کے استدلال کا رد کرنے کیلئے کافی ہے۔

بہرحال حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ کا جنازہ سپرد خاک بھی نہیں ہوا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بن گئے لیکن درحقیقت ان کی خلافت پوری طرح مضبوط نہیں ہوئی تھی کیونکہ ابھی انصار اور دیگر قبائل خصوصاً بنی ہاشم کے سربرآوردہ افراد نے ان کی بیعت نہیں کی تھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا: بہتر ہوگا کہ عباس بن عبدالمطلبؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے چچا اور بنی ہاشم کے بزرگ ہیں ان سے ملاقات کی جائے اور انھیں کسی طرح آمادہ کیا جائے کہ وہ حضرت علی علیہ السلام سے علیحدگی اختیار کرلیں۔ حضرت ابوبکرؓ فوراً حضرت عباسؓ سے ملے اور انھیں اعتماد میں لینا چاہا۔ حضرت عباسؓ نے ان سے کہا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کا قریشی ہونا خلافت کی دلیل ہے تو اس صورت میں تم نے ہماری حق تلفی کی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ ہم میں سے تھے اور ہم ہی ان کے قریب ترین رشتے دار ہیں اور اگر تم مسلمانوں کی رائے سے خلیفہ بنے ہو تو بھی ہم امت مسلمہ کا حصہ ہیں اور ہمیں سب مسلمانوں پر فضیلت حاصل ہے اور ہم نے تمھیں مسند خلافت پر فائز ہونے کی اجازت نہیں دی ہے۔ نیز یہ جو وعدے تم مجھ سے کر رہے ہو تو اس حوالے سے سوال یہ ہے کہ اگر یہ ہمارا ہی مال ہے تو تم نے اسے اپنی ملکیت کیونکر سمجھ لیا ہے اور اگر یہ مسلمانوں کا مال ہے تو تمھیں لوگوں کے مال میں تصرف کا حق کس نے دیا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اس سازش سے پوری طرح باخبر تھے۔ آپ دیکھ رہے تھے کہ اصحاب سقیفہ نے سادہ لوح عوام کو اس طرح دھوکا دیا ہے کہ اب وہ حق بات سننے کو تیار ہی نہیں چنانچہ آپ بنی ہاشم اور اصحاب کو اصل صورتحال بتانے کے لیے بی بی فاطمہؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو لے کر ان کے گھروں پر گئے اور ان سے اپنی بیعت کا مطالبہ کیا مگر چند افراد کے سوا کسی نے بھی آپ کا مطالبہ نہ مانا۔[1]

اکثر مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام تین راتوں تک مسلسل صحابہ کے گھروں پر جا کر ان

---

۱۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۱۵۳ پر حضرت علی علیہ السلام کے نام معاویہ کا خط ملاحظہ کیجئے۔

سے اپنی بیعت کا تقاضا کرتے رہے اور اتمام حجت فرماتے رہے مگر انھوں نے آپ کی بات نہیں مانی۔ جب آپ ان سے ناامید ہوگئے تو آپ نے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔

دوسری طرف حضرت عمرؓ مسلسل حضرت ابوبکرؓ کو یہ باور کرا رہے تھے کہ جب تک تم علیؑ سے بیعت نہیں لیتے تمہاری خلافت مستحکم نہیں ہوسکتی اس لیے انھیں طلب کرو اور ان سے بیعت لو تاکہ بنی ہاشم بھی علیؑ کی پیروی میں تمہاری بیعت کریں۔ چنانچہ خلیفہ ابوبکرؓ کے حکم پر خالد بن ولید، عبدالرحمٰن بن عوف، عمر بن خطاب اور چند افراد نے حضرت علی علیہ السلام کے گھر کے دروازے پر پہنچ کر آواز دی کہ ہم خلیفہ کی بیعت کے لیے علیؑ کو لینے آئے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے بیعت سے انکار کردیا۔ خالد بن ولید نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ گھر میں گھس کر علیؑ کو باہر لائیں چنانچہ وہ دروازہ توڑ کر گھر میں داخل ہوگئے۔[1]

زبیر بن عوّام جو اس موقع پر حضرت علی علیہ السلام کے گھر میں موجود تھے تلوار لہراتے ہوئے باہر نکلے اور ان لوگوں کو اس حرکت سے باز رہنے کو کہا مگر دو آدمیوں نے زبیر کو پشت کی طرف سے پکڑ لیا جبکہ باقی لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام کو گھیرے میں لے کر آپ کے بازوؤں میں رسی باندھی اور کھینچ کر ابوبکر کے پاس لے گئے۔ حضرت علی علیہ السلام نے ابوبکر سے فرمایا:

اے پسر ابوقحافہ! یہ کیسا حکم تم نے جاری کیا ہے کہ یہ لوگ مجھے اس طرح یہاں تک لائے ہیں؟

---

۱۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ دروازے کو جلانے کے لیے لکڑیاں لائی جائیں۔ پھر انھوں نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر علیؑ باہر نہ آئے تو ہم گھر کو آگ لگا دیں گے۔ حضرت فاطمہؑ نے دروازے کے عقب میں آکر فرمایا:

اے پسر خطاب! کیا تم ہمارے گھر کو جلانے آئے ہو؟ اس نے کہا: ہاں تاکہ علیؑ باہر آئیں اور خلیفہ کی بیعت کریں۔

(عقد الفرید، ج سوم، ص ۶۳)

حافظ ابراہیم مصری نے اسی حوالے سے حضرت عمرؓ کی تعریف میں یہ اشعار کہے ہیں:

وَکَلِمَۃٌ لِعَلِیٍّ قَالَھَا عُمَر ... اَکْرِمْ بِسَامِعِھَا اَعْظِمْ بِمُلْقِیْھَا

حَرَقْتُ بَیْتَكَ لَا اُبْقِیْ عَلَیْكَ بِھَا ... اِنْ لَمْ تُبَایِعْ وَ بِنْتُ الْمُصْطَفٰی فِیْھَا

مَا کَانَ غَیْرُ اَبِیْ حَفْصٍ بِقَائِلِھَا ... یَوْمًا لِفَارِسِ عَدْنَانَ وَ حَامِیْھَا

ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ عمرؓ کے سوا کسی میں اتنی جرأت کہاں کہ وہ قبیلہ عدنان کے بے مثل شہسوار علیؑ اور ان کے حامیوں سے یہ کہہ سکے کہ اگر تم نے بیعت نہ کی تو میں تمہارے گھر کو آگ لگا دوں گا اگرچہ اس میں بنت رسولؐ ہی کیوں نہ ہو۔

(شب ہائے پشاور)

جبکہ بعض تاریخوں میں ہے کہ خالد بن ولید کے حکم سے دروازہ توڑا گیا اور کچھ افراد گھر کے پچھواڑے سے چھت کے اوپر چڑھے اور پھر گھر میں داخل ہوئے۔ بہرحال جو بات مسلمہ ہے اور جس کی سب نے تصدیق کی ہے وہ یہی ہے حضرت علیؑ کو زبردستی بیعت کے لیے حضرت ابوبکرؓ کے پاس لے جایا گیا۔

کیا خاندان رسولؐ سے ایسا ہی برتاؤ کیا جائے گا؟ کیا تم رسول اکرم ﷺ کے ارشادات بھول گئے ہو؟

اس سے پہلے کہ حضرت ابوبکرؓ کچھ کہتے حضرت عمرؓ نے کہا:

علیؑ! تمھیں اس لیے یہاں لایا گیا ہے کہ تم خلیفہ کی بیعت کرو۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اگر تم لوگ دلیل کے ساتھ بات کرو تو ٹھیک ہے۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ سقیفہ میں تمھیں گروہ انصار پر کیونکر برتری حاصل ہوئی تھی؟

حضرت عمرؓ نے کہا: تمام عرب قبائل پر قریش کی بالادستی، مہاجرین کو انصار پر حاصل برتری اور رسول اللہ ﷺ سے قرابت داری ہمارے مستحق خلافت ہونے کی دلیل ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: میں بھی یہی دلیل تمہارے سامنے رکھتا ہوں اگرچہ میرے پاس اور بھی دلیلیں ہیں۔ اگر تمھیں قرابت رسول ﷺ کی وجہ سے انصار پر تفوق حاصل ہے اور خلافت کا معیار قرابت رسول ﷺ ہے تو سب جانتے ہیں کہ ان سے سب سے قریبی رشتہ میرا ہے، میں ان کا چچا زاد اور داماد ہوں۔ نیز میں ان کے دو فرزندوں حسنؑ و حسینؑ کا باپ ہوں۔ اس استدلال کے رد میں حضرت عمرؓ کے پاس چونکہ کوئی دلیل نہ تھی اس لیے انھوں نے کہا: تم کچھ بھی کہو ہم تم کو اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک تم خلیفہ کی بیعت نہ کرلو۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: بہت خوب! گویا تم دونوں نے ایکا کرلیا ہے کہ آج تم اس کے لیے کام کروگے تاکہ کل وہ خلافت کو تمہارے سپرد کر جائے۔ خدا کی قسم! میں تمہاری بات قبول نہیں کرتا۔ میں ہرگز اس کی بیعت نہیں کروں گا کیونکہ خود اس پر میری بیعت کرنا واجب ہے۔ اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے لوگوں سے فرمایا: اے گروہ مہاجرین! اللہ سے ڈرو۔ خلافت و امامت جسے اللہ نے خانوادۂ رسولؐ کے لیے مختص فرمایا ہے اسے باہر منتقل نہ ہونے دو۔ بخدا! ہم اہلبیت تم سے زیادہ اس منصب کے سزاوار ہیں۔ یہ صرف ہمارا حق ہے۔ تم خواہشات نفس کی پیروی نہ کرو۔ اس طرح تم راہ حق سے دور ہو جاؤ گے۔ اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام بیعت کیے بغیر گھر واپس تشریف لے آئے اور خانہ نشین ہوگئے یہاں تک کہ حضرت فاطمہؑ نے رحلت کی۔ اس کے بعد آپ نے بیعت کرلی۔

## بعض صحابہ کرام کا حضرت ابوبکرؓ پر اعتراض

نبیؐ اکرم ﷺ کی وفات کے پانچ دن بعد چند صحابہ کرام مسجد نبوی میں حضرت ابوبکرؓ کو نصیحت

کرنے گئے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے خدا کی حمد وثنا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فضائل بیان کرنے کے بعد فرمایا: اے ابوبکر! علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے خلافت کو چھین لینا اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی ہے۔ ایک دانا اور عاقبت اندیش آدمی دنیا کی چند روزہ اور جلد گزر جانے والی زندگی کے لیے آخرت کی ابدی زندگی کا سودا نہیں کرتا۔ تم لوگ پچھلی امتوں کی مثالیں سن چکے ہو۔ اس اقدام سے خود تمھیں اور مسلمانوں کو نقصان کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اے ابوبکر! میں اسلام کی مصلحت کے پیش نظر یہ باتیں تم سے کہہ رہا ہوں۔ ان کو قبول کرنا یا نہ کرنا تمہاری صوابدید پر ہے۔

ان کے بعد حضرت سلمان فارسیؓ نے حضرت علی علیہ السلام کے فضائل اور استحقاق خلافت کے بارے میں تقریر کی اور حضرت ابوبکرؓ کو حکومت غصب کرنے سے ڈرایا۔ پھر مہاجرین و انصار سے کہا: تم لوگ مسلمانوں کے بھائی چارے اور باہمی محبت کو نفرت اور کدورت سے مت بدلو اور ہوس اقتدار کی خاطر دین سے نہ کھیلو۔

ان کے بعد خالد بن سعدؓ نے کہا: اے ابوبکر! عمرؓ کی تحریک اور قبیلہ اوس وخزرج کے اختلاف کے نتیجے میں انصار نے تمہاری بیعت کی تھی ورنہ وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ اس طرح کی بیعت کوئی معنی نہیں رکھتی۔

ابو ایوب انصاریؓ، عثمان بن حنیفؓ اور عمار بن یاسرؓ نے بھی کھڑے ہوکر حضرت علی علیہ السلام کی فضیلت اور درخشاں اسلامی خدمات بیان کیں یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت علی علیہ السلام کے حامی صحابہ کی باتوں سے پریشان ہوکر مسجد سے نکلے اور گھر چلے گئے۔ گھر پہنچ کر انھوں نے مسلمانوں کو یہ پیغام بھجوایا کہ اب تمھیں مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں رہی اس لیے تم اپنے لیے کوئی اور خلیفہ منتخب کرلو۔

حضرت عمرؓ نے جب یہ پیغام سنا تو حضرت ابوبکرؓ کو منانے ان کے گھر گئے اور سمجھا بجھا کر دوبارہ مسجد میں لے آئے تاہم موصوف نے حضرت ابوبکرؓ کو لوگوں کے اعتراضات سے بچانے کی خاطر کچھ لوگوں کو حکم دیا کہ وہ ننگی تلواریں ہاتھ میں لے کر حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ ساتھ رہیں اور کسی بھی شخص کو ان سے بحث کرنے کی اجازت نہ دیں۔ حضرت عمرؓ کی اس تدبیر سے ایک بار پھر حضرت ابوبکرؓ کا رعب بڑھ گیا اور کوئی ان سے بحث کی جرأت نہ کرسکا۔

## حضرت ابوبکرؓ سے حضرت علی علیہ السلام کا احتجاج

علامہ طبرسی نے اپنی کتاب احتجاج میں حضرت ابوبکرؓ سے حضرت علی علیہ السلام کے احتجاج کو تفصیل

سے لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ کی بیعت ہوگئی اور خلافت مستحکم ہوگئی تو انھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے تنہائی میں ملاقات کی اور کہا: یا ابا الحسنؑ! خدا کی قسم مجھے اس خلافت سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ میں اس معاملے میں خود کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہوں۔

حضرت علی علیہ السلام نے پوچھا: پھر تم نے خلافت کیوں قبول کی؟ انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہؐ سے سنا تھا کہ میری امت کو خدا گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔ جب میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا میری خلافت پر اجماع ہے تو میں نے قول رسولؐ کی پیروی کرتے ہوئے اسے قبول کرلیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس سے اختلاف کرنے والے بھی موجود ہیں تو میں اسے کبھی قبول نہ کرتا۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: تم نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ خدا میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں فرمائے گا تو بتاؤ کیا میں اس امت میں شامل نہیں ہوں؟[1]

حضرت ابوبکرؓ: کیوں نہیں۔

حضرت علی علیہ السلام: کیا سلمان، ابوذر، مقداد، سعد بن عبادہ اور دیگر انصار جنھوں نے تمہاری خلافت قبول نہیں کی اس امت میں شامل نہیں ہیں؟

حضرت ابوبکرؓ: وہ بھی شامل ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام: پھر کس طرح تم نے حدیث رسولؐ کو اپنی خلافت کی دلیل سمجھا حالانکہ یہ سب تمہاری خلافت کے مخالف ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ: مجھے ان لوگوں کی مخالفت کا علم نہیں تھا۔ جب بیعت ہوچکی تب علم ہوا۔ اس وقت مجھے یہ خوف لاحق ہوا کہ اگر میں نے خلافت چھوڑ دی تو لوگ دین سے منحرف ہوجائیں گے۔

حضرت علی علیہ السلام: یہ بتاؤ کہ خلیفہ میں کیا خصوصیات ہونی چاہئیں؟

حضرت ابوبکرؓ: وہ امت کا خیر خواہ ہو۔ نیک اور باوفا ہو۔ عادل ہو، زاہد ہو، کتاب و سنت کو جانتا ہو، مظلوم کو ظالم سے حق دلانے والا ہو، سابق الاسلام ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرابت رکھتا ہو۔

حضرت علی علیہ السلام: خدا کی قسم کھا کر بتاؤ کہ جو صفات تم نے بیان کی ہیں وہ تم میں ہیں یا مجھ میں؟

حضرت ابوبکرؓ: یا ابا الحسنؑ! آپ میں یہ تمام صفات موجود ہیں۔

---

۱۔ حضرت علی علیہ السلام کا حضرت ابوبکرؓ سے یہ احتجاج منطقی تھا یعنی ان مسلمہ امور کی بنیاد پر جنھیں مخالفین بھی قبول کرتے تھے نیز یہ احتجاج ان کی مذمت کی علامت تھا ورنہ شوریٰ اور اجماع بالفرض تمام مسلمانوں کا ہی ہو تب بھی جانشین رسول کا انتخاب نہیں کرسکتا کیونکہ جس طرح نبی اور رسول کو خدا مقرر کرتا ہے اسی طرح رسول کے جانشین کا تقرر بھی خدا کرتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پہلے تم نے قبول کی تھی یا میں نے؟

حضرت ابوبکرؓ: آپ نے۔

حضرت علی علیہ السلام: سورۂ توبہ مشرکین تک تم نے پہنچائی تھی کہ میں نے؟

حضرت ابوبکرؓ: آپ نے۔

حضرت علی علیہ السلام: شب ہجرت بستر رسولؐ پر تم سوئے تھے یا میں؟

حضرت ابوبکرؓ: آپ۔

حضرت علی علیہ السلام: غدیر خم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے مسلمانوں کا مولا بنایا تھا یا تمھیں؟

حضرت ابوبکرؓ: آپ کو۔

حضرت علی علیہ السلام: آیہ ولایت إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ○ (سورۂ مائدہ: آیت ۵۵) میں خدا و رسولؐ کی ولایت کے ساتھ تمہاری ولایت کا ذکر آیا ہے یا میری؟

حضرت ابوبکرؓ: آپ کی۔

حضرت علی علیہ السلام: حدیث منزلت جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہارونؑ اور موسیٰؑ کی مثال دی ہے میرے بارے میں ہے یا تمہارے بارے میں؟

حضرت ابوبکرؓ: آپ کے بارے میں۔

حضرت علی علیہ السلام: نصاریٰ سے مباہلہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے اور میرے بیوی بچوں کو لے کر گئے تھے یا تمھیں اور تمہارے بیوی بچوں کو؟

حضرت ابوبکرؓ: آپ کو اور آپ کے بیوی بچوں کو۔

حضرت علی علیہ السلام: آیہ تطہیر میری اور میرے اہلبیت کی شان میں اتری ہے یا تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی شان میں؟

حضرت ابوبکرؓ: آپ کی اور آپ کے اہلبیتؑ کی شان میں۔

حضرت علی علیہ السلام: کساء کے نیچے میں اور میرے اہلبیت دعائے پیغمبرؐ کا محور تھے یا تم؟ [1]

---

۱۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فاطمہؑ، علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو اپنے ساتھ کساء (چادر) کے نیچے جمع کیا اور یہ آیت تلاوت فرمائی:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (سورہ احزاب: ۳۳)

(عقد الفرید ج ۴، ص ۳۱۱، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۲ء) رضوانی

حضرت ابوبکرؓ: آپ اور آپ کے اہلبیتؑ۔

حضرت علی علیہ السلام: سورۂ دہر کی آیت یُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ○ میرے بارے میں اتری ہے یا تمہارے بارے میں؟

حضرت ابوبکرؓ: آپ کے بارے میں۔

حضرت علی علیہ السلام: روز احد ہاتف غیبی نے تمھیں لافتی کہا تھا یا مجھے؟

حضرت ابوبکرؓ: آپ کو۔

حضرت علی علیہ السلام: روز خیبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمہارے ہاتھوں میں علم دیا تھا یا میرے ہاتھ میں علم دیا تھا اور خیبر تمہارے ہاتھوں فتح ہوا تھا یا میرے ہاتھوں؟

حضرت ابوبکرؓ: علم آپ کے ہاتھ میں دیا گیا تھا اور خیبر آپ کے ہاتھوں فتح ہوا تھا۔

حضرت علی علیہ السلام: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بیٹی فاطمہؑ کے لیے کسے منتخب کیا تھا مجھ کو یا تم کو؟

حضرت ابوبکرؓ: آپ کو۔

حضرت علی علیہ السلام: حسنؑ و حسینؑ جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یہ جوانان جنت کے سردار ہیں اور ان کا باپ ان سے افضل ہے تو بتاؤ وہ میں ہوں یا تم؟

حضرت ابوبکرؓ: بے شک آپ ہی ان کے باپ ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام: جو اپنے پروں سے فرشتوں کے ساتھ جنت میں پرواز کرتا ہے وہ میرا بھائی ہے یا تمہارا بھائی؟

حضرت ابوبکرؓ: وہ آپ کا بھائی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فیصلہ کرنے میں فصل الخطاب پر دلیل دیتے ہوئے أَقْضَاكُمْ عَلِيٌّ میرے لیے فرمایا تھا یا تمہارے لیے؟

حضرت ابوبکرؓ: آپ کے لیے۔

حضرت علی علیہ السلام: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس کے بارے میں اصحاب کو حکم دیا تھا کہ اسے امیرالمومنین کہہ کر سلام کرو وہ میں تھا یا تم؟

حضرت ابوبکرؓ: آپ۔

حضرت علی علیہ السلام: رشتے داری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میں قریب ہوں یا تم؟

حضرت ابوبکرؓ: آپ۔

حضرت علی علیہ السلام: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے دن بت شکنی کے لیے مجھے اپنے دوش مبارک پر بلند کیا تھا یا تمھیں؟

حضرت ابوبکرؓ: آپ کو۔

حضرت علی علیہ السلام: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا و آخرت میں مجھے اپنا علمدار کہا تھا یا تم کو؟

حضرت ابوبکرؓ: آپ کو۔

حضرت علی علیہ السلام: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد میں تمام صحابہ کے دروازے بند کرانے کے بعد میرے گھر کا دروازہ کھلا رکھا تھا یا تمہارے گھر کا؟

حضرت ابوبکرؓ: آپ کے گھر کا۔

حضرت علی علیہ السلام خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے عطا کردہ فضائل بیان فرما رہے تھے اور حضرت ابوبکرؓ ان کی تصدیق کر رہے تھے چنانچہ اس مکالمے کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

پھر وہ کون سی چیز ہے جس نے تمھیں فریب دیا اور تم نے مسند خلافت سنبھال لی؟

یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ رونے لگے اور بولے:

ابا الحسنؑ! آپ نے بالکل سچ فرمایا۔ مجھے صرف آج کی مہلت دیں تاکہ میں غور و فکر کرسکوں۔

اس کے بعد وہ حضرت علی علیہ السلام سے رخصت ہوئے اور انھوں نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ رات کو انھوں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا تو آگے بڑھ کر سلام کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منہ پھیر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے گھبرا کر پوچھا: یا رسول اللہؐ! کیا مجھ سے کوئی گستاخی ہوگئی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص جسے اللہ اور اس کا رسولؐ دوست رکھتے ہیں تم نے اس سے دشمنی کی ہے۔ حقدار کو اس کا حق لوٹا دو۔ حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا: یا رسول اللہؐ! کس کو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسی کو جس نے تم سے باز پرس کی ہے یعنی علیؑ کو۔ حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وعدہ کرلیا کہ میں یہ منصب انھیں واپس کر دوں گا۔

دوسرے دن علی الصباح وہ حضرت علی علیہ السلام کے پاس آئے اور کہنے لگے: ابا الحسنؑ! اپنا ہاتھ بڑھایئے تاکہ میں آپ کی بیعت کروں۔ پھر جو کچھ انھوں نے خواب میں دیکھا تھا بیان کیا۔ حضرت علیؑ نے اپنا دست مبارک آگے بڑھایا۔ حضرت ابوبکرؓ نے آپ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بیعت کرلی۔

پھر انھوں نے کہا: میں مسجد میں جا کر لوگوں کو اپنے خواب کے علاوہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ کروں گا اور خود اس منصب سے دستبردار ہو کر اسے آپ کے سپرد کر دوں گا۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: ٹھیک ہے۔

جب حضرت ابوبکرؓ حضرت علی علیہ السلام سے مل کر باہر آئے تو ان کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ اپنے آپ کو کوس رہے تھے۔ اس اثنا میں حضرت عمرؓ ان کے پاس آ پہنچے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: اے خلیفہ رسولؐ! یہ آپ کی کیا حالت ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے انھیں تمام ماجرا کہہ سنایا۔ حضرت عمرؓ نے کہا: آپ کو خدا کا واسطہ ہے بنو ہاشم کے سحر سے دھوکا نہ کھایئے اور ان کی باتوں پر یقین مت کیجیے۔ یہ ان کا پہلا جادو نہیں۔ یہ لوگ ایسے کام کرتے رہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کی باتوں میں آ کر حضرت ابوبکرؓ نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور ایک دفعہ پھر منصب خلافت پر قائز رہنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔

(احتجاج طبرسی ج ۱، ص ۱۵۷ تا ۱۸۴)

## فدک غصب کرنا

حضرت ابوبکرؓ کے غلط اقدامات میں سے ایک فدک کی ضبطی تھا۔ فدک مدینہ اور خیبر کے درمیان ایک گاؤں کا نام ہے جو مدینہ کے راستے پر دو منزلوں کے فاصلے پر تھا۔ اس گاؤں کی زمین بڑی زرخیز تھی اور اس میں سرسبز و شاداب نخلستان تھے۔ اس کی پوری آبادی یہودی تھی۔ جب فتح خیبر کے بعد یہودیوں کے دلوں پر اسلام کی ہیبت چھا گئی اور ہر طرف اسلام کا غلغلہ بلند ہوا تو فدک والوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سے صلح کر لی اور گاؤں کا آدھا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کو ہبہ کر دیا جبکہ باقی آدھا حصہ انھوں نے اپنے پاس رکھا۔ چونکہ یہ گاؤں لشکر کشی کے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے ہاتھ آیا تھا اس لیے بفحوائے قرآن یہ رسول اللہؐ کی ذاتی ملکیت قرار پایا جیسا کہ یہ آیت حکایت کرتی ہے **وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ** ۝ یعنی جو مال خدا نے اپنے رسولؐ کو ان لوگوں سے (جنگ کے بغیر) دلوایا ہے اس میں تمہارا کچھ حق نہیں کیونکہ اس کے لیے نہ تم نے گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ لیکن خدا اپنے رسولوں کو جن پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ (سورۂ حشر: آیت ۶)

یہ غنیمت نہیں ہے جس کا خمس اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے ہوتا ہے اور باقی مال رسولؐ اور

ان کی رحلت کے بعد امام کی رائے کے مطابق لشکریوں اور سپہ سالاروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا جان لو کہ جو کچھ بھی تم کو غنیمت ملے (یعنی کفار سے جو کچھ تم انھیں مغلوب کر کے حاصل کرو) پس اس کا پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسولؐ، رسولؐ کے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے اگر تم اللہ اور اس چیز پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے۔ (سورۂ انفال: آیت ۴۱)

جو مال لشکر کشی اور جنگ کے بغیر ہاتھ آئے وہ انفال ہے اور وہ صرف خدا اور اس کے رسولؐ کے لیے مخصوص ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ يَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (اے رسولؐ!) یہ لوگ آپ سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں کہ کیا ہے؟ تو کہہ دیجئے کہ انفال اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے ہے۔ (سورۂ انفال: آیت ۱)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: اَلْاَنْفَالُ مَالَمْ يُوْجَفْ عَلَيْهِ بِخَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ، اَوْ قَوْمٌ صَالَحُوْا، اَوْ قَوْمٌ اَعْطَوْا بِاَيْدِيْهِمْ، وَكُلُّ اَرْضٍ خَرِبَةٍ وَبُطُوْنُ الْاَوْدِيَةِ فَهُوَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَهُوَ لِلْاِمَامِ مِنْ بَعْدِهٖ يَضَعُهٗ حَيْثُ يَشَاءُ یعنی وہ مال انفال ہے جو بغیر جنگ کے یا کافر قوم سے صلح کے ذریعے حاصل ہو یا یہ لوگ خود اپنے ہاتھوں سے دیں۔ اس کے علاوہ غیر آباد زمین اور وادیوں کی گزرگاہیں وغیرہ سب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ کی ملکیت ہیں اور آپ کے بعد امام کو ان پر تصرف حاصل ہوتا ہے وہ جیسے چاہے اسے استعمال کرے۔ (اصول کافی ج ۲، باب الفیء والانفال، ح ۳)

اس بنا پر فدک آیت انفال میں شامل ہے نہ کہ فے اور خمس کی آیت میں کیونکہ فدک کو مسلمانوں نے جنگ کے ذریعے حاصل نہیں کیا تھا بلکہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرمان کے مطابق یہودیوں نے صلح کر کے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کو ہبہ کیا تھا لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ ذاتی طور پر فدک کے مالک تھے۔

تفسیر مجمع البیان اور اصول کافی میں وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ کے ذیل میں لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے اپنی پارۂ جگر حضرت فاطمہؑ کو بلایا اور فرمایا: اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ فدک کو (جو میری ملکیت ہے) تمھیں ہبہ کر دوں۔ حضرت فاطمہؑ نے کہا: یا رسول اللہؐ! میں بھی اسے آپ کی اور اللہ کی طرف سے قبول کرتی ہوں۔

یہ بات اہلسنت کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ تفسیر ثعلبی، شواہد التنزیل اور ینابیع المودۃ میں

لکھا ہے کہ مذکورہ آیت نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فدک حضرت فاطمہ زہراؑ کو دیدیا تھا۔

جب تک رسول اللہ ﷺ بقید حیات رہے فدک حضرت زہراؑ کے زیر تصرف رہا۔ حضرت زہراؑ نے فدک کی زمین کا محصول وصول کرنے کے لیے آدمی مقرر فرمائے تھے اور آپ اس آمدنی کو بنی ہاشم کے علاوہ دیگر غریبوں میں تقسیم فرماتی تھیں لیکن رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد ابوبکرؓ نے حضرت فاطمہؑ کے محصول لینے والوں کو ہٹا دیا اور فدک کو بحق سرکار ضبط کرلیا اور کہا کہ یہ مسلمانوں کا مال ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کا یہ اقدام سراسر انصاف کے منافی تھا اس لیے کہ اول تو فدک کا شمار انفال میں ہوتا تھا اور وہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتی ملکیت تھا، مسلمانوں کا مال نہ تھا۔ دوم یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے حین حیات میں اللہ کے حکم سے اسے بی بی فاطمہؑ کو ہبہ کردیا تھا۔ سوم یہ کہ قانون ملکیت کی رو سے اپنے پدر بزرگوار کی حیات مبارکہ میں ہی فدک بی بی کے زیر تصرف تھا اور آپ نے مسجد نبویؐ میں مہاجرین و انصار کے سامنے حضرت ابوبکرؓ سے اس حوالے سے جو احتجاج کیا تھا وہ ان کے غلط اقدام کا جواب بھی تھا اور اس کی مذمت بھی۔

حضرت ابوبکرؓ نے ایک من گھڑت حدیث پیش کرتے ہوئے کہا تھا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ ہم انبیاء ترکہ نہیں چھوڑتے۔ ہمارا جو بھی مال باقی رہ جائے وہ صدقہ ہے یعنی امت کا مال ہے۔

حضرت زہراؑ نے فرمایا: اے ابوقحافہ کے بیٹے! کیا یہ بات قرآن میں ہے کہ تم اپنے باپ کے وارث بنو لیکن میں اپنے پدر گرامی کی وارث نہیں بن سکتی؟ اگر انبیاء ورثہ نہیں چھوڑتے تو پھر وہ آیات جن میں انبیاء کے ورثاء کا ذکر ہے ان کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ کیا تم میرے پدر گرامی پر بہتان باندھ رہے ہو؟ کیا قرآن میں نہیں کہ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ یعنی سلیمان نے اپنے والد داؤد سے میراث پائی۔ (سورۂ نمل: آیت ۱۶) کیا زکریا کے بارے میں یہ ارشاد نہیں ہے کہ فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ○ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ زکریا نے اللہ سے دعا مانگی کہ اپنی رحمت و قدرت سے مجھے ایک بیٹا عطا فرما جو میرا اور اولاد یعقوب کا وارث بنے۔ (سورۂ مریم: آیت ۵۔۶) اسی طرح اور بھی آیتیں موجود ہیں۔ پس وہ کون سی دلیل ہے جس کی بنا پر تم مجھے میرے پدر نامدار کے ورثے سے محروم رکھنا چاہتے ہو؟ اَفَخَصَّكُمُ اللّٰهُ بِاٰيَةٍ اَخْرَجَ اَبِيْ مِنْهَا اَمْ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِخُصُوْصِ الْقُرْاٰنِ وَعُمُوْمِهٖ مِنْ اَبِيْ وَابْنِ عَمِّيْ کیا اللہ نے میرے بابا سے چھپا کر کسی آیت کو صرف تم پر نازل کیا ہے یا تم میرے بابا اور میرے چچا زاد

(حضرت علیؑ) سے زیادہ قرآن کے خاص و عام کے بارے میں جانتے ہو۔ (احتجاج طبرسی، خطبہ فاطمہ زہراؑ)

اگرچہ حضرت فاطمہؑ نے حضرت ابوبکرؓ اور ان کے ساتھیوں کو اپنی مدلل گفتگو سے سر دربار رسوا کردیا اور ان میں سے کوئی آپ کے استدلال کے جواب میں لب کشائی نہ کرسکا مگر اس کے باوجود آپ کو حق نہیں ملا اور آپ خالی ہاتھ گھر واپس تشریف لائیں اور حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: کاش! آپ موجود ہوتے تو دیکھتے کہ کس طرح میں نے عرب کے ضدی بہادروں کی ناک رگڑ دی ہے؟ کیا آپ اب بھی خاموش رہیں گے تاکہ فدک ان لوگوں کی حرص کی بھینٹ چڑھ جائے۔

حضرت علی علیہ السلام نے بی بی کو صبر کی تلقین کی اور فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کے مطابق خاموش ہوں۔ پھر امام نے بی بی کو تمام معاملات سے تفصیلاً آگاہ فرمایا چنانچہ بی بی کے لیے ان مصائب پر صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کے غم میں شدت آگئی اور آپ اپنے پدر بزرگوار کو یاد کرکے ہر وقت روتی رہتی تھیں۔ بی بی کے درد دل کی شدت کا اندازہ ان کے اس شعر سے لگایا جاسکتا ہے کہ

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبُ لَوْ اَنَّهَا صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

یعنی باباجان! آپ کے بعد مجھ پر وہ مصیبتیں ٹوٹ پڑی ہیں کہ اگر وہ روشن دنوں پر پڑتیں تو وہ تاریک راتوں میں بدل جاتے۔[1]

---

۱۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان کے حجرے میں فرداً فرداً پہلے مردوں پھر عورتوں اور پھر بچوں نے نماز پڑھ لی تو دو یا تین روز کے بعد آپ کو وہیں سپرد خاک کردیا گیا تب حضرت علی علیہ السلام نے آپ کی قبر مطہر پر کھڑے ہوکر فرمایا:

اِنَّ الصَّبْرَ لَجَمِیْلٌ اِلَّا عَنْكَ وَاِنَّ الْجَزَعَ لَقَبِیْحٌ اِلَّا عَلَیْكَ ۔ وَاِنَّ الْمُصَابَ بِكَ لَجَلِیْلٌ ۔ وَاِنَّهُ قَبْلَكَ وَ بَعْدَكَ لَجَلَلٌ

یعنی صبر کرنا اچھی بات ہے مگر آپ کے غم کے سوا اور بے قراری بری بات ہے مگر آپ کی وفات کے سوا اور آپ کی موت عظیم مصیبت ہے اور آپ سے پہلے اور آپ کے بعد آنے والی ہر مصیبت سبک ہے۔ (نہج البلاغہ، کلمات قصار، رقم ۲۹۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوگوار پارۂ جگر جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا جب بعد دفن اپنے پدر گرامی کی قبر مطہر کی زیارت کے لیے تشریف لائیں تو آپ نے ایک مرثیہ پڑھا جس میں آپ نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جدائی کو ایک عظیم مصیبت قرار دیا:

ماذا علی من شم تربة احمد ان لا یشم مدی الزمان غوالیا

صبت علیّ مصائب لو انها صبت علی الایام عدن لیالیا

جو کوئی قبر رسولؐ کی مٹی سونگھ لے پھر وہ عمر بھر کسی اور خوشبو کو سونگھنا گوارا نہ کرے گا۔ باباجان! آپ کے چلے جانے سے مجھ پر وہ مصائب ٹوٹ پڑے ہیں کہ اگر دنوں پر پڑتے تو وہ راتوں میں بدل جاتے۔ (رضوانی)

حقیقت یہ ہے کہ اصحاب سقیفہ کا یہ عمل ناپسندیدہ اور نامناسب تھا کیونکہ ابھی تو حبیب خدا ﷺ کا کفن بھی میلا نہ ہوا تھا۔ انھوں نے آنحضرت ﷺ کے پسماندگان کو تعزیت پیش کرنے کی بجائے ان کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیا حالانکہ عرب کے بدوؤں کو اپنی کوششوں اور قربانیوں کے ذریعے جس نے زمانے کی ترقی یافتہ اقوام پر غلبہ دلایا تھا اس کے اہلبیتؑ اس سلوک کے ہرگز مستحق نہ تھے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: قُلْ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (اے میرے رسولؐ!) ان مسلمانوں سے کہہ دیجئے کہ میں تم سے کار رسالت کا کوئی اجر نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ تم میرے قرابت داروں سے محبت رکھو۔ (سورۂ شوریٰ: آیت ۲۳) لیکن رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے والے اس گروہ نے دختر رسولؐ کے گھر کو نذر آتش کیا اور رسول اللہ ﷺ کی چہیتی بیٹی کو دن رات رونے پر مجبور کیا۔ ایسے میں آپ کی بیماری میں شدت آتی گئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں آپ اس دنیا کو خیر باد کہہ گئیں۔

# (۴) حضرت عمرؓ کی شوریٰ

خلافت کے دو سال چند ماہ بعد جب حضرت ابوبکرؓ بیمار ہو گئے تو انھوں نے اپنی خلافت کو مستحکم کرنے کے حوالے سے حضرت عمرؓ کی کوششوں کا پاس رکھتے ہوئے حضرت عمرؓ کو خلافت سونپنے کا فیصلہ کیا چنانچہ انھوں نے حضرت عمرؓ کی خلافت کی راہ ہموار کرنے کے لیے اور ان کے مخالف اہل قریش کو رام کرنے کے لیے چند اصحاب کو اپنے پاس بلایا اور ان کی موجودگی میں حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین مقرر کردیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات ۱۳ھ میں ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ کی تدفین کے بعد حضرت عمرؓ نے مسجد نبویؐ میں اپنی خلافت کا اعلان کیا اور لوگوں سے کہا کہ وہ ان کی بیعت کریں۔ حضرت علی علیہ السلام کے سوا تمام مسلمانوں نے خواہ نہ خواہ حضرت عمرؓ کی بیعت کرلی۔

حضرت عمرؓ دس سال اور چھ ماہ تک خلیفہ رہے۔ اس دوران دنیا کی دو بڑی سلطنتوں ایران اور روم کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ جب حضرت عمرؓ ابولؤلؤ کے ہاتھ سے زخمی ہوئے اور دیکھا کہ اس کاری زخم سے جانبر ہونا مشکل ہے تو آپ نے انتخاب خلیفہ کے لیے ایک مجلس شوریٰ تشکیل دی جس میں علی ابن ابی طالب، عثمان ابن عفان، عبدالرحمٰن ابن عوف، زبیر ابن عوّام، سعد ابن ابی وقاص اور طلحہ ابن عبیداللہ کو نامزد کیا اور ان پر یہ پابندی عائد کردی کہ وہ ان کے مرنے کے بعد تین دن کے اندر اندر اپنے میں سے ایک کو خلیفہ چن لیں۔ ان ہدایات کے بعد ارکان شوریٰ میں سے کچھ لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ ہمارے متعلق جو خیالات رکھتے ہوں ان کا اظہار فرماتے جائیں تاکہ ان کی روشنی میں قدم اٹھایا جائے۔ اس پر آپ نے فرداً فرداً ہر ایک کے متعلق اظہار رائے فرمایا۔ چنانچہ سعد سے کہا کہ تعصب اور سازش تمہاری گھٹی میں پڑی ہے۔ تم خلافت کے بالکل اہل نہیں ہو۔ اگر ایک قصبے کا انتظام تمہارے حوالے کردیا جائے تو تم اس کا بھی خیال نہیں رکھ سکتے اور عبدالرحمٰن سے کہا کہ تم ایک کمزور آدمی ہو اور زبیر سے کہا کہ تم بداخلاق اور فسادی ہو۔ خوش ہوتے ہو تو مومن اور غصے میں ہوتے ہو تو کافر بن جاتے

ہو۔ الغرض تم ایک دن شیطان ہوتے ہو تو دوسرے دن مہربان ہوتے ہو۔ اور طلحہ سے کہا کہ تم نے رسول اللہؐ کو ناخوش کیا تھا اور اپنی رحلت کے وقت آنحضرت ﷺ تم سے اس بات پر ناراض تھے جو تم نے آیت حجاب کے نزول کے وقت کہی تھی۔[1] اور حضرت عثمانؓ سے کہا کہ حیوانوں کا گوبر تم سے بہتر ہے۔ اگر تم خلیفہ بن گئے تو تم ابی معیط کے خاندان کو عوام پر مسلط کردو گے۔ اس کے بعد انھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا: اگر آپ مزاح کرنے والے نہ ہوتے تو خلافت کے لیے بے حد موزوں تھے۔ واللہ! اگر آپ کے ایمان کا مقابلہ تمام اہل زمین کے ایمان سے کیا جائے تو آپ کے ایمان کا پلڑا سب سے بھاری ہوگا۔ (منتخب التواریخ ص ۱۷۲۔ تاریخ طبری۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱)

حضرت عمرؓ نے ابوطلحہ انصاری سے کہا: جب تم لوگ مجھے دفن کرنے کے بعد واپس آؤ تو انصار کے پچاس آدمیوں کے ساتھ گھر کے باہر شوریٰ کے فیصلے کا تین دن تک انتظار کرنا تاکہ وہ آپس میں مشورہ کرکے اپنے میں سے ایک شخص کو خلیفہ منتخب کرلیں۔ پس اگر تین دن بعد پانچ ارکان کسی ایک خلیفہ پر متفق ہوجائیں تو ٹھیک اور اگر ایک رکن مخالفت کرے تو مخالفت کرنے والے کی گردن مار دینا۔ اگر چار متفق ہوں اور دو مخالفت کریں تو دونوں مخالفین کا سر قلم کردینا لیکن اگر تین ارکان کسی کی حمایت جبکہ تین دیگر اس کی مخالفت میں رائے دیں تو جس طرف عبدالرحمٰن بن عوف ہوں اس شخص کو ترجیح دینا اور دوسری طرف کے تینوں افراد کو قتل کردینا۔ اگر تین دن کے بعد بھی شوریٰ کوئی فیصلہ نہ کرسکے اور ان کے درمیان اختلاف باقی رہے تو ان سب کی گردنیں اڑا دینا اور مسلمانوں سے کہنا کہ وہ خود اپنے لیے خلیفہ چن لیں۔

حضرت عمرؓ نے اس شوریٰ کی تشکیل کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ سرکار رسالت مآب ﷺ اپنی رحلت کے وقت ان حضرات سے راضی تھے اسی لیے میں نے ان کو یہ ذمے داری سونپی ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک کو متفقہ طور پر خلیفہ بنالیں۔

یہاں ہم شوریٰ کی کارکردگی بیان کرنے سے قبل حضرت عمرؓ کی وصیت کے بارے میں گفتگو کریں گے جو تناقضات سے بھری ہوئی ہے۔

(۱) حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور ابوعبیدہ بن جراح کے درمیان جو خفیہ معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے ان افراد کو بالترتیب خلیفہ بنا تھا اسی لیے وفات رسول ﷺ کے بعد تینوں باہمی اتفاق سے فوراً سقیفہ پہنچے

---

۱۔ ابن ابی الحدید کہتے ہیں کہ آیت حجاب نازل ہونے کے بعد طلحہ بن عبیداللہ نے کہا تھا:
آج ازواج رسولؐ کے لیے حجاب کے لازمی ہونے کا کیا فائدہ کیونکہ کل وفات رسولؐ کے بعد ہم ان سے نکاح کرلیں گے چنانچہ اس وقت سورۂ احزاب کی آیت ۵۳ نازل ہوئی جس میں ازواج رسولؐ سے نکاح کرنا ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیا گیا۔

تھے جہاں حضرت ابوبکرؓ اور پھر حضرت عمرؓ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ اب ابوعبیدہ بن جراح کی باری تھی لیکن حضرت عمرؓ کے قتل سے پہلے ہی ان کا انتقال ہوگیا تھا اس لیے حضرت عمرؓ نے ان چھ افراد میں خلافت کو منحصر کردیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر ابوعبیدہ یا حذیفہ کا غلام سالم زندہ ہوتے تو وہ خلافت کے لیے ان لوگوں سے زیادہ سزاوار تھے۔

جب حضرت علی علیہ السلام کو زبردستی حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے لیے مسجد میں لایا گیا تھا تو ابوعبیدہ نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا تھا کہ اگر ہمیں علم ہوتا کہ آپ بھی خلافت میں دلچسپی رکھتے ہیں تو ہم ابوبکر کی بجائے آپ کی بیعت کرتے مگر اب وقت گزر چکا ہے کیونکہ لوگوں نے ابوبکر کی بیعت کرلی ہے۔

اگرچہ ابوعبیدہ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرلی تھی مگر وہ حضرت علی علیہ السلام کو خلافت کا زیادہ حقدار سمجھتا تھا اور اس نے خلافت سے حضرت علی علیہ السلام کی دلچسپی سے لاعلمی کو بہانہ قرار دیا تھا مگر حضرت عمرؓ نے ابوعبیدہ کی موت پر افسوس کرتے ہوئے ابوعبیدہ کو حضرت علی علیہ السلام سے زیادہ خلافت کا حقدار قرار دیا حالانکہ ابوعبیدہ اور سالم دونوں منافقین میں سے تھے اور لیلۃ العقبہ کے واقعے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اونٹ کو دوڑانے میں شریک تھے نیز یہ دونوں ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے جیش اسامہ میں شامل ہونے سے انکار کرکے حکم رسولؐ سے سرتابی کی تھی!

(۲) حضرت عمرؓ کی ناانصافی دیکھیے کہ انھوں نے ایک غلام کو خلافت کے لیے حضرت علی علیہ السلام سے فائق سمجھا اور اس کی موت پر افسوس کیا جبکہ سقیفہ میں انصار سے بحث کے دوران حضرت عمرؓ نے اس حدیث رسولؐ کا حوالہ دیا تھا جو کہ بارہ اماموں کے بارے میں تھی کہ وہ سب قریش سے ہوں گے اور حضرت ابوبکرؓ نے اسی حدیث کو اپنے مفاد میں پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ خلیفہ کا قریشی ہونا ضروری ہے لہٰذا کیسے حضرت عمرؓ نے حذیفہ کے غلام سالم کو خلافت کے قابل سمجھا جبکہ وہ قریشی نہیں تھا۔

(۳) حضرت عمرؓ نے شوریٰ کے چھ ارکان کی خامیوں کو بیان کرتے ہوئے ان میں سے ہر ایک کو صراحتاً یا اشارتاً کہا تھا کہ تم خلافت کے اہل نہیں ہو لہٰذا اس صورت میں ان سے یہ پوچھنا ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ افراد جو خود ان کے بقول خامیوں سے پُر تھے اور ان میں سے کوئی بھی خلافت کا اہل نہ تھا تو انھیں شوریٰ میں شامل کرکے انھی کے صلاح مشورے سے ایک کو خلیفہ منتخب کرنے کی دعوت کیوں دی تھی؟

(۴) حضرت عمرؓ نے ان چھ افراد کے انتخاب کی وجہ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضامندی بتائی مگر طلحہ بن عبید اللہ سے کہا کہ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ناخوش کیا تھا اور رحلت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم

سے ناراض تھے۔ کیا حضرت عمرؓ کی اس گفتگو میں کھلا تضاد نہیں؟

(۵) عبدالرحمٰن بن عوف میں فضیلت کی وہ کون سی بات تھی کہ حضرت عمرؓ نے ان کو امتیازی حیثیت دی اور کہا کہ موافقت اور مخالفت کرنے والوں کی تعداد برابر ہو تو جس طرف عبدالرحمٰن بن عوف ہوں اس گروہ کی رائے صائب ہوگی؟ کیا حقیقت یہ نہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے ان کو دو رائے رکھنے والے فرد کی حیثیت دی تھی اور یہ وہ سازش تھی جسے حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کو خلیفہ بنانے اور حضرت علی علیہ السلام کو قتل کرانے کے لیے تیار کی تھی کیونکہ انھوں نے ایسے لوگوں کو شوریٰ میں شامل کیا تھا جن کی اکثریت حضرت علی علیہ السلام کی مخالف تھی۔

ان چھ افراد میں صرف حضرت علی علیہ السلام اور حضرت عثمانؓ ہی تھے جن کے سروں پر ہمائے خلافت سایہ فگن نظر آتا تھا چنانچہ حضرت عمرؓ نے بھی اسی حقیقت کے پیش نظر عبدالرحمٰن بن عوف کو امتیازی حیثیت دی کیونکہ وہ حضرت عثمانؓ کا داماد تھا اور ان دونوں کے درمیان رشتہ اخوت بھی طے ہوا تھا۔ نیز ان تین افراد کی رائے کو جن میں عبدالرحمٰن شامل ہوتا عثمانؓ کی حمایت کی وجہ سے ہی ترجیح دی تھی۔

اس شوریٰ کے ایک رکن طلحہ کو بنو ہاشم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ عبدالرحمٰن کا گہرا دوست تھا۔ اس صورت میں یہ مسلمہ امر تھا کہ وہ حضرت عثمانؓ ہی کی حمایت کرتا۔ یہی حال سعد بن ابی وقاص کا تھا جو نہ صرف عبدالرحمٰن کی مخالفت نہیں کرسکتا تھا بلکہ اس کی طلحہ سے بھی دوستی تھی۔ اس صورت میں صرف ایک شخص جس سے توقع تھی کہ حضرت علی علیہ السلام کی حمایت کرے گا وہ زبیر تھا جس سے حضرت عمرؓ خوش نہیں تھے چنانچہ نتیجہ یہ نکلتا کہ حضرت علی علیہ السلام اور زبیر قتل کردیے جاتے۔

یہ تو تھا حضرت عمرؓ کی تشکیل کردہ شوریٰ کا مختصر تحقیقی تجزیہ جبکہ اس شوریٰ کی کارکردگی کی تفصیل درج ذیل ہے۔

حضرت عمرؓ کے قتل کے تین دن بعد حضرت عائشہؓ کے گھر میں شوریٰ کا اجلاس شروع ہوا تو گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا کہ مسلمانوں کو تفرقے سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم چھ افراد متفقہ طور پر اپنے میں سے ایک کو خلیفہ چن لیں لہٰذا آپ میں سے ہر ایک اپنی اپنی رائے دے تاکہ کم سے کم اختلاف ہوسکے۔

طلحہ حضرت عثمانؓ کے حق میں اور زبیر حضرت علی علیہ السلام کے حق میں دستبردار ہوگئے جبکہ سعد بن ابی وقاص نے عبدالرحمٰن بن عوف کی حمایت کی۔ اس طرح شوریٰ کمیٹی دو رائے رکھنے والے تین تین افراد

کے گروپ میں بٹ گئی۔ اس صورتحال میں حضرت علی علیہ السلام کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ معاملے کو حضرت عثمانؓ کے مفاد میں ختم کرائیں کیونکہ عبدالرحمٰن ذاتی طور پر خلافت کا امیدوار نہیں تھا۔ اگر اس کے دماغ میں اس طرح کا کوئی خیال موجود تھا تب بھی اس نے اِس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ علاوہ ازیں وہ پہلے ہی حضرت عثمانؓ سے در پردہ اس کی حمایت کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔

عبدالرحمٰن نے ایک دفعہ پھر اراکین شوریٰ کو خبردار کیا کہ وہ اختلاف سے گریز کریں کیونکہ اس شوریٰ میں اختلاف پیدا ہونے کا مطلب ان پچاس افراد کی تلواروں سے قتل ہونا ہے جو گھر کے دروازے پر نگرانی کر رہے ہیں۔

حضرت عثمانؓ نے جو عبدالرحمٰن کے خیالات سے آگاہ تھے حضرت علی علیہ السلام کے سامنے تجویز پیش کی کہ بہتر یہی ہے کہ ہم دونوں بھی عبدالرحمٰن کے حق میں دستبردار ہوجائیں تاکہ وہ مصلحت کے مطابق قدم اٹھائے۔ عبدالرحمٰن نے حضرت عثمانؓ کی اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور قسم کھا کر کہا کہ اسے خلافت کی کوئی طمع نہیں اور میں تم دونوں یعنی عثمانؓ اور علیؑ کے علاوہ خلافت کسی دوسرے کے سپرد نہیں کروں گا۔

حضرت علی علیہ السلام نہایت باریک بینی سے ان دونوں کی گفتگو کا جائزہ لے رہے تھے۔ آپ پر تمام معاملات پہلے سے ہی عیاں تھے اس لیے آپ نے جواب دینے سے گریز کیا۔

حضرت عثمانؓ نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا: اے ابو الحسن! مخالفت کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ حضرت عمرؓ کی وصیت کے مطابق جو کوئی بھی مخالفت کرے گا اس کے لیے قتل ہوجانے کے سوا کوئی چارہ نہیں اس لیے آپ بھی عبدالرحمٰن کو حکم (ثالث) مان لیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اب جبکہ معاملہ تمہارے حق میں جا رہا ہے تم کیوں جلدبازی سے کام لیتے ہوئے مجھے قتل کی دھمکی دے رہے ہو؟ میرے لیے یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ عبدالرحمٰن تمہاری حمایت کرے گا اور حق و مصلحت کے خلاف بولے گا لیکن مجبوراً اس شرط کے ساتھ کہ عبدالرحمٰن تمہارے ساتھ اپنی رشتے داری کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے صرف خدا کی رضا اور امت کی فلاح کو پیش نظر رکھے گا اسے حکم مقرر کرتا ہوں۔ عبدالرحمٰن نے قسم کھا کر کہا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔

عبدالرحمٰن نے مسجد نبویؐ میں لوگوں کو جمع کیا تاکہ مہاجرین اور انصار کی موجودگی میں اپنی رائے کا اعلان کرے مگر اس سے قبل اپنی غیر جانبداری کا مظاہرہ کرنے کے لیے اس نے حضرت علی علیہ السلام کے پاس جا کر کہا: میں یہی مصلحت سمجھتا ہوں کہ آج تمام مسلمان آپ ہی کی بیعت کریں لیکن شرط یہ ہے کہ

آپ خدا و رسولؐ کے احکامات اور سیرت شیخین کے مطابق حکومت چلائیں گے!

عبدالرحمٰن جانتا تھا کہ نہ صرف خلافت بلکہ پوری کائنات بھی اگر علیؑ کو دے دی جائے تب بھی وہ حق اور حقیقت کے منافی کوئی بات قبول نہیں کریں گے اور خدا کی رضا کے خلاف معمولی قدم بھی نہیں اٹھائیں گے لہٰذا شیخین کی سیرت جو حق کے خلاف تھی اس شرط کو حضرت علی علیہ السلام ہرگز قبول نہیں فرما سکتے تھے اسی وجہ سے عبدالرحمٰن چاہتا تھا کہ لوگوں کے سامنے امام سے قول لے کر اسے سند بنا سکے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: میں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور اپنے طریقے کے مطابق جو خدا اور اس کے رسولؐ کی سنت کے تحت ہے عمل کروں گا۔ میں دوسروں کی راہ و روش پر نہیں چل سکتا۔

ادھر عبدالرحمٰن، حضرت عثمان اور دیگر تمام لوگ یہی کچھ سننے کے منتظر تھے کیونکہ سب جانتے تھے کہ حضرت علی علیہ السلام نہ جھوٹی بات زبان پر لاتے ہیں اور نہ ہی راہ حق سے منحرف ہونے والے ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت علی علیہ السلام جنھوں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت کو غاصبانہ قرار دیا تھا اور اپنی حق تلفی کی شکایت بھی کرتے رہے تھے کیونکر ان دونوں کی سیرت پر مہر تصدیق ثبت کر سکتے تھے؟

اس کے بعد عبدالرحمٰن نے حضرت عثمانؓ کے سامنے بھی وہی بات رکھی جو حضرت علی علیہ السلام کے سامنے رکھی تھی۔ حضرت عثمانؓ نے با آواز بلند کہا: میں قسم کھا کر اقرار کرتا ہوں کہ سیرت شیخین کے سوا کسی اور راہ کو اختیار نہیں کروں گا۔[۱]

عبدالرحمٰن نے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کی اور انھیں خلافت کی مبارکباد دی۔ پھر بنو امیہ نے جو اسی موقع کے انتظار میں تھے گروہ در گروہ آکر بیعت کرنا شروع کر دی تاہم بنو ہاشم اور عمار بن یاسرؓ، مقداد بن اسودؓ اور بعض دیگر صحابہ نے بیعت نہیں کی۔ اس طرح عبدالرحمٰن بن عوف نے چالاکی سے خلافت حضرت عثمانؓ کی جھولی میں ڈال دی اور حضرت عمرؓ کا مقصد حاصل ہو گیا جبکہ حضرت علی علیہ السلام اپنی حقیقت پسندی کی بنا پر تیسری مرتبہ بھی اپنے جائز حق سے محروم رہے۔

اس ساری کارروائی کا مقصد جو حضرت عمرؓ کی منشا کے مطابق تھی حضرت عثمانؓ کو خلافت دلانا اور مخالفت کی صورت میں حضرت علی علیہ السلام کو قتل کروانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عبدالرحمٰن کی چال بازی اور مذکورہ شوریٰ کی تشکیل کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا تھا: خُدْعَةٌ وَاَیُّ خُدْعَة دھوکا ہے اور کیسا عجیب

---

۱۔ حضرت علی علیہ السلام نے سیرت شیخین کو سنت رسولؐ کے خلاف ہونے کی بنا پر قبول نہیں کیا تھا۔ کاش! حضرت عثمانؓ بھی انھی کی روش پر چلتے لیکن انھوں نے خلافت لینے کے بعد ایسے ایسے کام کیے جو ان کے قتل کا سبب بنے۔

دھوکا ہے؟ واقعاً حقیقت بھی یہی تھی کیونکہ یہ شوریٰ ایک فریب اور چال کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

امین الاسلام علامہ طبرسی کے مطابق حضرت علی علیہ السلام نے اس شوریٰ میں اپنے فضائل اسی طرح بیان کئے جس طرح حضرت ابوبکرؓ کے سامنے بیان کئے تھے۔ ان ارا کین نے بھی متفقہ طور پر حضرت علیؑ کے بیان کی تصدیق کی۔ اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: خدا سے ڈرو۔ اس کے حکم کی نافرمانی مت کرو۔ حقدار کو اس کا حق دو۔ سنت رسولؐ کی پیروی کو شعار بناؤ کیونکہ اگر تم نے اس کی مخالفت کی تو گویا تم نے خدا کی مخالفت کی۔ اسی لیے خلافت کو اس کے حقیقی حقدار کے سپرد کردو۔ ارکان شوریٰ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کہا: ہم آپ کی فضیلت جان چکے ہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ خلافت کے لیے آپ ہی سب سے زیادہ موزوں ہیں مگر آپ بیت المال کی تقسیم اور دیگر امور میں (اسلامی عدل ومساوات کے قائل ہیں اور) کسی کو بھی عام مسلمانوں پر ترجیح نہیں دیتے اس لیے اگر آپ خلیفہ بن گئے تو ہمیں ان کے برابر حیثیت دی جائے گی جبکہ اگر ہم حضرت عثمانؓ کو خلیفہ منتخب کریں تو وہ ہمارے مفادات کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عثمانؓ کو خلافت کے لیے منتخب کرلیا گیا۔

(احتجاج طبرسی ج ۱، ص ۱۹۲ ۔ ۲۱۰)

# (۵) حضرت علی علیہ السلام کی مشکل کشائی

اگرچہ ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کی پچیس سالہ خلافت کے دوران حضرت علی علیہ السلام گوشہ نشین اور عملی سیاست سے کنارہ کش رہے تاہم آپ خلفائے ثلاثہ کو علمی، عدالتی اور سیاسی مسائل کے حل میں برابر مدد دیتے رہے اور ان کو ان کی غلطیوں سے آگاہ فرماتے رہے۔ چنانچہ یہ سب امام کی رائے مشورے سے استفادہ کرتے تھے۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ خلفائے ثلاثہ نے ذاتی مشکل کے حل میں حضرت علی علیہ السلام ہی سے مدد اور رہنمائی مانگی۔ اگر ان مواقع پر حضرت علی علیہ السلام رہنمائی نہ فرماتے تو اسلام کا علمی پہلو ان خلفاء کی کم علمی کی وجہ سے مخفی رہ جاتا۔ ذیل میں ہم چند ایسے واقعات درج کر رہے ہیں۔

(۱) حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ایک شخص کو شراب نوشی کے الزام میں ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ انھوں نے اس شخص پر حد جاری کر دی۔ اس شخص نے کہا کہ مجھے شراب کی حرمت کا علم نہیں تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں شراب نہ پیتا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ تردد کا شکار ہو گئے اور معاملہ حضرت علی علیہ السلام کے سامنے پیش کیا گیا۔ حضرت نے فرمایا: مہاجرین و انصار کے مجمع میں اس کو بٹھا کر ایک آدمی بلند آواز سے پوچھے کہ کیا کسی نے اس کو شراب کی حرمت کے بارے میں بتایا تھا؟

اگر دو آدمی گواہی دیں کہ اس کو حرمت شراب کا علم تھا تو اس پر حد جاری کی جائے ورنہ اسے چھوڑ دیا جائے چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ایسا ہی کیا مگر کسی نے گواہی نہ دی جس سے پتا چل گیا کہ وہ اپنے دعوے میں سچا تھا لہٰذا اسے تنبیہ کے بعد چھوڑ دیا گیا۔

(۲) ایک یہودی عالم نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا: کیا آپ مسلمانوں کے رسولؐ کے جانشین ہیں؟ انھوں نے کہا: جی ہاں۔ یہودی بولا کہ ہم نے تورات میں پڑھا ہے کہ انبیاءؑ کے جانشین ان کی امت کے سب سے بڑے عالم ہوتے ہیں۔ اگر آپ جانشین رسولؐ ہیں تو مجھے بتائیں کہ اللہ کہاں ہے آسمان میں یا زمین پر؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: وہ آسمان میں عرش پر ہے۔ یہودی نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے

کہ وہ زمین پر نہیں ہے۔ یعنی وہ ایک جگہ ہے اور دوسری جگہ نہیں ہے؟[1]

حضرت ابوبکرؓ نے کہا: یہ زندیقوں اور منکرین خدا کی باتیں ہیں۔ یہاں سے چلا جا ورنہ میں تجھے قتل کردوں گا۔

یہ سن کر یہودی تعجب کرتے ہوئے اٹھا اور اسلام کا مذاق اڑاتا چلا۔ اتفاق سے اسے سامنے سے حضرت علی علیہ السلام آتے دکھائی دیئے۔ آپ نے یہودی سے فرمایا: تونے جو سوال کیا اور تجھے جو جواب ملا مجھے معلوم ہے۔ اب اصلی جواب سن! ہم کہتے ہیں کہ خدائے عزوجل جگہ اور مکان کا خالق ہے مگر خود اس کے لیے کوئی جگہ اور مکان نہیں۔ وہ اس سے کہیں بلند ہے کہ کوئی جگہ اسے گھیرے۔ وہ سمائے بغیر ہر جگہ موجود ہے۔ اس کا علم پوری کائنات پر محیط ہے۔ کوئی جگہ اس سے خالی نہیں اور میں نے جو کچھ کہا ہے اس کے درست ہونے کی تائید میں خود تمہاری کتاب تورات سے ثبوت پیش کرتا ہوں اور اگر تم جان لو کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ درست ہے تو کیا تم ایمان لے آؤ گے؟ یہودی نے کہا: جی ہاں!

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: کیا تم نے اپنی کتاب میں نہیں پڑھا کہ حضرت موسیٰؑ بن عمران ایک دن کہیں بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کے پاس مشرق کی طرف سے ایک فرشتہ آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے پوچھا: کہاں سے آرہے ہو؟ اس نے کہا: اللہ کے پاس سے۔ پھر ان کے پاس مغرب کی سمت سے ایک فرشتہ آیا اس سے بھی انھوں نے پوچھا: کہاں سے آرہے ہو؟ اس نے کہا: اللہ کے پاس سے۔ پھر ایک اور فرشتہ آیا۔ اس نے بتایا کہ میں ساتویں آسمان سے اللہ کے پاس سے آیا ہوں۔ اس کے بعد ایک اور فرشتہ آیا اس نے کہا کہ میں ساتویں زمین سے اللہ کے پاس سے آرہا ہوں۔ یہ سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: پاک ہے وہ ذات جس سے کوئی جگہ خالی نہیں اور اس کے لیے کوئی جگہ دور اور قریب نہیں۔

یہودی نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ کلام برحق ہے اور یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہؐ کی جانشینی کے حقدار اس شخص سے کہیں زیادہ آپ ہیں جو اس وقت اس مسند پر بیٹھا ہے۔

(ارشاد مفید ج ۱، باب دوم، فصل ۵۸)

(۳) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ کی رحلت کے بعد یہودیوں کی ایک جماعت مدینہ آئی۔ انھوں نے کہا کہ اصحاب کہف کے بارے میں قرآن کہتا ہے: **وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا** یعنی اصحاب کہف ۳۰۹ سال تک غار میں سوتے رہے۔ (سورۂ کہف: آیت ۲۵) حالانکہ تورات میں ہے کہ

---

۱۔ یہ جسم کی خاصیت ہے کہ جو جسم ایک جگہ ہو وہ دوسری جگہ نہیں ہوسکتا اور اللہ جسم و جسمانیت سے پاک ہے۔

وہ غار میں تین سو سال تک رہے۔ ان دونوں باتوں میں تضاد ہے۔ ان میں سے صرف ایک بات صحیح ہوسکتی ہے۔

یہودیوں کے اس اعتراض کا نہ صرف خلیفہ بلکہ تمام اصحاب بھی جواب نہ دے سکے چنانچہ حلال مشکلات حضرت علی علیہ السلام سے رجوع کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں۔ یہودیوں کا کیلنڈر شمسی ہے اور مسلمانوں کا کیلنڈر ہجری ہے۔ تورات یہودیوں کی زبان میں نازل ہوئی تھی اور قرآن عربی میں اترا ہے۔ اس طرح تین سو شمسی سال تین سو نو قمری سالوں کے برابر ہیں کیونکہ شمسی سال میں ۳۶۵ دن ہوتے ہیں اور ہجری سال میں ۳۵۴ دن۔ گویا ہر سال میں گیارہ دن اور چھ گھنٹوں کا فرق ہے جس کے نتیجے میں ۳۳ شمسی سال تقریباً ۳۴ قمری سال کے برابر ہوتے ہیں۔ اس حساب سے ۳۰۰ شمسی سال ۳۰۹ ہجری سال ہوئے۔ (منتخب التواریخ ص ۶۹۷ منقول از بحار الانوار)

(۴) ابن شہر آشوب کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے صبح ایک عورت سے نکاح کیا اور اس عورت نے اسی رات ایک بچے کو جنم دیا۔ پھر وہ شخص مرگیا۔ اس طرح ماں، بیٹا اس شخص کے مال کے وارث بن گئے۔ یہ بات کیونکر ممکن ہوسکتی ہے؟

حضرت ابوبکرؓ اس کا جواب نہ دے سکے مگر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: ایسا ممکن ہے۔ اس شخص کی ایک کنیز تھی جو اس سے حاملہ ہوئی تھی۔ جب وضع حمل کا وقت قریب ہوا تو اس نے کنیز کو آزاد کر کے صبح اس سے نکاح کرلیا۔ پھر اسی رات عورت نے بچے کو جنم دیا اور اس کا شوہر مرگیا تو ماں اور بیٹا دونوں اس کی میراث کے مالک بن گئے۔ لوگوں کے ایسے سوالات سے عاجز آتے تو حضرت ابوبکرؓ کہا کرتے تھے کہ اَقِیْلُوْنِیْ وَلَسْتُ بِخَیْرِکُمْ وَعَلِیٌّ فِیْکُمْ یعنی مجھے معاف رکھو۔ میں تم لوگوں سے بہتر نہیں جبکہ تم میں علیؑ موجود ہیں۔

(۵) ایک دفعہ دو آدمی سو دینار کی ایک تھیلی کسی عورت کے پاس یہ کہہ کر رکھوا گئے کہ جب ہم دونوں ایک ساتھ تمہارے پاس آئیں تب یہ امانت ہمیں لوٹا دینا اور اگر ہم میں سے کوئی ایک تمہارے پاس آئے تو اسے امانت ہرگز واپس نہ دینا۔ ایک عرصہ گزرنے کے بعد ان میں سے ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ میرا ساتھی مرگیا ہے لہٰذا تھیلی مجھے دے دو۔ عورت نے امانت واپس کرنے سے انکار کردیا تو وہ شخص اس عورت کے خاندان والوں کے پاس شکایت لے گیا۔ خاندان والوں کے شدید دباؤ کی وجہ سے عورت نے وہ امانت ایک اکیلے آدمی کو واپس کردی۔ ایک سال گزرنے کے بعد دوسرا آدمی اس عورت کے پاس

آیا اور امانت کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ عورت نے اسے بتایا کہ تمہارا ساتھی کچھ عرصہ پہلے آیا تھا اور یہ کہہ کر امانت لے گیا کہ تم مر چکے ہو مگر وہ شخص اپنی امانت واپس لینے پر بضد رہا یہاں تک کہ معاملہ حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا۔ حضرت عمرؓ نے اس عورت سے کہا: امانت تمہارے پاس تھی اس لیے تمھیں اس شخص کو رقم دینی ہوگی۔ عورت نے دہائی دی کہ خدا کے لیے فیصلہ مت کیجیے بلکہ ہمیں حضرت علی علیہ السلام کے پاس بھجوا دیں تاکہ وہ اس قضیہ کا فیصلہ کریں۔ حضرت عمرؓ نے اس کی درخواست قبول کرلی اور وہ دونوں حضرت علیؑ کے پاس پہنچے۔ حضرت علی علیہ السلام نے پورا قصہ سننے کے بعد اس شخص سے فرمایا: کیا تم نے امانت رکھواتے وقت یہ شرط نہیں رکھی تھی کہ جب تم دونوں ایک ساتھ آؤ گے تب امانت واپس کی جائے؟ اس شخص نے کہا: جی ہاں! یہ شرط تھی۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جاؤ اور اپنے ساتھی کو لے آؤ اور اپنی امانت واپس لے جاؤ۔ یہ سن کر وہ نوسرباز سر جھکائے واپس چلا گیا۔ (محب الدین طبری، ذخائر العقبیٰ ص ۷۹۔۸۰)

(۶) ایک پاگل عورت کو زنا کے الزام میں حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا گیا۔ انھوں نے عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علی علیہ السلام بھی وہاں موجود تھے۔ آپ نے حضرت عمرؓ سے کہا: کیا تمھیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ کا فرمان یاد نہیں؟ حضرت عمرؓ نے کہا: کون سا فرمان؟ حضرت علی علیہ السلام نے کہا: رسول خداؐ کا فرمان ہے کہ تین افراد پر حد جاری نہیں ہوتی۔ پاگل پر جب تک اس کی عقل بحال نہ ہوجائے، بچے پر جب تک وہ بالغ نہ ہوجائے اور سوئے ہوئے پر جب تک وہ جاگ نہ جائے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اس عورت کو رہا کر دیا۔ (کشف الغمہ ص ۳۳)

(۷) ایک حاملہ عورت کو زنا کے الزام میں حضرت عمرؓ کے پاس لایا گیا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ کیا تو نے بدکاری کی ہے؟ اس نے اعتراف کیا تو حضرت عمرؓ نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیدیا۔ جب اسے سنگسار کرنے کے لیے لے جایا جا رہا تھا تو حضرت علی علیہ السلام وہاں سے گزر رہے تھے۔ آپ نے پوچھا: اس عورت کو کہاں لے جا رہے ہو؟ بتایا گیا کہ اسے سنگسار کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام اس عورت کو لے کر حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور بولے: کیا تم نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا ہے؟ حضرت عمرؓ نے کہا: جی ہاں! اس نے اعتراف جرم کرلیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: تمہارا یہ حکم اس عورت کے بارے میں ہے لیکن جو بچہ اس کے پیٹ میں ہے اس کے متعلق تم کیا کہو گے؟ پھر آپ نے فرمایا: شاید تم نے اس عورت کو ڈرا دھمکا کر اعتراف جرم کروایا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا: جی ہاں! ایسے ہی ہوا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: کیا تم نے نہیں سنا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا تھا

جس سے ڈرا دھمکا کر اعتراف جرم کرایا جائے اس پر کوئی حد جاری نہیں ہوسکتی۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اس عورت کو چھوڑ دیا اور کہا: عَجَزَتِ النِّسَاءُ اَنْ تَلِدَ مِثْلَ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْطَالِبٍ لَوْ لَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ عورتیں علی بن ابی طالبؑ جیسا فرزند پیدا نہیں کرسکتیں۔ اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہوجاتا۔ (کشف الغمہ ص ۳۳)

(۸) ایک عورت کو حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا گیا جس نے چھ ماہ میں بچے کو جنم دیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے خیال کیا چونکہ زمانہ حمل نو ماہ کا ہوتا ہے اور اس عورت نے ۳ ماہ پہلے بچہ جنا ہے گویا وہ پہلے ہی بدکاری کرچکی تھی اس لیے انھوں نے حکم دیا کہ عورت کو سنگسار کردیا جائے۔ حضرت علی علیہ السلام نے یہ فیصلہ سننے کے بعد فرمایا: اس عورت پر حد جاری نہیں ہوسکتی۔ حضرت عمرؓ نے کسی کو حضرت علی علیہ السلام کے پاس بھیجا اور پوچھا: بتائیں اس عورت پر کیوں حد جاری نہیں ہوسکتی۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: ارشاد اقدس الٰہی ہے وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔ یہ حکم اس آدمی کے لیے ہے جو پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۳۳) اور وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا یعنی حمل اور دودھ پلانے کا عرصہ تیس مہینے ہے۔ (سورۂ احقاف: آیت ۱۵) اس طرح اگر تیس مہینے میں سے دودھ پلانے کے چوبیس مہینے منہا کردیئے جائیں تو حمل کی مدت چھ ماہ بنتی ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے عورت کو رہا کرنے کا حکم دیا اور کہا لَوْ لَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ (کفایۃ الخصام ص ۶۸۰، باب ۳۵۶)

(۹) مناقب ابن شہر آشوب میں ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک مرد اور ایک عورت کو لایا گیا اور بتایا گیا کہ اس مرد نے عورت سے کہا تھا کہ تو زانیہ ہے۔ عورت نے مرد کے جواب میں کہا تو مجھ سے زیادہ زنا کار ہے۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ دونوں پر حد جاری کی جائے۔ حضرت علی علیہ السلام نے جو وہاں موجود تھے فرمایا: فیصلہ دینے میں جلد بازی اچھی بات نہیں نیز تمہارا فیصلہ بھی درست نہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا: پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: مرد کو آزاد کردو اور عورت پر دو حدیں جاری کرو اس لیے کہ مرد کا زنا کار ہونا ایک گواہی سے ثابت نہیں ہوا البتہ عورت نے زنا کا اعتراف کیا ہے کیونکہ اس نے مرد سے کہا تھا کہ تو مجھ سے زیادہ زنا کار ہے۔ لہٰذا عورت پر ایک حد اس لیے ہوگی کہ اس نے زنا کا اقرار کیا ہے اور دوسری حد اس لیے جاری ہوگی کہ اس نے مرد پر زنا کی تہمت لگائی ہے حالانکہ اس کے پاس اپنے دعوے کی سچائی کا کوئی ثبوت نہیں۔

(۱۰) ایک شخص نے کسی کو قتل کردیا تھا۔ مقتول کے ورثاء اس کی شکایت لے کر حضرت عمرؓ کے پاس

آئے۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ قاتل کو گرفتار کر کے مقتول کے باپ کے حوالے کر دیا جائے تا کہ وہ قصاص میں اسے قتل کر دے۔ مقتول کے باپ نے قاتل پر دو شدید ضربیں لگائیں۔ اسے یقین تھا کہ وہ مر جائے گا لیکن ابھی اس میں جان باقی تھی۔ اس کے ورثاء اسے اٹھا کر لے گئے۔ انھوں نے اس کی دیکھ بھال اور علاج معالجہ کیا یہاں تک کہ وہ چھ مہینے میں اچھا ہو گیا۔ مقتول کے باپ نے ایک دن اسے بازار میں دیکھا تو پکڑ کر دوبارہ حضرت عمرؓ کے پاس لایا اور پورا واقعہ سنایا۔ حضرت عمرؓ نے ایک بار پھر حکم دیا کہ قاتل کی گردن اڑا دی جائے۔ قاتل نے حضرت علی علیہ السلام سے داد رسی چاہی۔ حضرت علی علیہ السلام تشریف لائے اور حضرت عمرؓ سے فرمایا: تم نے اس شخص کے بارے میں کیا حکم جاری کیا ہے؟ انھوں نے کہا: ابو الحسنؑ! یہ شخص اس کے بیٹے کا قاتل ہے اور النفس بالنفس جان کے بدلے جان کے قرآنی حکم کے مطابق اس کا قتل کیا جانا ضروری ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: کیا کسی کو دو مرتبہ قتل کیا جا سکتا ہے؟ حضرت عمرؓ سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور وہ خاموش ہو رہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے مقتول کے باپ سے کہا: کیا تم اس شخص کو دو شدید ضربوں کے ذریعے قتل نہیں کر چکے؟ اس شخص نے کہا: ہاں! میں نے اسے اپنے خیال میں قتل تو کر دیا تھا مگر وہ بچ گیا اس لیے اگر میں اسے دوبارہ قتل نہ کروں تو میرے بیٹے کا خون رائیگاں جائے گا۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اس صورت میں لازم ہے کہ پہلے تم دو ضربوں کا قصاص ادا کرو۔ یہ شخص بھی تمھیں دو ضربیں لگائے گا۔ اس کے بعد اگر تم بچ گئے تو اسے قتل کر دینا۔

مقتول کے باپ نے کہا: ابو الحسنؑ! یہ قصاص تو موت سے بھی سخت تر ہے اس لیے میں اسے معاف کرتا ہوں۔ اس کے بعد دونوں نے صلح کر لی۔ تب حضرت عمرؓ نے ہاتھ بلند کر کے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَنْتُمْ اَهْلُ بَيْتِ الرَّحْمَةِ يَا اَبَا الْحَسَنِ۔ ثُمَّ قَالَ لَوْلَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ الحمد للہ: یا ابو الحسنؑ! آپ اہلبیت، رحمت ہیں۔ پھر کہا: اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔ (ناسخ التواریخ، احوال امیر المومنینؑ)

(۱۱) حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں دو عورتوں کے درمیان ایک بچے پر جھگڑا ہوا۔ ان عورتوں میں سے ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ یہ بچہ اسی کا ہے مگر دونوں کے پاس اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے کوئی گواہ نہ تھا۔ اس صورتحال میں حضرت عمرؓ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیونکر فیصلہ کریں۔ آخر کار انھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے مشکل کشائی کی درخواست کی۔ حضرت علی علیہ السلام نے دونوں عورتوں کو بلایا اور انھیں پند و نصیحت کی تا کہ غلط دعویٰ کرنے والی عورت دستبردار ہو جائے مگر وہ دونوں اپنے اپنے موقف پر قائم رہیں۔

یہ دیکھ کر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: آری لائی جائے۔ عورتوں نے پوچھا کہ آری سے آپ کیا کریں گے؟ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: میں بچے کے دو ٹکڑے کر کے تمہارے درمیان تقسیم کر دوں گا۔ یہ سن کر ایک عورت چپ رہی مگر دوسری چلا اٹھی۔ ابوالحسنؑ! آپ کو خدا کا واسطہ! ایسا مت کیجئے۔ میں اپنا حصہ اس عورت کو بخشتی ہوں۔ آپ پورا بچہ اسی کو دیدیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے تکبیر بلند کی اور فرمایا: یہ تمہارا ہی بچہ ہے، اس عورت کا نہیں۔ اگر یہ بچے کی ماں ہوتی تو یہ بھی تڑپ اٹھتی۔ یہ سن کر دوسری عورت نے بھی اعتراف کیا کہ بچہ اس کا نہیں ہے۔ اس طرح حضرت عمرؓ کی مشکل حل ہوئی اور انھوں نے اس حیرت انگیز انصاف پر حضرت علی علیہ السلام کو دعا دی۔ (ارشاد مفید ج ۱، باب دوم، فصل ۵۹)

(۱۲) مناقب میں اصبغ بن نباتہ سے روایت ہے کہ پانچ آدمیوں کو زنا کرنے کے جرم میں حضرت عمرؓ کے پاس لایا گیا تو انھوں نے سب کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: لوگوں کی زندگی کے حوالے سے فیصلہ کرنا آسان بات نہیں۔ اس کے لیے حالات اور کیفیت کی تحقیق لازم ہے۔ چنانچہ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک شخص عیسائی ہے اور اس نے مسلمان عورت کے ساتھ زنا کیا ہے۔ لہٰذا حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کو شخص قتل کردو کیونکہ یہ ذمی ہے اور اس نے اسلامی حکومت کی پناہ میں رہتے ہوئے عہد شکنی کی ہے۔ دوسرے کے متعلق آپ نے فرمایا کہ یہ شخص شادی شدہ ہے اور اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے لہٰذا حکم قرآن کے مطابق اسے سنگسار کردو۔ تیسرے شخص کے متعلق جو غیر شادی شدہ تھا آپ نے فرمایا: اسے ایک سو کوڑے مارے جائیں۔ چوتھے شخص کے بارے میں جو غلام تھا آپ نے فرمایا اسے پچاس کوڑے مارے جائیں کیونکہ غلام کی سزا آزاد شخص کی سزا کا نصف ہے اور پانچویں شخص کے بارے میں فرمایا کہ اسے چھوڑ دیا جائے کیونکہ یہ پاگل ہے۔ یہ فیصلہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا: لَوْلَا عَلِیٌّ لَافْتَضَحْنَا اگر علیؑ نہ ہوتے تو ہم رسوا ہو جاتے۔

(۱۳) یمن کا ایک شخص اپنی بیوی کو یمن میں چھوڑ کر کسی کام سے مدینہ آیا۔ وہاں اس نے ایک عورت کے ساتھ بدکاری کی۔ اسے حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اگرچہ وہ محصن (شادی شدہ) ہے تاہم اس کے لیے سنگسار کئے جانے کا حکم نہیں بلکہ اسے سو کوڑے مارے جائیں کیونکہ اس کی بیوی اس کے ساتھ نہیں لہٰذا اسے غیر شادی شدہ بدکار کی سزا دی جائے۔ اس وقت حضرت عمرؓ نے کہا: لَا اَبْقَانِیَ اللّٰہُ لِمُعْضَلَۃٍ لَمْ یَکُنْ لَھَا اَبُو الْحَسَن خدا مجھے ایسی مشکل کے لیے زندہ نہ رکھے جسے حل کرنے کے لیے علیؑ موجود نہ ہوں۔

(۱۴) ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں رقمطراز ہیں کہ ایک دن عمر بن خطابؓ کے دربار میں خانۂ کعبہ میں موجود زیورات کے متعلق بات چیت ہو رہی تھی۔ ایک گروہ نے کہا کہ اگر ان زیورات کو وہاں سے نکال کر اسلامی لشکر میں تقسیم کر دیا جائے تو اس کا ثواب زیادہ ہوگا کیونکہ خانۂ کعبہ کو زیورات کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ اس حوالے سے شش و پنج میں مبتلا تھے۔ انھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے دریافت کیا کہ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: قرآن میں اموال کی چار قسمیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک مسلمانوں کا ذاتی مال ہے جو کہ ورثاء کے درمیان تقسیم ہوتا ہے۔ دوسرا مال فے ہے جو اس کے مستحقین میں تقسیم ہوتا ہے۔ تیسرا خمس ہے جسے اللہ نے اپنے لیے اور اپنے رسولؐ اور ان کی اولاد کے لیے مخصوص کیا ہے اور چوتھا مال صدقہ ہے جس کا مصرف بھی اللہ نے متعین فرما دیا ہے لیکن خانۂ کعبہ کے زیورات کے بارے میں اللہ نے کچھ نہیں فرمایا۔ ایسا ہرگز نہیں کہ اللہ اسے بھول گیا ہے کیونکہ کوئی چیز اور کوئی جگہ اس سے پوشیدہ نہیں لہٰذا تم بھی ان زیورات کی طرف ہاتھ مت بڑھاؤ اور وہ جہاں ہیں وہیں رہنے دو۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے خانۂ کعبہ کے زیورات کو وہیں رہنے دیا اور کہا: اگر علیؑ نہ ہوتے تو ہم رسوا ہو جاتے۔

(کفایۃ الخصام ص ۶۸۴)

(۱۵) ایران کے خلاف جنگ میں غلبہ حاصل کرنے کے لیے حضرت عمرؓ نے مسلمانوں سے مشورہ مانگا تو ایک گروہ نے کہا کہ شام کے لشکر کو نہاوند بھیجا جائے جبکہ دوسرے گروہ نے کہا کہ حضرت عمرؓ خود لشکر کی قیادت سنبھالیں اور محاذ جنگ پر جائیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا: یا ابا الحسن! آپ ہماری رہنمائی کیوں نہیں فرماتے؟ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: لشکر شام کو بلانا یا آپ کا محاذ پر جانا مناسب نہیں کیونکہ پہلی صورت میں شام جو روم کی سرحد پر واقع ہے لشکر اسلام سے خالی ہو جائے گا اور دوسری صورت میں اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو مسلمانوں کے لیے کوئی پناہ گاہ نہ رہے گی اس لیے آپ خود محاذ پر نہ جائیں بلکہ ایک آزمودہ کار سپہ سالار کو وہاں بھیجیے اور اہل بصرہ کو بھی اپنے بھائیوں کی کمک کے لیے بھیج دیں کیونکہ بصرہ کی صورتحال جنگی اعتبار سے شام جیسی نہیں۔ وہاں سے حسب ضرورت سپاہیوں کی بھرتی ہو سکتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علی علیہ السلام کے مشورے پر عمل کیا اور اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ پھر رومیوں کے ساتھ جنگ میں بھی حضرت علی علیہ السلام نے ان کی رہنمائی فرمائی۔

(ارشاد مفید۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ)

(۱۶) ابن صباغ مالکی **فصول المھمہ** میں لکھتے ہیں کہ ایک شخص کو حضرت عمرؓ کے پاس لایا گیا جو یہ کہتا تھا کہ مجھے فتنہ پسند اور حق ناپسند ہے۔ میں یہود و نصاریٰ کی تصدیق کرتا ہوں۔ جسے میں نے دیکھا نہیں اس پر ایمان رکھتا ہوں اور جو چیز ابھی خلق نہیں ہوئی اس کا اقرار کرتا ہوں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے حضرت علی علیہ السلام کو بلوا بھیجا۔ جب آپ تشریف لائے تو حضرت عمرؓ نے آپ کو اس شخص کے خیالات سے آگاہ کیا۔ آپ نے فرمایا:

وہ سچ کہتا ہے کہ اسے فتنہ پسند ہے کیونکہ اللہ فرماتا ہے: **اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ** یعنی بے شک تمہارا مال اور تمہاری اولاد فتنہ ہے۔ (سورۂ انفال: آیت ۲۸)

حق اسے ناپسند ہے سے اس کی مراد موت ہے کیونکہ اللہ فرماتا ہے: **وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ** اور موت کی مدہوشی حق کے ساتھ آ گئی۔ (سورۂ ق: آیت ۱۹)

یہ جو یہود و نصاریٰ کی تصدیق کرتا ہے تو ٹھیک کرتا ہے کیونکہ اللہ فرماتا ہے: **وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ** یہود کہتے ہیں کہ نصرانیت کی کوئی بنیاد نہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودیت کی کوئی بنیاد نہیں۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۱۱۳)

یہ شخص جسے دیکھے بغیر ایمان لایا ہے وہ باری تعالیٰ کی ذات ہے اور وہ چیز جو ابھی خلق نہیں ہوئی مگر یہ اس کا اقرار کرتا ہے اس سے مراد قیامت ہے۔

یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا: **اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ مُعْضَلَةٍ لَا عَلِيَّ لَهَا** میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس مشکل سے جس کے حل کے لیے علیؑ موجود نہ ہوں۔ (ابن صباغ مالکی، فصول المھمہ ص ۱۸)

اہلسنت مؤرخین اور علماء لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے کئی مواقع پر کہا تھا کہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔ چنانچہ شیخ سلیمان قندوزی اپنی کتاب **ینابیع المودۃ** میں لکھتے ہیں کہ **كَانَتِ الصَّحَابَةُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ يَرْجِعُوْنَ اِلَيْهِ فِيْ اَحْكَامِ الْكِتَابِ وَيَاْخُذُوْنَ عَنْهُ الْفَتَاوٰى كَمَا قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فِيْ عِدَّةِ مَوَاطِنَ لَوْ لَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ** یعنی اصحاب رسولؐ قرآنی احکامات جاننے کے لیے حضرت علی علیہ السلام سے رجوع کرتے تھے اور فتویٰ حاصل کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے کئی مواقع پر کہا تھا کہ اگر علیؑ نہ ہوتے عمر ہلاک ہو جاتا۔ (سلیمان قندوزی، ینابیع المودۃ ص ۷۰، باب ۱۴)

حضرت عثمانؓ بھی اپنے دور خلافت میں علمی اور عدالتی مشکلات کو حل کرنے کے سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام سے مدد لیتے تھے۔ گویا مجموعی طور پر حضرت علی علیہ السلام نے تمام علمی، سیاسی، فقہی اور عدالتی

مشکلات میں اسلام اور مسلمانوں کے بہترین مفاد میں خلفائے ثلاثہ کی رہنمائی فرمائی کیونکہ آپ کا مقصد اسلام کی حفاظت کرنا تھا۔ آپ نے امت کو تفرقہ سے بچانے کے لیے خلفاء کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا البتہ انھیں ان کے غلط اقدامات کے انجام سے خبردار ضرور کرتے رہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے بارہا حضرت عثمانؓ کو نصیحت کی اور انھیں سیدھا راستا دکھایا مگر انھوں نے آپ کی نصیحتوں پر کان نہیں دھرے اور آخرکار مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔

# حضرت علی علیہ السلام کا دور خلافت

## (۱) قتل عثمانؓ کے اسباب

عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے وقت یہ شرط رکھی تھی کہ وہ سنت رسولؐ اور سیرت شیخین پر عمل کریں گے اور انھوں نے اس شرط کو ہنسی خوشی قبول کیا تھا مگر مسند خلافت پر بیٹھنے کے بعد انھوں نے سنت رسولؐ اور سیرت شیخین کے برعکس عمل کیا۔ (مروج الذہب ج ۱، ص ۴۳۵۔ شرح نہج البلاغہ ج ۱)

حضرت عثمانؓ نے بنی امیہ خاص کر ابوسفیان کو مال اور منصب سے خوب نوازا۔ ابوسفیان نے ایک محفل میں جہاں حضرت عثمانؓ نے بنی امیہ کے اکابرین کو مدعو کر رکھا تھا کہا کہ خلافت کو گیند کی طرح اچھالتے رہو لیکن دھیان رکھو کہ وہ بنی امیہ کے سوا کسی اور کے ہاتھوں میں نہ جائے۔ یہ خلافت بھی حکومت ہی ہے اور میں جنت جہنم پر ایمان نہیں رکھتا۔ (الاصابہ ج ۴، ص ۸۸۔ مروج الذہب ج ۱، ص ۴۴۰)

حضرت عثمانؓ نے بیت المال سے اپنے رشتے داروں پر خوب نوازشات کیں۔ حکام اور گورنروں کے لیے باصلاحیت افراد کے بجائے صرف اپنے رشتے داروں کا تقرر کیا۔ مختلف شہروں کے لوگ ان کے مقرر کردہ حکام اور گورنروں کی شکایتیں اصحاب رسولؐ اور خود حضرت عثمانؓ سے کر چکے تھے مگر ان شکایتوں کا ازالہ نہیں کیا گیا۔ انھوں نے اپنی خلاف شریعت روش کو جاری رکھا لہٰذا سول سوسائٹی نے ان کے غلط اقدامات کو روکنے کا فیصلہ کیا اور ان کے مقرر کردہ حکام اور گورنروں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

حضرت عثمانؓ کی بیت المال سے اپنے رشتے داروں پر بے جا نوازشات سے اصحاب رسولؐ میں شدید غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور انھوں نے باہمی مشورے سے فیصلہ کیا کہ پہلے حضرت عثمانؓ اور ان کے تمام حکام کی غلط کاریوں کی فہرست ایک خط کی صورت میں حضرت عثمانؓ کو بھیجی جائے اور اگر اس خط کا کوئی اثر نہ ہو تو پھر ان کو معزول کر دیا جائے۔

یہ خط رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت عمارؓ نے (جن کی کنیت ابو یقظان تھی)

حضرت عثمانؓ کو پہنچایا۔ انھوں نے خط کو پڑھ کر پھینک دیا اور اپنے غلاموں سے کہا کہ وہ حضرت عمارؓ کو زدوکوب کریں چنانچہ غلاموں نے حضرت عمارؓ کو خوب مارا اور خود حضرت عثمانؓ نے بھی ان کے پیٹ پر لاتیں ماریں یہاں تک کہ وہ بیہوش ہوگئے۔ اس مار کی وجہ سے وہ ہرنیا کے مرض میں مبتلا ہوگئے تھے۔

اس واقعے کی خبر جب دوسرے اسلامی شہروں میں پہنچی تو مسلمانوں کی آتش غضب مزید بھڑک اٹھی۔ یہ خبر سن کر حضرت ابوذر غفاریؓ نے جنھیں حضرت عثمانؓ نے جلاوطن کرکے شام بھیج دیا تھا مسلمانوں کے اجتماعات میں کھلم کھلا حضرت عثمانؓ اور ان کے گورنروں کی مذمت شروع کردی۔ انھوں نے مسلمانوں کو حضرت عثمانؓ کے کردار سے آگاہ کیا جو خدا کی مرضی اور سنت رسولؐ بلکہ سیرت شیخین کے بھی صریح خلاف تھا۔

حضرت ابوذرؓ کو شام جلاوطن کرنے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ نے بنی امیہ کو خطیر مال سے نوازا تھا نیز مروان بن حکم اور زید بن ثابت کو ایک لاکھ دینار سے بھی زائد رقم دی تھی۔ حضرت ابوذرؓ کو جب اس بات کا علم ہوا تو آپ حضرت عثمانؓ کے دربار میں گئے[1] اور آپ نے بلند آواز سے اس آیت کی تلاوت کی وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ اور وہ لوگ جو سونا چاندی جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں دردناک عذاب کی بشارت سنا دو۔ (سورۂ توبہ: آیت ۳۴)

حضرت عثمانؓ کو حضرت ابوذرؓ پر سخت غصہ آیا چنانچہ انھوں نے دربار میں موجود لوگوں سے پوچھا: اگر مسلمانوں کے بیت المال میں سے ان کا حاکم کچھ رقم کسی کو بطور قرض دے تو کیا یہ جائز نہیں؟

---

۱۔ یہ واقعہ اس طرح بھی نقل ہوا ہے کہ جب معاویہ نے حضرت ابوذرؓ کو شام سے مدینہ بھیجا تو آپ کو بغیر پالان کے اونٹ پر بٹھایا گیا اور جو لوگ آپ کی نگرانی پر مامور تھے وہ آپ کو اترنے کی اجازت دیے بغیر اونٹ کو بیابانوں میں بھگاتے ہوئے لے آئے۔ اس سختی کی وجہ سے آپ کی رانوں کا گوشت ادھڑ گیا تھا۔ (تاریخ یعقوبی ج ۲، ص ۱۴۹ مطبوعہ نجف، عراق)

حضرت ابوذرؓ اسی زخمی حالت میں دربار خلافت میں وارد ہوئے۔ وہاں عبدالرحمٰن بن عوف کا ترکہ وارثوں میں تقسیم کے لیے لایا گیا تھا جو اتنا زیادہ تھا کہ دربار میں دوسری طرف کھڑا ہوا شخص نظر نہیں آتا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے کہا: میں عبدالرحمٰن کے لیے بھلائی کی امید رکھتا ہوں۔ وہ صدقہ دیتا تھا، مہمان داری کرتا تھا اور جو کچھ تم لوگ دیکھ رہے ہو وہ چھوڑ کر مرا ہے۔

کعب الاحبار نے کہا: یا امیرالمومنین! آپ نے بجا فرمایا۔ حضرت ابوذرؓ نے اسی خستہ حالت میں اپنا عصا کعب کے سر پر مارا اور کہا: اے یہودی کی اولاد! کیا تو ہمیں ہمارا دین سکھائے گا۔ پھر یہ آیت پڑھی وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ○ (مروج الذہب ج ۲، ص ۳۴۰ مطبوعہ بیروت) رضوانی

کعب الاحبار نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت ابوذرؓ نے کعب الاحبار کے سر پر زور سے اپنا عصا مارا اور کہا: یَابْنَ الْیَهُوْدِیَّتَیْنِ اَتُعَلِّمُنَا دِیْنَنَا؟ اے یہودی کی اولاد! کیا تو ہمیں ہمارا دین سکھائے گا؟ اسی وجہ سے حضرت عثمانؓ نے انھیں مدینہ بدر کرکے شام بھجوا دیا۔ حضرت ابوذرؓ شام میں بھی حضرت عثمانؓ اور معاویہ کے خلاف بولتے رہے یہاں تک کہ معاویہ نے مجبور ہوکر حضرت عثمانؓ کو خط لکھا کہ حضرت ابوذرؓ یہاں بھی لوگوں کو تمہارے خلاف اکسانے میں مصروف ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے جواب میں لکھا کہ وہ انھیں بے کجاوہ اونٹ پر رسیوں سے باندھ کر ان کے پاس بھیج دے چنانچہ معاویہ نے ایسے ہی کیا اور ابوذرؓ کو مدینہ بھجوا دیا۔ (منتخب التواریخ ص ۱۷۶)

حضرت ابوذرؓ جب حضرت عثمانؓ کے پاس لائے گئے تو حضرت عثمانؓ نے کہا:

میں نے سنا ہے کہ تم نے شام میں ایک ہنگامہ مچا رکھا تھا۔

حضرت ابوذرؓ: میں نے جو کچھ کیا وہ حق تھا۔

حضرت عثمانؓ: تمھیں ان کاموں سے کیا سروکار ہے؟

حضرت ابوذرؓ: میں ایک مسلمان ہوں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا میرا فرض ہے۔

چونکہ حضرت عثمانؓ میں حضرت ابوذرؓ سے بحث کرنے کی ہمت نہ تھی اس لیے انھوں نے حضرت ابوذرؓ کو مدینہ بدر کرکے ربذہ کے بے آب و گیاہ علاقے میں بھجوا دیا اور مروان کو حکم دیا کہ اس بات کو یقینی بنائے کہ کوئی شخص ابوذرؓ کو الوداع کہنے نہ جائے۔ حکومت کے خوف سے کوئی حضرت ابوذرؓ کو الوداع کہنے نہ نکلا مگر حضرت علی علیہ السلام بنی ہاشم کے چند افراد کے ساتھ حضرت ابوذرؓ کو الوداع کہنے آئے۔ آپ ربذہ میں ایک عرصے تک مقیم رہے اور پھر اسی جگہ بے سروسامانی کے عالم میں دار فانی سے کوچ کر گئے۔

مؤرخین کے مطابق عثمانی گورنر کے مظالم سے تنگ آکر مصریوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور حضرت عثمانؓ پر ہلہ بول دیا۔ حضرت عثمانؓ کو جب خطرے کا احساس ہوا تو انھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے مدد مانگی اور اپنے رویے پر معذرت چاہی۔ حضرت علی علیہ السلام نے اہل مصر سے فرمایا: تم لوگوں نے احیائے حق کے لیے قیام کیا ہے اور عثمانؓ نے اپنی سابقہ روش سے توبہ کرنے کے بعد کہا ہے کہ وہ اپنے ماضی پر پشیمان ہیں اور وہ تین دن کے اندر آپ لوگوں کی خواہش کے مطابق ظالم حکام اور گورنروں کو معزول کردیں گے۔

اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے حضرت عثمانؓ کی طرف سے اہل مصر کے لیے ایک معاہدہ تحریر

کیا جس کے بعد وہ لوگ واپس چلے گئے۔ دوران سفر انھوں نے حضرت عثمانؓ کے غلام کو دیکھا جو اونٹ پر سوار مصر کی طرف جا رہا تھا۔ اہل مصر کو اس کے متعلق شک ہوا، انھوں نے اس کی تلاشی لی تو اس کے پاس سے گورنر مصر کے نام ایک خط ملا جس کا مضمون یہ تھا۔

"جب عبدالرحمٰن بن عدیس تمہارے پاس پہنچے تو اسے ایک سو کوڑے لگاؤ، اس کا سر اور داڑھی مونڈ کر اسے قید کردو۔ عمرو بن حمق، سودان بن حمدان اور عروہ بن نباع کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کرو۔"

مصریوں کا وفد یہ خط لے کر نہایت غصے میں حضرت عثمانؓ کے پاس واپس آیا اور کہا:

تم نے ہمارے ساتھ خیانت کی ہے۔

حضرت عثمانؓ نے خط سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔

مصریوں نے کہا: خط تمہارا غلام لے کر جا رہا تھا۔

حضرت عثمانؓ نے کہا: اس نے یہ کام میری اجازت کے بغیر کیا ہے۔

مصریوں نے کہا: وہ تمہارے اونٹ پر سوار تھا۔

حضرت عثمانؓ نے کہا: میرا اونٹ چوری ہوا ہے۔

مصریوں نے کہا: خط تمہارے منشی کا تحریر کردہ ہے۔

حضرت عثمانؓ نے کہا: اس نے یہ کام میری اجازت اور اطلاع کے بغیر کیا ہے۔

مصریوں نے کہا: بہرحال تم خلافت کے لائق نہیں ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ تم مستعفی ہوجاؤ کیونکہ اگر یہ کام تمہاری اجازت سے ہوا ہے تو تم نے خیانت کی ہے اور اگر اتنا بڑا کام تمہاری اجازت اور اطلاع کے بغیر ہوا ہے تو اس صورت میں بھی تمہاری لاپروائی ثابت ہے لہٰذا تمھیں استعفیٰ دینا پڑے گا یا پھر اپنے ظالم حکام کو معزول کرنا ہوگا۔

حضرت عثمانؓ نے کہا: اگر میں تمہاری خواہش کے مطابق عمل کروں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت تمہارے پاس ہے لہٰذا میری کیا حیثیت رہے گی؟ یہ سن کر وہ لوگ نہایت غصے کے عالم میں وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ (تاریخ طبری ج ۲، ص ۴۰۲، ۴۰۹۔ تاریخ یعقوبی ج ۲، ص ۱۵۰ بحوالہ شیعہ در اسلام[1])

حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ حکام میں سے ایک ان کا مادری بھائی ولید بن عقبہ تھا۔ اسے کوفہ کا والی مقرر کیا گیا تھا۔ وہ ہمیشہ شراب کے نشے میں مست رہتا تھا۔ ایک دن اس نے نشے کی حالت میں فجر

---

۱۔ علامہ سید محمد حسین طباطبائی کی اس کتاب کو جامعہ تعلیمات اسلامی نے **پاسداران اسلام** کے نام سے اردو میں شائع کیا ہے۔

کی نماز دو کی بجائے چار رکعت پڑھائی تو ابن مسعود نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا: ولید نے سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نماز میں بھی بخشش دکھائی ہے۔

کوفہ سے کچھ لوگ مدینہ آئے اور انھوں نے حضرت عثمانؓ سے ولید کی شکایت کرتے ہوئے کہا: آپ کا گورنر شراب پیتا ہے۔ ہم نے اسے ہمیشہ نشے میں غرق دیکھا ہے اس لیے ہم اسے معزول کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔

حضرت عثمانؓ نے کہا: تم الزام تراشی کر رہے ہو۔ پھر ان کی شکایت دور کرنے کی بجائے حکم دیا کہ جن لوگوں نے ولید کی شکایت کی ہے انھیں کوڑے مارے جائیں۔ عام مسلمانوں پر اس نے یہ ظاہر کیا کہ ان لوگوں نے اپنے والی پر تہمت لگائی ہے اس لیے ان پر حد جاری کی گئی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا: تم نے فاسق کی بجائے گواہی دینے والوں کو کوڑے لگائے ہیں۔ تمہارا یہ طرز عمل نہایت غیر مناسب ہے۔ مجبور ہو کر حضرت عثمانؓ نے ولید بن عقبہ کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ اپنے چچا زاد سعید بن عاص کو گورنر لگا دیا۔ اسی طرح حکم بن عاص اور اس کے بیٹے مروان بن حکم کو جنھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں مدینہ سے جلاوطن کر کے طائف بھیج دیا تھا نیز شیخین نے بھی اپنے دور حکومت میں انھیں مدینہ واپس آنے سے منع کیے رکھا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے نہ صرف واپس بلا لیا بلکہ مروان بن حکم کو منصب وزارت پر فائز کر دیا جس پر مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا۔

اپنے چچا زاد عبد اللہ بن عامر کو حضرت عثمانؓ نے بصرہ اور ایران کی حکومت سونپی جبکہ اپنے رضاعی بھائی عبد اللہ بن سعد کو مصر کا گورنر بنایا اور معاویہ بن ابی سفیان کو جو حضرت عمرؓ کے زمانے سے شام کا گورنر تھا اس عہدے پر برقرار رکھا۔ اس کے علاوہ اپنے لیے ایک عالیشان محل تعمیر کرایا۔ ان سب غلط اور غیر مناسب اقدامات کے نتیجے میں حضرت عثمانؓ کے خلاف عوامی بے چینی اور ناراضی بڑھ گئی اور اقتدار ان کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ انھوں نے بنی امیہ کو اتنے اختیارات دیئے کہ بنی امیہ حضرت عثمانؓ سے کہیں زیادہ طاقتور ہو گئے اس لیے معاویہ اس فکر میں رہنے لگا کہ مرکزی حکومت کی اطاعت کے بجائے شام کو خود مختار ملک کی حیثیت دی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ جب حضرت عثمانؓ کو مسلمانوں کے احتجاج سے خطرے کا احساس ہوا تو انھوں نے معاویہ سے امداد طلب کی لیکن معاویہ نے جس کی دلی تمنا یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ قتل ہو جائیں اور وہ خود خلافت کا دعویدار بن سکے صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ

خلیفہ کی نافرمانی نہیں کر سکتا یزید بن اسد کی سرکردگی میں کچھ لوگوں کو مدینہ بھیجا لیکن ان کو یہ ہدایت دی کہ وہ مدینہ سے آٹھ فرسخ دور محلہ ذی خشب میں رک جائیں اور نئے حکم کا انتظار کریں۔ وہ لوگ وہیں ٹھہرے رہے یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ قتل ہو گئے۔ اس وقت معاویہ نے انھیں شام واپس بلالیا۔

بہر حال خلافت کا معاملہروز بروز بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔ اصحاب رسولؐ نے حضرت عثمانؓ کو جتنی نصیحتیں کیں سب بے سود ثابت ہوئیں یہاں تک کہ حضرت علی علیہ السلام ایک دفعہ پھر مسلمانوں کی طرف سے حضرت عثمانؓ کے پاس گئے اور انھیں خیر خواہی کے جذبے سے سمجھایا اور بھیانک انجام سے خبردار کیا مگر حضرت عثمانؓ کے پاس نصیحت سننے والے کان ہی نہ رہے تھے۔ اگلے دن منبر پر جا کر انھوں نے شکایت کرنے والوں کو ڈرایا دھمکایا جبکہ اپنے حکام اور گورنروں کا دفاع کیا۔

مدینہ کے لوگوں نے جب یہ صورتحال دیکھی تو ان کی آتش غضب بھڑک اٹھی ، وہ گلی کوچوں میں نکل آئے اور کھلم کھلا حضرت عثمانؓ کو برا بھلا کہنے لگے۔ اس آتش غضب کو مزید بھڑکانے میں طلحہ، زبیر ، بی بی عائشہؓ اور بی بی حفصہؓ سرفہرست تھیں یہاں تک کہ یہ شورش حضرت عثمانؓ کے گھر کے محاصرے کا سبب بن گئی۔

جب حضرت عثمانؓ کو یقین ہو گیا کہ اب مدینہ کے مسلمان انھیں معاف نہیں کریں گے تو انھوں نے بنی امیہ کے بزرگوں کو جمع کر کے ان سے صلاح مشورہ کیا۔ انھوں نے یہ رائے دی کہ خلیفہ گرد و نواح کے شہروں سے مدد طلب کرے اور شام اور بصرہ کے سپاہیوں کو حکم دے کہ وہ مدینہ آکر بغاوت کو کچل دیں۔

حضرت عثمانؓ نے فوراً معاویہ اور عبد اللہ بن عامر کو صورتحال سے آگاہ کیا جو بالترتیب شام اور بصرہ کے گورنر تھے۔ عبد اللہ نے بصرہ کی جامع مسجد میں لوگوں کو اکٹھا کر کے حضرت عثمانؓ کی مدد کرنے کے لیے کہا لیکن کسی نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ ادھر معاویہ نے بھی جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں ٹال مٹول سے کام لیا۔

مسلمانوں کی طرف سے حضرت عثمانؓ کے گھر کے محاصرے میں بتدریج شدت پیدا ہو رہی تھی اور باہر والوں سے ان کا رابطہ مکمل طور پر منقطع ہو چکا تھا۔ نوبت با ینجا رسید کہ انھیں پینے کا پانی بھی میسر نہ ہوا چنانچہ مجبور ہو کر وہ گھر کی چھت پر آئے اور محاصرہ کرنے والوں سے پوچھا: کیا تمہارے درمیان علیؑ موجود ہیں ؟ انھیں بتایا گیا کہ وہ موجود نہیں ہیں۔ ان کا محاصرے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بعد

حضرت عثمانؓ نے پانی مانگا مگر لوگوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ یہ خبر جب حضرت علی علیہ السلام کو ملی تو آپ شدید ناراض ہوئے۔ آپ نے فوراً پانی کے مشکیزے بنی ہاشم کے چند افراد کے ہاتھوں اپنے صاحبزادے امام حسن علیہ السلام کی نگرانی میں حضرت عثمانؓ کے گھر بھجوائے۔ اگرچہ محاصرہ کرنے والوں نے انھیں روکنا چاہا مگر اس کے باوجود انھوں نے پانی حضرت عثمانؓ تک پہنچایا۔

مسلمان یہ خیال کر رہے تھے کہ محاصرے کے نتیجے میں حضرت عثمانؓ خلافت سے مستعفی ہوجائیں گے اسی لیے وہ نئے خلیفہ کے انتخاب کا سوچ رہے تھے مگر حضرت عثمانؓ اور بنی امیہ اس منصب کو چھوڑنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔

ادھر محاصرہ کرنے والوں کو یہ اطلاع بھی مل گئی کہ حضرت عثمانؓ نے شام اور بصرہ سے کمک منگوائی ہے لہٰذا انھوں نے کوشش شروع کردی کہ کمک پہنچنے سے پہلے ہی حضرت عثمانؓ کو قتل کردیا جائے۔ حضرت عثمانؓ کے مستعفی ہونے سے انکار کے بعد وہ لوگ ان کے گھر پر ٹوٹ پڑے اور ۸۲ سالہ حضرت عثمانؓ کو تلوار اور خنجر کے وار کرکے قتل کردیا۔

قتل عثمان کا واقعہ ۳۵ھ میں وقوع پذیر ہوا اور اس طرح ۲۵ سال تک حق کے مرکز سے دوری کا دور ختم ہوا مگر اس کے خطرناک نتائج ہمیشہ کیلئے اسلام اور مسلمانوں کیلئے مستقل دردسر بن گئے۔

# (۲) خلافت کے لیے حضرت علی علیہ السلام کا انتخاب

قتل عثمانؓ کے بعد مسلمان مسجد نبوی میں خلیفہ کے چناؤ کے لیے جمع ہوگئے۔ حضرت عثمانؓ کے بارہ سالہ دور خلافت کی سختیوں نے انھیں باشعور بنا دیا تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے سے کہنا شروع کیا کہ امور خلافت ایسے شخص کے سپرد کئے جانے چاہیں جو حقیقی معنوں میں اس عہدے کے لائق ہو۔

اس دوران حضرت عمار یاسرؓ، حضرت مالک اشترؓ، حضرت رفاعہ بن رافعؓ وغیرہ جو حضرت علیؑ کے شیدائی تھے انھوں نے لوگوں کو حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کی ترغیب دی۔

انھوں نے اپنی مدلل گفتگو اور پُر تاثیر خطاب میں سابقہ خلفاء کے کردار کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے موجودہ صورتحال کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کی مخالفت کا نتیجہ قرار دیا جو حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے بارے میں تھا۔ انھوں نے اسلام کے لیے حضرت علی علیہ السلام کی خدمات، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپ کی رشتے داری اور سابق الایمان ہونے کا تذکرہ کیا اور مسلمانوں پر واضح کیا کہ وہی خلافت کے حقدار ہیں۔ حقائق واضح ہونے کے بعد مہاجرین و انصار سب حضرت علی علیہ السلام کی بیعت پر آمادہ ہوگئے۔

پھر وہ لوگ مسجد رسولؐ سے سیدھے حضرت علی علیہ السلام کے بیت الشرف پہنچے اور کہا:

یا علیؑ! قتل عثمانؓ کے بعد مسلمانوں کا کوئی خلیفہ نہیں۔ آپ اپنا دست مبارک آگے بڑھائیں تاکہ ہم آپ کی بیعت کریں کیونکہ اس منصب کے لیے آپ سے زیادہ کوئی لائق نہیں ہے۔ سب مسلمان آپ کی بیعت کرنے کے لیے تیار ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: تم لوگ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میرے سوا کسی اور کو چن لو۔ میں بھی تمہاری طرح اس کی اطاعت کروں گا کیونکہ میرا وزیر رہنا امیر بننے سے تمہارے حق میں کہیں زیادہ بہتر ہے۔

مسلمانوں نے کہا: یا علیؑ! اصحاب رسولؐ آپ سے تقاضا کر رہے ہیں کیا آپ ان کی درخواست

بھی قبول نہیں فرمائیں گے؟!

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

تم لوگ میری خلافت کو برداشت نہیں کرسکو گے جلد یا بدیر تم مجھ سے منہ پھیر لوگے کیونکہ خلافت ایک سادہ مسئلہ نہیں ہے۔ یہ وہ بھاری بوجھ ہے جو اٹھانے والے کو تھکا دیتا ہے اور اس کا آرام چھین لیتا ہے۔ میں ایسا شخص نہیں ہوں جو دائرہ حقیقت سے باہر قدم رکھ دے اور معمولی مفاد کی خاطر لوگوں کے حقوق کو پامال کردے یا معززین اور اکابرین کی سفارش اور دباؤ میں آسکے۔ جب تک ظالم سے مظلوم کا حق نہ دلادوں میرے ضمیر کو چین نہیں ملتا اور جب تک میں بغاوت کرنے والوں یا دھونس جمانے والوں کی ناک نہ رگڑوا دوں آرام سے نہیں بیٹھتا۔

حضرت علی علیہ السلام گفتگو کو جتنا طول دے رہے تھے ستم دیدہ اور رنجیدہ مسلمان شدت سے آپ کو اپنی اطاعت کا یقین دلا رہے تھے۔ مالک اشترؒ نے قریب آکر کہا: یا علیؑ! اٹھ جائیے! لوگ آپ کے سوا کسی کو نہیں چاہتے۔ خدا کی قسم! اگر آپ نے اس کام میں تاخیر فرمائی اور خود کو خلافت سے دور رکھا تو چوتھی مرتبہ بھی آپ خود کو اپنے جائز حق سے دور کردیں گے۔ اس وقت تمام مسلمانوں نے زور زور سے کہنا شروع کیا: مَا نَحْنُ بِمُفَارِقِيكَ حَتّٰى نُبَايِعَكَ ہم آپ سے اس وقت تک جدا نہیں ہوں گے جب تک آپ کی بیعت نہ کرلیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اِنْ كَانَ وَلَا بُدَّ مِنْ ذَالِكَ فَفِي الْمَسْجِدِ فَاِنَّ بَيْعَتِيْ لَا يَكُوْنُ خَفِيًّا وَلَا يَكُوْنُ اِلَّا عَنْ رِضَاءِ الْمُسْلِمِيْنَ وَفِيْ مَلَاءٍ وَ جَمَاعَةٍ یعنی اب جبکہ تمہارا یہی اصرار ہے اور اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تو سب مسجد میں جمع ہوجائیں کیونکہ میں خفیہ بیعت لینا نہیں چاہتا بلکہ بیعت مسلمانوں کی رضامندی سے کھلے عام ہونی چاہیے۔

تمام مسلمان مسجد نبویؐ میں جمع ہوئے اور ان کی اکثریت نے برضا و رغبت حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کرلی۔ طلحہ و زبیر جیسے سرکردہ افراد جن کے ذہنوں میں کچھ اور بات تھی انھوں نے بھی صورتحال کو دیکھتے ہوئے بیعت کرنے میں ہی مصلحت جانی۔ انھوں نے دیکھا کہ اب ان کے لیے خلافت کا حصول ممکن نہیں رہا تو انھوں نے بھی بیعت کرلی کہ شاید انھیں کوئی سرکاری منصب مل جائے یا وہ گورنری حاصل کرلیں۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ظاہری طور پر دوسرے لوگوں کو بھی امام کی بیعت کی ترغیب دلائی۔ جس شخص نے سب سے پہلے بیعت کی وہ طلحہ تھا البتہ سعد بن ابی وقاص، عبد اللہ بن عمر وغیرہ نے بیعت

نہیں کی۔ ؎۱

حضرت علی علیہ السلام نے بیعت لینے کے بعد خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَلَا وَاِنَّ بَلِیَّتَکُمْ قَدْ عَادَتْ کَهَیْئَتِهَا یَوْمَ بَعَثَ اللّٰهُ نَبِیَّکُمْ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ بَعَثَهٗ بِالْحَقِّ لَتُبَلْبَلُنَّ بَلْبَلَةً وَلَتُغَرْبَلُنَّ غَرْبَلَةً وَلَتُسَاطُنَّ سَوْطَ الْقِدْرِ حَتّٰی یَعُوْدَ اَسْفَلُکُمْ اَعْلَاکُمْ وَاَعْلَاکُمْ اَسْفَلَکُمْ، وَلَیَسْبِقَنَّ سَابِقُوْنَ کَانُوْا قَصَّرُوْا وَلَیَقْصُرَنَّ سَبَّاقُوْنَ کَانُوْا سَبَقُوْا جان لو کہ تمہارے لیے وہی آزمائش کا دور پلٹ آیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے وقت تھا۔ قسم ہے اس پروردگار کی جس نے رسولؐ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا تھا کہ تم بری طرح تہ و بالا کیے جاؤ گے اور اس طرح چھانٹے جاؤ گے جس طرح چھلنی سے کسی چیز کو چھانا جاتا ہے اور اس طرح خلط ملط کیے جاؤ گے جس طرح چمچے سے ہنڈیا یہاں تک کہ تمہارے ادنیٰ، اعلیٰ اور اعلیٰ، ادنیٰ ہو جائیں گے۔ جو پیچھے تھے وہ آگے بڑھ جائیں گے اور جو ہمیشہ آگے رہتے تھے وہ پیچھے چلے جائیں گے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا: گناہ ان سرکش گھوڑوں کی مانند ہیں جن پر ان کے سواروں کو سوار کر دیا گیا ہو اور باگیں بھی ان کی اتار دی گئی ہوں اور وہ لے جا کر ان کو دوزخ میں پھاند پڑیں اور تقویٰ رام کی ہوئی سواریوں کی مانند ہے جن پر ان کے سواروں کو سوار کیا گیا ہو اس طرح کے باگیں ان کے ہاتھ میں دے دی گئی ہوں اور وہ ان کو اطمینان کے ساتھ لے جا کر جنت میں اتار دیں۔ ایک حق ہوتا ہے اور ایک باطل اور کچھ حق والے ہوتے ہیں اور کچھ باطل والے۔ اب اگر باطل زیادہ ہو گیا ہے تو یہ پہلے بھی بہت ہوتا رہا ہے اور اگر حق کم ہو گیا ہے تو بسا اوقات ایسا ہوا ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہ اس کے بعد باطل پر چھا جائے۔ اگرچہ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ کوئی چیز پیچھے ہٹ کر آگے بڑھے۔

(نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۱۶)

---

۱۔ عبد الملک بن مروان کے زمانے میں جب حجاج بن یوسف نے عبد اللہ بن زبیر کو گرفتار کرنے کے لیے مکہ پر لشکر کشی کی تو اس نے عبد اللہ کو قتل کرنے کے بعد اس کے جسم کو سولی پر لٹکا دیا۔ اس وقت یہی عبد اللہ بن عمر جس نے حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کرنے سے انکار کیا تھا مکہ میں اپنی جان کے خوف سے حجاج کے پاس گیا اور کہا کہ تم عبد الملک بن مروان کے نمائندے ہو اور میں تمہارے پاس اس کی بیعت کرنے کے لیے آیا ہوں اپنا ہاتھ بڑھاؤ تاکہ میں بیعت کروں۔ حجاج نے اس سے کہا: تم نے تو علیؑ کی بیعت نہیں کی تھی آج تمھیں بیعت کی یاد کیسے آ گئی؟ تم از خود یہاں نہیں آئے بلکہ ابن زبیر کے سولی پر لٹکے ہوئے جسم نے تمھیں یہ راہ دکھائی ہے۔ اس وقت حجاج کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ اس نے اپنی ٹانگ لمبی کر کے کہا: میرا ہاتھ اس وقت مشغول ہے اگر تم چاہو تو میرے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر بیعت کر سکتے ہو؟ چنانچہ عبد اللہ بن عمر نے حجاج کے پاؤں پر اپنا ہاتھ رکھ کر بیعت کی۔

خطبے کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے نماز پڑھی اور گھر تشریف لے گئے جہاں آپ نے حکومتی امور و معاملات کا جائزہ لیا۔ پھر دوسرے دن مسجد میں آکر خطبہ ارشاد فرمایا اور لوگوں کو اپنی حکومت کی پالیسیوں سے آگاہ فرمایا۔ امام نے خدا کی حمد وثنا اور رسول اللہؐ پر درود وسلام کے بعد فرمایا:

آگاہ ہوجاؤ! میں تمھیں راہ حق پر گامزن کروں گا۔ رسول اللہؐ کی روش جو برسوں سے متروک ہے اسی کو آگے بڑھاؤں گا۔ میں تمہارے لیے احکامات قرآن کا اجرا کروں گا۔ میں خود بھی خدا کے فرمان اور سنت رسولؐ سے ذرہ برابر انحراف نہیں کروں گا۔ تمہارا آرام اور مفاد میری پہلی ترجیح ہوگی۔ جو کام بھی تمہارے لیے کروں گا، تمہارے مشورے سے کروں گا تاہم یہ مشورت خیر خواہی اور اسلام کی مصلحت پر مبنی ہوگی۔ میں عوامی مفاد کو پیش نظر رکھوں گا نہ کہ کسی خاص طبقے کے مفاد کو۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں اس روش پر تمھیں مشکل کا سامنا ہو، تاہم تمھیں صبر وتحمل اور بردباری سے سختی کو برداشت کرنا ہوگا۔ تم لوگ بہتر جانتے ہو کہ مجھے نہ تو خلافت کا لالچ ہے اور نہ ہی میں اس ذمے داری کو قبول کرنے کے لیے تیار تھا۔ تمہارے اصرار پر میں نے ملت کی سرپرستی اپنے ذمے لی ہے کیونکہ ملت کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں اس لیے مجھ پر فرض ہوگیا ہے کہ میں بھی تم سے حق و انصاف پر مبنی سلوک کروں۔

مجھے معلوم ہے کہ کچھ لوگوں کے پاس بہت ساری دولتیں، خوبصورت کنیزیں اور زرخیز زمینیں ہیں۔ اگر انھوں نے حق اور شرعی ضابطوں کے برخلاف یہ سب کچھ جمع کیا ہے تو میں انھیں مجبور کردوں گا کہ وہ لوٹی ہوئی دولت قومی خزانے میں جمع کرادیں۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تقویٰ کے سوا مسلمانوں کے درمیان کوئی چیز وجہ امتیاز نہیں اور اس تقویٰ کی جزا بھی آخرت میں ملے گی۔ اس بنا پر بیت المال کی تقسیم میں تمام مسلمان میری نظر میں یکساں ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں۔ میری حکومت کی بنیاد عدل و مساوات ہے، مظلوم اور بے سہارا افراد مجھے عزیز ہیں۔ میری نظر میں طاقتور ظالم کمزور اور بیکار ہیں۔

عرب امراء خصوصاً بنی امیہ جنھوں نے خلافت عثمان کے زمانے میں بیت المال کو اپنی ملکیت سمجھ رکھا تھا وہ اس غیر متوقع صورتحال سے بوکھلا گئے۔ وہ یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ حضرت علی علیہ السلام اس طرح کی انقلابی بات کریں گے، حق گوئی اور انصاف پسندی میں اس حد تک جائیں گے۔ گویا رسول اللہؐ کی رحلت کے بعد پچیس سال کے عرصے میں ہر چیز بھلا دی گئی تھی اور اس پورے عرصے میں احکام دین کا اجرا نہیں کیا گیا تھا۔ یہ صرف حضرت علی علیہ السلام ہی تھے جنھوں نے پچیس سال تک چلنے والے طبقاتی نظام مسترد کرتے ہوئے فرمایا تھا: عرب اور عجم، آقا اور غلام، سیاہ اور سفید سب قانون کی نظر میں برابر

ہیں اور بیت المال کو سب کے درمیان برابر تقسیم کیا جانا ضروری ہے۔

پھر آپ نے فرمایا : وَاللهِ لَوْ وَجَدْتُهُ قَدْ تُزُوِّجَ بِهِ النِّسَآءُ وَمُلِكَ بِهِ الْاِمَآءُ لَرَدَدْتُهُ فَاِنَّ فِي الْعَدْلِ سَعَةً وَمَنْ ضَاقَ عَلَيْهِ الْعَدْلُ فَالْجَوْرُ عَلَيْهِ اَضْيَقُ خدا کی قسم ! اگر مجھے ایسا مال بھی کہیں نظر آتا جو عورتوں کے مہر اور کنیزوں کی خریداری پر صرف کیا جا چکا ہے تو اسے بھی واپس پلٹا لیتا۔ چونکہ عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے میں وسعت ہے اور جسے عدل کی صورت میں تنگی محسوس ہو اسے ظلم کی صورت میں زیادہ تنگی محسوس ہوگی۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵)

حضرت علی علیہ السلام نے حکم دیا کہ حضرت عثمانؓ کے ذاتی مال کو ان کی اولاد کے لیے رہنے دیا جائے باقی مال جو انھوں نے بیت المال سے لیا تھا مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔ اس تقسیم سے ہر شخص کو تین دینار ملے اور اس میں کسی کو بھی امتیازی حیثیت نہیں دی گئی۔ غلام، آزاد شدہ اور اشراف کو آپ نے ایک ہی نظر سے دیکھا۔

ظاہر ہے کہ یہ عادلانہ روش کچھ لوگوں کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ یہ لوگ زمانۂ جاہلیت کے رواج کے مطابق خود کو اونچے خاندان کا تصور کرتے تھے اور توقع رکھتے تھے کہ ان کا حصہ بیت المال میں عام لوگوں سے زیادہ ہونا چاہیے۔ حضرت علی علیہ السلام کا عادلانہ سلوک دیکھ کر یہ لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ علیؑ نے ہماری خاندانی حیثیت کو نظر انداز کیا ہے۔ انھوں نے ہمیں سیاہ فام غلاموں اور عام لوگوں کے برابر سمجھا ہے لہٰذا ہمارے پاس دو ہی راستے ہیں کہ ہم اس روش کو برداشت کرتے رہیں یا ان سے کنارہ کش ہو جائیں ؟

حضرت علی علیہ السلام کو پہلے سے ہی معلوم تھا کہ اس قسم کے لوگ اپنی بیعت پر قائم نہیں رہیں گے کیونکہ یہ لوگ خود کو ''اونچی چیز'' سمجھتے ہیں اور بہت جلد عوام الناس کو بھی دھوکا دے کر راہ حق سے ہٹا دیں گے۔ اس لیے آپ خلافت کے منصب کو قبول کرنے کے لیے پہلے ہی راغب نہ تھے۔

حضرت علی علیہ السلام کو خلافت کی ابتدا سے ہی تین بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

(۱) عبد اللہ بن عمر اور سعد بن ابی وقاص جیسے کچھ سرکردہ افراد نے آپ کی بیعت نہیں کی تھی۔

(۲) حضرت عثمانؓ کے معاویہ جیسے حکام اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار حاکم بنے ہوئے تھے اور انھیں بغیر جنگ کے معزول کرنا ممکن نہ تھا۔

(۳) قتل عثمان کا معاملہ درمیان میں اٹکا ہوا تھا اور جو کوئی بھی نافرمانی کے لیے کوشاں تھا وہ خون عثمان

کے قصاص کا بہانہ کردیتا اس لیے حضرت علی علیہ السلام مجبور تھے کہ حضرت عثمانؓ کو قتل کرنے والوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی وضاحت کریں۔

یہ وہ تین اہم عوامل تھے جنھوں نے حضرت علی علیہ السلام کے مختصر دور خلافت کو بری طرح متاثر کیا اور آپ کا زیادہ تر وقت اس طرح کے شرپسندوں کی سرکوبی میں گزرا۔

حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کے چوتھے دن ابن عمر نے آ کر آپ سے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ سب لوگ آپ کی خلافت سے متفق نہیں ہیں اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس معاملے کو شوریٰ پر چھوڑ دیا جائے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: احمق! تمھیں ان باتوں سے کیا لینا ہے؟ کیا خلافت لینے کے لیے میں لوگوں کے پاس گیا تھا؟ کیا لوگ بیعت کے لیے میرے گھر پر ٹوٹ پڑے تھے؟ پھر کیا ہوا ہے کہ تم اب کہہ رہے ہو کہ خلافت کے معاملے کو شوریٰ کے ذریعے طے کیا جائے؟ اس کے بعد آپ منبر پر تشریف لے گئے اور آپ نے کھلے عام اس واقعے کو لوگوں کے سامنے بیان کیا اور انھیں قرآن اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات کی پیروی کرنے کی دعوت دی۔

ادھر بیعت کرنے والوں میں بھی بعض ایسے لوگ تھے جن کے ذہنوں میں کچھ تحفظات تھے۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بھی خلافت عثمان کی مانند ہے چنانچہ اگر انھوں نے حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کرنے میں سبقت کی تو حضرت علی علیہ السلام انھیں اسلامی حکومت میں کہیں والی یا حاکم مقرر کردیں گے یا انھیں بیت المال سے زیادہ حصہ دیں گے۔ ایسے ہی افراد میں سے ایک طلحہ تھا جس نے سب سے پہلے حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کی تھی اور یہ بیعت بغیر لالچ کے نہ تھی لیکن جب اس طرح کے لوگوں نے دیکھا کہ حضرت علی علیہ السلام نے مسلمانوں کے درمیان بیت المال کی رقم برابر برابر تقسیم کی ہے تو یہ عمل انھیں بہت ناگوار گزرا اور انھوں نے اعتراضات شروع کردیے۔ چنانچہ سہیل بن حنیف نے کہا: یا امیر المومنینؑ! یہ غلام جسے آپ نے تین دینار دیے ہیں میرا آزاد کردہ ہے اور آج آپ نے اسے میرے برابر لا کھڑا کیا ہے؟ (کیونکہ دونوں کو تین تین دینار دیے گئے تھے)۔ علاوہ ازیں طلحہ، زبیر، مروان بن حکم، سعید بن عاص اور قریش کے چند دوسرے افراد نے بھی اسی طرح کی باتیں کیں لیکن حضرت علی علیہ السلام ایسے نہ تھے جو اس طرح کی باتوں سے متاثر ہوجاتے اور جادۂ حق سے ہٹ جاتے۔ آپ نے ان کے جواب میں فرمایا: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں جس رعایا کا حاکم بنایا گیا ہوں اس پر ظلم کر کے چند افراد کی حمایت حاصل کروں؟ خدا کی قسم! جب تک شب و روز کا سلسلہ جاری ہے، جب

تک آسمان پر ستارے گردش کر رہے ہیں میں ایسا ہرگز نہیں کرسکتا۔ اگر یہ میرا ذاتی مال ہوتا تب بھی میں اسے برابر تقسیم کرتا لیکن یہ تو اللہ کا مال ہے پھر میں کس طرح اس کی تقسیم میں ایک مسلمان کو دوسرے پر فوقیت دے سکتا ہوں ؟ اس کے بعد آپ نے فرمایا: أَلَا وَإِنَّ إِعْطَاءَ الْمَالِ فِي غَيْرِ حَقِّهِ تَبْذِيرٌ وَإِسْرَافٌ، وَهُوَ يَرْفَعُ صَاحِبَهُ فِي الدُّنْيَا وَيَضَعُهُ فِي الْآخِرَةِ، وَيُكْرِمُهُ فِي النَّاسِ وَيُهِينُهُ عِنْدَ اللهِ، وَلَمْ يَضَعِ امْرُؤٌ مَالَهُ فِي غَيْرِ حَقِّهِ وَلَا عِنْدَ غَيْرِ أَهْلِهِ إِلَّا حَرَمَهُ اللهُ شُكْرَهُمْ وَكَانَ لِغَيْرِهِ وُدُّهُمْ، فَإِنْ زَلَّتْ بِهِ النَّعْلُ يَوْمًا فَاحْتَاجَ إِلَى مَعُونَتِهِمْ فَشَرُّ خَدِينٍ وَأَلْأَمُ خَلِيلٍ یاد رکھو! مال کا ناحق دینا بھی اسراف ہے اور یہ کام دنیا میں انسان کو ظاہری طور پر بلند کردیتا ہے لیکن آخرت میں ذلیل کردیتا ہے۔ اسے لوگوں کی نظر میں محترم بنا دیتا ہے مگر خدا کی نگاہ میں پست کر دیتا ہے اور جب بھی کوئی شخص مال کو ناحق یا نااہل لوگوں پر صرف کرتا ہے تو اللہ اس کے شکریے سے بھی اسے محروم کر دیتا ہے نیز اس کی محبت کا رخ بھی دوسروں کی طرف مڑ جاتا ہے پھر کسی دن اگر اس کا پاؤں پھسل جائے اور وہ ان لوگوں کی مدد کا محتاج ہوجائے (جنھیں اس نے مال سے نوازا تھا) تو وہ اس کے بدترین دوست اور ذلیل ترین ساتھی ثابت ہوتے ہیں۔

(نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۴)

بہرحال حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے ابتدائی ایام میں ہی طلحہ اور زبیر نے آپ کو ایک پیغام بھجوایا کہ ہم نے آپ کی خلافت کے سلسلے میں کافی تگ و دو کی تھی اور لوگوں کو آپ کی بیعت پر آمادہ کیا تھا نیز مہاجرین اور انصار نے بھی ہماری ہی پیروی کرتے ہوئے آپ کی بیعت کی تھی لہٰذا اب جبکہ عنان اقتدار آپ کے ہاتھ آگئی ہے آپ نے ہمیں نظر انداز کر کے مالک اشتر وغیرہ کو نوازا ہے؟

حضرت علی علیہ السلام نے ان کے قاصد سے پوچھا: طلحہ اور زبیر ایسی بات سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ قاصد نے کہا: طلحہ کو بصرہ کی حکومت اور زبیر کو کوفہ کی حکومت چاہیے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اس وقت جبکہ دونوں مدینہ میں بیکار بیٹھے ہوئے ہیں انھوں نے مجھے چین سے نہیں رہنے دیا۔ اگر بصرہ اور کوفہ کی حکومت ان کے ہاتھ میں آگئی تو وہ لوگوں کو میرے خلاف اکسا کر دین خدا میں رخنہ پیدا کریں گے۔ میں ان کے شر سے محفوظ نہیں ہوں۔ ان دونوں بزرگوں سے کہو کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے ڈریں اور امت میں فتنہ پیدا نہ کریں۔ یقیناً انھوں نے یہ آیت سنی ہوگی تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ○ یہ آخرت کا گھر ہم نے ان لوگوں کے لیے تیار کر رکھا ہے جو زمین میں نہ سرکشی کرنا چاہتے ہیں نہ فساد۔

اور اچھا انجام پرہیزگاروں ہی کے لیے ہے۔ (سورۂ قصص: آیت ۸۳)

(ناسخ التواریخ، حالات امیر المومنینؑ، کتاب جمل ص ۲۹)

طلحہ اور زبیر کو یہ بات سن کر یقین ہوگیا کہ انصاف پرور علیؑ کے ہاتھوں عہدہ ملنے اور بیجا توقعات کے بر آنے کی امید رکھنا فضول ہے اس لیے کوئی ایسا راستا نکالنا ضروری ہے جس سے اپنی خواہشات کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔

ادھر حضرت علی علیہ السلام نے لوگوں کی بیعت کے بعد یہ فیصلہ کرلیا کہ سب سے پہلے حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ نا اہل حکام اور گورنروں کو معزول کر کے ان کی جگہ باصلاحیت اور نیک افراد کو ذمے داری سونپیں گے۔ چنانچہ آپ نے معاویہ ابن ابی سفیان کو ایک خط لکھا جو حضرت عمرؓ کے زمانے سے امیر شام چلا آرہا تھا۔ آپ نے اسے آگاہ کیا کہ لوگوں نے آپ کی بیعت کرلی ہے اور اسے بھی دعوت دی کہ وہ بھی آپ کی بیعت کرے لیکن معاویہ جو خود خلافت کے خواب دیکھ رہا تھا اس نے حضرت علی علیہ السلام کے خط کو اہل شام سے مخفی رکھا اور ان سے اپنی بیعت کرائی۔ اس نے حضرت علی علیہ السلام کے خط کا جواب ہی نہیں دیا تاکہ اس فرصت سے استفادہ کرے اور اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔

معاویہ نے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے دوسرے افراد کے ذریعے حضرت علی علیہ السلام کو جنگوں میں مصروف رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے زبیر کو ایک خط لکھا اور اسے جتایا کہ وہ خلافت کا حقدار ہے چنانچہ اسے اپنی خلافت کے لیے آواز بلند کرنی چاہیے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ وہ شام کے لوگوں سے طلحہ اور زبیر کے لیے بیعت لے گا اس لیے کہ خلافت بالترتیب ان دونوں کا حق ہے۔ معاویہ نے مزید لکھا کہ بصرہ اور کوفہ تمہارے نزدیک ہیں لہٰذا علیؑ سے پہلے تم ان علاقوں کو اپنے قبضے میں لے لو اور خون عثمان کا بدلہ لینے کے بہانے علیؑ سے جنگ کے لیے اٹھو۔

جب معاویہ کا خط زبیر کو ملا تو وہ معاویہ کے فریب میں آگیا کیونکہ خلافت کی تمنا پہلے ہی اس کے دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔ اس نے خط کو سب سے پوشیدہ رکھا اور تنہائی میں طلحہ سے ملاقات کرکے اسے خط کے مندرجات سے آگاہ کیا۔ (ناسخ التواریخ، کتاب جمل، ص ۲۹)

بعض مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ معاویہ نے زبیر کو لکھا تھا کہ میں نے شام کے لوگوں سے بطور خلیفہ اپنے لیے بیعت لے لی ہے اور میرے بعد تم اور طلحہ خلیفہ بنو گے۔ (منتخب التواریخ ص ۱۷۷)

طلحہ اور زبیر جو حضرت علی علیہ السلام سے بصرہ اور کوفہ کی گورنری حاصل کرنے میں ناکامی کے بعد

اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کسی دوسرے راستے کی تلاش میں تھے انھیں جب معاویہ کا خط ملا تو انھوں نے حضرت علی علیہ السلام کی مخالفت اور ان کے خلاف باقاعدہ جنگ کرنے کا ارادہ کرلیا اور معاویہ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے حضرت عثمانؓ کے قصاص کو اپنی بغاوت کا بنیادی سبب قرار دینے کے لیے مکہ جانے کا فیصلہ کیا تاکہ وہاں جاکر اس مقصد کی تکمیل کے لیے راہ ہموار کرسکیں۔ مکہ اس مقصد کے لیے بہت موزوں جگہ تھی کیونکہ وہاں مروان بن حکم اور بی بی عائشہؓ پہلے ہی موجود تھے جو حضرت علی علیہ السلام کے شدید مخالفین میں شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ طلحہ اور زبیر کے مکہ پہنچنے کے بعد چند افراد پر مشتمل ایک گروہ تشکیل پایا جس کی وجہ سے جنگ جمل برپا ہوئی۔

# (۳) جنگ جمل

جنگ جمل کا بنیادی سبب وہ طبقاتی اختلاف تھا جو رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد دربار خلافت نے پیدا کر دیا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام کی خلافت درحقیقت سابقہ خلافتوں میں اختیار کی گئی پالیسیوں کے خلاف ایک انقلابی تحریک تھی تاکہ اسلامی حکومت کو زمانۂ رسالتؐ کی حالت پر بحال کیا جائے۔ جب طلحہ و زبیر اور ان کے گروپ نے حضرت علی علیہ السلام کی خلافت میں اسلامی معاشرے کے اندر اپنی حیثیت ایک عام مسلمان کے برابر محسوس کی اور انھیں اپنے مادّی مفادات خطرے میں نظر آئے تو انھوں نے آپ کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے ان دونوں کو گورنری نہ دی تو انھوں نے سمجھ لیا کہ مدینہ میں وہ کسی سازش کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے لہٰذا انھوں نے سرزمین مکہ کا انتخاب کیا اور حضرت علی علیہ السلام سے یہ کہہ کر مکہ جانے کی اجازت مانگی کہ وہ عمرہ کرنا چاہتے ہیں!!

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: تم لوگ تمام شہروں میں آنے جانے کے لیے آزاد ہو لیکن میں جانتا ہوں کہ تمہارا یہ سفر کسی خاص مقصد کے لیے ہے۔ تم لوگوں نے جو منصوبہ بنایا ہے اس پر تم مدینہ میں عمل درآمد نہیں کر سکتے اس لیے مکہ جانا چاہتے ہو مگر ان دونوں نے قسم کھا کر کہا کہ اس سفر سے ان کا مقصد عمرہ ادا کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے انھیں اجازت دیتے ہوئے بیعت توڑنے کے انجام سے ڈرایا۔ آپ نے ان دونوں سے اپنی بیعت کی تجدید کرائی اور انھیں یہ حدیث یاد دلائی جو آنحضرت ﷺ نے ان دونوں کی موجودگی میں ارشاد فرمائی تھی کہ یا علیؑ! میرے بعد تم ناکثین، قاسطین اور مارقین سے جنگ کرو گے۔

(مسعودی، اثبات الوصیۃ)

بہر حال وہ حضرت علی علیہ السلام سے اجازت لے کر مکہ پہنچے اور وہاں کے ماحول کو اپنی سرگرمیوں کے لیے بڑا سازگار پایا۔

طلحہ اور زبیر کے مکہ پہنچنے سے قبل بی بی عائشہؓ وہاں موجود تھیں۔ بی بی نے جب حضرت عثمانؓ کے غلط کاموں کو دیکھا تھا تو لوگوں سے متعدد بار کہا تھا کہ اس ''نعثل''[۱] کو قتل کردو۔ جب لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کرلیا اور بغاوت زور پکڑ گئی تو بی بی خود کو اس بغاوت سے علیحدہ ظاہر کرنے کے لیے یا اس وجہ سے کہ کہیں ان کو اخلاقی طور پر حضرت عثمانؓ کی مدد نہ کرنا پڑے مدینہ سے مکہ آ گئی تھیں۔

مراسم حج کے بعد مدینہ واپسی کے سفر میں جب بی بی کو حضرت عثمانؓ کے قتل اور حضرت علی ؑ کے خلیفہ بن جانے کی خبر ملی تو وہ مدینہ واپسی کا ارادہ ترک کر کے دوبارہ مکہ آگئیں۔ اس وقت عبد اللہ بن حضرمی مکہ کا حاکم تھا۔ وہ حضرت عثمانؓ کا کٹر حامی اور حضرت علی ؑ کا شدید مخالف تھا۔

حاکم مکہ کے علاوہ بی بی عائشہؓ، طلحہ، زبیر، مروان اور حضرت علی ؑ کے دیگر مخالفین اطراف و اکناف سے مکہ آکر جمع ہوگئے۔ یمن سے یعلیٰ بن امیہ اور بصرہ سے عبداللہ بن عامر بھی آکر ان سے مل گئے۔ اس گروپ کا ایک جگہ جمع ہوکر حضرت علی ؑ کے خلاف سازشیں کرنا جنگ جمل کا باعث بنا اور بی بی عائشہؓ نے دیگر ازواج رسولؐ سے اس سلسلے میں تعاون طلب کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ جناب ام سلمہؓ اور بی بی حفصہؓ کو بھی اپنے گروپ میں شامل کرلیں مگر جناب ام سلمہؓ نے ان کے منصوبے کی شدید مخالفت کی اور کہا: اے عائشہ! کیا تم خود لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے قتل پر نہیں اکساتی رہیں؟ پھر کیا وجہ ہے کہ آج تم اس کے قصاص کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ہو؟ اور یہ تم علی مرتضیٰ ؑ سے کیوں دشمنی کر رہی ہو حالانکہ وہ رسول خدا ﷺ کے چچا زاد بھائی اور وصی و جانشین ہیں۔ مہاجرین و انصار سب نے مل کر ان کی بیعت کی ہے۔ بتاؤ! کیا رسول خدا ﷺ نے اپنی ازواج کو خدا کا یہ فرمان نہیں سنایا تھا **وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ**... اپنے گھروں میں رہو اور زمانہ جاہلیت کی طرح خودنمائی مت کرو۔ (سورہ احزاب: آیت ۳۳)

جناب ام سلمہؓ کے جواب سے خاص کر قرآن سے استناد کرنے پر بی بی عائشہؓ کو بڑی مایوسی ہوئی لہٰذا انھوں نے بی بی حفصہؓ سے رابطہ کیا جنھوں نے ان کی بات مان لی مگر ان کے بھائی ابن عمر نے ان کو اس کام سے روک دیا چنانچہ بی بی حفصہؓ کی طرف سے کسی قسم کا تعاون نہ ملنے پر بی بی عائشہؓ نے خود ہی مخالفین علیؑ کی قیادت سنبھال لی۔ ادھر جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں معاویہ نے زبیر کو خط کے ذریعے

---

۱۔ نعثل مدینہ میں ایک دراز ریش لنگڑے یہودی کا نام تھا۔ بی بی عائشہؓ حضرت عثمانؓ کو اس سے تشبیہ دیا کرتی تھیں۔

خلافت کا لالچ دلا کر حضرت علی علیہ السلام کی مخالفت پر اکسایا تھا اس لیے اس مخالف گروپ نے ابتدا میں یہ پروگرام بنایا کہ شام جا کر معاویہ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیں جو حضرت علی علیہ السلام کا پہلے ہی سے مخالف تھا مگر معاویہ کو ان لوگوں کے فیصلے کی اطلاع مل گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر یہ گروپ شام آ گیا اور بالفرض علیؑ پر غالب آ گیا تو اس صورت میں اسے طلحہ و زبیر کی بیعت کرنا پڑے گی اس لیے معاویہ نے فوری طور ایک گمنام خط لکھا جس میں تحریر تھا کہ تم لوگ معاویہ کے دھوکے میں نہ آنا۔ اس سے تمھیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ جب وہ حضرت عثمانؓ کی طرف سے شام کا حاکم تھا تو اس نے ان کی مدد کرنے سے اس وقت تک گریز کیا جب تک وہ قتل نہیں ہو گئے لہٰذا یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ تم لوگوں کو مدد فراہم کرے!!

معاویہ نے یہ خط گمنام دستخط کے ساتھ زبیر کو بھیجا۔ زبیر نے خط ملنے پر مخالفین علیؑ کو جن میں بی بی عائشہؓ سرفہرست تھیں خط کے مضمون سے آگاہ کیا۔[1] جس کے بعد شام کے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا

---

۱۔ ابتدا میں حضرت عثمانؓ سے بی بی عائشہؓ کی مخالفت کا سبب یہ تھا کہ بی بی عائشہؓ اور بی بی حفصہؓ کو اپنے اپنے والد کے زمانے میں زیادہ وظیفہ ملا کرتا تھا لیکن جب حضرت عثمانؓ نے خلافت سنبھالی تو انھوں نے بنی امیہ کے لوگوں کو فائدہ پہنچایا جس کی وجہ سے بی بی عائشہؓ اور دوسرے لوگوں کے وظیفہ میں بے حد کمی واقع ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بی بی عائشہؓ حضرت عثمانؓ کی مخالف ہوگئیں اور انھوں نے اسے قتل کر دینے کے لیے لوگوں کو اکسایا۔ حضرت علی علیہ السلام سے بی بی عائشہؓ کی مخالفت کی چند وجوہات تھیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ حضرت علی علیہ السلام حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں ان کے مخالف تھے اور اس کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ کے لیے اپنی شخصیت کا اظہار مشکل ہو گیا تھا جبکہ بی بی عائشہؓ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ کسی کو اپنے باپ سے افضل دیکھ سکیں۔ دوسری طرف بی بی عائشہؓ حضرت خدیجہؑ کی سوکن تھیں اور رسول اکرم ﷺ کو جناب خدیجہؑ سے جو قلبی محبت تھی اور جس کا اظہار آنحضرت ﷺ اپنی بیٹی حضرت فاطمہؑ سے فرمایا کرتے تھے اس سے بی بی عائشہؓ کے نسوانی جذبات مجروح ہوتے تھے۔ وہ چاہتی تھیں کہ نگاہ رسولؐ میں سب سے زیادہ محترم وہی رہیں لیکن وہ برابر مشاہدہ کرتی تھیں کہ آنحضرت ﷺ جناب خدیجہؑ کی وفات کے بعد بھی ان بی بی کی قربانیوں اور خلوص و محبت کو فراموش نہ کر سکے اور حضرت فاطمہؑ سے جو جناب خدیجہؑ کی یادگار تھیں بے حد پیار کرتے تھے۔ اب چونکہ حضرت فاطمہؑ حضرت علیؑ کی زوجہ تھیں اس لیے وہ حضرت علی علیہ السلام سے بھی حسد کرتی تھیں۔ حضرت علی علیہ السلام سے بی بی عائشہؓ کی مخالفت کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ جب حضرت عثمانؓ نے ان کے وظیفے میں کٹوتی کر کے اسے اپنے رشتے داروں کو دے دیا تو انھیں توقع تھی کہ مستقبل میں وہ اپنا نقصان پورا کر لیں گی مگر جب انھیں خبر ملی کہ حضرت علی علیہ السلام خلیفہ ہو گئے ہیں تو وہ سمجھ گئیں کہ اب مالی لحاظ سے ان کا معاملہ مزید مشکلات میں پڑ گیا ہے کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ حضرت علی علیہ السلام استحقاق سے زیادہ ایک پائی بھی بیت المال سے کسی کو نہیں دیں گے اگرچہ وہ ان کا اپنا چہیتا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے علاوہ بی بی عائشہؓ خلافت کو بنی ہاشم سے نکال کر اپنے خاندان میں منتقل کرنا چاہتی تھیں اس لیے یہ مسلمہ امر ہے کہ وہ جنگ سے دستبردار نہیں ہو سکتی تھیں۔ وہ اپنی خواہشات کے ہاتھوں مجبور تھیں کہ بغاوت کرنے والوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کریں۔ مزید تفصیلات کے لیے علامہ سید مرتضیٰ عسکری کی کتاب ''تاریخ اسلام میں حضرت عائشہؓ کا کردار'' دیکھیے۔

گیا اور اسی میں مصلحت سمجھی گئی کہ بصرہ کا رخ کیا جائے کیونکہ وہاں طلحہ اور زبیر کے حمایتوں کی اکثریت تھی اور وہاں ان لوگوں کو اپنے مقصد کا حصول یقینی نظر آ رہا تھا۔

بی بی عائشہؓ نے طلحہ و زبیر اور دیگر مخالفین کے تعاون سے مکہ میں ایک لشکر تیار کیا۔ یعلیٰ بن امیہ نے اس مقصد کے لیے انھیں خطیر رقم فراہم کی جس سے ہتھیار خریدے گئے۔ اس کے بعد عسکر نامی اونٹ پر سوار ہو کر بی بی عائشہؓ بصرہ کی طرف اپنے لشکر کے ہمراہ روانہ ہوگئیں۔[1]

اس گروپ نے اس خوف سے کہ کہیں حضرت علی علیہ السلام کو اس کی خبر نہ ہو جائے، آپ کی آمد سے قبل ہی بصرہ پر قبضہ کرنے کے لیے نہایت تیزی سے کہیں رکے بغیر سفر جاری رکھا یہاں تک کہ راستے میں حوئب کے مقام پر رات ہوگئی۔ انھوں نے وہاں پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ اس رات حوئب کے کتوں نے بی بی عائشہؓ کے خیمے کے پاس بھونکنا شروع کر دیا۔ کتوں کی آواز سن کر بی بی عائشہؓ کی نیند اڑ گئی۔ انھوں نے اس جگہ کا نام پوچھا تو انھیں بتایا گیا کہ اس کا نام حوئب ہے۔ یہ سن کر وہ شدید خوفزدہ ہوگئیں اور حضرت علی علیہ السلام کے خلاف اپنے اقدام پر پشیمان ہوئیں کیونکہ انھوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ سن رکھا تھا کہ میری ایک زوجہ پر حوئب کے کتے بھونکیں گے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بی بی عائشہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: حمیرا! خبردار! کہیں وہ تم ہی نہ ہو؟

اس وقت انھیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول یاد آیا تو سخت پشیمان ہوئیں اور اصرار کیا کہ وہ اس گروپ سے علیحدگی اختیار کر کے مکہ واپس جانا چاہتی ہیں۔

زبیر کو جب یہ اطلاع ملی تو اس نے چند افراد کو قائل کیا کہ وہ اس بات کی جھوٹی گواہی دیں کہ یہ جگہ حوئب نہیں اور حوئب ابھی کئی فرسخ دور ہے۔ اس طرح انھوں نے بی بی عائشہؓ کو مطمئن رہنے کی قسم دی چنانچہ انھوں نے اپنی نگرانی میں بصرے کی طرف پیش قدمی جاری رکھی۔

بصرہ کے نزدیک پہنچ کر طلحہ اور زبیر نے اکابرین بصرہ کو خط لکھ کر حضرت علی علیہ السلام سے حضرت عثمانؓ کا قصاص لینے کی دعوت دی۔ ان اکابرین نے جواب دیا کہ حضرت عثمانؓ کو قتل کرنے والے تو مدینے میں ہیں اور تمہارا اس مقصد کے لیے یہاں آنے کا کوئی جواز نہیں ہے مگر ان لوگوں نے اکابرین بصرہ کی بات پر کان نہیں دھرا اور شہر پر حملہ کر دیا۔ کافی قتل و غارت کے بعد حضرت علی علیہ السلام کے مقرر کردہ حاکم بصرہ عثمان بن حنیف نے ہتھیار ڈال دیئے اور اس گروپ نے بصرہ پر قبضہ کر لیا۔

---

۱۔ چونکہ اس جنگ میں بی بی عائشہؓ اونٹ پر سوار تھیں اس لیے اسے ''جنگ جمل'' کہا جاتا ہے۔ بصرہ میں ہونے کی وجہ سے اسے جنگ بصرہ کا بھی نام دیا گیا ہے۔

ادھر حضرت علی علیہ السلام مختلف علاقوں کے گورنروں کو تبدیل کرنے میں مصروف تھے اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں آپ نے جریر بن عبد اللہ بجلی کے ذریعے معاویہ کو خط ارسال کیا تھا جس میں اس سے اپنی بیعت کا مطالبہ کیا تھا لیکن معاویہ نے حضرت علی علیہ السلام کے مکتوب کا جواب دینے کی بجائے زبیر کو خط لکھ کر اسے حضرت علی علیہ السلام کی مخالفت پر اکسایا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے دوبارہ جریر کو خط لکھا اور اسے تاکید کی کہ میرا خط ملتے ہی معاویہ کو جنگ اور صلح میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کرنے کو کہو۔ اگر وہ صلح پر آمادہ ہو تو اس سے میری بیعت لو اور اگر وہ جنگ چاہتا ہے تو پھر مجھے اس بارے میں آگاہ کرو۔

معاویہ نے حضرت علی علیہ السلام پر قتل عثمان کا الزام عائد کرتے ہوئے خط کے ذریعے آپ سے مطالبہ کیا کہ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو اس کے سپرد کیا جائے۔

حضرت علی علیہ السلام اپنے مخالفین میں معاویہ کو سب سے زیادہ چالاک اور دھوکے باز سمجھتے تھے۔ آپ کو معلوم تھا کہ شام میں اسے کافی اثر و رسوخ حاصل ہے چنانچہ آپ نے فیصلہ کیا کہ ایک لشکر تیار کر کے شام بھیجیں اور معاویہ کا معاملہ نمٹائیں لیکن اسی دوران آپ کو اطلاع ملی کہ بی بی عائشہؓ نے طلحہ اور زبیر کی مدد سے بصرہ پر قبضہ کر لیا ہے اور اہل بصرہ کو خون عثمانؓ کے انتقام کے بہانے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف بغاوت پر اکسایا جا رہا ہے چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے شام کی بجائے پہلے اہل بصرہ کی بغاوت کو کچلنے کا فیصلہ فرمایا۔

حضرت علی علیہ السلام مسجد میں منبر پر تشریف لے گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود وسلام کے بعد فرمایا: اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ عَایِشَةَ سَارَتْ اِلَی الْبَصْرَةِ وَمَعَهَا طَلْحَةُ وَالزُّبَیْرُ وَکُلٌّ مِنْهُمَا یَرَی الْاَمْرَ لَهُ دُوْنَ صَاحِبِهِ. اَمَّا طَلْحَةُ فَابْنُ عَمِّهَا وَ اَمَّا الزُّبَیْرُ فَخَتَنُهَا. وَاللّٰهِ لَوْ ظَفَرُوْا بِمَا اَرَادُوْا وَلَنْ یَنَالُوْا ذٰلِكَ اَبَدًا لَیَضْرِبَنَّ اَحَدُهُمَا عُنُقَ صَاحِبِهِ بَعْدَ تَنَازُعٍ مِنْهُمَا شَدِیْدٍ وَاللّٰهِ اِنَّ رَاکِبَةَ الْجَمَلِ الْاَحْمَرِ مَا تَقْطَعُ عَقَبَةً وَلَا تَحُلُّ عُقْدَةً اِلَّا فِیْ مَعْصِیَةِ اللّٰهِ وَسَخَطِهِ حَتّٰی تُوْرِدَ نَفْسَهَا وَمَنْ مَعَهَا مَوَارِدَ الْهَلَکَةِ. اَیْ وَاللّٰهِ لَیُقْتَلَنَّ ثُلُثُهُمْ وَلَیَهْرِبَنَّ ثُلُثُهُمْ وَلَیَتُوْبَنَّ ثُلُثُهُمْ وَاِنَّهَا الَّتِیْ تَنْبَحُهَا کِلَابُ الْحَوْاَبِ وَاِنَّهُمَا لَیَعْلَمَانِ اَنَّهُمَا مُخْطِئَانِ وَرُبَّ عَالِمٍ قَتَلَهُ جَهْلُهُ وَمَعَهُ عِلْمُهُ وَلَا یَنْفَعُهُ. حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ لوگو! عائشہ بصرہ روانہ ہوگئی ہیں اور طلحہ و زبیر اس کے ہمراہ ہیں۔ ان دونوں میں سے ہر ایک خلافت کا مدعی ہے اس لیے کہ طلحہ عائشہ کا چچا زاد بھائی ہے اور زبیر اس کا بہنوئی۔ خدا کی قسم! اگر یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے تو وہ دونوں ایک دوسرے کی گردن مارنے کے درپے ہوں گے تاہم وہ کامیاب

نہیں ہوں گے اور خدا کی قسم! یہ سرخ اونٹ پر سوار عورت نہ تو کوئی گرہ کھول سکے گی اور نہ ہی کسی ٹیلے پر چڑھے گی، نہ ہی کسی منزل پر رکے گی مگر یہ کہ اللہ کی نافرمانی اور غضب کی طرف جائے گی یہاں تک کہ وہ خود کو بھی اور اپنے ساتھیوں کو بھی ہلاکت کے گھاٹ اتار دے گی۔ خدا کی قسم! اس گروہ کے ایک تہائی لوگ قتل ہوجائیں گے، ایک تہائی بھاگ جائیں گے اور ایک تہائی پلٹ جائیں گے۔ یہ وہی عورت ہے جس پر حوئب کے کتے بھونکیں گے۔ طلحہ اور زبیر دونوں جانتے ہیں کہ وہ غلط راستے پر گامزن ہیں مگر بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ علم رکھنے والے اپنی جہالت کے ہاتھوں قتل ہوجاتے ہیں اور ان کا علم انھیں کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ ہماری مدد کے لیے اللہ کافی ہے جو بہترین مددگار ہے۔

(ناسخ التواریخ، حالات امیر المومنینؑ، کتاب جمل ص ۴۱)

ظاہر ہے کہ ام المومنین بی بی عائشہؓ جو رسول خدا ﷺ کی زوجہ محترمہ اور حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی تھیں نیز طلحہ و زبیر جن کا شمار مسلمانوں کی اہم شخصیات میں ہوتا تھا اور وہ رسول خدا ﷺ کے نامور اصحاب میں سے تھے ان کے خلاف لشکر کی تیاری کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس لیے حضرت علی علیہ السلام نے اہل مدینہ کو بصرہ میں ان کی کارگزاریوں سے آگاہ کرنا ضروری خیال کیا تاکہ لوگوں کو ان کی سرکوبی کے لیے اپنے ساتھ بصرہ لے جائیں۔ چنانچہ دوسرے دن آپ ایک مرتبہ پھر منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور ارشاد فرمایا: فَخَرَجُوْا يَجُرُّوْنَ حُرْمَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ كَمَا تُجَرُّ الْاَمَةُ عِنْدَ شِرَآئِهَا مُتَوَجِّهِيْنَ بِهَا اِلَى الْبَصْرَةِ، فَحَبَسَا نِسَاءَهُمَا فِيْ بُيُوْتِهِمَا وَاَبْرَزَا حَبِيْسَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ لَهُمَا وَلِغَيْرِهِمَا فِيْ جَيْشٍ مَا مِنْهُمْ رَجُلٌ اِلَّا وَقَدْ اَعْطَانِي الطَّاعَةَ وَسَمَحَ لِيْ بِالْبَيْعَةِ طَائِعًا غَيْرَ مُكْرَهٍ، فَقَدِمُوْا عَلٰى عَامِلِيْ بِهَا وَخُزَّانِ بَيْتِ مَالِ الْمُسْلِمِيْنَ وَغَيْرِهِمْ مِنْ اَهْلِهَا. فَقَتَلُوْا طَائِفَةً صَبْرًا وَطَائِفَةً غَدْرًا. فَوَاللّٰهِ لَوْ لَمْ يُصِيْبُوْا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اِلَّا رَجُلًا وَاحِدًا مُعْتَمِدِيْنَ لِقَتْلِهٖ بِلَا جُرْمٍ جَرَّهٗ لَحَلَّ لِيْ قَتْلُ ذَالِكَ الْجَيْشِ كُلِّهٖ اِذْ حَضَرُوْهُ فَلَمْ يُنْكِرُوْا وَلَمْ يَدْفَعُوْا عَنْهُ بِلِسَانٍ وَلَا بِيَدٍ، دَعْ مَا اَنَّهُمْ قَدْ قَتَلُوْا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ مِثْلَ الْعِدَّةِ الَّتِيْ دَخَلُوْا بِهَا عَلَيْهِمْ یعنی میرے مخالفین مکہ سے نکل پڑے ہیں اس حال میں کہ وہ ناموس رسولؐ کو یوں کھینچ کر میدان جنگ میں لے کر جا رہے تھے جیسے کنیزیں خرید و فروخت کے وقت لے جائی جاتی ہیں۔ ان کا رخ بصرہ کی طرف ہے۔ ان دونوں (طلحہ اور زبیر) نے اپنی عورتوں کو گھروں میں بند کر رکھا ہے اور زوجہ رسولؐ کو میدان میں لے آئے ہیں۔ ان کے لشکر میں کوئی ایسا نہیں جو میری بیعت نہ کرچکا ہو اور بغیر جبر و اکراہ کے میری اطاعت میں نہ رہ چکا ہو۔ یہ لوگ

پہلے میرے عامل بصرہ اور خازن بیت المال پر حملہ آور ہوئے اور (عثمان بن حنیف کو قتل کردیا)۔ پھر لوگوں میں سے کچھ کو صبر (یعنی ڈنڈوں اور پتھروں) سے اور کچھ کو مکر وفریب سے مار ڈالا۔ خدا کی قسم! اگر یہ لوگ وہاں سوائے ایک مسلمان کے کسی اور کو نہ پاتے اور اس ایک شخص کو عمداً قتل کردیتے تب بھی میرے لیے جائز تھا کہ میں پورے لشکر کے ساتھ ان تمام مخالفین کو قتل کر ڈالتا اس لیے کہ وہاں وہ لوگ موجود تھے جنھوں نے برے کاموں سے نہیں روکا اور اپنی زبان اور ہاتھ سے بیگناہوں کو قتل کرنے سے منع نہیں کیا قطع نظر اس سے کہ انھوں نے اپنے لشکر کی تعداد کے برابر وہاں کے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔

(نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷۰)

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے فصیح وبلیغ خطاب کے ذریعے اہل مدینہ کو صورتحال سے آگاہ فرمایا اور اصحاب جمل کی سازش کو بے نقاب کیا جنھوں نے آپ کی بیعت توڑنے کے بعد اپنے مکروہ عزائم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس طرح کی صورتحال پیدا کی تھی۔ آپ نے اہل مدینہ کو اس فتنے کی سرکوبی کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دی۔

حضرت علی علیہ السلام سہل بن حنیف کو مدینہ میں اپنا قائم مقام مقرر کرکے مہاجرین و انصار کی ایک جماعت کو لے کر جن کی اکثریت جنگ بدر میں شریک تھی بصرہ روانہ ہوگئے جبکہ آپ نے امام حسن علیہ السلام، مالک اشترؓ اور محمد بن ابی بکرؓ کو چند دیگر افراد کے ہمراہ کوفہ بھیجا تاکہ وہ کوفہ سے بھی جاں بازوں کو لے کر حضرت علی علیہ السلام کے لشکر میں شامل ہوجائیں۔ اس وقت کوفہ کا گورنر ابو موسیٰ اشعری تھا جسے حضرت عثمانؓ نے کوفہ کا گورنر مقرر کیا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اسے خط لکھا کہ وہ اہل کوفہ سے آپ کی بیعت لے لیکن اس نے یہ سوچ کر کہ حضرت عثمانؓ کے خون کا انتقام لینے والے طلحہ و زبیر کی حمایت اور کمک سے ہی وہ اپنے منصب پر باقی رہ سکتا ہے۔ اہل کوفہ کو طلحہ اور زبیر کی حمایت کرنے کی دعوت دی جو ظاہراً خون عثمان کے انتقام کا ڈھونگ رچا رہے تھے۔ اس نے حضرت علی علیہ السلام کی بیعت لینے سے جان بوجھ کر گریز کیا۔

حضرت علی علیہ السلام کے نمائندوں نے اسے سمجھانے کی جتنی کوششیں کیں وہ سب بے سود ثابت ہوئیں یہاں تک کہ مالک بن حارث الاشتر نخعیؓ نے دار الامارہ پر قبضہ کرلیا اور ابو موسیٰ اشعری کے غلاموں کو وہاں سے مار بھگایا۔ اس وقت ابو موسیٰ مسجد میں تھا۔ چنانچہ مالک اشتر مسجد میں گئے اور انھوں نے اسے منبر سے اتار کر کہا: اے غدار احمق! لوگ حضرت علی علیہ السلام کے سوا کسی کی بیعت نہیں کریں گے۔ ابو موسیٰ

نے جب دیکھا کہ وہ مالک کا مقابلہ نہیں کرسکتا تو چپکا ہو رہا۔ اس کے بعد مالک اشترؒ منبر پر گئے اور انھوں نے لوگوں کو حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کرنے کی دعوت دی۔ تقریباً تمام اہل کوفہ سے بیعت لینے کے بعد وہ مختصر مدت میں بارہ ہزار افراد پر مشتمل لشکر لے کر حضرت علی علیہ السلام کی طرف روانہ ہو گئے۔

یہ لوگ کوفہ سے نکل کر ذی قار کے مقام پر حضرت علی علیہ السلام کے لشکر سے جا ملے اور امام کی زیارت کے بعد اپنی خوشی و مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے: ہم خدائے بزرگ و برتر کے شکر گزار ہیں جس نے ہمیں آپ کا ساتھ دینے کی توفیق عطا فرمائی۔ حضرت علی علیہ السلام نے بھی ان کی حوصلہ افزائی کی۔ آپ نے اللہ کی حمد و ثنا اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام کے بعد ان لوگوں کے فیصلے کو سراہا اور انھیں طلحہ و زبیر کی طرف سے بیعت شکنی نیز خون عثمان کے انتقام کا بہانہ بنا کر بصرہ کی تاراجی سے آگاہ فرمایا اور لشکر والوں کو نئی صورتحال سے مطلع کیا۔ حضرت علی علیہ السلام کی گفتگو سننے کے بعد ان لوگوں نے راہ حق میں قربانی دینے اور اس فتنے کی سرکوبی کے لیے اپنی آمادگی کا یقین دلایا۔ (ارشاد مفید ج ۱، باب سوم، فصل ۲۱)

حضرت علی علیہ السلام اپنے لشکر کے ساتھ ذی قار سے روانہ ہو کر زاویہ پہنچے جو بصرہ سے چند کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے اور وہیں پڑاؤ ڈالا کیونکہ حضرت علی علیہ السلام ہمیشہ صلح کو جنگ پر ترجیح دیا کرتے تھے۔ اسی مقام سے آپ نے طلحہ و زبیر کو ایک خط بھجوایا اور انھیں نصیحت کی۔ امام نے اس خط کے علاوہ قعقاع بن عمر اور چند افراد کو اصحاب جمل سے مذاکرات کے لیے بھی روانہ فرمایا تاکہ یہ لوگ بات چیت کے ذریعے انھیں انجام کار سے خبردار کریں لیکن مخالفین نے جنھیں اس جنگ میں اپنی فتح کا یقین تھا ہر قسم کی نصیحت ماننے سے انکار کر دیا۔ بی بی عائشہؓ کو جب یہ خبر ملی کہ والی کوفہ ابو موسیٰ اشعری حضرت علی علیہ السلام کا مخالف ہے تو انھیں گمان ہوا کہ شاید کوفہ سے کوئی بھی شخص حضرت علی علیہ السلام کی حمایت اور مدد نہیں کرے گا لہٰذا انھیں جب اطلاع ملی کہ حضرت علی علیہ السلام بصرہ کے نزدیک پہنچ چکے ہیں تو انھوں نے قائد ہونے کی حیثیت سے زبیر کو یہ ذمے داری سونپی کہ وہ طلحہ، مروان اور دوسروں کے ساتھ مل کر لشکر کو صف آراء کریں اور جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔

قعقاع نے جب یہ دیکھا کہ بات چیت کا کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا اور مخالفین صف بندی کر رہے ہیں تو وہ حضرت علی علیہ السلام کے پاس واپس آئے اور آپ کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔

ادھر بصرہ کے قبیلہ ربیعہ سے تین ہزار افراد بھی حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ آ ملے تھے، اس طرح حضرت علی علیہ السلام کے لشکر کی تعداد تقریباً بیس ہزار تک پہنچ گئی تھی جبکہ اصحاب جمل کی تعداد تیس ہزار تھی

جنھیں ان لوگوں نے مختلف شہروں سے بھرتی کیا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے جب دیکھا کہ اصحاب جمل نے جنگ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے تو آپ نے بھی اپنے سپہ سالاروں مالک اشترؒ، عدی بن حاتمؓ، محمد بن ابی بکرؓ عمار بن یاسرؓ وغیرہ کو طلحہ اور زبیر کی نیت سے آگاہ فرماتے ہوئے ان کی جنگی ذمے داریوں کا تعین فرمایا۔

ادھر بی بی عائشہؓ اپنے لشکر کے ہمراہ زاویہ کی طرف چل پڑیں جو کہ بصرہ کے شمال میں واقع تھا اور شہر کے دفاع کے لیے نہایت مناسب علاقہ تھا۔ آپ وہاں پہنچ کر حضرت علی علیہ السلام کے لشکر کے سامنے رک گئیں۔ بعض مؤرخین کے مطابق طرفین کے سپاہیوں نے ایک دوسرے کے مقابلے کے لیے جس دن صف آرائی کی وہ ۱۷ / جمادی الثانی ۳۶ھ جبکہ ناسخ التواریخ کے مطابق ۱۹ / جمادی الاول ۳۶ھ کی تاریخ تھی۔ (ناسخ التواریخ، حالات امیر المومنینؑ، کتاب جمل ص ۷۰)

دوسرے دن زبیر نے اپنے لشکر کے مختلف دستوں کو حکم دیا کہ وہ منظم انداز میں حضرت علی علیہ السلام کے لشکر کی طرف بڑھیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے جب دیکھا کہ آتش پیکار بھڑکا چاہتی ہے تو آپ نے اپنے لشکر کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا تا کہ جنگ نہ ہو اور معاملہ صلح کے ساتھ ختم ہو جائے۔ یہ دیکھ کر بی بی عائشہؓ نے بھی اپنے لشکر کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ اس طرح طرفین میں پہلے دن کوئی جنگ نہ ہوئی۔ دوسرے دن پھر دونوں لشکر صف آراء ہوئے تو حضرت علی علیہ السلام نے تلوار اور زرہ کے بغیر اپنے لشکر سے علیحدہ ہو کر تنہا سپاہ جمل کی طرف گھوڑا دوڑایا اور سپاہ جمل کے ہراول دستے تک جا پہنچے اور بلند آواز میں زبیر کو پکارا۔ سب لوگ مبہوت رہ گئے، کوئی نہ سمجھ سکا کہ حضرت علی علیہ السلام کا مقصد کیا ہے؟ آپ بغیر تلوار اور زرہ کے اتنی بہادری سے دشمن کے سامنے کیا سوچ کر آئے ہیں؟

زبیر نے جو فولادی لباس پہنے بی بی عائشہؓ کی محمل کے پاس کھڑا تھا اپنے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھا اور حضرت علی علیہ السلام کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ جب بی بی عائشہؓ نے حضرت علی علیہ السلام کے مقابلے میں زبیر کو جاتے دیکھا تو انھیں زبیر کی موت کا یقین ہو گیا مگر ان کے ہمراہیوں نے بتایا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں، علیؑ کسی کو قتل کرنے نہیں آئے۔ وہ تلوار کے بغیر آئے ہیں۔ یقینی طور پر علیؑ کو زبیر سے کوئی کام ہوگا؟ زبیر نے حضرت علی علیہ السلام کی آنکھوں میں جھانکا تا کہ جان سکے کہ ان کو اس سے کیا کام ہے؟

حضرت علی علیہ السلام: زبیر! یہ سب کیا ہے؟ تم کس راہ پر چل نکلے ہو؟

زبیر: قتل عثمان کا قصاص لینے۔

حضرت علی علیہ السلام: اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو اپنے ہاتھوں کو خود باندھو اور خود کو عثمان کے ورثاء کے

حوالے کردو۔ کیا تمہارے علاوہ عثمان کو قتل کرانے والا کوئی اور تھا؟ زبیر خاموش رہا۔

حضرت علی علیہ السلام: میں تمہاری غلط فہمی دور کرنے اور تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ فرمودات یاد دلانے آیا ہوں جنھیں تم نے بھلا دیا ہے۔ اے زبیر! ذرا یاد کرو وہ دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرو بن عوف کے گھر میں تشریف فرما تھے اور میں تمہاری تلاش میں وہاں پہنچا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمہارا ہاتھ پکڑا ہوا تھا جونہی میں وہاں پہنچا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہل کرتے ہوئے مجھے سلام کیا تو تم نے کہا تھا کہ اے علیؑ! آپ نے تکبر کیا۔ کیوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہلے سلام نہیں کیا؟ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: زبیر! یاد رکھو! علیؑ متکبر نہیں اور مستقبل میں تم اس سے جنگ کرو گے اور اس جنگ میں تم ظالم ہوگے۔

پھر فرمایا: کیا تمھیں وہ دن بھی یاد ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تم سے پوچھا تھا: زبیر! کیا تم علیؑ کو دوست رکھتے ہو؟ تم نے کہا تھا جی ہاں یا رسول اللہؐ! علیؑ میرا ماموں زاد بھائی ہے تو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: اس کے باوجود تم اس کے خلاف جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوگے۔

حضرت علی علیہ السلام نے اسی طرح کی اور باتیں بھی زبیر کو یاد دلائیں جنھیں یاد کر کے زبیر کا ارادہ متزلزل ہوگیا اور وہ سوچنے لگا کہ میں دنیا کے لالچ میں آ کر اپنے ماموں زاد اور جانشین رسولؐ کے خلاف لڑ کر اللہ کے غضب کو دعوت دے رہا ہوں۔ (ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۲۰۲)

زبیر نے شرمندہ ہو کر حضرت علی علیہ السلام سے معذرت کی اور کہا: میں وعدہ کرتا ہوں کہ ابھی اسی وقت اس لشکر سے نکل جاؤں گا۔ اب اس کام میں ذرہ برابر مداخلت نہیں کروں گا۔ چنانچہ حضرت علیؑ اپنے لشکر کی طرف جبکہ زبیر حواس باختہ بی بی عائشہؓ کی طرف چل پڑا۔

بی بی عائشہؓ نے پوچھا: علیؑ کو تم سے کیا کام تھا؟ زبیر نے کہا: ماضی کی چند باتیں یاد دلا رہے تھے۔ بی بی عائشہؓ نے کہا: مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ علیؑ کی باتوں نے ہی تمہارے ارادے کو متزلزل کر دیا ہے۔ واقعاً حق بھی یہی ہے۔ کون ہے جو علیؑ کا سامنا کرے اور ان کا رعب اس کے وجود پر لرزہ طاری نہ کردے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا حریف وہ شخص ہے جس کا نام سن کر عرب کے سورما بھی کانپنے لگتے ہیں۔ بی بی عائشہؓ نے ایسی ایسی طنزیہ باتیں کیں کہ زبیر کو غصہ آ گیا۔ ادھر اس کے بیٹے عبد اللہ بن زبیر نے بھی بی بی کی باتوں کی تائید کی تو زبیر نے کہا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ میں اس جنگ کے فتنے میں نہیں پڑوں گا۔ ابن زبیر نے کہا: قسم کا ازالہ کفارہ ادا کر کے کیا جا سکتا ہے۔ یہ سن کر زبیر مزید بھڑک گیا اور اس نے اپنی قسم کے کفارے میں ایک غلام کو آزاد کر دیا اور حضرت علی علیہ السلام کے لشکر پر حملہ کرنے آگے

بڑھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے لشکر سے کہا: زبیر کو مت چھیڑو۔ وہ جنگ کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ادھر زبیر نے چند ایسے نمائشی حملے کئے جن میں نہ اس کو کوئی نقصان پہنچا اور نہ ہی لشکر علیؑ کا کوئی سپاہی زخمی ہوا۔ پھر وہ اپنے لشکر کی طرف واپس پلٹا اور اپنے بیٹے اور بی بی عائشہؓ کو مخاطب کر کے کہا: دیکھا تم نے، مجھے ان حملوں سے کوئی خوف نہیں۔ ابن زبیر نے ہنس کر کہا: یہ بھی ایک قسم کا بہانہ ہے لیکن زبیر نے اس کی بات پر کان نہیں دھرے اور سپاہ جمل سے نکل کر وادی السباع چلا گیا۔ وہاں وہ عمرو بن جرموز کا مہمان بنا۔ رات کو وہ سو رہا تھا کہ عمرو نے تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا۔ پھر زبیر کا جسم دفن کیا اور اس کا سر لے کر حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں پیش ہو گیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: تم نے زبیر کو قتل کر کے اچھا نہیں کیا۔ وہ تمہارا مہمان تھا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زبیر کے قاتل پر لعنت کرتے سنا تھا۔

عمرو حیران رہ گیا اور اسے قدرے افسوس بھی ہوا۔ اس نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا: میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ خاندان بنی ہاشم کے ساتھ کس طرح برتاؤ کیا جائے۔ جب کوئی آپ کی نافرمانی کرتا ہے تو آپ اس پر لعنت کرتے ہیں اور جب آپ کے دشمن کو قتل کرتا ہے تو آپ اس پر لعنت کرتے ہیں۔

(منتخب التواریخ ص ۱۷۸۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱)

بہر حال زبیر کے جانے کے بعد اس کے بیٹے عبد اللہ بن زبیر نے بی بی عائشہؓ کے فرمان کے مطابق سپاہ جمل کو حکم دیا کہ وہ علیؑ کے لشکر پر تیر اندازی شروع کرے۔ ادھر حضرت علی علیہ السلام کے سپاہیوں نے بھی نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام سے جنگ کی اجازت چاہی۔

حضرت علی علیہ السلام نے جو ہمیشہ صلح کو جنگ پر ترجیح دیا کرتے تھے جنگ سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر لشکر علیؑ کی خاموشی نے دشمن کو جری بنا دیا اور ان کی طرف سے تیر اندازی میں شدت آ گئی یہاں تک کہ لشکر علیؑ کے چند سپاہی زخمی بھی ہو گئے۔ اس صورتحال میں بھی حضرت علی علیہ السلام نے صبر کا دامن نہ چھوڑا۔ آپ نے مسلم نامی ایک جوان کو قرآن دے کر سپاہ جمل کے پاس بھیجا تاکہ انھیں احکام قرآن کے مطابق عمل کی دعوت دے۔ یہ جوان جس نے خود اس ذمے داری کو اپنے حوالے کرنے کی درخواست کی تھی جب سپاہ جمل کے نزدیک پہنچا تو انھوں نے تلوار سے اس کے دونوں بازو شہید کر دیئے۔ اس طرح وہ جوان شہادت کے بلند رتبے پر فائز ہو گیا جبکہ اس کے ہاتھ میں موجود قرآن پاک کے اوراق زمین پر بکھر گئے۔ حضرت علی علیہ السلام نے جب یہ منظر دیکھا تو فرمایا: **لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ اَلْاٰنَ طَابَ الْقِتَالُ** اب جنگ جائز ہو گئی ہے۔ پھر آپ نے سپاہیوں کو جنگ کا حکم دیا اور اپنے فرزند محمد بن حنفیہ کو

بھی دشمن پر حملہ کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: تَزُوْلُ الْجِبَالُ وَلَا تَزُلْ... بیٹا! پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے مگر تم نہ ہٹنا۔ اپنے دانتوں کو بھینچ لینا۔ اپنا کاسۂ سر اللہ کے حوالے کردینا۔ زمین میں قدم گاڑ دینا۔ نگاہ آخر قوم پر رکھنا، آنکھوں کو بند کرلینا اور اس بات کو بھی یاد رکھنا کہ مدد اللہ ہی کی طرف سے آنے والی ہے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۱)

محمد بن حنفیہ فوراً میدان کی طرف لپکے۔ اگرچہ وہ نہایت بہادر تھے تاہم دشمن کی طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی اس وجہ سے قدرے تامل کیا تاکہ تیروں کی بارش میں کچھ کمی ہو تو آگے بڑھیں۔ یہ دیکھ کر حضرت علی علیہ السلام ان کے قریب گئے اور ان کے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا: اَدْرَکَکَ عِرْقٌ مِنْ اُمِّکَ یعنی یہ تامل تمہاری ماں کے دودھ کا اثر ہے ورنہ تمہارا باپ تو ایسا نہیں۔ پھر فاتح بدر وحنین نے ذاب سے تلوار نکال کر تن تنہا دشمن پر حملہ کیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے خرمن پر گرنے والی بجلی کی مانند مختصر وقت میں سپاہ جمل کو درہم برہم کرکے رکھ دیا۔ ان کے بڑے بڑے جنگجو آپ کی تلوار سے خاک وخون میں غلطاں ہوگئے۔ حضرت علی علیہ السلام نے اتنی شدت سے تلوار چلائی کہ تلوار ٹیڑھی ہوگئی۔ چنانچہ آپ نے ایک کونے میں جاکر تلوار کو اپنے زانوئے مبارک پر رکھ کر سیدھا کیا اور اس کے بعد دوبارہ دشمن پر حملہ کیا اور شدید جنگ کے بعد اپنے خیمے میں واپس تشریف لائے اور محمد بن حنفیہ سے فرمایا: بیٹا! جنگ ایسے لڑی جاتی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب نے عرض کی: یا امیر المومنینؑ! محمد جیسے نڈر اور بہادر کی نظیر بہت کم ملتی ہے لیکن قوت وشجاعت میں آپ کی برابری کون کرسکتا ہے؟

اس کے بعد محمد بن حنفیہ چند انصار اور جنگ بدر کے کچھ مجاہدین کے ہمراہ دشمن پر ٹوٹ پڑے اور سپاہ جمل کی بہت بڑی تعداد کو تہ تیغ کرنے کے بعد واپس آئے۔ ان شدید حملوں کے نتیجے میں جنگ کے پہلے دن سپاہ جمل کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرے اور تیسرے دن بھی لشکر علیؑ کے تابڑ توڑ حملوں اور پیش قدمی کی وجہ سے سپاہ جمل کو پسپا ہونا پڑا کیونکہ ان کے حوصلے پست ہوگئے تھے اور قوت مدافعت جواب دے گئی تھی۔

حضرت علی علیہ السلام کے سپہ سالاروں مالک اشترؒ، عمار یاسرؓ وغیرہ نے نہایت شجاعت و بسالت کا مظاہرہ کیا اور دشمنوں کو خزاں رسیدہ پتوں کی طرح زمین پر بکھیر کر رکھ دیا۔ دوسری طرف طلحہ اپنے لشکریوں کو استقامت کی تلقین کرتے ہوئے انھیں بھاگنے سے باز رکھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس موقع پر مروان بن حکم نے جس کی طلحہ سے ناراضگی چل رہی تھی اپنے ایک غلام کی پشت پر کھڑے ہوکر ایک زہر آلود

تیر طلحہ کی طرف پھینکا جو نشانے پر لگا اور طلحہ ہلاک ہوگیا۔ طلحہ کی موت سے سپاہ جمل کے قدم اکھڑ گئے اور سپاہی راہ فرار اختیار کرنے لگے۔ اس موقع پر حضرت علی علیہ السلام کے لشکر نے ان کا تعاقب شروع کردیا اور بی بی عائشہؓ کی محمل کے اردگرد صرف قبیلۂ بنی ضبہ کے لوگ رہ گئے۔ یہ لوگ اپنی جان پر کھیل کر محمل کی حفاظت کررہے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام کے سپہ سالاروں نے انتہائی جرأت کے ساتھ حملہ کیا اور بی بی عائشہؓ کی محمل کی سمت بڑھے۔ جو بھی بی بی کے اونٹ کی مہار اپنے ہاتھ میں لیتا لشکر علیؑ کے کسی سپاہی کی تلوار سے اپنے ہاتھ کٹوا بیٹھتا یہاں تک کہ عبدالرحمٰن بن صرد اور بعض مورخین کے مطابق امام حسن علیہ السلام نے آگے بڑھ کر اس اونٹ کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں۔ اونٹ کے گرتے ہی اس کا دفاع کرنے والے لوگ بھاگ گئے۔

حضرت علی علیہ السلام بی بی کے نزدیک آئے اور فرمایا: يَا عَايِشَةُ اَهٰكَذَا اَمَرَكِ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَنْ تَفْعَلِيْ اے عائشہ! کیا رسول اللہؐ نے تمھیں یہی کچھ کرنے کا حکم دیا تھا؟

بی بی نے کہا: يَا اَبَا الْحَسَنِ ظَفَرْتَ فَاَحْسِنْ وَمَلَكْتَ فَاَسْجِعْ یا ابا الحسنؑ! آپ نے فتح پائی۔ اب ہم پر احسان کیجیے۔ ہم آپ کے رحم و کرم پر ہیں لہٰذا عفو و درگزر سے کام لیجیے۔

(منتخب التواریخ ص ۱۷۹۔ ناسخ التواریخ، در حالات امیر المومنینؑ، کتاب جمل ص ۸۵)

حضرت علیؑ نے محمد بن ابی بکر کو ذمے داری سونپی کہ وہ اپنی نگرانی میں اپنی بہن کو مدینہ پہنچا ئیں۔

جنگ جمل تیسرے دن ختم ہوگئی اور حضرت علی علیہ السلام کے لشکر نے شہر بصرہ کا کنٹرول حاصل کرلیا۔ لشکر علیؑ کے تقریباً بیس ہزار آدمیوں میں سے ۱۷۰۰ آدمی شہید ہوئے اور سپاہ جمل کے تقریباً تیس ہزار آدمیوں میں سے تیرا ہزار آدمی قتل ہوئے۔ بہرحال یہ ایک بہت بڑا فتنہ تھا جو بی بی عائشہؓ نے طلحہ اور زبیر کے ساتھ مل کر برپا کیا تھا۔ اسی فتنے کے نتیجے میں طلحہ اور زبیر مارے گئے۔ حضرت علی علیہ السلام کا بی بی اور بصرہ کے شکست خوردہ عوام کے ساتھ جو سلوک رہا وہ آپ کی عظمت اور جوانمردی کی واضح دلیل ہے۔

سپاہ جمل کے مفرور سپاہی بصرہ کے گرد و نواح میں روپوش تھے۔ کسی میں جرأت نہ تھی کہ اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکلے چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمان جاری کیا کہ جو بھی اسلحہ پھینک دے گا اسے عام معافی دیدی جائے گی۔ یہ لوگ جو اسی انتظار میں تھے یہ فرمان سن کر بے حد خوش ہوئے اور ہتھیار پھینک کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔

حضرت علی علیہ السلام نے حکم دیا کہ جمعہ کے دن سب بصرہ کی جامع مسجد میں نماز کے لیے جمع ہوں۔

اہل بصرہ بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز کے بعد آپ نے اپنے خطبے میں ان کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا: كُنْتُمْ جُنْدَ الْمَرْاَةِ وَاَتْبَاعَ الْبَهِيْمَةِ، رَغَا فَاَجَبْتُمْ وَعُقِرَ فَهَرَبْتُمْ. اَخْلَاقُكُمْ دِقَاقٌ وَعَهْدُكُمْ شِقَاقٌ وَدِيْنُكُمْ نِفَاقٌ... افسوس! تم ایک عورت کے سپاہی اور ایک جانور کے پیچھے چلنے والے تھے۔ وہ بلبلایا تو تم لبیک کہتے ہوئے بڑھے اور وہ زخمی ہوگیا تو تم بھاگ کھڑے ہوئے۔ تم پست اخلاق اور عہد شکن ہو اور تمہارا دین نفاق ہے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۳)

اہل بصرہ حضرت علی علیہ السلام کی باتیں سن کر بہت شرمندہ ہوئے اور انھوں نے معذرت چاہی اور مسجد میں امام کی بیعت کی تجدید کی۔

حضرت علی علیہ السلام نے بصرہ میں امن و امان بحال کرنے کی خاطر چند دن تک وہاں قیام فرمایا۔ اس دوران آپ اپنے خطاب میں لوگوں کو خدا پرستی، تقویٰ اور پاکدامنی اختیار کرنے کی دعوت دیتے رہے اور فتنہ و فساد اور گمراہی پھیلانے سے منع فرماتے رہے۔ نیز آپ نے بی بی عائشہؓ، طلحہ اور زبیر کے نامناسب رویے سے جس کا اہل بصرہ خود بھی مشاہدہ کرچکے تھے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں ان افراد کی پیمان شکنی کے انجام سے بھی باخبر کیا کہ جس کی وجہ سے بہت سے مسلمانوں کا خون بہا۔ چند دن قیام کرنے کے بعد ابن عباس کو بصرہ کا گورنر بنا کر آپ اپنے لشکر کے ہمراہ کوفہ روانہ ہوگئے۔ آپ نے دیگر علاقوں کے لیے بھی نئے گورنروں کی تقرری فرمائی۔ مالک اشترؓ کو نصیبین کا گورنر مقرر فرمایا۔

اس جنگ کے بہت برے اثرات مرتب ہوئے اور اسلام کی معنویت کو زبردست دھچکا لگا۔ اس سے عربوں میں بغض و عناد جڑ پکڑنے لگا جس نے ان کے درمیان انتقام کا بیج بو دیا اس لیے کہ یہ جنگ حضرت علی علیہ السلام کے بیس ہزار اور بی بی عائشہؓ کے تیس ہزار سپاہیوں کے درمیان ہوئی تھی اور صرف تین دن میں تقریباً پندرہ ہزار اور بعض مؤرخین کے مطابق اٹھارہ یا بیس ہزار افراد قتل ہوئے تھے۔

جنگ جمل کے سیاسی اثرات بھی بہت برے نکلے۔ مسلمانوں کے درمیان پہلے سے موجود اختلاف مزید گہرے ہوگئے جس کی وجہ سے معاویہ کے لیے خلافت تک رسائی آسان تر ہوگئی کیونکہ جتنا عرصہ حضرت علی علیہ السلام جنگوں میں مصروف رہے اتنا عرصہ معاویہ لوگوں کو دھوکا دینے اور لشکر جمع کرنے میں لگا رہا۔ اس نے شام میں بی بی عائشہؓ، طلحہ اور زبیر کی بغاوت کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور حضرت علی علیہ السلام کی مخالفت کے لیے قتل عثمان کا معاملہ خوب اچھالا۔

# (۴) جنگ صفین

اگرچہ جنگ جمل جس کی تفصیل بیان کی جاچکی ہے حضرت علی علیہ السلام کی فتح پر منتج ہوئی تاہم یہ فتح اب بھی ادھوری تھی کیونکہ ابھی معاویہ جیسے آپ کے جانی دشمن موجود تھے۔ معاویہ جو حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں شام کا گورنر مقرر ہوا تھا اب بھی وہاں حاکم تھا۔ وہ ایک عرصے سے اس علاقے پر تاحیات حکمرانی کا خواب دیکھ رہا تھا اس لیے حضرت علی علیہ السلام پر لازمی ہوگیا تھا کہ اپنے اس دشمن اور اس کے گروہ کو جو قاسطین کے نام سے مشہور تھے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کریں چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے شام پر حملہ کرنے کے لیے کوفہ میں جو چھاؤنی کا علاقہ تھا فوج جمع کرنے میں مصروف ہوگئے۔

جب نصیبین کے گورنر مالک اشترؒ کوفہ روانہ ہوئے تو راستے میں ان کا ضحاک بن قیس سے ٹکراؤ ہوا جو معاویہ کی طرف سے حران کا گورنر تھا۔ ضحاک نے مالک کا راستا روکا تو مالک نے اس کا بھرپور مقابلہ کیا اور اس کے لشکر کو مار بھگایا۔ جب معاویہ کو ضحاک کی شکست کی خبر ملی تو اس نے عبدالرحمٰن بن خالد کو ایک لشکر کے ہمراہ مالک سے لڑنے بھیجا۔ عبدالرحمٰن اپنے سپاہیوں کے ساتھ رقہ پہنچا اور مالک کے مدمقابل آ کھڑا ہوا۔ اگرچہ عبدالرحمٰن کا لشکر نفری اور جنگی سامان کے لحاظ سے مالک کے لشکر پر بھاری تھا تاہم مالک کے بہادرانہ حملوں نے اسے بھی شکست فاش دی۔ اس نے بالآخر راہ فرار اختیار کی۔ مالک کے سپاہیوں نے اس کے لشکر کا تعاقب کر کے انھیں اس علاقے سے مار بھگایا۔ اس طرح رقہ اور جزیرہ کا علاقہ جو معاویہ کے زیر تسلط تھا مالک کے قبضے میں آ گیا۔

مالک اشترؒ نے حضرت علی علیہ السلام کو خط لکھا اور ضحاک کے بعد عبدالرحمٰن کی شکست کی تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے معاویہ کی چالوں کی طرف بھی اشارہ کیا کہ یہ حملے معاویہ کی حضرت علی علیہ السلام سے مخالفت کی دلیل بھی ہیں اور اس امر کا ثبوت بھی کہ معاویہ ایک بڑی اور فیصلہ کن جنگ کی تیاری کیے ہوئے ہے۔ مالک اشترؒ کا خط موصول ہونے کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے منبر پر جا کر لوگوں کو یہ خط پڑھ کر سنایا اور

معاویہ کے عزائم سے آگاہ فرمایا کیونکہ کچھ لوگوں کو حضرت علی علیہ السلام سے معاویہ کی پرخاش کا یقین نہیں تھا۔ چنانچہ اس طرح ان لوگوں کے دل سے یہ شک دور ہوگیا اور انھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے وعدہ کیا کہ اس حوالے سے آپ جو بھی حکم دیں گے وہ اس کی اطاعت کریں گے۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام سریر آرائے خلافت ہوتے ہی شام پر حملے کا ارادہ کر چکے تھے مگر جب آپ کو سقوط بصرہ کی خبر ملی اور پتا چلا کہ طلحہ اور زبیر نے بصرہ کے عامل کو وہاں سے نکال دیا ہے تو آپ نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا اور بصرہ کا رخ کیا۔ شام پر حملے کی وجہ یہ بھی تھی کہ معاویہ نے حضرت علی علیہ السلام کے خط کے جواب میں نہ صرف یہ کہ بیعت نہیں کی تھی بلکہ طلحہ و زبیر کی طرح آپ پر قتل عثمانؓ کا الزام لگا کر قاتلان عثمانؓ سے انتقام کو اپنی مخالفت کا بہانہ قرار دیا تھا۔

معاویہ نے اپنے خط میں لکھا تھا:

معاویہ بن صخر کی طرف سے علی بن ابی طالبؑ کے نام۔

اما بعد! مجھے اپنی جان کی قسم! اگر تمہارا دامن خون عثمان سے آلودہ نہ ہوتا تو یہ مسلمان جنھوں نے تمہاری بیعت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالا ہے ان کی نظر میں تم بھی ابوبکر، عمر اور عثمان کی طرح ہوتے لیکن تم نے مہاجرین کو قتل عثمان پر اکسایا اور انصار کو ان کی مدد سے روکا۔ وہ نادان لوگ تھے جو تمہاری باتوں میں آگئے اور انھیں مظلومانہ قتل کر ڈالا لیکن اہل شام اٹھ کھڑے ہوئے ہیں وہ تمہارے خلاف جنگ سے اس وقت تک دستبردار نہیں ہوں گے جب تک قاتلان عثمان کو تم ان کے حوالے نہیں کردیتے اور خلافت کے معاملے کو شوریٰ پر نہیں چھوڑ دیتے۔ طلحہ و زبیر کی طرح تم مجھ پر کوئی حجت قائم نہیں کر سکتے اس لیے کہ انھوں نے تمہاری بیعت کی تھی مگر میں نے نہیں کی۔ نیز تم اہل شام پر اہل بصرہ کی مانند حجت قائم نہیں کر سکتے کیونکہ اہل بصرہ نے تمہاری اطاعت قبول کرلی تھی لیکن اہل شام نے ایسا نہیں کیا۔ رہی بات اسلام اور رسولؐ سے تمہاری قرابت کی تو میں تمہاری حیثیت، مقام اور شرافت سے انکار نہیں کرتا۔

(ناسخ التواریخ، کتاب صفین ص ۱۴۴)

قتل عثمان کے حوالے سے اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں خون عثمان کا انتقام ہر بغاوت کرنے والے فتنہ باز کا نعرہ تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ ایسی شخصیت سے قتل عثمان کا انتقام لینے کے درپے تھے جس کا نہ صرف اس معاملے سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ انھوں نے خیر خواہی کے جذبے سے ہمیشہ حضرت عثمانؓ کو نصیحت کی تھی۔ محاصرے کے دوران انھوں نے

حضرت عثمانؓ کے گھر پانی کی مشکیں بھی بھجوائی تھیں۔

استاد عبد اللہ علائلی اپنی تالیف ''ایام الحسینؑ'' میں لکھتے ہیں:

مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ عمرو بن عاص لوگوں کو قتل عثمان کی ترغیب دلاتا ہے، بی بی عائشہؓ کھلے عام حضرت عثمانؓ کی مخالفت کرتی ہیں، معاویہ ان کی مدد سے گریز کرتا ہے، طلحہ اور زبیر باغیوں کی مدد کرتے ہیں۔ ان کے قتل کے بعد یہی لوگ ایک دوسرے کو خون عثمان کا انتقام لینے کی ترغیب دلاتے ہیں اور حضرت علی علیہ السلام جو خیر خواہی کے جذبے سے حضرت عثمانؓ کو نصیحت کرتے ہوئے ان کی کارگزاریوں کے برے انجام سے ان کو خبردار کرتے ہیں اور ان کے سر پر آنے والی بلاؤں کو ٹالنے کی کوشش کرتے رہے انہی کو ''خون عثمان کے انتقام'' کی دھمکی دی جا رہی تھی۔

بہرحال حضرت علی علیہ السلام نے معاویہ کے خط کے جواب میں لکھا:

میری بیعت ایک عمومی بیعت ہے اور اس میں تمام مسلمان شامل ہیں چاہے وہ مدینہ میں رہتے ہوں یا بصرہ اور شام میں۔ تم مجھ پر قتل عثمان کا الزام لگا کر چاہتے ہو کہ میری بیعت سے نکل جاؤ مگر سب جانتے ہیں کہ ان کو میں نے قتل نہیں کیا کہ مجھ پر قصاص لازم آئے، تم نے خود ان کی مخالفت کی اور جب انھوں نے تم سے مدد مانگی تو تم نے ان کی مدد بھی نہ کی یہاں تک کہ وہ قتل ہو گئے۔

حضرت علی علیہ السلام نے معاویہ کو ایک اور خط میں لکھا:

فَاَمَّا اِكْثَارُكَ الْحِجَاجَ فِيْ عُثْمَانَ وَ قَتَلَتِهٖ فَاِنَّكَ اِنَّمَا نَصَرْتَ عُثْمَانَ حَيْثُ كَانَ النَّصْرُ لَكَ وَخَذَلْتَهٗ حَيْثُ كَانَ النَّصْرُ لَهٗ رہی بات تمہارا عثمان اور ان کے قاتلوں کے بارے میں جھگڑا بڑھانا تو اس کے متعلق تمہاری بات بیہودہ ہے اس لیے کہ تم نے عثمان کی اس وقت مدد کی جب اس میں تمہارا فائدہ تھا اور ان کو اس وقت بے یار و مددگار چھوڑ دیا جب تمہاری مدد ان کے حق میں مفید ہو سکتی تھی۔

(نہج البلاغہ، مکتوب ۳۷)

حضرت علی علیہ السلام نے کوفہ میں چند ماہ قیام فرمایا اور اس عرصے میں اہل شام سے جنگ سے بچنے کی خاطر معاویہ کو کئی خطوط لکھے اور اسے اپنی مخالفت کے بھیانک نتائج اور خونریزی سے بچنے کی نصیحت فرمائی مگر حضرت علی علیہ السلام کے ان تمام خطوط کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ معاویہ ہر بار آپ کے خط کے جواب میں آپ ہی کو قتل عثمان کا الزام دیتا رہا۔ معاویہ نے قبیلہ عبس کے ایک شخص کے ہاتھوں جو معاویہ کے گمراہ کن پروپیگنڈے کی وجہ سے آپ سے کینہ رکھتا تھا آپ کو ایک خط بھیجا۔ اس شخص نے کوفہ میں

وہ خط آپ کو پیش کیا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ شام کے حالات کیسے ہیں؟ تو اس نے گستاخانہ انداز میں کہا: اہل شام کے سینے تمہارے خلاف بغض سے بھرے ہوئے ہیں۔ جب تک وہ تم سے خون عثمانؓ کا انتقام نہیں لے لیتے ہرگز چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: تم احمق ہو۔ معاویہ نے تمھیں دھوکا دیا ہے۔ حضرت عثمانؓ کے قاتل ان چند افراد کے سوا جن میں معاویہ بھی شامل ہے کوئی اور نہیں۔ حضرت علی علیہ السلام کے جاں نثار اصحاب اس گستاخ شخص کو قتل کرنا چاہتے تھے مگر آپ نے ان کو یہ کہہ کر روک دیا کہ سفیر کو قتل کرنا ہمارا شیوہ نہیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے معاویہ کا خط کھولا جس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے علاوہ اور کچھ تحریر نہ تھا چنانچہ آپ نے فرمایا: معاویہ نے جنگ کا ارادہ کرلیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے حسن نیت اور فریب کے بارے میں چند جملے ارشاد فرمائے اور لوگوں کو معاویہ کی فریب کاری کے خلاف جہاد کی دعوت دی۔

معاویہ کا سفیر حضرت علی علیہ السلام کی عظمت اور دل موہ لینے والے کلام سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے کھڑے ہوکر کہا: یا امیرالمومنینؑ! مجھے معاف فرمائیں۔ میں نے آپ سے بہت دشمنی کی لیکن اب میں آپ سے محبت کرنے لگا ہوں اس لیے کہ حقائق مجھ پر واضح ہوچکے ہیں اور میں جان گیا ہوں کہ معاویہ نے میری طرح سب اہل شام کو دھوکا دے کر اپنا گرویدہ بنایا ہوا ہے لہٰذا مجھے اجازت دیں کہ آج کے بعد میں آپ کی خدمت میں رہ کر اپنی پرانی دشمنی کو آپ کی محبت میں بدل ڈالوں۔ حضرت نے شفقت بھری نظروں سے اسے داد دی اور اپنے اصحاب سے فرمایا: اس کی دیکھ بھال کا خاص خیال رکھو۔

جب یہ خبر معاویہ تک پہنچی تو اسے بڑا رنج ہوا اور اس نے کہا:

یہ شخص ہمارے تمام راز علیؑ کو بتا دے گا اس لیے بہتر یہی ہے کہ علیؑ کے حملہ کرنے سے پہلے ہم ان پر حملہ کردیں۔ معاویہ نے اسی مقصد کے لیے اپنے تمام قریبی بزرگوں، مدینہ میں موجود صحابیوں اور خاص کر امویوں کو مدد کے لیے الگ الگ خطوط لکھے مگر سوائے امویوں کے کسی نے بھی اسے خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ عبداللہ بن عمر نے تو صراحت کے ساتھ لکھا کہ میں تمہاری نیرنگیوں سے خوب واقف ہوں۔ تم نے عثمان کی مدد کرنے سے عمداً گریز کیا تھا تاکہ وہ قتل ہوجائیں اور تم مطلق العنان حاکم بن جاؤ۔

بعض دیگر افراد اور اصحاب رسولؐ نے بھی معاویہ کو ایسا ہی جواب دیا اور اس کی حمایت سے انکار کیا۔ آخرکار صرف بنی امیہ کی پشت پناہی کے سہارے وہ حضرت علی علیہ السلام سے لڑنے کے لیے تیار ہوگیا اگرچہ دل میں وہ یہی سوچ رہا تھا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں۔ حضرت علی علیہ السلام کا مقابلہ کرنا اس کے

بس کا روگ نہیں اس لیے کہ حضرت علی علیہ السلام ہر لحاظ سے اس پر برتری رکھتے تھے۔ زہد و تقویٰ اور علم و شجاعت میں بھی معاویہ آپ کے جوڑ کا نہیں تھا اور حسب نسب اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرابت کے لحاظ سے بھی حضرت علی علیہ السلام کو فضیلت حاصل تھی۔ سب باشعور لوگ جانتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام پر معاویہ کو وہی ترجیح دے سکتا ہے جو عقل کا اندھا ہو۔

کبھی اس کے ذہن میں یہ منظر ابھرتا تھا کہ میدان جنگ میں حضرت علی علیہ السلام اسے لڑنے کے لیے بلا رہے ہیں تو اس تصور سے ہی اس کا پتہ پانی ہوجاتا اور وہ خود کو حضرت علی علیہ السلام کے مقابلے میں بے تاب وتواں محسوس کرتا۔ موت اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دکھائی دیتی مگر اس کے باوجود وہ اقتدار سے دستبردار ہونا نہیں چاہتا تھا۔

ایک مدت تک وہ دن رات انہی خیالات میں کھویا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح اپنا مقصد حاصل کرے۔ آخرکار اس کے بھائی عتبہ بن ابی سفیان نے کہا: اس مسئلے کا حل صرف عمرو بن عاص کو اپنے ساتھ ملانا ہے اس لیے کہ سیاسی جوڑ توڑ اور مکر وفریب کے معاملے میں وہ عرب میں مانا ہوا ہے اور جہاں مکر وفریب کی عملداری ہو وہاں عوام کو دھوکا دینا اور گمراہ کرنا بہت آسان ہوتا ہے اور اس طرح علیؑ پر برتری حاصل کی جاسکتی ہے۔

معاویہ نے کہا: عمرو بن عاص میری دعوت قبول نہیں کرے گا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ علیؑ کو ہر لحاظ سے مجھ پر برتری حاصل ہے۔ عتبہ نے کہا: عمرو بن عاص لوگوں کو فریب دیتا رہتا ہے تم بھی عمرو کو مال اور وعدوں کے ذریعے فریب دو![1]

بے اصول معاویہ کو اپنے بھائی کی یہ تجویز پسند آئی اور اس نے عمرو بن عاص کو ایک خط لکھا جو اس وقت فلسطین میں تھا۔ خط کا خلاصہ یہ ہے:

میں عثمان کی طرف سے شام میں حاکم مقرر ہوں۔ عثمان جو خلیفہ رسولؐ تھے اپنے گھر میں پیاسے اور مظلوم شہید کردیئے گئے ہیں اور تم جانتے ہو کہ مسلمان ان کے قتل سے بہت غمگین ہیں اس لیے ضروری ہوگیا ہے کہ قاتلان عثمان سے بدلہ لیا جائے۔ اس لیے میں تم کو بھی اس کام میں شرکت کی پیشکش کرتا ہوں تاکہ اس کار خیر سے عظیم ثواب حاصل ہو۔

معاویہ ابتدا میں اپنے اصلی مقصد کو عمرو بن عاص پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا اور اس پیشکش کا

---

۱۔ لیکن حب دنیا نے عمرو بن عاص اور معاویہ دونوں کو فریب دے کر ان کی آخرت تباہ کر ڈالی۔

ہدف صرف اور صرف عمرو کو اپنی فتح کے لیے استعمال کرنا تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے اصل مقصد کا اظہار کئے بغیر عمرو کو قاتلان عثمان سے انتقام کی دعوت دی اور حضرت علی علیہ السلام کا نام نہیں لیا لیکن عمرو بن عاص معاویہ کا خط پڑھتے ہی معاویہ کی نیت جان گیا اور اس نے یہ ظاہر کئے بغیر کہ وہ اس کا مقصد جان گیا ہے معاویہ کو لکھا:

معاویہ! تم نے علیؑ سے جنگ کرنے کی مجھے ناحق ترغیب دی ہے کیونکہ علیؑ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا زاد، وصی اور جانشین ہیں اور تم جو خود کو عثمان کا مقرر کردہ حاکم کہتے ہو عثمان کے قتل کے بعد تمہارا دور حکومت بھی ختم ہو چکا ہے۔ اس کے بعد عمرو بن عاص نے اسلام کے لیے حضرت علی علیہ السلام کی عسکری خدمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کی شان میں نازل ہونے والی آیات اور احادیث کا تفصیل سے ذکر کیا اور اپنے خط کے آخر میں لکھا کہ تمہارے خط کا جواب یہی ہے جو میں نے لکھ دیا ہے۔

معاویہ نے جب دیکھا کہ اس کا نشانہ خالی گیا ہے اور وہ عمرو کو بغیر کسی شرط اور لالچ کے فلسطین سے شام نہیں بلا سکتا تو اس نے مجبور ہو کر اپنے مذموم مقاصد سے قدرے پردہ اٹھاتے ہوئے ایک اور خط میں عمرو کو لکھا:

تم علیؑ سے طلحہ اور زبیر کی جنگ کے بارے میں سن چکے ہو۔ اب مروان بن حکم بھی اہل بصرہ کی ایک جماعت کے ہمراہ میرے پاس آیا ہوا ہے۔ ادھر علیؑ نے مجھ سے بیعت کا مطالبہ کیا ہے میں تمہارے انتظار میں ہوں تاکہ تمہارے ساتھ اس بارے میں مشورہ کروں۔ اس لیے جلدی پہنچو کیونکہ میرے پاس جاہ و مقام تمہارے انتظار میں ہے۔

معاویہ کا یہ خط جب عمرو کو ملا تو اس نے اپنے بیٹوں عبد اللہ اور محمد کو بلا کر ان کی رائے معلوم کی۔ عبد اللہ نے اپنے باپ کو معاویہ کے پاس جانے سے منع کیا مگر محمد نے اس کو ترغیب دلائی۔ عمرو نے کہا: عبد اللہ تم نے میری آخرت کو پیش نظر رکھا ہے جبکہ محمد نے میری دنیا کو۔ عمرو یہ بات دوسروں سے بہتر جانتا تھا مگر اس کے باوجود اس نے اپنی آخرت کو فراموش کر دیا۔[۱]

---

۱۔ عمرو بن عاص بڑھاپے میں دنیا کی محبت میں گرفتار ہوا اور معاویہ کی طرف چل دیا حالانکہ اس کی زندگی کے صرف چھ سال باقی تھے کیونکہ ۴۲ھ یا ۴۳ھ میں جب وہ مصر کا حاکم تھا مصر میں اس کی موت واقع ہوئی۔ بقول شاعر

آدمی پیر چو شد حرص جوان میگردد      خواب در وقت سحرگاہ گران میگردد

آدمی جب بڈھا ہو جاتا ہے تو اس میں طمع عروج پر ہوتی ہے اور سحر خیزی کے وقت نیند بھی عروج پر ہوتی ہے۔ یعنی جب طمع کا وقت نہیں ہوتا اس وقت آدمی طمع کرتا ہے اور جب سونے کا وقت نہیں ہوتا اس وقت وہ سوتا ہے۔

عمرو بن عاص عازم سفر ہوا اور تیز رفتاری سے شام پہنچ گیا۔ معاویہ نے اسے خوش آمدید کہا اور اسے بڑی پذیرائی بخشی۔ جب خلوت ہوئی تو معاویہ جس نے عمرو بن عاص کو اپنی مٹھی میں کرلیا تھا ملوکانہ لہجے میں باتیں کرتے ہوئے خون عثمان کا بدلہ لینے کی بات کی اور اسے بھی اس میں شامل ہونے کی ترغیب دلائی۔ عمرو نے جب یہ دیکھا کہ معاویہ بغیر کسی صلے اور شرط کے اسے اس خطرناک کام میں دھکیلنا چاہتا ہے تو اس نے سیاست سے کام لیتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام کی تعریف کرنا شروع کردی اور اسلام کی ترقی میں ان کی خدمات اور اسلامی غزوات میں ان کی شجاعت کا ذکر چھیڑ دیا۔ پھر معاویہ سے ناصحانہ انداز میں بولا: تمہارا یہ اقدام نہ صرف آسان نہیں بلکہ یہ تمہاری آخرت کو بھی برباد کردے گا۔

معاویہ نے کہا: میں اپنی آخرت سنوارنے کے لیے ہی تو یہ قدم اٹھا رہا ہوں۔ اس سے بہتر کیا کام ہوسکتا ہے کہ میں خون عثمان کا بدلہ لینے کے لیے قیام کروں کیونکہ عثمان ایک نرم دل اور مہربان خلیفہ تھے اور ان کو مظلومانہ شہید کردیا گیا ہے۔

عمرو بن عاص نے کہا: تم نے تو مجھے لوگوں کو فریب دینے کے لیے بلایا تھا مگر اب تم ہی مجھے فریب دینے کی کوشش کر رہے ہو؟ پورے عرب میں میری مکاری کا جادو چلتا ہے۔ تم ایک عام آدمی سمجھ کر مجھ سے باتیں کر رہے ہو؟ کون عقل مند تمہاری بات پر یقین کرے گا۔ اگر واقعی تمہارا دل عثمان کے لیے دکھی ہے تو پھر اس وقت جب وہ محاصرے میں تھے اور تم سے مدد مانگ رہے تھے تم نے ان کی مدد سے پہلوتہی کیوں کی؟ تمہاری نظریں خلافت پر جمی ہوئی ہیں۔ تم خون عثمان کے انتقام کو محض ایک بہانہ بنا رہے ہو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں اس کام میں تمہارا ساتھ دوں تو تمھیں خود میری ہی زبان میں مجھ سے بات کرنا ہوگی تم یہ فریب کسی اور کو دو کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ پھر ہمارا ایک دوسرے کو دھوکا دینا چہ معنی دارد؟ اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے کندھے سے کندھا ملا کر چلوں تو پھر جس طرح تم خلافت کو اپنے لیے مختص کرنا چاہتے ہو اسی طرح مصر کی حکومت میرے لیے مختص کردو اور یہ وعدہ کرو کہ وہ ہمیشہ میرے پاس ہی رہے گی اور تم کبھی اسے مجھ سے واپس نہیں لوگے۔

معاویہ نے جب دیکھا کہ عمرو واقعی بہت ہوشیار ہے اور وہ حکومت مصر لیے بغیر تعاون نہیں کرے گا تو مجبور ہوکر اس نے عمرو کا مطالبہ مان لیا اور ان کے درمیان ایک تحریری معاہدہ ہوا کہ علیؑ پر فتح پانے اور مکمل خلافت ہاتھ آنے پر معاویہ مصر کی حکومت عمرو بن عاص کے سپرد کردے گا۔ اس تحریر میں بھی معاویہ نے فریب سے کام لیتے ہوئے کاتب سے کہا: اُكْتُبْ عَلَى أَنْ لَا يَنْقُضَ شَرْطٌ طَاعَتِهِ

لکھو کہ عمرو اطاعت معاویہ کی شرط کو نہیں توڑے گا۔ معاویہ کا مقصد تھا کہ عمرو بن عاص سے اپنی بیعت مطلقہ کا اقرار لے لے تاکہ اگر وہ اسے مصر کی حکومت نہ دے تب بھی عمرو معاویہ کی اطاعت سے منحرف نہ ہوسکے لیکن عمرو جو کہ معاویہ سے بھی زیادہ چالاک تھا اس نے کاتب سے کہا: اُكْتُبْ عَلٰى اَنْ لَا يَنْقُضَ طَاعَتَهٗ شَرْطًا لکھو کہ اس کی اطاعت کو متعلقہ شرط پورا ہونے کی صورت میں نہیں توڑے گا یعنی اگر معاویہ نے اسے حکومت مصر نہ دی تو اس کے لیے اطاعت لازمی نہ ہوگی۔

بہرحال عمرو بن عاص نے معاویہ سے تحریری معاہدہ ہوجانے کے بعد خود کو اس کے اختیار میں دے دیا اور اس کا وزیر و مشیر بن گیا۔[۱]

معاویہ نے پہلی فرصت میں عمرو بن عاص کو خلوت میں طلب کیا اور خود کو درپیش مشکلات اس کے سامنے بیان کیں۔ معاویہ کی ایک اہم مشکل یہ تھی کہ محمد بن ابی حذیفہ جو معاویہ کا سخت دشمن تھا قید خانے سے بھاگ نکلا تھا اور اس کے فرار سے معاویہ سخت پریشان تھا چنانچہ معاویہ نے عمرو سے کہا: اگر میں علیؑ سے جنگ کرنے شام سے باہر نکلتا ہوں تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں محمد بن ابی حذیفہ میری عدم موجودگی میں شام پر حملہ کرکے یہاں قابض نہ ہوجائے۔ چنانچہ علیؑ سے جنگ کرنے سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہوگی کہ محمد بن ابی حذیفہ کچھ لوگوں کو بیعت لینے کے لیے میرے پاس بھیج دے اور یہ حکومت روم بھی مسلمانوں کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شام کو دوبارہ واپس لینے کے لیے اقدام کرسکتی ہے۔

---

۱۔ عمرو بن عاص کے چچازاد بھائی کو جب معاویہ اور عمرو بن عاص کے درمیان معاہدے کی خبر ملی تو اس نے عمرو کی مذمت میں اشعار کہے تھے جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

اَلَا یَا عَمْرُو اَحْرَزْتَ مِصْرًا ... وَمَا مِلْتَ الْغَدَاةَ اِلَی الرَّشَادِ
وَبِعْتَ الدِّیْنَ بِالدُّنْیَا خَسَارًا ... فَاَنْتَ بِذَاكَ مِنْ شَرِّ الْعِبَادِ
وَمِلْتَ اِلٰی مُعَاوِیَةَ بْنِ حَرْبٍ ... فَکُنْتَ بِهَا کَوَافِدِ قَوْمِ عَادِ
اَلَمْ تَعْرِفْ اَبَا حَسَنٍ عَلِیًّا ... وَمَا نَالَتْ یَدَاهُ مِنَ الْاَعَادِی
عَدَلْتَ بِهٖ مُعَاوِیَةَ بْنَ حَرْبٍ ... فَیَا بُعْدَ الصَّلَاحِ مِنَ الْفَسَادِ

اے عمرو! تو نے مصر کی حکومت اپنے نام تو کرلی لیکن تو کبھی ہدایت کی صبح درخشاں کو نہ دیکھ سکے گا۔ تو نے دنیا کے بدلے دین بیچ کر گھاٹے کا سودا کیا ہے جس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ تو بدترین خلائق ہے۔ تو معاویہ بن حرب بن گیا، یہ ایسا ہے گویا تو قوم عاد کا نمائندہ ہے۔ کیا تو ابوالحسن علیؑ کو نہیں جانتا، ان کے ہاتھوں سے کوئی دشمن دین نہیں بچا۔ بالآخر تو معاویہ کی طرف ہی پلٹ گیا اور یوں سیدھے راستے سے دور اور فتنہ و فساد سے قریب ہوگیا۔ (ناسخ التواریخ، کتاب صفین، ص ۱۳۶)

عمرو نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: میری رائے میں علیؑ سے لڑنا زیادہ ضروری ہے جبکہ محمد بن ابی حذیفہ ہمارے لیے زیادہ اہم نہیں جبکہ حکومت روم کو تحفے تحائف بھجوا کر وقتی طور پر راضی رکھا جاسکتا ہے اس لیے تمہاری کوشش علیؑ سے جنگ کے بارے میں ہونی چاہیے۔

معاویہ نے کہا: تم جو صلاح دو گے میں وہی کروں گا۔ عمرو نے ایک گروہ کو محمد بن ابی حذیفہ کے تعاقب میں روانہ کیا جنھوں نے اسے گرفتار کر کے مار ڈالا۔ پھر معاویہ نے شہنشاہ روم کو بھی تحفے ارسال کر کے خاموش کر دیا اور اس کے بعد اپنی پوری قوت کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام سے لڑنے کے لیے لشکر تیار کرنے میں لگ گیا۔ معاویہ نے اس ضمن میں کسی بھی حیلے بہانے، جھوٹ اور ریاکاری سے گریز نہیں کیا اور خون عثمان کا انتقام لینے کے لیے اہل شام کو بھڑکاتا رہا۔ اس نے ہر جگہ حضرت علی علیہ السلام پر بہتان باندھے اور شام والوں کے دلوں میں بغض علیؑ کو پختہ کر دیا چنانچہ تیس ہزار افراد حضرت علی علیہ السلام کے خلاف جنگ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

دوسری طرف حضرت علی علیہ السلام نے دیکھا کہ متعدد خطوط بھجوانے کے باوجود معاویہ آپ کی بیعت پر آمادہ نہیں۔ نیز مالک اشترؓ کا خط بھی آپ کو اس طرف متوجہ کر رہا تھا کہ معاویہ آپ سے جنگ کے درپے ہے۔ پھر آپ کو خبر ملی کہ عمرو بن عاص بھی معاویہ کے ساتھ مل گیا ہے تو آپ نے ابن عباس کو جو بصرہ کے حاکم تھے حکم دیا کہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کو مسلح کر کے کوفہ لے آئیں۔ پھر آپ نے چند دوسرے افراد کو بھی مالک اشترؓ سمیت اپنے پاس بلوا لیا۔ آپ منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور اہل کوفہ کو معاویہ کے مذموم مقصد سے آگاہ فرما کر لشکر میں شامل ہونے کی تاکید کی۔

یہاں ہم جنگ صفین کے واقعہ کو بیان کرنے سے قبل معاویہ اور عمرو بن عاص کا تعارف کرانا چاہتے ہیں تاکہ آپ جان سکیں کہ امام علی علیہ السلام کے مقابلے میں عرب کے ان دونوں افراد نے کیونکر اتحاد کیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ جنگ صفین کے اصل ذمے دار کون تھے؟

## معاویہ کون تھا؟

معاویہ ابوسفیان اور ہند کا بیٹا تھا۔ اس نے اپنے ماں باپ کی خباثت ورثے میں پائی تھی۔ ابوسفیان رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اکثر جنگوں میں کفار قریش کا سردار رہا اور حقیقت یہی ہے کہ بدر، احد، خندق اور دیگر جنگیں اسی کی وجہ سے برپا ہوئی تھیں۔ ابوسفیان نے ۲۱ سال تک رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے

دشمنی کی اور فتح مکہ کے دن مجبوراً اسلام قبول کیا مگر باطنی طور پر کفر پر ہی قائم رہا۔

معاویہ کی ماں ہند، عتبہ بن ربیعہ بن عبدشمس کی بیٹی تھی۔ اسے آنحضرت ﷺ سے سخت بغض تھا اور وہ مکہ میں آنحضرت ﷺ کو اذیتیں دیا کرتی تھی۔ وہ جنگ احد میں دوسری عورتوں کے ساتھ ساتھ لشکر والوں کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی اور ڈھول بجا بجا کر انھیں مسلمانوں کے خلاف جوش دلا رہی تھی۔ پھر جنگ کے خاتمے پر جب رسول خدا ﷺ کے چچا حضرت حمزہ بن عبدالمطلب شہید ہو گئے تو ہند نے حضرت حمزہ کا جگر چبایا مگر اسے نگل نہ سکی۔ اسی وقت سے اس کا نام ہند جگر خوارہ مشہور ہوا۔[۱]

معاویہ بھی اپنے باپ کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف لڑتا رہا اور فتح مکہ کے دن مجبوراً اسلام لایا مگر در پردہ اسلام کو تباہ کرنے کے درپے رہا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس حقیقت کا پردہ چاک کیا ہے کہ معاویہ اور اس کا باپ تلوار کے ڈر سے اسلام لائے تھے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

فَأَنَا أَبُو حَسَنٍ قَاتِلُ جَدِّكَ وَأَخِيكَ وَخَالِكَ شَدْخًا يَوْمَ بَدْرٍ، وَذَٰلِكَ السَّيْفُ مَعِي وَبِذَٰلِكَ الْقَلْبِ أَلْقَى عَدُوِّي، مَا اسْتَبْدَلْتُ دِينًا وَلَا اسْتَحْدَثْتُ نَبِيًّا، وَإِنِّي لَعَلَى الْمِنْهَاجِ الَّذِي تَرَكْتُمُوهُ طَائِعِينَ وَدَخَلْتُمْ فِيهِ مُكْرَهِينَ میں وہی ابوالحسن ہوں جس نے بدر کے دن تمہارے نانا (عتبہ بن ربیعہ) تمہارے بھائی (حنظلہ) اور تمہارے ماموں (ولید بن عتبہ) کے پرخچے اڑائے تھے۔ وہی تلوار اب بھی میرے پاس موجود ہے اور میں اسی دل گردے کے ساتھ اب بھی دشمن کا مقابلہ کروں گا۔ نہ میں نے کوئی دین بدلا ہے اور نہ کوئی نیا نبی کھڑا کیا ہے۔ میں اسی راہ (اسلام) پر چل رہا ہوں جسے تم نے اپنی مرضی سے چھوڑ رکھا تھا اور پھر مجبوراً اس دین میں داخل ہوئے۔ (نہج البلاغہ، مکتوب ۱۰ و ۲۸)

محمد بن جریر طبری لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: إِذَا رَأَيْتُمْ مُعَاوِيَةَ عَلَىٰ مِنْبَرِي فَاقْتُلُوهُ جب کبھی معاویہ کو میرے منبر پر دیکھو تو اسے قتل کر دینا۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ ایک دن ابوسفیان گدھے پر سوار تھا۔ معاویہ نے گدھے کی لگام پکڑ رکھی تھی اور اس کا بھائی گدھے کو ہانک رہا تھا۔ رسول خدا ﷺ نے انھیں دیکھ کر فرمایا: لَعَنَ اللّٰهُ الرَّاكِبَ وَالْقَائِدَ وَالسَّائِقَ خدا اس سوار پر، اس سواری کی لگام پکڑنے والے پر اور اسے ہانکنے والے تینوں پر لعنت کرے۔

(تاریخ طبری ج ۱۱، ص ۳۵۷۔ نصر بن مزاحم، کتاب صفین ص ۲۲۰)

عیسائی دانشور جارج جرداق اپنی نفیس کتاب الامام علی کے حصہ چہارم میں لکھتا ہے:

---

۱۔ قبول اسلام کے بعد حضرت حمزہ کے قاتل وحشی کو رسول خدا ﷺ نے معاف فرما دیا تھا۔

بنی امیہ کی تمام بری خصلتیں معاویہ میں جمع ہوگئی تھیں۔ اس کی مذمت کے لیے اتنا کافی ہے کہ اسے اسلام اور انسانیت کی مطلق خبر نہ تھی اور اس کے اعمال اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ وہ اسلام سے کوسوں دور تھا۔ (الغدیر ج ۱۰)

## عمرو بن عاص کون تھا؟

عمرو اپنے حسب نسب کے لحاظ سے معاویہ کی طرح تھا۔ زمخشری اور ابن جوزی کے مطابق اس کی ماں "نابغہ" ابتدا میں ایک کنیز تھی مگر جب بدکاری کی وجہ سے وہ بدنام ہونے لگی تو اس کے آقا نے اسے آزاد کر دیا۔ نابغہ نے آزاد ہونے کے بعد بھی بدکاری جاری رکھی اور انہی تعلقات کے نتیجے میں عمرو پیدا ہوا۔ ابتدا میں پانچ آدمی عمرو کے باپ ہونے کے دعویدار تھے اس لیے کہ ابولہب، امیہ بن خلف، ابوسفیان، ہشام بن مغیرہ اور عاص نے ایک ہی طہر[1] میں اس کی ماں کے ساتھ ملاپ کیا تھا۔ عمرو کی پیدائش کے بعد زمانۂ جاہلیت کے رواج کے مطابق ان میں سے ہر ایک نے اس کے باپ ہونے کا دعویٰ کیا مگر آخری فیصلہ نابغہ پر چھوڑ دیا گیا جس نے عاص کا انتخاب کیا جو دوسروں سے زیادہ دولت مند تھا اور نابغہ پر دولت لٹاتا تھا حالانکہ عمرو کی شکل و شباہت ابوسفیان سے زیادہ ملتی تھی۔

خود ابوسفیان نے بھی کہا تھا کہ خدا کی قسم! عمرو کی ماں کے رحم میں میرا نطفہ تھا۔ شاعر رسولؐ حسانؔ بن ثابت کا شعر ہے:

أَبُوكَ أَبُو سُفْيَانَ لَا شَكَّ قَدْ بَدَتْ  لَنَا فِيكَ مِنْهُ بَيِّنَاتُ الدَّلَائِلِ

یعنی تیرا باپ ابوسفیان تھا اور تیری شکل سے یہ بات ظاہر ہے کہ تو اسی کا نطفہ ہے۔

(الغدیر ج ۱۰، ص ۲۱۹)

عمرو بن عاص بھی دشمن رسولؐ تھا اور اس نے آنحضرت ﷺ کی ہجو میں اشعار کہے تھے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا: بار الہا! میں شاعر نہیں کہ اسے شعر میں جواب دوں۔ تو اس کے اشعار کے حروف کے برابر اس پر لعنت فرما۔

عمرو ہمیشہ مخالفین رسولؐ کے ساتھ رہا۔ حبشہ جانے والے مہاجرین کو قریش کی طرف سے واپس کرنے کا مطالبہ کرنے کے لیے وہ حبشہ گیا۔ وہاں نجاشی کے سامنے حضرت جعفر بن ابی طالبؑ نے جب

---

۱۔ ایک حیض سے دوسرے حیض تک کا درمیانی عرصہ۔

اس کی مذمت کی تو اس نے بڑا شور مچایا۔ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت میں اسے مصر کا گورنر بنایا تو اس نے بیت المال کا ناجائز استعمال کیا اور حضرت عمرؓ نے اسے سخت سرزنش کی۔ معاویہ کے ساتھ مل کر اس نے جن بدترین جرائم کا ارتکاب کیا ان کا تذکرہ آگے آئے گا۔

آخرکار معاویہ اور عمرو نے دنیا سمیٹنے کے لیے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف ایک دوسرے سے تعاون کیا۔ معاویہ اسی مقصد کے لیے اپنے لشکر کے ساتھ شام سے منزلیں مارتا ہوا دریائے فرات کے کنارے صفین تک پہنچ گیا اور اس نے جنگ کا بگل بجا دیا۔

ادھر حضرت علی علیہ السلام نے نخیلہ[1] کو اپنی فوج کا مرکز قرار دیا اور نہایت ہی تجربہ کار اور باصلاحیت افراد کو مختلف دستوں کا سالار مقرر فرمایا۔ نخیلہ کے مقام سے آپ اپنے سپاہیوں کے ہمراہ ۵ رشوال ۳۶ھ کو مدائن روانہ ہوئے۔ مدائن میں آپ نے لوگوں کے مسائل سنے اور مختلف سرکاری امور نمٹائے اور پھر اپنے سپاہیوں کے ہمراہ صفین کی طرف بڑھے اور وہاں پہنچ کر معاویہ کی فوج کے بالکل سامنے پڑاؤ ڈالا۔ آپ کے سپہ سالاروں میں مالک اشتر، قیس بن سعید، عمار بن یاسر، محمد بن ابی بکر، عدی بن حاتم، ابو ایوب انصاری، ہاشم مرقال اور خزیمہ بن ثابت ذوالشہادتین کے نام قابل ذکر ہیں۔

جنگ جمل کی طرح اس جنگ سے پہلے بھی آپ نے دشمنوں کو نصیحت کے ذریعے جنگ سے باز رہنے کی تلقین فرمائی۔ آپ نے معاویہ کو دوبارہ خطوط لکھے اور اسے جنگ کے بھیانک نتائج سے خبردار فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے اپنے سپاہیوں سے خطاب کیا اور فرمایا: لَا تُقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى يَبْدَؤُوْكُمْ، فَاِنَّكُمْ بِحَمْدِ اللهِ عَلٰى حُجَّةٍ وَتَرْكُكُمْ اِيَّاهُمْ حَتّٰى يَبْدَؤُوْكُمْ حُجَّةٌ اُخْرٰى لَكُمْ عَلَيْهِمْ فَاِذَا كَانَتِ الْهَزِيْمَةُ بِاِذْنِ اللهِ فَلَا تَقْتُلُوْا مُدْبِرًا وَلَا تُصِيْبُوْا مُعْوِرًا وَلَا تُجْهِزُوْا عَلٰى جَرِيْحٍ وَلَا تَهِيْجُوا النِّسَآءَ بِاَذًى... خبردار! اس وقت تک جنگ شروع نہ کرنا جب تک وہ لوگ پہل نہ کریں کیونکہ تم بحمد اللہ اپنی حجت رکھتے ہو لہٰذا اس وقت تک ابتدا نہ کرنا جب تک وہ جنگ نہ چھیڑیں جو ان کے لیے تمہاری دوسری حجت ہو جائے گی۔ اس کے بعد جب حکم خدا سے دشمن کو شکست ہو جائے تو کسی بھاگنے والے کو قتل نہ کرنا، کسی کمزور پر ہاتھ نہ اٹھانا، کسی زخمی پر قاتلانہ حملہ نہ کرنا۔ عورتوں کو اذیت نہ دینا اگرچہ وہ تمھیں اور تمہارے سپہ سالاروں کو گالیاں ہی کیوں نہ دیں... (نہج البلاغہ، مکتوب ۱۴)

دوسری طرف معاویہ نے بھی نہ صرف یہ کہ حضرت علی علیہ السلام کے خطوط اور نصیحتوں کی کوئی پروا

---

۱۔ شام کی سمت اور کوفہ کے کنارے واقع یہ جگہ اسلحہ کا ڈپو تھا۔

نہ کی بلکہ اس نے اپنے سپاہیوں کو آپ کے خلاف لڑنے کی ترغیب دلاتے ہوئے اپنے خطاب میں کہا:
فَاِنَّكُمْ عَلٰی حَقٍّ وَلَكُمْ حُجَّةٌ وَاِنَّمَا تُقَاتِلُوْنَ مَنْ نَكَثَ الْبَيْعَةَ وَسَفَكَ الدَّمَ الْحَرَامَ فَلَيْسَ لَهُ فِي السَّمَآءِ عَاذِرٌ اس جنگ میں ہرگز سستی سے کام نہ لینا، اپنی جان دینے سے دریغ نہ کرنا۔ اس لیے کہ تم حق پر ہو اور تمھارے لیے یہ بات حجت ہے کہ تم اس کے خلاف لڑ رہے ہو جس نے عثمان کی بیعت کو توڑا اور اس کا ناحق خون بہایا حالانکہ اللہ کے حضور اس کے پاس کوئی عذر نہیں ہے۔

عمرو بن عاص نے بھی معاویہ کی طرح اپنی تقریر میں اہل شام کو جنگ کرنے کی ترغیب دلائی۔

حضرت علی علیہ السلام کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپ نے بھی اپنے سپاہیوں کو جمع کر کے انھیں معاویہ اور عمرو کی سازش سے آگاہ کر کے لشکر شام سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا اور اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: اے اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو۔ جنگ کے دوران خوف و وحشت کا سبب بننے والی چیزوں سے اپنی آنکھیں موند لو۔ آوازوں کو آہستہ کردو، گفتگو کم کرو، دشمن کا سامنا کرنے اور اس سے جہاد کرنے کے لیے تلواروں کے وار، نیزوں کے رد و بدل اور دست بدست جنگ کے لیے اپنا جی کڑا کرو۔ ثابت قدم رہنا اور اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہنا تاکہ کامیاب و کامران ہوسکو۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا کرنے سے گریز کرو کیونکہ اس طرح تم کمزور ہوجاؤ گے، صبر و ہمت سے کام لو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ خدایا! انھیں صبر کا الہام کر، ان کی مدد فرما اور انھیں بڑا ثواب عطا فرما۔ اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْهُمُ الصَّبْرَ وَاَنْزِلْ عَلَيْهِمُ النَّصْرَ وَاَعْظِمْ لَهُمُ الْاَجْرَ.

(ارشاد مفید ج ۱، باب ۳، فصل ۳۱)

معاویہ نے پہلے صفین پہنچ کر دریا کے گھاٹ کے نزدیک پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا تاکہ حضرت علیؑ کے لشکر کو دریا سے پانی لینے سے روکا جاسکے۔ اس نے حکم دیا تھا کہ اہل کوفہ کو فرات کے گھاٹ کے قریب نہ آنے دیا جائے لیکن مالک اشترؒ نے حضرت علی علیہ السلام کے حکم سے ان پر شدید حملہ کیا اور لشکر شام کے کئی سپاہیوں کو قتل کر کے گھاٹ پر قبضہ کرلیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس قبضے کے بعد دونوں لشکر والوں کو وہاں سے پانی پینے کی اجازت دے دی۔ جب فرات کے گھاٹ پر مالک اشترؒ نے قبضہ کیا اور معاویہ نے دیکھا کہ لشکر شام کی شکست اور اہل عراق کے لشکر کی فتح مالک اشترؒ کی شجاعت کی مرہون منت ہے تو اُس نے اس سورما کو ہی ختم کر دینے کا ارادہ کرلیا تاکہ لشکر شام کو مستقبل میں ان سے نجات مل جائے۔ اس مقصد کے لیے معاویہ نے سہم کو جو بڑا طاقتور پہلوان تھا مالک اشترؒ سے مقابلے کے لیے بھیجا۔

سہم ایک بڑے گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کا پورا جسم لوہے میں ڈوبا ہوا تھا اور لشکر عراق کے سامنے آکر اس نے مالک کو مبارزہ کے لیے للکارا۔ مالک اشترؓ نے جو میدان کارزار میں غضبناک شیر کی مانند حملہ آور ہوتے تھے اور اپنی تلوار سے بڑے بڑے بہادروں کے ٹکڑے کر ڈالتے تھے، گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سہم کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ سہم نے مالک اشتر کو گالیاں دیتے ہوئے ان پر یکا یک وار کردیا لیکن مالک اشترؓ نے اپنی جنگی مہارت سے اس کے وار کو خالی جانے دیا۔ پھر اپنی تلوار سے سہم کو سر سے سینے تک کو چیر ڈالا۔ اسی دوران لشکر شام سے دو جنگجو مالک اشترؓ پر ٹوٹ پڑے لیکن مالک نے انھیں بھی کوئی موقع نہ دیا، ان دونوں کو بھی قتل کر ڈالا اور واپس چلے آئے۔

اس کے بعد معاویہ نے عبید اللہ بن عمر کو چند دیگر افراد کے ہمراہ حملہ کرنے کا حکم دیا۔ عبید اللہ رجز پڑھ کر اپنی تعریفیں کر رہا تھا اور لشکر کو جنگ کے لیے للکار رہا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے محمد بن ابی بکر کو اس کے مقابلے میں بھیجا۔ محمد بن ابی بکر چند افراد کے ہمراہ عبید اللہ کی طرف بڑھے اور جنگ چھڑ گئی جو شام ڈھلے تک جاری رہی۔ طرفین ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے کہ معاویہ نے شرجیل کو عبید اللہ کی مدد کے لیے بھیجا۔ ادھر حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر، محمد بن ابی بکر کی مدد کے لیے بھیجا اور اس طرح لشکر علیؑ اور لشکر معاویہ میں گھمسان کی جنگ چھڑ گئی جس میں طرفین کا بھاری جانی نقصان ہوا۔ آخر ذی الحجہ ۳۶ھ تک یہ جنگ اسی طرح جاری رہی۔

حضرت علی علیہ السلام اس جنگ میں بھی ہمیشہ کی طرح یہی کوشش کرتے رہے کہ خونریزی سے بچا جائے لیکن معاویہ کسی طرح جنگ بندی پر تیار نہ ہوا۔ آخرکار فریقین ماہ محرم ۳۷ھ کے آغاز پر جنگ بندی پر متفق ہوگئے۔ حضرت علی علیہ السلام جنگ بندی میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے کیونکہ اس طرح امید تھی کہ اس عرصے میں طرفین کے درمیان کوئی سمجھوتہ طے پا جائے اور خون خرابہ بند ہوجائے مگر معاویہ اپنی ضد پر اڑا رہا اور صلح کی کوئی راہ نہ نکل سکی یہاں تک کہ ماہ محرم ختم ہوگیا اور یکم صفر کو دوبارہ جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور یہ جنگ ۱۷ رصفر تک جاری رہی۔ اسی حساب سے مؤرخین نے اس جنگ کی مدت میں اختلاف کیا ہے۔ بعض مؤرخین نے بارہ ماہ اور بعض نے اٹھارہ ماہ اس کی مدت لکھی ہے۔

عربوں کی داخلی جنگوں میں یہ سب سے خون آشام جنگ تھی جسے حق و باطل یا نور اور ظلمت کے درمیان ہونے والی جنگ کہا جاسکتا ہے۔

جنگ کے پہلے چند دنوں میں حضرت علی علیہ السلام نے یہی مصلحت سمجھی کہ ایک کے مقابلے میں ایک

شخص لڑے تاکہ زیادہ خونریزی سے بچا جاسکے لیکن اس دوران آپ کے اصحاب باوفا میں سے حضرت عمار یاسرؓ شہید ہوگئے۔

معاویہ نے عرب کے مشہور پہلوان اجیر کو حضرت علی علیہ السلام کے سپہ سالاروں سے لڑنے کے لیے بھیجا۔ حضرت علی علیہ السلام کا ایک غلام اس شخص کے ہاتھوں شہید ہوگیا۔ غلام کی شہادت سے حضرت علی علیہ السلام کو بہت دکھ ہوا اور آپ خود اس کے مقابلے کے لیے تشریف لے گئے۔ اجیر حضرت علی علیہ السلام کو نہیں پہچانتا تھا۔ اس نے بڑے غرور سے حضرت علی علیہ السلام پر اپنی تلوار کا وار کیا مگر آپ نے اس کا وار ناکام بنا دیا اور اس کے بعد اپنے دست مبارک سے اجیر کو اس کی زین سے اٹھا کر اس طرح زمین پر پٹخ دیا کہ اس کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہلاک ہوگیا۔ پھر آپ نے لشکر شام پر حملہ کیا اور بہت سے شامیوں کو قتل کرنے کے بعد واپس آگئے۔

۴ رصفر ۳۷ھ کا دن تھا جب ابو ایوب انصاریؓ نے اپنے دستے کے سپاہیوں کو لشکر شام پر حملے کے لیے روانہ کیا جبکہ خود معاویہ پر حملے کے لیے آگے بڑھے۔ جو بھی ان کے راستے میں آتا وہ ان کے ہاتھ سے قتل ہوجاتا۔ معاویہ نے جب انھیں اپنے قریب آتے دیکھا تو بھاگ کر شامیوں کے درمیان چھپ گیا۔ ابو ایوب انصاریؓ سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد کو قتل کرنے کے بعد اپنے سپاہیوں سمیت واپس آگئے۔ معاویہ یہ منظر دیکھ کر بے حد بے چین ہوگیا اور شامیوں پر برس پڑا کہ تم لوگ اتنی بھاری تعداد میں ہوتے ہوئے بھی ابو ایوب انصاری کا مقابلہ نہ کرسکے اور وہ میرے نزدیک پہنچ گئے حالانکہ اگر تم میں سے ہر ایک اسے ایک ایک پتھر مارتا تو وہ پتھروں میں دب جاتے۔ مرقع بن منصور نے معاویہ سے کہا: کبھی کبھی کوئی سوار میدان کارزار میں کود کر اس طرح کے کام کرجاتا ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں اور اب میں بھی انہی کی طرح اہل عراق کے لشکر میں گھس کر علیؑ کے خیمے تک پہنچ جاؤں گا۔

معاویہ نے کہا: میں دیکھتا ہوں تم کیا کارنامہ کرتے ہو؟ مرقع نے تیزی سے اپنے گھوڑے کا رخ اہل عراق کے لشکر کی طرف موڑا اور اس نیت سے آگے بڑھا کہ راستا بناتے ہوئے خود کو حضرت علیؑ تک پہنچائے گا لیکن جونہی وہ ابو ایوب انصاری کے سپاہیوں کے قریب پہنچا مرقع کا سر ہوا میں اڑتا نظر آیا۔ یہ دیکھ کر معاویہ کو طیش آگیا اور اس نے عام حملے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے بھی اپنے لشکر کو جنگ مغلوبہ کا حکم دے دیا۔ یہ پہلا عام حملہ تھا جو دونوں لشکروں کے درمیان شروع ہوا۔ حضرت علی علیہ السلام کے سپہ سالاروں نے نہایت بے جگری کے ساتھ لڑنا شروع کیا۔

یہ خونریزی معاویہ کی ہوس اقتدار کا نتیجہ تھی کیونکہ اس نے حضرت علی علیہ السلام کی نصیحتوں کو نظر انداز کرکے اہل شام کو جنگ میں جھونک دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت علی علیہ السلام نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ خود معاویہ کے مقابلے پر جائیں گے۔ چنانچہ آپ لشکر شام کے سامنے آئے پکارے: کہاں ہے ہند کا بیٹا؟ جب کوئی جواب نہ آیا تو آپ نے دوبارہ پکارا۔ اے معاویہ! تم تو خلافت کے مدعی ہو اور لوگوں کے قتل کا باعث بنے ہو۔ اگر مرد ہو تو سامنے آؤ اور مجھ سے لڑو۔ ہم میں سے جو بھی غالب آجائے خلافت اسی کی ہوجائے گی۔ ہم اس معاملے کا فیصلہ اپنی تلواروں پر چھوڑتے ہیں۔

معاویہ نے خوف کی وجہ سے کوئی جواب نہ دیا تو لشکر شام میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ ابرہہ الصباح بن ابرہہ نے جو شام کا ایک بہادر جنگجو تھا حضرت علی علیہ السلام کی تائید کرتے ہوئے کہا: لوگو! خدا کی قسم! اگر یہ حالت اسی طرح رہی تو تم میں سے ایک بھی آدمی زندہ نہیں بچے گا۔ کیوں خودکشی پر تلے ہوئے ہو۔ ایک طرف ہوجاؤ۔ علیؑ اور معاویہ کو دست بدست لڑنے دو۔

حضرت علی علیہ السلام نے اس کی بات سن کر فرمایا: میں نے اہل شام سے ایسی بات نہیں سنی جس نے مجھے ابرہہ کی بات سے زیادہ خوش کیا ہو لیکن معاویہ ذوالفقار حیدری کے خوف سے اپنے لشکر کی آخری صفوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے اردگرد موجود سپاہیوں سے کہا: ابرہہ کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اکابرین شام نے ایک دوسرے سے کہا: خدا کی قسم! ابرہہ ہم سے زیادہ دانا ہے۔ بات اس کے سوا کچھ نہیں کہ معاویہ علیؑ سے ڈرتا ہے؟ (ناسخ التواریخ، امیر المومنینؑ، کتاب صفین ص ۴۰۱)

حضرت علی علیہ السلام نے کئی بار معاویہ کو للکارا مگر معاویہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ آخرکار عروہ بن داؤد نے لشکر معاویہ میں سے آواز دی اب جبکہ معاویہ کو علیؑ کے ساتھ جنگ پسند نہیں تو میں خود ان کی طرف جاتا ہوں۔ پھر اس نے کہا: اے فرزند ابو طالبؑ! اپنی جگہ پر ٹھہرنا، میں تمہارا مقابلہ کروں گا۔

جب وہ حضرت علی علیہ السلام کے قریب پہنچا تو آپ نے اپنی تلوار سے ایسا زبردست وار کیا کہ وہ اپنے گھوڑے پر ہی دو ٹکڑے ہوگیا اور گھوڑے کی زین بھی کٹ گئی۔ عروہ کا ایک چچا زاد بھائی بھی لشکر میں تھا۔ وہ اس خون کا بدلہ لینے کے لیے آگے بڑھا تو حضرت علی علیہ السلام نے اسے بھی عروہ کے پاس پہنچا دیا اور خیمے میں واپس تشریف لے آئے۔

رہ گئی عمرو بن عاص کی حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ لڑائی تو وہ ایک ایسا تماشہ تھا کہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

عمرو بن عاص نہ صرف یہ کہ حضرت علی علیہ السلام بلکہ تمام مشہور جنگجوؤں کا سامنا کرنے سے گھبراتا تھا مگر وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگوں پر یہ بات ظاہر ہو کہ وہ ایک ڈرپوک شخص ہے۔ اتفاق سے ایک دن حضرت علی علیہ السلام نقاب پہنے آہستہ آہستہ سپاہ شام کے نزدیک پہنچ گئے۔ آپ اس شخص کی طرح چل رہے تھے جو معرکہ آرائی سے کتراتا ہے۔ عمرو بن عاص جو مقابلے کے لیے ایسے ہی افراد کی تلاش میں رہتا تھا اپنی بہادری کی دھاک بٹھانے کے لیے اس نقاب پوش سوار کی جانب تیزی سے بڑھا۔ اس نے سوار کے قریب پہنچ کر یہ رجز پڑھا:

يَا قَادَةَ الْكُوفَةِ مِنْ اَهْلِ الْفِتَنِ　　يَا قَاتِلِيْ عُثْمَانَ ذَاكَ الْمُؤْتَمَنِ

كَفٰى بِهٰذَا حَزَنًا مِنَ الْحَزَنِ　　اَضْرِبُكُمْ وَلَا اَرٰى اَبَا الْحَسَنِ

اے قائدین کوفہ! تم وہ اہل فتنہ ہو جنھوں نے مرد امین عثمانؓ کو قتل کیا۔ اس غم کا مداوا یہ ہے کہ میں تمھیں مار ڈالوں، میں علیؑ کو تمہارے درمیان نہیں دیکھنا چاہتا۔

حضرت علی علیہ السلام نے جب عمرو کو مکمل طور پر اپنی دسترس میں پایا تو شیر کی مانند اس کی طرف بڑھے اور یہ رجز پڑھا:

اَنَا الْاِمَامُ الْقُرَشِيُّ الْمُؤْتَمَنُ　　يَرْضٰى بِهِ السَّادَةُ مِنْ اَهْلِ الْيَمَنِ

مِنْ سَاكِنِيْ نَجْدٍ وَمِنْ اَهْلِ عَدَنِ　　اَبُوْ حُسَيْنٍ فَاعْلَمَنْ وَ اَبُوْ حَسَنِ

میں وہ امام قرشی اور مرد امین ہوں جس سے اکابرین یمن، اہل نجد اور اہل عدن خوش ہیں۔ جان لو میں حسینؑ اور حسنؑ کا بابا ہوں۔

آپ نے اپنے تعارف کے ساتھ ہی تیزی سے عمرو کو نیزے کی انی سے گھوڑے سے گرا دیا اور اس کے سر پر اپنی ذوالفقار کو لہرایا۔ عمرو نے جب حضرت علی علیہ السلام کو پہچان لیا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے دل کی رگیں پھٹ رہی تھیں۔ اس کی آرزوئیں خاک میں مل رہی تھیں اور وہ اپنی موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا۔

جب ذوالفقار کی چمک نے اسے مبہوت کر دیا تو اس حالت میں بھی جبکہ بچنے کی کوئی سبیل نہیں تھی اس نے اپنی مکاری اور حضرت علی علیہ السلام کی انسانی شرافت سے فائدہ اٹھایا۔ وہ چاروں شانے چت زمین پر گرا پڑا تھا۔ اس نے اچانک اپنی دونوں ٹانگیں اس طرح بلند کیں کہ اس کی شرمگاہ نمایاں ہو گئی اور حضرت علی علیہ السلام کی تلوار کے مقابلے میں اس کے لیے ڈھال بن گئی۔

حضرت علی علیہ السلام نے عمرو کی طرف سے منہ پھیر لیا اور یہ فرماتے ہوئے واپس ہو گئے کہ خدا کی لعنت ہو تم پر جو اپنی شرمگاہ کے مقروض ہو چکے ہو۔

عمرو نے کچھ دیر تک اپنی ٹانگوں کو اسی طرح اٹھائے رکھا یہاں تک کہ حضرت علی علیہ السلام اس سے کافی دور چلے گئے۔ پھر وہ ہانپتا کانپتا وہاں سے بھاگا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ گرتا پڑتا معاویہ کے خیمے میں پہنچا اور سکھ کا سانس لیا۔

معاویہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: عمرو! تو نے کیا ہی اچھا حربہ اختیار کیا۔ تیرے سوا کوئی اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ جا! اپنی شرمگاہ کا شکریہ ادا کر کیونکہ تو اسی کا مقروض بن گیا ہے۔ تجھے چھوڑ دینے والے کا اخلاق، عفت اور کرم قابل آفرین ہے۔ خدا کی قسم! علیؑ کے سوا اور کوئی ایسا نہ ہوگا جو تجھے اس طرح چھوڑ دیتا۔ معاویہ اپنی باتوں کے ساتھ قہقہہ لگا کر عمرو کا مذاق اڑا رہا تھا۔ چنانچہ عمرو نے بھی معاویہ کو اس کی بزدلی کا طعنہ دیتے ہوئے کہا: تمھیں یاد ہے علیؑ نے تمھیں مبارزہ کے لیے للکارا تھا پھر تم نے جواب کیوں نہیں دیا! علیؑ کا سامنا کرنے سے گریز کر کے تم اپنے لیے ننگ و عار کا باعث بن گئے ہو۔

معاویہ نے کہا: میں اقرار کرتا ہوں کہ میں علیؑ جیسے بہادر سے نہیں لڑ سکتا مگر تیرا آج کا یہ عمل بے حد مضحکہ خیز ہے۔ عمرو معاویہ کے طنز سے بہت دکھی ہوا اور معاویہ کو کوستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اس حقیقت کے باوجود کہ جنگ کے آغاز سے ہی حضرت علی علیہ السلام کے سپہ سالار مسلسل کامیاب ہو رہے تھے حضرت علی علیہ السلام کی یہی کوشش تھی کہ صلح کو جنگ پر ترجیح دیں تاکہ مسلمانوں کا خون نہ بہے۔ آپ خونریزی سے منع فرمایا کرتے یہاں تک کہ جنگ کے دوران بھی پند و نصیحت سے کام لیتے تھے لیکن جب نصیحت کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوتا تو مجبوراً جنگ جاری رکھتے۔

حضرت علی علیہ السلام اپنے لشکر والوں سے نہایت ہی مؤثر انداز میں خطاب فرماتے۔ آپ کے خطبات آپ کے لشکر والوں کی قوت ایمانی اور جذبہ جہاد میں اضافے کا باعث بنتے کیونکہ آپ کا کلام ملکوتی کلام تھا اور سننے والوں کے دل و دماغ کو منقلب کر دیتا تھا۔

آپ نے اپنے سپاہیوں سے فرمایا: موت سے خوف کی وجہ سے جنگ سے بھاگنا بے معنی ہے کیونکہ جب تک کسی کی موت کا وقت نہ آجائے وہ نہیں مرے گا۔ پھر آپ نے بطور دلیل یہ آیت تلاوت فرمائی: قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ○

اے رسولؐ! کہہ دیجئے اگر تم موت اور قتل سے بھاگو گے تو تمھیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور دنیا میں تھوڑی دیر ہی آرام کرسکو گے۔ (سورۂ احزاب: آیت ۱۶)

اسی طرح آپ اپنے لشکر کو صبر و بردباری سے کام لینے کی تلقین اور راہ خدا میں شہادت کے اجر کی یاد دہانی کے لیے یہ آیت پڑھ کر ان کا ایمان تازہ کردیتے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ بے شک اللہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ (سورۂ صف: آیت ۴)

حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب بھی اپنی فداکاری اور جاں بازی کے ذریعے آپ سے اپنی عقیدت کا عملی مظاہرہ کرتے تھے۔

دوسری طرف معاویہ تھا جس نے جھوٹے وعدوں کے ذریعے اپنے سپاہیوں کو مشتعل کر کے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف برسرپیکار رکھنے کے علاوہ حضرت علی علیہ السلام کے لشکر میں بھی مختلف بہانوں سے پھوٹ ڈالنے کی کوششیں جاری رکھی ہوئی تھیں۔

حضرت علی علیہ السلام کے لشکر میں سے ایک شخص خالد بن معمر معاویہ کے فریب میں آگیا۔ خالد ایک مشہور جنگجو تھا۔ اس نے حضرت علی علیہ السلام کے حکم پر ۹ ہزار سپاہیوں کے ہمراہ لشکر شام پر زبردست حملہ کیا تھا اور لشکر شام کے درمیان سے گزرتا ہوا معاویہ کے خیمے تک پہنچ کر معاویہ کے کئی محافظوں کو قتل کرچکا تھا۔ معاویہ نے جب اپنے لشکر کو شکست کھاتے دیکھا تو اس نے ہشیاری سے کام لیتے ہوئے اپنے ایک محرم راز کو خالد کے پاس بھیجا اور کہا کہ اس سے کہو: یہ جنگ تمہارے لیے بیکار ہے۔ تم لوگوں کو قتل کرنے کی بجائے میری خلافت کی راہ ہموار کرو۔ میری کامیابی کی صورت میں میں خراسان کی حکومت تمہارے حوالے کردوں گا۔

تیغ زنی کے جوہر دکھانے والے خالد کے بازوؤں کی طاقت اس آرزوئے خام کی طمع میں کمزور پڑ گئی اور وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ یہ نفاق کا پہلا بیج تھا جو معاویہ نے حضرت علی علیہ السلام کے سپہ سالاروں کے دلوں میں بویا تھا۔ اس کے بعد اس نے اشعث بن قیس کو بھی امارات کا وعدہ دے کر بہکایا۔ بعد میں انہی لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام کے پیروکاروں کو آپ سے منحرف کردیا تھا۔

جنگ صفین روز بروز شدت پکڑ رہی تھی کیونکہ اب تلوار کے سوا کوئی اور چیز طرفین کے مابین فیصلہ نہیں کرسکتی تھی اس لیے دونوں طرف سے دباؤ تھا کہ جنگ کو جاری رکھا جائے تاکہ معلوم ہوجائے کہ فتح کس کے قدم چومتی ہے؟ اسی وجہ سے ہر روز صبح سے شام تک دونوں لشکر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے

اور بہت سے سپاہی خاص کر شامی ہلاک ہو جاتے۔

معاویہ کے جو جنگجو حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ اتر گئے ان میں سے ایک مخارق بھی تھا۔ اس نے حضرت علی علیہ السلام کے چار سپہ سالاروں کو یکے بعد دیگرے شہید کیا تھا۔ پھر اس نے ان شہیدوں کے سر کاٹے اور ان کی شرمگاہیں کھول دیں۔ حضرت علی علیہ السلام کو اس کی اس حرکت سے بہت تکلیف ہوئی اور آپ نقاب ڈالے اس کی طرف بڑھے اور اسے اس کے گھوڑے پر ہی دو ٹکڑے کر ڈالا۔ اس کے گھوڑے کی زین بھی کٹ گئی تھی۔ اس کے بعد سات نامور شامی تیغ آزما مخارق کے خون کا بدلہ لینے کے لیے میدان میں آئے تو حضرت علی علیہ السلام نے ان سبھوں کو جہنم رسید کر دیا۔

بعد میں بُسر بن ارطات نے جس کے سر پر ہیرو بننے کا بھوت سوار تھا معاویہ کو حضرت علی علیہ السلام کے مقابلے سے عاجز دیکھا تو اس نے حضرت علی علیہ السلام کو قتل کرنے یا ان کے ہاتھوں قتل ہو جانے کا ارادہ کیا کیونکہ دونوں صورتوں میں وہ مشہور ہو جاتا۔ اسی مقصد سے وہ لشکر شام سے نکل کر لشکر علیؑ کی طرف آیا۔ جب وہ قریب پہنچا اور اس کی نظریں حضرت علی علیہ السلام سے ملیں تو خوف سے اس کا رواں رواں کانپنے لگا اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ حضرت علی علیہ السلام فوراً اس کی طرف بڑھے اور نیزہ مار کر اسے زمین پر گرا دیا۔ بسر نے جب خود کو موت کے چنگل میں دیکھا تو اس نے بھی عمرو بن عاص کی طرح اپنی شرمگاہ کھول دی اور خود کو حضرت علی علیہ السلام کی تلوار سے بچا لیا کیونکہ حضرت علی علیہ السلام نے فوراً اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور فرمایا: خدا کی لعنت ہو عمرو بن عاص پر جس نے اس بے غیرتی کو تمہارے درمیان رواج دیا۔ بسر فوراً بھاگا اور لشکر شام میں پہنچ کر دم لیا۔ اس طرح اس کا نام بہادری میں مشہور ہونے کی بجائے ذلت کا باعث بن گیا۔

اس واقعے کے بعد اہل عراق اہل شام کو ملامت کرتے ہوئے کہتے کہ تم باتیں تو مردانگی کی کرتے ہو مگر میدان کارزار میں تمہاری ڈھال تمہاری شرمگاہیں ہوتی ہیں۔ کتنے ذلت کی بات ہے کہ اس حیلہ کو عمرو بن عاص نے تمہارے لیے یادگار بنا دیا ہے۔ خود حضرت علی علیہ السلام نے بھی نہج البلاغہ میں عمرو کی بری خصلتوں کے بیان میں فرمایا ہے: فَإِذَا كَانَ عِنْدَ الْحَرْبِ فَأَيُّ زَاجِرٍ وَ آمِرٍ هُوَ مَا لَمْ تَأْخُذِ السُّيُوفُ مَآخِذَهَا فَإِذَا كَانَ ذَالِكَ كَانَ أَكْبَرُ مَكِيدَتِهِ أَنْ يَمْنَحَ الْقَوْمَ سَبَّتَهُ! جب جنگ میں آتا ہے تو جب تک تلواریں نیام سے باہر نہ نکل آئیں تو کیا کیا باتیں بناتا ہے (فتنہ و فساد پیدا کرنے کے لیے) لیکن جب تلواریں اپنی منزل پر زور پکڑ لیتی ہیں تو اس کا سب سے بڑا حربہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی شرمگاہ کو

لوگوں کے سامنے برہنہ کردے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۸۳)

جنگ صفین میں حضرت علی علیہ السلام کے جو جاں نثار شہید ہوئے ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بزرگ صحابی حضرت عمار یاسرؓ بھی تھے۔ اگرچہ حضرت عمار یاسرؓ تقریباً نوے سال کے تھے مگر انھوں نے میدان کارزار میں نہایت ہی مدلل اور شیریں لہجے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح اور معاویہ اور اس کے پیروکاروں کی مذمت کی اور فرمایا:

نَحْنُ ضَرَبْنَاكُمْ عَلٰى تَنْزِيلِهٖ وَالْيَوْمَ نَضْرِبُكُمْ عَلٰى تَأْوِيلِهٖ

ہم ماضی میں قرآن کی تنزیل پر تم سے جنگ کیا کرتے تھے اور آج اسی قرآن کی تاویل پر تمہارے ساتھ برسرپیکار ہیں۔

حضرت عمارؓ نے اس جنگ میں لشکر شام کے بہت سے سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور ابو العادیہ کے ہاتھوں جام شہادت نوش فرمایا۔ حضرت عمارؓ کی شہادت پر حضرت علی علیہ السلام کو شدید دکھ ہوا۔ آپ نے اپنے سپاہیوں سے فرمایا: جس کسی کو عمار کی شہادت سے دکھ نہ پہنچا ہو اسے اسلام سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔

حضرت عمارؓ کی شہادت کے بعد لشکر شام میں سراسیمگی پھیل گئی کیونکہ اکثر لوگ سن چکے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: تَقْتُلُكَ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ یعنی عمار تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔[۱]

اہل شام نے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہی وہ باغی گروہ ہیں کیونکہ ہم نے ہی عمار کو قتل کیا ہے لیکن معاویہ نے کہا: اِنَّمَا قَتَلَهٗ مَنْ اَخْرَجَهٗ ان کا قاتل وہ ہے جو انھیں ان کے گھر سے میدان جنگ میں کھینچ کر لایا ہے۔ معاویہ کی اس بات کا مقصد حضرت علی علیہ السلام کو حضرت عمارؓ کے قتل کا ذمے دار ٹھہرانا تھا۔ عمرو بن عاص نے آہستہ سے معاویہ سے کہا: اس صورت میں حمزہؓ کے قتل کے ذمے دار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے نہ کہ مشرکین مکہ کیونکہ وہی حمزہؓ کو احد میں لے کر آئے تھے۔ معاویہ نے کہا: یہ مذاق اور فضول باتوں کا

---

۱۔ مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت حضرت عمارؓ کے سر سے غبار صاف کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا:

وَيْحَ عَمَّارٍ تَقْتُلُهُ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ عَمَّارٌ يَدْعُوهُمْ اِلَى اللّٰهِ وَيَدْعُوْنَهٗ اِلَى النَّارِ یعنی افسوس! عمار کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔ عمار انھیں اللہ کی طرف بلا رہے ہوں گے اور وہ ان کو جہنم کی طرف بلا رہے ہوں گے۔

(صحیح بخاری جلد ۲، صفحہ ۶۹، مطبوعہ دار الاشاعت، کراچی)

سب سے پہلا سر جو زمانہ اسلام میں کاٹ کر لے جایا گیا وہ حضرت عمار بن یاسرؓ کا سر تھا۔

(مولانا مودودی، خلافت وملوکیت، صفحہ ۱۷۷) رضوانی

وقت نہیں۔ خبردار! ایسی بات کسی اور کے سامنے مت کہنا۔

حضرت علیؑ کے دیگر سرداران لشکر میں ہاشم بن عتبہ (مرقال)، عمر بن محصن اور خزیمہ بن ثابت تھے جو زبردست جنگ کرنے کے بعد شہید ہوئے۔

مالک اشترؒ کو حضرت علی علیہ السلام کے سرداران لشکر میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ انھوں نے صفین میں زبردست حملے کر کے سپاہ شام کو پیچھے دھکیل دیا تھا۔ ایک دن میدان جنگ میں ان کی للکار پر عبید اللہ بن عمر مقابلے کے لیے معاویہ کے لشکر سے نکلا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا مدمقابل کون ہے۔ جونہی وہ قریب پہنچا، اس نے مالک اشترؒ کو پہچان لیا اور دہشت زدہ ہوگیا۔ موت کو سامنے دیکھ کر اس نے کہا:

اے مالک! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ للکارنے والے تم ہو تو میں ہرگز لڑنے نہ آتا۔ اب مجھے اجازت دو کہ میں واپس چلا جاؤں۔ مالک نے کہا: تم اس ذلت کو کیونکر قبول کرو گے کہ اہل شام یہ کہیں کہ عبید اللہ اپنے مدمقابل کے سامنے سے بھاگ گیا۔ اس نے کہا: جان کے مقابلے میں لوگوں کی باتوں کی کوئی پروا نہیں۔ لوگوں کا فَرَّ جَزَاہُ اللّٰہُ[1] کہنا قُتِلَ رَحِمَہُ اللّٰہُ[2] کہنے سے بہتر ہے۔ مالک نے کہا: جاؤ! میں نے تمھیں چھوڑ دیا مگر یاد رکھو آج کے بعد جب تک پہچان نہ لو کسی کے مقابلے کے لیے مت نکلنا۔ عبید اللہ نے واپس آ کر کہا: خدا نے آج مجھے شیر غضبناک سے بچا لیا ہے۔ یہ سن کر معاویہ نے کہا: اے بزدل! کیا تیرا بھاگ آنا کافی نہیں تھا کہ تو مالک کی تعریف کر کے ہمارے سپاہیوں کے حوصلے بھی پست کرنا چاہتا ہے؟ مالک بھی ایک انسان ہے اور تم بھی انسان ہو پھر یہ خوف کس لیے ہے۔ تم نے اس سے مقابلہ کیوں نہیں کیا؟ اس نے کہا: اے امیر! تمھیں زیب نہیں دیتا کہ تم میری توہین کرو۔ اس جنگ کا اصل سبب تم ہی ہو۔ سب سے زیادہ تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم میدان میں جا کر لڑو۔ تم خود کیوں نہیں جاتے۔ مالک بھی انسان ہے اور تم بھی انسان ہو؟

بہرحال لشکر معاویہ کے سرداروں میں سے ہر ایک نے اپنی قوم اور قبیلے کے ہمراہ مالک کے ساتھ جنگ کی اور مالک اشتر نے اپنے قبیلے کے کچھ لوگوں کے ساتھ سخت مقابلہ کیا اور مجموعی طور پر لشکر شام کے ۸۰ افراد کو قتل کر ڈالا۔ مالک بڑی کوششوں کے بعد عمرو بن عاص تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور انھوں نے اسے نیزہ مار کر زمین پر گرایا ہی تھا کہ عمرو بن عاص کے طرفدار جمع ہو کر مالک اور عمرو کے درمیان حائل ہو گئے اور عمرو کو میدان سے بچا لے گئے۔

---

۱۔ بھاگ گیا، اللہ اسے جزا دے۔ ۲۔ قتل ہوگیا، اللہ اس پر رحمت کرے۔

مالک نے اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ لڑنے والے بہت سے لوگوں کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا اور یزید بن زیاد اور نعمان بن جبلہ جیسے سورماؤں کے چھکے چھڑا دیئے اور ان کے قبیلوں کو تتر بتر کر دیا۔ انھوں نے اس طرح دادِ شجاعت دی کہ سب حیران رہ گئے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے یہ جنگ عربوں کی خون آشام داخلی جنگ تھی اور حضرت علیؑ کو مسلمانوں کے اختلاف کا بے حد دکھ تھا۔ آپ نے متعدد بار معاویہ کو نصیحت کی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اسے خود نبرد آزمائی کی دعوت دی تاکہ جنگ کا فوری فیصلہ ہوجائے مگر اس نے اسے قبول نہ کیا یہاں تک کہ آپ نے دوسری بار معاویہ کو جوش دلانے والے اشعار پڑھ کر اسے للکارا مگر وہ سامنے نہ آیا۔ اس کے بعد آپ نے مالک کے ساتھ مل کر اس گمراہ گروہ پر حملہ کیا اور مختصر سے عرصے میں معاویہ کے سپاہیوں کو چوہوں کی طرح بلوں میں گھس جانے پر مجبور کر دیا۔

جنگ کے آخری دنوں میں سپاہ شام کی شکست یقینی ہوچکی تھی۔ حضرت علیؑ اور مالک کی نگرانی میں سپاہ عراق نے سپاہ شام کے گرد گھیرا تنگ کر کے شکست ان کے ماتھے پر لکھ دی تھی حالانکہ معاویہ ہر لحہ اپنے سپہ سالاروں کو مختلف صوبوں کی حکومت کا لالچ دے کر اور عام افراد کو درہم و دینار کے وعدوں کے ذریعے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کوشاں تھا۔

مؤرخین کے مطابق لشکر عراق کے تمام سپاہی دو مرتبہ حملہ کرنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھے تھے۔ پہلی مرتبہ عمار یاسرؓ اور اویس قرنی کی شہادت کے بعد — جنھوں نے کوفہ کے سرداروں اور بنی ہاشم کے جوانوں کے ساتھ مل کر سپاہ شام پر حملہ کیا تھا بلکہ معاویہ کے خیمے تک جا پہنچے تھے — اور دوسری مرتبہ لیلۃ الہریر کے موقع پر جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

سردیوں میں جب سخت سردی پڑتی ہے تو کتے بھونکنے کی بجائے ٹھنڈ کی تکلیف سے چلاتے ہیں۔ اس چلانے کو عربی میں ہریر کہتے ہیں۔ لیلۃ الہریر میں زخموں کی کثرت اور درد کی شدت کی وجہ سے لشکر شام کے سپاہی چلا رہے تھے اور تاریک رات میں ان کی چیخ و پکار راتوں کو سنائی دینے والی کتوں کی چیخوں سے مشابہ تھی اس لیے اس رات کو لیلۃ الہریر کہا جاتا ہے۔

لیلۃ الہریر میں لڑی جانے والی لڑائی جنگ صفین کا آخری معرکہ تھا۔ اس کی تفصیل بیان کرنے سے قبل حضرت علیؑ اور معاویہ کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی اس کا مختصر تذکرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لیلۃ الہریر سے چند روز پہلے معاویہ نے حضرت علیؑ کو خط لکھ کر درخواست کی تھی کہ آپ شام کی

حکومت معاویہ کو دینے کا اعلان کریں تا کہ جنگ کا خاتمہ ہو۔

ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں لکھتے ہیں:

معاویہ نے خط لکھتے وقت اپنا مقصد عمرو بن عاص کو بتایا تو اس نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا: معاویہ! تم کتنے بھولے ہو؟ کیا تمہارا فریب علیؑ پر کوئی اثر کرے گا؟ معاویہ نے کہا: ہم دونوں کیا عبد مناف کی اولاد نہیں ہیں؟

عمرو نے کہا یہ تو ٹھیک ہے مگر وہ خاندان نبوت کے فرد ہیں اور تمھیں اس طرح کا کوئی شرف حاصل نہیں ہے۔ بہر حال اگر تم خط لکھنا ہی چاہتے ہو تو لکھو۔

معاویہ نے خط میں لکھا:

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ جنگ اس قدر جانی نقصان کا باعث بنے گی تو میں ہرگز یہ قدم نہ اٹھاتا۔ میں اپنی عقل پر حیران اور اپنے کئے پر پشیمان ہوں اور آئندہ اپنی اصلاح کی کوشش کروں گا۔ میں نے پہلے بھی طوق اطاعت کا بوجھ اٹھائے بغیر شام کی حکومت اپنے پاس رکھنے کا مطالبہ کیا تھا جو قبول نہ ہوا آج پھر میں وہی مطالبہ دہرا رہا ہوں۔ خدا کی قسم! بہت زیادہ سپاہی قتل ہو چکے ہیں۔ میدان جنگ لاشوں سے اٹ گیا ہے۔ بڑے بڑے سورما پیوند خاک ہو گئے ہیں۔ باقی ماندہ افراد کی جان کے بارے میں سوچنا ضروری ہو گیا ہے۔ ہم دونوں عبد مناف کی اولاد ہیں اور ہم میں سے کسی کو بھی ایک دوسرے پر کوئی برتری حاصل نہیں کہ جس کی وجہ سے کوئی کسی کا فرمانبردار بنے۔ والسلام

حضرت علی علیہ السلام نے خط پڑھنے کے بعد معاویہ کو لکھا:

مجھے تمہارا یہ مطالبہ کہ میں شام کا علاقہ تمہارے حوالے کردوں قبول نہیں ہے کیونکہ میں جس چیز سے کل انکار کر چکا ہوں وہ آج تمھیں عطا نہیں کرسکتا۔ تمہارا یہ کہنا کہ جنگ میں بہت زیادہ سپاہی مارے جا چکے ہیں لہٰذا باقی رہ جانے والوں کی فکر ضروری ہے تو یاد رکھو! جس کا خاتمہ حق پر ہوا ہے اس کا انجام جنت ہے اور جسے باطل نگل گیا ہے اس کا انجام دوزخ ہے۔ اور تمہارا یہ کہنا کہ ہم دونوں عبد مناف کی اولاد ہیں تو یہ بات صحیح ہے لیکن نہ امیہ، ہاشم جیسا ہوسکتا ہے، نہ حرب عبد المطلب جیسا، نہ ابوسفیان ابو طالبؑ جیسا ہوسکتا ہے اور نہ راہ خدا میں ہجرت کرنے والا آزاد کردہ غلام جیسا، نہ واضح نسب والے کا قیاس، استلحاق کردہ پر ہوسکتا ہے اور نہ حق کو باطل جیسا قرار دیا جاسکتا ہے۔

بدترین اولاد وہ ہے جو اپنے ان آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلے جو جہنم میں گر چکے ہیں۔

ان باتوں سے قطع نظر ہمارے ہاتھوں میں نبوت کا شرف ہے جس کے ذریعے ہم نے باطل کے عزت داروں کو ذلیل اور حق کے کمزوروں کو معزز کر دیا ہے۔

اللہ نے جب عرب کو اپنے دین میں گروہ در گروہ داخل کیا تو کچھ لوگ خوشی خوشی اور کچھ لوگ خوف اور ڈر سے مسلمان ہوئے۔ تم بھی دین کے دائرے میں خوف کی بنا پر داخل ہوئے تھے جبکہ سبقت کرنے والے ایمان میں سبقت کر چکے تھے اور ہجرت میں سبقت کرنے والوں کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ لہٰذا خبردار! شیطان کو اپنی زندگی کا حصے دار نہ بناؤ اور اپنے نفس کی لگام اس کے ہاتھ میں مت دو۔

(ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ)

معاویہ کو خط کا جواب بھیجنے کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے اس معاملے کو پوری طرح ختم کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ جنگ صفین کو شروع ہوئے ایک سال بیت چکا تھا۔ اس دوران معاویہ آپ کی نصیحتوں کو نظر انداز کرتا رہا تھا جبکہ انفرادی طور پر مقابلہ یا پورے قبیلے کے حملوں سے جنگ اپنے منطقی انجام تک نہ پہنچ پائی تھی۔ چنانچہ لشکر کے سالار اعلیٰ کی حیثیت سے آپ نے تمام چھوٹے بڑے دستوں کے سرداروں اور مختلف طبقوں کے لوگوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی اور اس معاملے کو اس کے سامنے رکھا۔ بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ تمام عراقی سپاہی مل کر ایک رات حملہ کر کے معاویہ اور اس کے ساتھیوں کا قلع قمع کر دیں گے۔ اس مقصد کے لیے ماہ صفر ۳۸ھ کی ایک رات (لیلۃ الہریر) کا انتخاب کیا گیا اور حضرت علی علیہ السلام نے اس رات سے ایک دن قبل سپاہیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

مَعَاشِرَ الْمُسْلِمِيْنَ اسْتَشْعِرُوا الْخَشْيَةَ وَتَجَلْبَبُوا السَّكِيْنَةَ... مسلمانو! خوف خدا کو اپنا شعار بناؤ۔ سکون اور وقار کی چادر اوڑھ لو۔ اپنے دانتوں کو بھینچ لو کیونکہ اس سے تلواریں سروں سے اچٹ جاتی ہیں۔ لباس جنگ مکمل طور پر زیب تن کر لو۔ تلواروں کو نیام سے نکالنے سے قبل نیام کے اندر حرکت دے لو۔ دشمن کو ترچھی نظر سے دیکھتے رہو، اپنے نیزوں سے دونوں طرف وار کرتے رہو، اسے اپنی تلواروں کی باڑھ پر رکھو اور تلواروں کے حملے قدم آگے بڑھا کر کرو۔ یاد رکھو! تم پر اللہ تعالیٰ کی نظر ہے اور تم رسول اللہؐ کے چچا زاد بھائی کے ساتھ ہو۔ دشمن پر مسلسل حملے کرتے رہو اور فرار سے شرم کرو کیونکہ اس کا عار نسلوں میں رہ جاتا ہے اور اس کا انجام جہنم ہے۔ اپنے نفس کو ہنسی خوشی اللہ کے حوالے کر دو اور موت کی طرف نہایت درجہ سکون و اطمینان سے قدم آگے بڑھاؤ۔ تمہارا نشانہ یہ عظیم لشکر (سپاہ شام) اور طناب دار خیمہ (معاویہ کا ٹھکانا) ہونا چاہیے۔ اسی کے وسط پر حملہ کرو کیونکہ شیطان اسی کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا

ہے۔ اس کا یہ حال ہے کہ اس نے ایک قدم حملے کے لیے آگے بڑھا رکھا ہے اور بھاگنے کے لیے ایک قدم پیچھے کر رکھا ہے (اگر اس نے تمھیں کمزور دیکھا تو حملہ کرے گا اور اگر اس نے تمہاری شجاعت دیکھی تو بھاگ جائے گا) لہٰذا تم مضبوطی سے اپنے ارادے پر جمے رہو یہاں تک کہ حق صبح کے اجالے کی مانند واضح ہو جائے۔ مطمئن رہو کہ بلندی تمہارا حصہ ہے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال کو ضائع نہیں کرتا۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۶۶)

رات ہوتے ہی حملے کا حکم ملا تو حضرت علی علیہ السلام کے لشکر نے سپاہ شام پر یلغار کر دی۔ صبح ہونے تک شدید جنگ ہوتی رہی۔ عراقیوں نے اس تاریک رات میں شامیوں کے دلوں پر ایسا رعب قائم کیا کہ ان کے دل دہل گئے۔ سپاہ شام کی صفیں درہم برہم ہو گئیں اور ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ سپاہ شام سپہ سالاروں کے قابو سے باہر ہو چکی تھی اور نظم و ضبط جو لشکر کا خاصہ ہوتا ہے تباہ ہو چکا تھا۔ عراقی فداکاری اور بہادری کی داستان رقم کر رہے تھے۔ شامیوں کے دلوں پر خوف چھایا ہوا تھا۔ ان کی ایک بڑی تعداد کام آ چکی تھی۔ ابن شہر آشوب کے مطابق اس رات عراقی لشکر کے چار ہزار اور شامی لشکر کے بتیس ہزار سپاہی قتل ہو گئے جبکہ صاحب **کشف الغمہ** نے اس رات کے مقتولین کی تعداد چھتیس ہزار بیان کی ہے۔

مالک اشترؓ بلند آواز سے عراقیوں کو شامیوں پر فتح کی نوید سنانے کے ساتھ ان کی بہادری کی داد دیتے رہے۔ حضرت علی علیہ السلام سپہ سالار اعلیٰ کی حیثیت سے مختلف دستوں کے درمیان نظم و ضبط برقرار رکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں اپنے لشکریوں میں قدرے سستی دیکھتے تو اپنے حیدری حملوں کے ذریعے انھیں ان کے ہدف کی طرف آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے۔

بہرحال سپاہ شام کے قدم اکھڑ چکے تھے۔ اس کی صفوں کا نظم و ضبط ختم ہو چکا تھا۔ سپاہی موت کو اپنی نگاہوں کے سامنے رقصاں دیکھ کر پریشان تھے۔ معاویہ کے مذموم مقاصد کا دفاع کرنے والے مر چکے تھے جبکہ ایک گروہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھاگ گیا تھا۔

دن چڑھ آیا تو اہل عراق نے معاویہ کے خیمے پر یلغار کر دی۔ معاویہ بھاگنے کی راہ تلاش کر رہا تھا کہ اس نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنے سپاہیوں سے یہ کہتے سنا کہ اے گروہ مومنین! دیکھا تم نے دشمنوں کے ساتھ جنگ کہاں پہنچ گئی ہے؟ تمہاری فتح کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ معاملہ ختم ہونے کو ہے... اس وقت معاویہ نے عمرو بن عاص سے کہا: سنا تم نے علیؑ کیا کہہ رہے ہیں؟ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

عمرو نے کہا: معاویہ! ہمارے آدمی ایسے نہیں کہ ان کا علیؑ کے آدمیوں سے موازنہ کیا جائے۔

خود تم کسی طرح علیؑ کے حریف نہیں بن سکتے۔ ان باتوں سے قطع نظر اس جنگ میں علیؑ کی آرزو شہادت ہے جبکہ تمہاری خواہش تخت شام ہے۔ نیز عراق کے عوام ڈرتے ہیں کہ اگر تم غالب آ گئے تو ان سے انتقام لو گے جبکہ اہل شام مطمئن ہیں کہ وہ علیؑ کی فتح کے باوجود کسی مشکل میں گرفتار نہیں ہوں گے اس لیے کہ علیؑ فتح مند ہو کر بھی ان کو کچھ نہیں کہیں گے لہٰذا ایسی صورت میں تم علیؑ پر ہرگز غلبہ نہیں پا سکتے۔

معاویہ نے کہا: میں نے تم کو ڈراوا دینے اور لشکر شام کو بد دل اور کمزور بنانے کو نہیں کہا۔ نہ میں نے تم کو عراقیوں کی بہادری کا قصیدہ پڑھنے کو کہا ہے۔ اس وقت تم کوئی ایسی تدبیر کرو کہ ہماری جان اس مصیبت سے چھوٹ جائے۔ کیا تم کو مصر کی حکومت نہیں چاہیے؟

عمرو نے کہا: مجھے پہلے دن سے ہی معلوم تھا کہ تم لڑ کر علیؑ سے جیت نہیں سکتے اس لیے میں نے آج جیسے دن کے لیے ایک چال سوچ رکھی تھی۔ تم فوراً لشکر والوں سے کہو کہ جس جس کے پاس قرآن ہے وہ اسے نوک نیزہ پر بلند کر کے اہل عراق سے کہے: لوگو! ہمارے ساتھ کتاب خدا کے مطابق سلوک کرو اور مسلمانوں کا خون مت بہاؤ۔ جب تمہارے لشکری یہ کام کریں گے تو اہل عراق میں پھوٹ پڑ جائے گی اور وہ جنگ بند کر دیں گے۔ (ناسخ التواریخ، کتاب صفین ص ۴۱۹)

معاویہ نے کہا: عمرو! تم نے بڑی زبردست ترکیب سوچی ہے۔ پھر اس نے فوراً ایک گروہ سے کہا کہ وہ قرآن کو نوک نیزہ پر بلند کریں اور اہل عراق کے سامنے بلند آواز سے کہیں:

يَا مَعْشَرَ الْعَرَبِ هٰذَا كِتَابُ اللّٰهِ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اے گروہ عرب! یہ سب قتل و غارت کس لیے ہے حالانکہ اللہ کی یہ کتاب ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرنے والی ہے۔

مالک اشترؓ پکارے کہ ان کے فریب میں نہ آنا۔ یہ محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ ان لوگوں کا کتاب خدا پر کوئی ایمان نہیں۔ ہم اتنی مدت تک ان کو نصیحت کرتے رہے اور قرآن و سنت کے مطابق عمل کی دعوت دیتے رہے مگر انھوں نے ہماری دعوت قبول نہیں کی۔ اب جان کے خوف سے انھوں نے یہ چال چلی ہے۔ یاد رکھو! علی علیہ السلام خود قرآن ناطق ہیں۔

اشعث بن قیس چلا کر بولا: اب ان لوگوں سے جنگ نہیں کی جا سکتی کیونکہ انھوں نے ہمیں قرآن کو حکم (ثالث) قرار دینے کی دعوت دی ہے۔ اشعث کے بعد خالد بن معمر نے بھی یہی کہا جسے معاویہ نے خراسان کی امارت دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ان دونوں کی باتیں سن کر اہل عراق نے جو جنگ کرتے کرتے تھک چکے تھے اس رائے کو مان لیا اور کہنے لگے کہ اب ان لوگوں سے لڑنا حرام ہے۔

اب اس فتنے کو ختم ہونا چاہیے اور طرفین کے درمیان قرآن سے فیصلہ ہونا چاہیے۔

اشعث بن قیس ایک متلون مزاج شخص تھا۔ اسلام لانے کے بعد ایک دفعہ مرتد ہو چکا تھا۔ خلافت ابوبکر کے دوران دوبارہ مسلمان ہوا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے اسے آذر بائیجان کی حکومت سونپی تھی۔ جب حضرت علی علیہ السلام خلیفہ ہوئے تو اس نے آپ کی بیعت کر لی مگر عدم صلاحیت کی بنا پر آپ نے اس کو معزول کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ بڑا ناخوش تھا اور شاید انتقام کے لیے کسی بہانے کی تلاش میں تھا۔ آخر اس نے اپنا کام دکھایا اور ایسے حساس موقع پر لشکر عراق میں پھوٹ ڈالی کہ جنگ صفین میں حضرت علی علیہ السلام نے ڈیڑھ سال تک جو زحمتیں اٹھائی تھیں ان پر پانی پھر گیا۔

اشعث نے جب دیکھا کہ مالک اشترؓ صف اول میں برسرپیکار ہیں تو اس نے لوگوں کو جنگ بندی پر اکسانا شروع کیا اور انھیں بھائی بھائی کو قتل کرنے اور ایک دوسرے سے دشمنی کرنے کے خوفناک نتائج اور اتفاق و اتحاد کے فوائد بتانے کے لیے ایک تقریر کر ڈالی جس سے لشکر عراق حوصلہ ہار بیٹھا۔ اشعث کے ساتھیوں نے تلواریں نیام کر لیں اور آواز بلند کی کہ ہم صلح چاہتے ہیں لیکن مالک اشترؓ ان باتوں پر کان دھرے بغیر لڑ رہے تھے۔ وہ معاویہ کے خیمے تک پہنچا ہی چاہتے تھے کہ اشعث نے دھمکی دی کہ یا علیؑ! مالک کو خبردار کریں اور اسے واپس بلا کر اس خون خرابے کو روکیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے مجبور ہو کر یزید بن ہانی کو مالک کے پاس بھیجا تا کہ وہ ان کو صورتحال سے مطلع کرے۔ یزید بن ہانی نے جب مالک کو صورتحال بتائی تو مالک نے کہا: تم اپنی آنکھوں سے میدان کی حالت دیکھ رہے ہو۔ جاؤ! مولا سے کہو: مجھے صرف ایک گھنٹے کی مہلت دے دیں۔ میں معاویہ کو ان کے حضور پیش کر دوں گا۔

یزید بن ہانی نے واپس آ کر کہا: یا امیر المومنینؑ! دشمن کا لشکر پسپا ہو رہا ہے۔ فتح کی ہوائیں چل پڑی ہیں۔ کوئی مالک کے مقابلے کی تاب نہیں رکھتا۔ وہ دشمن کے تعاقب میں ہے اور اس نے ایک گھنٹے کی مہلت مانگی ہے تا کہ معاویہ کو آپ کے حضور پیش کرے۔ یہ سن کر اشعث نے کہا: یا علیؑ! مالک کو فوراً واپس بلائیں ورنہ وہ آپ کو زندہ نہیں دیکھ سکے گا۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ میں نے یزید کو بھیجا تھا؟ پھر آپ نے دوبارہ یزید کو بھیجا اور فرمایا: مالک سے جا کر کہو کہ اگر تم اپنے امام کو زندہ سلامت دیکھنا چاہتے ہو تو جنگ روک کر فوراً واپس آؤ۔ مالک نہایت غم و غصے میں واپس آئے۔ ان کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

قسمت تو دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

مالک نے حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں پہنچنے کے بعد جب صورتحال دیکھی تو چیخ کر کہا:

اے اہل عراق! تم کو کیا ہوگیا ہے؟ تم نے جنگ سے منہ کیوں موڑ لیا ہے اور اپنے امام کی نافرمانی کیوں کر رہے ہو؟ حالانکہ تمہارا پلہ بھاری ہے اور فتح ہونے ہی والی ہے۔

اشعث نے کہا: مالک! ان باتوں کو چھوڑو۔ جن لوگوں نے قرآن ہاتھ میں اٹھا رکھے ہوں ان سے جنگ نہیں کی جاسکتی۔

مالک نے کہا: کتنے احمق ہو تم۔ ایک سال تک ہم ان کو قرآن کی طرف بلاتے رہے مگر انھوں نے ہماری دعوت قبول نہیں کی۔ آج ان کا یہ عمل اس فریب کے سوا کچھ نہیں جو عمرو بن عاص نے ان کو سکھایا ہے۔ اگر مجھے فرصت دی جاتی تو میں آج ہی ان سب کو بیعت کرنے پر مجبور کردیتا۔

اشعث نے کہا: ہم راضی نہیں ہیں کہ ان کی طرف کوئی تیر پھینکا جائے یا تلوار چلائی جائے۔

مالک نے کہا: تم سب چلے جاؤ۔ اور ہمیں تنہا چھوڑ دو۔ ہم اکیلے ہی ان کا خاتمہ کردیں گے۔ مگر اس منافق ٹولے نے کہا: توبہ! توبہ! ایسا کرنا ناقابل معافی جرم ہے۔ اگر ہم تم کو آزاد چھوڑ دیں گے تو ہم بھی تمہارے جرم میں برابر کے شریک ٹھہریں گے۔

مالک نے غصے میں کہا: تم لوگوں کو ان باتوں سے کیا سروکار ہے؟ تم اوباش، پست اور بے وفا لوگ ہو۔ اتنی جلدی اپنا عہد توڑ بیٹھے ہو۔ اہل شام سے پہلے تم کو قتل کرنا زیادہ مناسب ہے۔ اشعث نے شور مچا کر مالک کو برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ یہ سن کر مالک نے اشعث کے سر پر تازیانہ مارا۔ اشعث کے ساتھیوں نے شور مچایا اور اپنی تلواریں لہراتے ہوئے مالک کی طرف بڑھے۔ مالک نے بھی قبضہ شمشیر پر ہاتھ رکھا۔ قریب تھا کہ ایک نیا محاذ کھل جاتا حضرت علی علیہ السلام نے مالک کو روک دیا۔ اس وقت حضرت علی علیہ السلام کی رگوں کا خون شدید دکھ اور افسوس کی وجہ سے منجمد ہوکر رہ گیا تھا۔ آپ نے مالک کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: اے مالک! چارہ کار ہمارے ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔ خدا لعنت کرے اس قوم پر جو ہمیں قرآن کی طرف دعوت دے رہی ہے حالانکہ اس قوم کو قرآن سے کوئی سروکار نہیں۔

اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے اہل عراق کو مخاطب کر کے فرمایا:

تم نے وہ کام کیا ہے جس سے اسلام کی قوت متزلزل ہوگئی، اس کی توانائی جاتی رہی اور اس کی

جگہ ناتوانی و رسوائی نے لے لی۔ جب تم فتح کی بلندی کو چھو رہے تھے اور تمہارے دشمن کو اپنی ہلاکت کا خوف تھا اور اس خوف نے اس کا دل توڑ دیا تھا اور وہ اپنے زخموں کا درد محسوس کر رہا تھا تو اس نے فریب دینے کے لیے قرآن کو نیزوں پر بلند کر دیا اور تم کو احکام قرآن کی طرف بلایا محض اس لیے کہ وہ خود کو تم سے دور کر کے جنگ کو رکوائے اور تم کو فریب سے گردش زمانہ کا منتظر ٹھہرائے۔ اب اگر تم اپنے دشمن کی منشا پوری کرنے پر اتفاق کرتے ہو اور اس کا چاہا ہوا پورا ہو جاتا ہے تو تم دھوکا کھانے والوں میں سے ہو۔ خدا کی قسم! میں نہیں سمجھتا کہ اس کے بعد تم ہدایت پر متفق ہو سکو یا تمہاری دور اندیشی اور عقل مندی صحیح انجام تک پہنچ سکے۔ (ارشاد مفید ج ۱، باب دوم، فصل ۳۵)

بہر حال حضرت علی علیہ السلام نے مظلومانہ طریقے سے بادل نخواستہ جنگ سے ہاتھ کھینچ لیا اور اسلحہ کی جھنکار بند ہوگئی۔ صلح کی باتیں ہونے لگیں اس لیے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ خود حضرت علی علیہ السلام کے ساتھیوں کی اکثریت اشعث کی ہاں میں ہاں ملانے لگی تھی۔[1]

---

۱۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو خیال آئے کہ حضرت علی علیہ السلام جیسے شجاع نے ہارے ہوئے معاویہ اور اشعث جیسے منافق اور اس کے ساتھیوں کو مالک اشتر اور قیس بن سعد جیسے باوفا اصحاب کے تعاون سے کیوں قتل نہیں کر دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عمل نہ صرف دین کی مصلحت کے منافی تھا بلکہ سیاسی لحاظ سے بھی درست نہیں تھا۔ اس لیے کہ آپ کے لشکر والے آپ کے خلاف ہوگئے تھے اور وہ درحقیقت حضرت علی علیہ السلام کی اطاعت یہ سمجھ کر نہیں کر رہے تھے کہ وہ واجب الاطاعت امام ہیں۔ اگر وہ ایسا سمجھتے تو آپ کی مخالفت ہی کیوں کرتے۔ لشکر والوں کی نظر میں آپ کا منصب خلافت باقی ہی نہ رہا تھا۔ اسی لیے آپ نے فرمایا تھا: اِنِّي كُنْتُ اَمْسِ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَاَصْبَحْتُ الْيَوْمَ مَاْمُوْرًا وَ كُنْتُ نَاهِيًا فَاَصْبَحْتُ مَنْهِيًّا یعنی کل تک میں مومنوں کا امیر تھا مگر آج ان کا محکوم بن گیا ہوں یعنی مجھ پر حکم چلایا جا رہا ہے۔ کل تک میں تم لوگوں کو منع کرتا تھا اور آج تم لوگ مجھے منع کر رہے ہو۔

مقام و منصب کی اپنی توقیر ہوتی ہے اور دیگر عوامل اس کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام کی معاویہ کے ساتھ جنگ ذاتی غرض کے لیے نہیں تھی۔ آپ خلیفہ کی حیثیت سے بغاوت پر آمادہ معاویہ کے خلاف لڑ رہے تھے۔ اس وقت جبکہ آپ کی فوج میں بغاوت پھیل گئی تھی اگر یہ جنگ جاری رہتی اور معاویہ پوچھتا کہ علیؑ تم کیوں مجھ سے لڑ رہے ہو تو حضرت علی علیہ السلام کے پاس کوئی دلیل نہ ہوتی اس لیے کہ اگر حضرت علی علیہ السلام فرماتے کہ میں امیر المومنین ہوں تو معاویہ پوچھ سکتا تھا کہ وہ مومنین کہاں ہیں جن کے آپ امیر ہیں؟ آپ کا کوئی منصب نہیں ہے۔ صاحبان ایمان آپ کو خلیفہ نہیں مانتے بلکہ اختلافات ختم کرنے کے لیے وہ میرے ہم آواز ہیں اور میری طرح وہ بھی قرآن کو حکم مانتے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت علی علیہ السلام جنگ بندی پر مجبور اور ثالثی پر راضی ہوئے۔

عمرو بن عاص نے سوچ سمجھ کر ہی نفاق کا یہ بیج بویا تھا اور کہا تھا کہ میں نے اپنی آخرت گنوا کر معاویہ کی دنیا آباد کرائی ہے۔

اشعث نے کہا: یا علیؑ! اب جبکہ طرفین قرآن کو ثالث بنانے پر راضی ہیں آپ اجازت دیں تو میں معاویہ کے پاس جا کر اس کی رائے معلوم کروں اور یہ بھی پوچھوں کہ وہ کس طرح اس کام کو انجام تک پہنچانا چاہتا ہے؟

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اب معاملہ میرے اختیار سے نکل چکا ہے۔ تم لوگ اپنی مرضی سے سب کچھ کر رہے ہو۔ اس صورتحال میں میرا اس معاملے میں کوئی عمل دخل نہیں۔

اشعث معاویہ کے پاس گیا تو معاویہ نے اسے دونوں طرف سے حکم مقرر کرنے پر آمادہ کیا۔ اشعث نے واپس آ کر کہا: اہل شام کا خیال ہے کہ فریقین اپنی اپنی طرف سے ایک ایک حکم چنیں جو ایک عرصے تک اس بارے میں خوب سوچ بچار کریں۔ پھر دونوں حکم جو فیصلہ کریں سب اس پر راضی ہو جائیں۔

معاویہ نے اس حوالے سے ایک خط بھی حضرت علی علیہ السلام کو بھجوایا جس میں لکھا تھا کہ ہمارے درمیان جنگ اور دشمنی بڑھ چکی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک خود کو برحق سمجھتا ہے اور دوسرے کی اطاعت کرنا نہیں چاہتا۔ لوگوں کی بڑی تعداد قتل ہو چکی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ یہ عفریت کہیں اس (جنگ) کے بعد بھی باقی نہ رہے۔ روز حشر میرے اور تمہارے سوا کوئی ان واقعات کا ذمے دار نہ ہوگا لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ اب اختلاف کو ختم ہونا چاہیے اور مسلمانوں کا خون بہانا رک جانا چاہیے۔ چنانچہ صحیح طریقہ یہی ہے کہ میرے اور تمہارے اصحاب میں سے دو نمائندے منتخب کئے جائیں جو قرآن کے ذریعے ہمارے بیچ فیصلہ کریں لہٰذا اے علیؑ! اللہ سے ڈرو! اور اگر اہل قرآن ہو تو قرآن کے حکم ہونے پر راضی رہو۔ والسلام

حضرت علی علیہ السلام نے معاویہ کو جواب میں لکھا:

اما بعد! بہترین چیز جس کی طرف انسان کو توجہ دینا چاہیے، اس کا نیک کردار ہے جو خوبیوں کو اپنانے اور برائیوں کو چھوڑنے کا سبب بنتا ہے۔ ظلم اور باطل، انسان کے دین اور دنیا دونوں کو تباہ کر دیتے ہیں اور برا سوچنے والے کی زبان کو دراز کر دیتے ہیں۔

اے معاویہ! دنیا سے خبردار رہو۔ دنیا فانی ہے۔ اس سے تم کو جو بھی حاصل ہوگا تم اس سے فائدہ نہیں پا سکتے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جس چیز کا موقع نکل گیا، تم اسے دوبارہ ہرگز نہیں پا سکو گے۔ اس دن سے ڈرو جب نیکوکاروں سے لوگ حسد کریں گے اور جس نے اپنے نفس کی باگ شیطان کے ہاتھ میں دے رکھی ہے اسے شرمندگی کا سامنا ہوگا کیونکہ وہ دنیا کا فریب خوردہ ہے۔ آج تم مجھے حکم قرآن پر عمل کی دعوت دے رہے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ تم اہل قرآن میں سے نہیں ہو۔ تم حکم قرآن کے سامنے

گردن خم نہیں کرتے۔ میں تمہاری دعوت کو قبول نہ کرتا مگر جو قرآن کے حکم پر راضی نہ ہو وہ گمراہی کی ہولنا کیوں سے بچ نہیں سکتا۔ (ناسخ التواریخ، کتاب صفین ص ۴۲۷ ۔ ۴۲۸)

اہل عراق جب خط کے مضمون سے مطلع ہوئے تو بہت خوش ہوئے۔ اشعث دوبارہ معاویہ کے پاس گیا اور حکم کے تعین کے سلسلے میں اہل عراق کی رضامندی سے اسے آگاہ کیا۔ معاویہ نے اپنی طرف سے عمرو بن عاص کو حکم کے لیے منتخب کیا۔ اشعث اور اس کے منافق ساتھیوں نے اپنے ہی بھائی بند ابوموسیٰ اشعری کو اس کام کے لیے منتخب کیا۔ جب حضرت علی علیہ السلام کو یہ خبر ملی تو آپ نے فرمایا: سبحان اللہ! اس منافق ٹولے نے کم از کم مجھے حکم بنانے کا اختیار تو دیا ہوتا۔ یہ تو مجھے یہ اختیار بھی نہیں دے رہے۔ پھر آپ نے فرمایا: اب جبکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے تو حکم کے انتخاب میں میری رائے کا احترام کیا جائے اور اس کام کے لیے ابن عباس یا مالک اشتر میں سے کسی کو چنا جائے اس لیے کہ ابوموسیٰ کے نہ صرف میرے ساتھ تعلقات ٹھیک نہیں ہیں بلکہ وہ ایک بیوقوف آدمی ہے اور عمرو بن عاص جیسے چالاک شخص سے معاملہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

اشعث اور اس کے گروہ نے کہا: ابن عباس آپ کا چچا زاد ہے۔ وہ آپ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا جبکہ مالک اشتر پر بھی قتل عثمان کا الزام ہے اور اس پر لشکر کشی کا بھوت سوار رہتا ہے۔ اس جنگ کی آگ بھی اسی نے لگائی ہے۔ وہ جوشیلا ہے چنانچہ عمرو بن عاص کے ساتھ ٹھنڈے دل و دماغ سے بات نہیں کرسکتا۔ ہمارے خیال میں اس کام کے لیے ابوموسیٰ اشعری مناسب آدمی ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے جتنا اصرار کیا، عراقی اپنی مرضی کے مطابق ابوموسیٰ ہی کو ثالثی کے لیے منتخب کرنے پر مصر رہے۔ آخرکار ۱۷ رصفر ۳۸ھ کو حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ کے دستخطوں سے صلح نامہ طے پایا جس پر عراق اور شام کے سرداران لشکر کی گواہیاں تھیں۔ اس صلح نامہ کا مضمون یہ تھا:

حکمین ماہ رمضان المبارک ۳۸ھ تک ۶ ماہ کے عرصے میں طرفین کے اختلاف کو آیات قرآنی کے مطابق حل کریں گے اور فرمان الٰہی کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ ان دونوں افراد کو عراق اور شام کی حکومتوں کی طرف سے سیاسی پناہ حاصل ہے۔ مقررہ مدت کے بعد اگر حکمین کا فیصلہ قرآن کے مطابق ہوا تو وہ حکم تمام لوگوں کے لیے حجت ہوگا اور اگر حکمین کا فیصلہ قرآن کے مطابق نہ ہوا تو ان کی سیاسی و حکومتی محافظت ختم ہوجائے گی اور ان کا فیصلہ نہیں مانا جائے گا۔

اگر حکمین میں سے کوئی ایک مقررہ مدت ختم ہونے سے قبل فوت ہوگیا تو متعلقہ حکومت اس کی

جگہ کسی دوسرے شخص کو سابق شرائط کے ساتھ حکم مقرر کرے گی۔

اگر دونوں ثالث اس عرصے میں کسی حتمی نتیجے تک نہ پہنچے تو جنگ دوبارہ شروع ہو جائے گی۔

ثالثی کے لیے جو شرائط مقرر کی گئی تھیں اگرچہ وہ ظاہراً عادلانہ تھیں لیکن عوام اس بات سے بے خبر تھے کہ ابو موسیٰ اشعری اس کام کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت علی علیہ السلام، مالک اشتر ابن عباس اور دوسروں نے اس انتخاب پر شدید تحفظات کا اظہار کیا تھا۔ وہ پہلے دن سے ہی جان چکے تھے کہ عمرو بن عاص یقینی طور پر اپنی ہشیاری سے ابو موسیٰ کو متاثر کرے گا اور اس ثالثی کا نتیجہ صرف اور صرف معاویہ کے حق میں ظاہر ہوگا۔

اس صلح کے طے پا جانے کے بعد معاویہ شام چلا گیا جبکہ حضرت علی علیہ السلام مقتولین کی نماز جنازہ اور تدفین کے بعد شدید غم و الم کی حالت میں صفر ۳۸ھ کے آخر میں کوفہ واپس تشریف لے گئے۔ عربوں کی اس داخلی جنگ میں تقریباً پچانوے ہزار آدمی قتل ہوئے تھے۔ صاحب ناسخ التواریخ کی روایت کے مطابق مقتولین کی تعداد ایک لاکھ دس ہزار تھی جس میں سے نوے ہزار شامی اور بیس ہزار عراقی تھے۔

# (۵) ثالثی کے نتائج

ابو موسیٰ اشعری اور عمرو بن عاص نے ثالث منتخب ہونے کے بعد دومۃ الجندل میں جو مدینہ اور شام کے درمیان واقع ایک قلعہ ہے ملاقات کی۔ شام اور عراق کے لشکر کی طرف سے چار چار سو افراد کو نمائندگی کے لیے منتخب کیا گیا جو اپنے اپنے ثالث کے ساتھ دومۃ الجندل پہنچے تاکہ ان کی موجودگی میں دونوں ثالث اپنا فیصلہ سنائیں۔

عمرو بن عاص چار سو سواروں کے ساتھ مذکورہ جگہ ابو موسیٰ اشعری سے چند دن پہلے ہی پہنچ گیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے شریح بن ہانی کی زیر نگرانی چار سو افراد ابو موسیٰ اشعری کے ساتھ بھیجے اور ابن عباس کو امام جماعت کے طور پر ان کے ساتھ بھیجا۔

روانگی کے وقت معاویہ نے عمرو بن عاص سے کہا:

میں نے اور پورے لشکر شام نے بھرپور تائید کے ساتھ تم کو اس کام کے لیے مقرر کیا تھا جبکہ ابو موسیٰ اشعری کا انتخاب علیؑ پر مسلط کیا گیا تھا لہٰذا اب دیکھنا یہ ہے کہ تم کیا کارنامہ دکھاتے ہو؟

اور ابن عباس نے بھی روانہ ہوتے وقت ابو موسیٰ اشعری سے کہا:

تمہارا حریف عرب کا مانا ہوا مکار شخص ہے۔ پورے عرب میں اس کی مکاری مشہور ہے اس لیے اس کی چال بازیوں سے بچنے کی کوشش کرنا۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ حضرت علی علیہ السلام تمام اخلاقی صفات اور اقدار کے حامل ہیں اور دوسروں سے زیادہ خلافت کے اہل اور حقدار ہیں جبکہ معاویہ ظلم پیشہ آدمی ہے۔ وہ غلط راہ ہی اپنائے گا۔

جب عمرو کو ابو موسیٰ کی آمد کا پتا چلا تو اس نے ان کی آؤ بھگت کی اور دیدہ و دل فرش راہ کردیئے۔ ابو موسیٰ نے جب عمرو کا یہ برتاؤ دیکھا تو خوشی سے پھولا نہ سمایا اور عمرو نے اس کا دل جیت لیا۔ ابن عباس نے جو صورتحال کا بغور جائزہ لے رہے تھے ابو موسیٰ کو کہلا بھیجا کہ عمرو کی آؤ بھگت سے دھوکا

مت کھانا، وہ معاشرے میں تم سے زیادہ محترم نہیں ہے۔ اس کی یہ عقیدت صرف دکھاوا ہے لہٰذا تم ہشیار رہنا کیونکہ جو محبت کا اظہار کسی غرض سے کرتا ہے وہ محبت نہیں کینہ ہوتا ہے۔

ابن عباس نے یہ پیغام عدی بن حاتم کے ذریعے بھجوایا تھا مگر عمرو کے استقبال کے بعد ابو موسیٰ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ وہ ایک اہم شخصیت ہے اس لیے اس نے تمکنت کے ساتھ عدی سے کہا: تم لوگ میرے کام میں دخل نہ دو۔ یہ ایک اہم ذمے داری ہے اور عوام نے مجھے اس کام کے لیے چنا ہے اس لیے مجھے تمہاری نصیحت کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد اس نے عمرو سے کہا: آئندہ میرے اور تمہارے درمیان ہونے والی گفتگو صیغہ راز میں رہے اور کسی کو اس کی خبر نہ ہو۔

عمرو نے جو اسی تجویز کا منتظر تھا اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ایک کونے میں خیمہ نصب کیا جائے۔ اس کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ اس خیمے میں ابو موسیٰ اور عمرو روزانہ مذاکرات کرتے۔ خیمے کے اطراف ڈیوٹی پر مامور سپاہیوں کو تاکید تھی کہ ان دونوں کی اجازت کے بغیر کسی کو خیمے میں جانے نہ دیا جائے۔

عمرو نے چاپلوسی سے ابو موسیٰ کو اپنی مٹھی میں کرنے کے جتن شروع کر دیئے۔ ایک دن اس نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے ابو موسیٰ سے کہا: اس میں کوئی شک نہیں کہ عثمان مظلوم مارے گئے اور تم تو خود عثمان کے طرفداروں میں سے ہو۔

ابو موسیٰ نے کہا: تمہاری بات درست ہے لیکن قتل عثمان کے وقت میں مدینہ میں موجود نہیں تھا ورنہ میں اس کی ہر ممکن مدد کرتا۔

عمرو نے کہا: اب جبکہ معاویہ خون عثمان کا بدلہ لینے کے لیے سرگرم عمل ہے اور اسے خلافت کا کوئی لالچ بھی نہیں ہے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم بھی اس کا ساتھ دو؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ معاویہ ایک مدبر، طاقتور اور تجربہ کار شخص ہے۔ اس کا تعلق بھی قریش کے ایک محترم خاندان سے ہے۔ اگر ہم اسے مسند خلافت پر بٹھا دیں تو گویا ہم مسلمانوں کے مفاد میں ایک بہترین کارنامہ انجام دے سکتے ہیں!

ابو موسیٰ نے بگڑ کر کہا: معاویہ شریف گھرانے کا فرد ہے یا علیؑ؟ وہ کون سی خوبی ہے جو علیؑ میں نہیں اور معاویہ میں ہے؟ ہماری ثالثی عام مسلمانوں سے متعلق ہے۔ اس کے لیے اتنی آسانی سے فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ خلافت کے لیے عبد اللہ بن عمر موزوں آدمی ہے اس لیے کہ اب تک اس نے کوئی فتنہ کھڑا نہیں کیا۔ وہ ایک سلیم النفس اور خوش اخلاق آدمی ہے۔

عمرو نے کہا: منصب خلافت کے لیے ہر شخص مناسب نہیں۔ خلیفۃ المسلمین کے لیے ضروری ہے

کہ وہ جرأت مند، مدبر اور دور اندیش ہو اور ابن عمر میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں۔

ابو موسیٰ نے کہا: اگر تمہارا یہی اصرار ہے کہ معاویہ خلیفہ بنے تو میں اس کا شدید مخالف ہوں۔

عمرو نے جب دیکھا کہ ابو موسیٰ، معاویہ کا مخالف ہے تو اس نے ابو موسیٰ کا ہاتھ پکڑا اور اسے خیمے سے باہر لا کر کہا: میرے بھائی! اب میں وہ تجویز دے رہا ہوں کہ تم اس کی مخالفت نہیں کرو گے اور یہ تجویز مسلمانوں کے بہترین مفاد میں ہے۔

ابو موسیٰ نے کہا: کہو۔

عمرو نے کہا: جس طرح تم معاویہ کے لیے خلافت پسند نہیں کرتے اس طرح میں علیؑ، ابن عمر اور ان جیسے لوگوں کے لیے خلافت کا مخالف ہوں۔ میرے اور تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم دونوں کو مسلمانوں کی طرف سے جو مینڈیٹ ملا ہے اس کے تحت علیؑ اور معاویہ دونوں کو خلافت سے معزول کر دیں اور اس کے بعد خلیفہ کے انتخاب کا معاملہ شوریٰ پر چھوڑ دیں تا کہ وہ جسے چاہے خلیفہ بنا دے۔ اس طرح میری اور تمہاری کوئی ذمے داری نہیں رہے گی۔

ابو موسیٰ نے جو حضرت علی علیہ السلام سے خوش نہیں تھا اور معاویہ کو بھی معزول کرنا چاہتا تھا عمرو کی تجویز مان لی۔ عمرو نے جو جلد از جلد اپنے مقصد کو حاصل کرنا چاہتا تھا، کہا: اے رسول خداؐ کے معزز صحابی! ثالثی کے لیے جو مدت مقرر کی گئی تھی وہ ختم ہونے کو ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ ہم وقت ضائع کئے بغیر اپنی اپنی رائے کا مسلمانوں کے سامنے اعلان کر دیں۔

ابو موسیٰ جو ایک بار پھر عمرو کی خوشامدانہ باتوں سے پھولا نہیں سما رہا تھا بولا: ہم یہ کام کل ہی کردیں گے اور مدعیان خلافت کو معزول کر کے عوام کو جنگ و پیکار سے بچائیں گے۔

عمرو دیکھ رہا تھا کہ سارا کام اس کی خواہش کے مطابق ہو رہا ہے پھر بھی وہ ابو موسیٰ پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ اصحاب علیؑ میں سے کوئی خاص کر ابن عباس اس سے نہ ملے۔

اگلے دن مقررہ وقت پر ابو موسیٰ اور عمرو لوگوں کے سامنے پہنچے۔ عمرو نے ایک بار پھر ابو موسیٰ کی عقل پر پردے ڈال دیئے۔ اس نے خوشامدانہ انداز میں ابو موسیٰ سے کہا کہ آپ بزرگ ہیں پہلے آپ اپنی رائے کا اظہار کیجئے۔ ابن عباس نے ابو موسیٰ کو سمجھایا کہ وہ گفتگو میں پہل نہ کرے مگر ابو موسیٰ نے ان کی بات نہ مانی اور گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا: لوگو! یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ جنگ صفین میں ہزاروں افراد قتل ہوگئے، بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہوگئیں۔ اس جنگ کو بھڑکانے والے دو

افراد علیؑ اور معاویہ خلافت کے دعویدار ہیں۔ اگر ثالثی کا معاملہ درمیان میں نہ آتا تو ابھی تک یہ برادر کشی جاری رہتی اس لیے مسلمانوں کو پُر امن رکھنے کے لیے میں نے اور عمرو بن عاص نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ ان دونوں افراد کو خلافت سے معزول کردیا جائے تاکہ مسلمان خود شوریٰ تشکیل دیں اور لائق خلافت فرد کو چنیں لہٰذا میں عراق اور حجاز کے مسلمانوں کی طرف سے علیؑ کو خلافت سے معزول کرتا ہوں۔

یہ فیصلہ سنتے ہی اس کی مخالفت اور موافقت میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اب عمرو کی باری تھی چنانچہ وہ کھڑا ہوا اور اس نے قتل و خونریزی پر اظہار افسوس کے بعد کہا: بھائیو! علیؑ اور معاویہ کا اختلاف جنگ کا باعث تھا۔ اب جبکہ ابو موسیٰ نے علیؑ کو معزول کردیا ہے میں بھی ان کے فیصلے کی تائید کرتے ہوئے علیؑ کو معزول کرتا ہوں اور ان کی جگہ معاویہ کو خلافت پر فائز کرتا ہوں کیونکہ وہ اس منصب کا اہل بھی ہے اور خون عثمان کا بدلہ لینے والا بھی اور اس آیت کے مطابق کہ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا جو شخص مظلوم قتل ہوجائے ہم اس کے وارث کو اقتدار دیتے ہیں (سورۂ بنی اسرائیل: آیت ۳۳) معاویہ پر ہی قاتلان عثمان کو کیفر کردار تک پہنچانے کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔

عمرو کی تقریر ختم ہوئی تو لوگوں میں ہیجان پیدا ہوگیا۔ سب سے پہلے ابو موسیٰ نے ہی شدید غصے میں عمرو سے کہا: قَدْ غَدَرْتَ وَفَجَرْتَ وَاِنَّمَا مَثَلُكَ مَثَلُ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ تم نے غداری اور مکاری کی ہے! تم اس کتے کی مانند ہو جسے مارو تب بھی بھونکے اور کھلا چھوڑ دو تب بھی بھونکے یعنی کسی حال میں اس سے اچھائی کی امید نہیں۔ (آیت قرآن کی طرف اشارہ ہے)۔

یہ سن کر عمرو عاص نے قہقہہ لگایا اور کہا: اِنَّمَا مَثَلُكَ مَثَلُ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا یعنی تم بھی اس گدھے کی طرح ہو جس پر بوجھ لاد دیا گیا ہو۔ (آیت قرآن کی طرف اشارہ ہے)۔

چونکہ عمرو کی بات ابو موسیٰ کے حوالے سے درست تھی اسی لیے بعد میں وہ ''حمار اشعری'' (اشعری گدھا) مشہور ہوگیا۔ اس وقت اسے سمجھ آیا کہ حضرت علی علیہ السلام کو واقعاً یہ حق تھا کہ وہ اسے ثالثی کے لیے منتخب نہ کریں۔

ابو موسیٰ حضرت علی علیہ السلام اور آپ کے اصحاب کے خوف سے مکہ بھاگ گیا اور عمرو تیزی سے دمشق روانہ ہوگیا۔ جب وہ معاویہ کے پاس پہنچا تو اس نے خلیفہ کی حیثیت سے معاویہ کو سلام کیا۔

یہ ثالثی خود معاویہ کے بقول عمرو کی چال تھی اور اہل کوفہ کے شدید دباؤ کی وجہ سے حضرت علیؑ نے اسے قبول کیا تھا لیکن جب ثالثوں نے معاہدے کی شرائط کے مطابق فیصلہ نہ دیا تو ایک دفعہ پھر

حضرت علی علیہ السلام اور ان کے اصحاب اس کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے اس لیے کہ

(۱) قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں جس سے دو متحارب افراد کے اختلاف کو دور کیا جا سکے۔

(۲) حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کے دن چند ایک کے سوا تمام مہاجرین و انصار نے ان کی بیعت کر لی تھی اور منصب خلافت امام سے مخصوص ہو گیا تھا۔ طلحہ و زبیر کے علاوہ جنھوں نے بیعت توڑ دی تھی پوری امت میں کوئی بھی اس کا مخالف نہ تھا۔

(۳) عمرو عاص اور ابو موسیٰ کو یہ ذمے داری سونپی گئی تھی کہ مدعیان خلافت کے اختلاف کو احکام قرآن کے مطابق حل کریں۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے معاویہ کو لکھا تھا کہ میں تیری بات کو قبول نہیں کرتا تاہم حکم قرآن کو قبول کرتا ہوں لیکن ثالثوں نے خدا اور قرآن کا نام تک نہیں لیا۔ عمرو عاص نے ابو موسیٰ کو دھوکا دینے کے لیے تمام حیلوں بہانوں سے کام لیا۔

(۴) دونوں ثالثوں نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا۔ ان کے پاس خلیفہ کو معزول کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ ان کا کام صرف اختلاف کا حل تلاش کرنا تھا۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر ثالثوں نے اس امر پر اتفاق کیا تھا کہ وہ دونوں مدعیان خلافت کو معزول کر کے اس معاملے کو مسلمانوں کے شوریٰ پر چھوڑ دیں گے لیکن عمرو عاص نے اس کے خلاف عمل کیا اور معاویہ کو معزول کرنے کے بجائے اس کی خلافت کو مستحکم کیا۔ اس کے اسی عمل سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس نے پہلے جس بات پر اتفاق کیا تھا وہ محض ابو موسیٰ کو دھوکا دینے کے لیے تھا۔ یہی وہ وجوہات تھیں جن کے پیش نظر حضرت علی علیہ السلام اور ان کے اصحاب نے اعتراض کیا اور معاملہ جوں کا توں رہا اور اس کے حل کے لیے دشمنوں کے خلاف تلوار اٹھانی پڑی۔

اس ثالثی کا ایک اور برا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت علی علیہ السلام کے لشکر میں نزع بڑھ گیا اور بارہ ہزار خوارج پیدا ہو گئے جو نہ صرف حضرت علی علیہ السلام سے تعاون نہیں کرتے تھے بلکہ آپ کی راہ میں روڑے اٹکانے لگے تھے چنانچہ حضرت علی علیہ السلام کو ان لوگوں سے نہروان میں جنگ لڑنا پڑی۔

# (۶) جنگ نہروان

ماہ صفر ۳۸ھ میں جنگ صفین سے واپسی کے بعد حضرت علی علیہ السلام کی شہادت تک کا عرصہ دو سال سے کچھ اوپر بنتا ہے لیکن اس عرصے میں بھی حضرت علی علیہ السلام کو جو مشکلات درپیش رہیں وہ ناقابل بیان ہیں۔ لشکر کی پے در پے شکست نے حضرت علی علیہ السلام کو سخت رنج پہنچایا۔

حضرت علی علیہ السلام کو یہ رنج معاویہ اور عمرو بن عاص کے مکر و فریب سے کہیں زیادہ اپنے ہی سپاہیوں کی سردمہری، بے وقوفی اور بے وفائی کی وجہ سے ہوا۔

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

اہل کوفہ کی ڈھٹائی کی وجہ سے حضرت علی علیہ السلام کو اس قدر رنج ہوا کہ آپ نے کئی بار موت کی تمنا کی تاکہ آپ اس بے عمل اور بے حس قوم کے شر سے نجات پائیں۔

امام نے ایک خطبے میں ان لوگوں کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا تھا: **وَاللّٰہِ اِنْ جَآئَنِی الْمَوْتُ وَلَیَاْتِیَنِّیْ فَلَیُفَرِّقَنَّ بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ لَتَجِدَنَّنِیْ لِصُحْبَتِکُمْ قَالِیًا** خدا کی قسم! اگر موت میرا سراغ لگالے اور یقیناً اس نے میرے اور تمہارے درمیان جدائی پیدا کرنے کے لیے ضرور آنا ہے تو تم دیکھو گے کہ مجھے تمہارے ساتھ زندہ رہنا کتنا ناپسند ہے۔

جنگ صفین میں عمرو عاص کی تجویز پر قرآن کو نوک نیزہ پر بلند کر کے متحارب گروہوں میں ثالثی کی جو آواز بلند ہوئی تھی اس نے لشکر عراق میں اتنے بڑے اختلاف کو جنم دیا کہ ان اختلافات کو بعد میں پیش آنے والی حضرت علی علیہ السلام کی تمام تر مشکلات کا پیش خیمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ میں خلافت کے معاملے پر اختلاف کا فیصلہ ثالثوں پر چھوڑ دیا گیا اور حضرت علی علیہ السلام کے نہ چاہتے ہوئے بھی ابو موسیٰ کو آپ کی طرف سے ثالث مقرر کیا گیا تھا مگر صلح کی

قرارداد طے پا جانے کے بعد حضرت علی علیہ السلام کے لشکر میں سے ایک گروہ نے کہا: جو لوگ قتل ہو گئے ان کا خون رائیگاں چلا گیا ہے۔ اس گروہ نے اعتراض کیا کہ ہم نے حکم خدا کا تقاضا کیا تھا نہ کہ ابو موسیٰ اور عمرو کی ثالثی کا جبکہ کچھ افراد ایسے تھے جنھوں نے دونوں لشکروں کی مخالفت شروع کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ یہ دونوں باطل پر ہیں کیونکہ حکم صرف اور صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ بہر حال یہی سوچ تھی جس کی بنا پر صفین سے کوفہ واپسی کے موقع پر تقریباً بارہ ہزار سپاہی حضرت علی علیہ السلام کے لشکر سے جدا ہو گئے۔ وہ حضرت علی علیہ السلام اور ان کا ساتھ دینے والے سپاہیوں سے لڑنے کے علاوہ ان کو کافر بھی کہنے لگے۔ یہ گروہ کوفہ پہنچنے کے بعد حضرت علی علیہ السلام کے لشکر سے نکل کر عبداللہ بن وہب کی قیادت میں حروراء چلا گیا۔

حضرت علی علیہ السلام کے لشکر سے نکلنے والے اس گروہ کا نعرہ تھا **لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ** یعنی کسی کا حکم نہیں چلے گا سوائے اللہ کے۔ ظاہراً یہ گروہ عابد و زاہد لوگوں پر مشتمل تھا۔ ان لوگوں کی پیشانیوں پر کثرت سجود سے گھٹے پڑ گئے تھے لیکن اپنی نادانی اور کم فہمی کی وجہ سے وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ حضرت علی علیہ السلام نے ان لوگوں کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ لوگ حق کو باطل کی تاریکیوں میں تلاش کر رہے ہیں؟

یہ گروہ جو بعد میں خوارج کہلایا اس بات سے ناواقف تھا کہ وہ قرآن جس کی حکومت کا وہ نعرہ لگا رہے ہیں قرطاس وقلم سے وجود پانے والی ایک کتاب ہے۔ اس سے احکامات کے استنباط کے لیے ایک ایسے فرد کی ضرورت ہے جو قرآن کے احکامات پر عبور رکھتا ہو۔ عراق کے مسلمانوں کے نزدیک وہ فرد فرید حضرت علی علیہ السلام تھے جو قرآن ناطق ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے ابن عباسؓ کو خوارج کے پاس بھیجا تا کہ وہ ان کی غلط فہمی دور کریں لیکن وہ لوگ اپنی رائے اور عقیدے سے دستبردار ہونے پر تیار نہ ہوئے۔ اس گروہ کا اہم ترین اعتراض یہ تھا کہ حضرت علی علیہ السلام نے اہل شام سے جنگ تو کی مگر ان کے اموال کو ضبط کیوں نہیں کیا؟ دوسری بات یہ کہ ہم (خوارج) نے قرآن کی ثالثی کا مطالبہ کیا تھا پھر علیؑ نے ابو موسیٰ اور عمرو بن عاص کی ثالثی کو تسلیم کیوں کیا؟ تیسری بات یہ کہ صلح نامے میں علیؑ نے اپنے نام کے ساتھ امیر المومنین کا لفظ کیوں نہیں لکھا؟ اس سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ خود علیؑ کو اپنی خلافت پر یقین نہیں تھا لہٰذا اس صورت میں اس جنگ میں قتل ہونے والوں کو کس کھاتے میں ڈالا جائے گا؟

ابن عباسؓ کے بعد حضرت علی علیہ السلام خود بنفس نفیس اس گروہ کے پاس تشریف لے گئے اور انھیں سمجھایا کہ میں بھی تم لوگوں کی طرح حکم قرآن کے اجرا کا خواہاں ہوں۔ اسی لیے میں نے معاویہ سے جنگ لڑی تھی۔ تمھیں معلوم ہے کہ میں جنگ بند کرنے اور ابو موسیٰ کو ثالث بنانے کے خلاف تھا مگر خود تم لوگوں کے شدید اصرار اور دباؤ پر میں نے جنگ بندی قبول کی۔ میں تو اب بھی اپنی پہلی رائے پر قائم ہوں اور دوبارہ شام پر حملہ کرنے کی تیاری میں مصروف ہوں۔ تم لوگ بھی اس کام میں میری مدد کرو۔

خوارج نے کہا: تم اور ہم سب کافر ہو گئے تھے۔ ہم نے تو توبہ کر لی ہے لیکن تم ابھی تک اسی حالت پر باقی ہو لہٰذا پہلے توبہ کرو۔ پھر ہم تمھاری مدد کریں گے۔

یہ گروہ سب لوگوں کو برا بھلا کہتا تھا۔ ان کا نعرہ صرف اس آیت کی تلاوت تھا وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ اور جو لوگ اس کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے کے مطابق حکم نہیں دیتے وہ کافر ہیں۔ (سورۂ مائدہ: آیت ۴۴) مگر ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ یعنی قرآن کے مطابق حکم دینے والی ہستی خود حضرت علی علیہ السلام ہیں۔[۱]

بہر حال! جب حضرت علی علیہ السلام اس گروہ کی ہدایت سے ناامید ہو گئے تو آپ نے ان کی مدد کے بغیر ہی شام پر حملے کے لیے لشکر کی تیاری شروع کر دی۔ اس دوران کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ، اہل عراق کی ہزیمت اور حضرت علی علیہ السلام کے لیے دکھ میں اضافے کا باعث بنا۔

معاویہ نے جو ثالثی سے بے حد خوش تھا خود کو مزید مستحکم بنانے کے ساتھ ساتھ اپنی حکومت کو توسیع دینے کے لیے کوششیں تیز کر دی تھیں۔ اسے جب حضرت علی علیہ السلام کے لشکر میں اختلاف اور اہل عراق میں تفرقہ کی خبر ملی تو وہ عراق پر حملہ کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ معاویہ نے ضحاک بن قیس کو یہ ذمے داری سونپی کہ وہ چار ہزار آدمیوں کو لے کر عراق جائے اور سرحد پار گڑبڑ پھیلائے۔ عراق کے عوام کو قتل کرے اور ان کا مال لوٹ لے۔ اس کارروائی سے معاویہ کا مقصد اہل عراق میں خوف و ہراس پھیلانا اور انھیں شام پر حملے کے بارے میں سوچنے سے باز رکھنا تھا۔

---

۱۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے تحکیم کے بارے میں فرمایا تھا:

اِنَّا لَمْ نُحَكِّمِ الرِّجَالَ، وَاِنَّمَا حَكَّمْنَا الْقُرْآنَ. هٰذَا الْقُرْآنُ اِنَّمَا هُوَ خَطٌّ مَسْتُوْرٌ بَيْنَ الدَّفَّتَيْنِ، لَا يَنْطِقُ بِلِسَانٍ، وَلَا بُدَّ لَهُ مِنْ تَرْجُمَانٍ وَاِنَّمَا يَنْطِقُ عَنْهُ الرِّجَالُ ہم نے آدمیوں کو نہیں بلکہ قرآن کو حَکم قرار دیا تھا۔ چونکہ یہ قرآن دو دفتیوں کے درمیان ایک لکھی ہوئی کتاب ہے جو زبان سے نہیں بولتی اس لیے ضرورت تھی کہ اس کے لیے کوئی ترجمان ہو اور وہ آدمی ہی ہوتے ہیں جو اس کی ترجمانی کرتے ہیں۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۳) رضوانی

ضحاک نہایت تندخو شخص تھا۔ اس نے معاویہ کے حکم پر عراق پہنچتے ہی قتل و غارت گری شروع کردی۔ دوسرے بہت سے افراد کے علاوہ اس نے عبد اللہ بن مسعود کے بھتیجے عمرو بن عمیس کو ان کے ساتھیوں سمیت قتل کر ڈالا۔ جب یہ خبر کوفہ میں حضرت علی علیہ السلام کو ملی تو شدت غضب سے آپ پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اسی حالت میں منبر پر تشریف لے گئے اور آپ نے بے عمل اور بے حس کوفیوں سے فرمایا: اے اہل کوفہ! اگر تم راہ خدا میں کام کرنا چاہتے ہو تو عمرو بن عمیس اور اس کے ساتھیوں کی طرف بڑھے چلو جو تمہارے ہی لشکر کا حصہ تھے۔ ان میں سے کچھ شہید ہوگئے اور کچھ زخمی ہیں۔ جاؤ جا کر جنگ کرو اپنے دشمن کے ساتھ، اپنی ناموس کا دفاع کرو اگر تم کچھ کرنے والے ہو؟

جب آپ نے لوگوں کی سستی اور کاہلی ملاحظہ کی تو فرمایا: اے بے وفا اور بے حمیت لوگو! کاش میرے پاس تم جیسے آٹھ آدمیوں کی بجائے معاویہ کے سپاہیوں جیسا ایک سپاہی ہوتا۔ خدا کی قسم! میں اپنے رب سے ملاقات کا مشتاق ہوں تاکہ ہمیشہ کے لیے تم لوگوں سے جان چھوٹے۔ مجھے خبر ملی ہے کہ معاویہ نے ضحاک بن قیس کو قتل و غارت کے لیے بھیجا ہے اور اس خونخوار اور کمینے شخص نے تمہارے کچھ بھائیوں کو قتل کرکے ان کا مال لوٹ لیا ہے مگر تم اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے ہو اور اپنے حریم سے دفاع کے لیے جنبش بھی نہیں کرنا چاہتے۔ (ارشاد مفید، ج ۱، باب سوم، فصل ۳۸ تلخیص کے ساتھ)

حضرت علی علیہ السلام نے حجر بن عدی کو ضحاک کے تعاقب میں بھیجا۔ ضحاک کچھ دن اہل کوفہ کی مزاحمت کرتا رہا مگر جب اس کے انیس سپاہی مارے گئے تو وہ تاریکی شب میں واپس شام بھاگ گیا۔

بسر بن ابی ارطات نے بھی معاویہ کے حکم پر ایک بڑے لشکر کے ساتھ حجاز اور یمن پر یلغار کی۔ اس نے بھی بہت سے شیعیان علیؑ کو قتل کیا اور ان کے مال و اسباب کو لوٹا۔ اس وقت عبید اللہ ابن عباس حضرت علی علیہ السلام کی طرف سے والی یمن تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ وہ بسر کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے تو اپنی جگہ عمرو بن اراکہ کو نائب بنا کر خود یمن سے کوفہ روانہ ہوگئے۔ بسر نے یمن پہنچ کر قتل وغارت کا بازار گرم کردیا اور عمرو بن اراکہ کو بھی قتل کر ڈالا۔ نیز عبید اللہ ابن عباس کے دو کمسن بچوں کو بھی ذبح کر ڈالا۔ بچوں کی ماں یہ دل خراش منظر دیکھ کر ہوش وحواس کھو بیٹھی۔

جب حضرت علی علیہ السلام کو یہ خبر ملی تو آپ نے اہل کوفہ کو سرزنش کی اور حارثہ بن قدامہ کو جس نے خود اس کام کی خواہش کی تھی دو ہزار سواروں کے ہمراہ بسر بن ابی ارطات کے مقابلے کے لیے روانہ فرمایا بسر کو جب حارثہ بن قدامہ کے آنے کی اطلاع ہوئی تو وہ بھاگ کر شام چلا گیا۔ (ناسخ التواریخ ص ۶۴۳)

پھر معاویہ نے سفیان بن عوف غامدی کو چھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ عراق کا امن خراب کرنے بھیجا۔ سفیان بن عوف نے انبار آکر وہاں کے حاکم حسان بن حسان بکری کو قتل کردیا اور شہر میں دہشت گردی کا بازار گرم کردیا۔ اس کے فوجیوں نے عورتوں کے زیورات بھی نوچ لیے۔ یہ ساری مصیبتیں حضرت علی علیہ السلام کے احکامات نہ ماننے اور بے عملی کی وجہ سے اہل کوفہ پر پڑی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت علی علیہ السلام نے اس موقع پر خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

مجھے خبر ملی ہے کہ معاویہ نے انبار پر شب خون مارا ہے، وہاں کے حاکم کو قتل کردیا ہے اور اس کے سپاہیوں نے تمہارے سواروں کو اس شہر کی حدود سے نکال باہر کیا ہے۔ نیز دشمن کے ایک سپاہی نے ایک مسلمان اور ایک ذمی عورت کے کنگن، کڑے، ہار اور گوشوارے بھی اتار لیے ہیں۔ وہ عورت اس ظلم کی تاب نہ لاتے ہوئے فریاد کرنے لگی اور اس نے اپنے رشتے داروں کو بھی مدد کے لیے پکارا۔ دشمن لوٹ کا مال اپنے ساتھ شام لے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس واقعے کو سن کر غم سے مرجائے تو باعث تعجب نہیں بلکہ میرے نزدیک ایسے واقعات سن کر مرجانا ہی بہتر ہے۔

جب میں نے گرمیوں میں تمھیں جنگ کی دعوت دی تو تم نے ہوا گرم ہونے کا بہانہ کرکے گرمی کا زور ٹوٹنے تک کی مہلت مانگی۔ پھر جب سردیوں میں تمھیں جنگ کے لیے کہا تو تم نے شدید سردی کا بہانہ کیا۔ تم لوگ جو سردی اور گرمی کا بہانہ کرکے جنگ سے راہ فرار اختیار کررہے ہو خدا کی قسم جنگ کے میدان میں تلوار دیکھ کر اور تیزی سے بھاگو گے۔ **يَاأَشْبَاهَ الرِّجَالِ وَلَا رِجَالَ!** اے مردوں کی شکل وصورت والے نامردو! وائے ہو تم پر۔ تمہاری عقلیں بچوں کی سی اور تمہاری سوچ حجلہ نشین عورتوں کی سی ہے۔ اے کاش! میں تمھیں نہ دیکھتا اور نہ ہی میری تم سے جان پہچان ہوتی کیونکہ ایسی شناسائی ندامت اور رنج واندوہ کا باعث بننے کے علاوہ کچھ نہیں۔

**قَاتَلَكُمُ اللهُ لَقَدْ مَلَأْتُمْ قَلْبِيْ قَيْحًا وَشَحَنْتُمْ صَدْرِيْ غَيْظًا وَجَرَّعْتُمُوْنِيْ نُغَبَ التَّهْمَامِ أَنْفَاسًا** خدا تمھیں غارت کرے۔ تم نے میرے دل کو پیپ سے بھر دیا ہے اور میرے سینے کو رنج سے چھلکا دیا ہے۔ تم نے مجھے ہر سانس میں غم کے جام پلائے ہیں اور اپنی نافرمانی وسرکشی سے میری رائے کو بھی بیکار اور بے اثر بنا دیا ہے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۲۷)

ان واقعات کے علاوہ دوسرے واقعات بھی رونما ہوئے جو عراقیوں کی شکست اور حضرت علیؑ کے رنج وغم کا موجب بنے۔ ان میں سے کچھ کی تفصیل درج ذیل ہے۔

قیس بن سعد حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے اوائل میں مصر کا حاکم تھا۔ وہ صفین میں بھی اپنے دستے کے ہمراہ موجود تھا۔ اس کی جگہ محمد بن ابی بکر کو مصر کا حاکم مقرر کیا گیا۔ معاویہ نے ثالثی کے بعد عمرو بن عاص کو مصر کی حکومت دینے کا جو وعدہ کر رکھا تھا اسے پورا کرنے کے لیے مصر پر قبضہ کرنے کا ارادہ کر لیا چنانچہ اس نے معاویہ بن خدیج کو ایک لشکر کے ساتھ مصر پر حملے کرنے کے لیے بھیجا۔ ادھر عمرو نے بھی مصر کے عوام کو محمد بن ابی بکر کے خلاف اکسانا شروع کر دیا۔

محمد بن ابی بکر کو جب شکست ہونے لگی تو انھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے کمک مانگی۔ حضرت علیؑ نے مالک اشتر کو جو جزیرہ کے گورنر تھے کوفہ بلایا اور ان کو مصر کی حکومت سنبھالنے کا حکم دیا اور محمد بن ابی بکر کو معزول کر دیا اور کوفہ بلا لیا تاکہ انھیں کوئی دوسری ذمے داری سونپیں اس لیے کہ مصر میں مالک جیسے جری حاکم کی ضرورت تھی جو معاویہ اور عمرو بن عاص کو تلوار سے جواب دے سکے۔

مالک اشتر ذی قعدہ ۳۸ھ میں کوفہ سے مصر روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک گدڑی پوش آدمی مالک سے ملا۔ مالک نے جو حضرت علی علیہ السلام کی پیروی کرتے ہوئے ہمیشہ غریبوں اور ناداروں کو اپنی شفقتوں سے نوازتے تھے اس آدمی سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے جواب دیا: میرا نام نافع ہے۔ مدینہ میں حضرت عمرؓ کا غلام تھا۔ اب آزاد ہوں۔ مدینہ میں سخت مشکلات کا شکار تھا اس لیے مصر جا رہا ہوں تاکہ وہاں کوئی کام تلاش کروں۔[۱]

مالک نے کہا: اگر میرے ساتھ رہنا پسند کرو تو تمہاری خوراک اور پوشاک میرے ذمے ہے۔ نافع نے جواب دیا: اس سے بہتر میرے لیے کیا سعادت ہو سکتی ہے، مجھے آپ کے ساتھ رہنا منظور ہے۔ مالک نے اس کو اپنے لشکر میں شامل کر لیا۔

مصر تک پہنچنے میں ابھی تین دن کا سفر باقی تھا چنانچہ جب لشکر شہر قلزم پہنچا تو رات وہاں آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ صبح نافع نے زہر ملے شہد سے ایک گلاس شربت تیار کیا اور مالک کو پیش کیا۔ مالک نے شربت پینے کے بعد لشکر کو کوچ کرنے کا حکم دیدیا۔ ابھی سفر کو چند گھنٹے ہی گزرے تھے کہ مالک اشتر کی حالت غیر ہوگئی اور وہ گھوڑے سے زمین پر گر گئے۔ لشکر والے مالک اشتر کی طرف دوڑے اور ان کے علاج معالجے میں مشغول ہوگئے لیکن زہر ہلاہل اپنا اثر دکھا چکا تھا۔ مالک اشتر کے ساتھیوں کو جب حقیقت کا پتا چلا تو انھوں نے نافع کو بہت تلاش کیا مگر اس کا کوئی نام و نشان نہ ملا۔ مالک اشتر وہیں

---

۱۔ نافع حضرت عثمانؓ کا غلام تھا لیکن اس ڈر سے کہ کہیں مالک پہچان نہ لیں اس نے خود کو حضرت عمرؓ کا غلام ظاہر کیا۔

راستے میں رحلت کر گئے اور آپ کے ساتھی آپ کا جنازہ لے کر شہر قلزم واپس آ گئے۔

اِدھر نافع[1] مالک اشتر کو زہر دینے کے بعد بھاگم بھاگ معاویہ کے پاس پہنچا۔ معاویہ کو اس خبر سے بے حد خوشی ہوئی اور اس نے اہل شام کو یہ خوشخبری سنائی کہ اب علیؑ تم لوگوں پر حملہ نہیں کر سکتے اس لیے کہ علیؑ کا پشت پناہ مالک مر گیا ہے۔ معاویہ نے نافع کو انعام و اکرام سے نوازا اور اہل شام کو جن کے دلوں پر مالک اشتر کی تلوار کے زخم تازہ تھے جشن منانے کا حکم دیا۔

دوسری طرف یہ خبر جب حضرت علی علیہ السلام کو ملی تو آپ کو اتنا شدید دکھ ہوا کہ آپ زار و قطار رونے لگے اور فرمایا: مالک اشتر کی موت ایک عظیم سانحہ ہے۔ اب ہم کبھی مالک اشتر کی نظیر نہ دیکھ سکیں گے۔ مالک اشتر تو شیر تھا جس کی آواز سن کر دشمنوں کے دل دہل جاتے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام نے انتہائی دکھ کے ساتھ فرمایا: مَالِكٌ وَمَا مَالِكٌ لَوْ كَانَ جَبَلًا لَكَانَ فِنْدًا لَا يَرْتَقِيهِ الْحَافِرُ وَلَا يَرْقَى عَلَيْهِ الطَّائِرُ أَمَا وَاللّٰهِ هَلَاكُهُ قَدْ أَعَزَّ أَهْلَ الْمَغْرِبِ وَأَذَلَّ أَهْلَ الْمَشْرِقِ لَا أَرَى مِثْلَهُ بَعْدَهُ أَبَدًا جانتے ہو مالک کون تھا؟ مالک اگر پہاڑ ہوتا تو وہ بھی ایسا عظیم اور بلند پہاڑ، جس کی چوٹی پر نہ تو کوئی چل کر قدم رکھ سکتا تھا اور نہ ہی کوئی پرندہ اس کے اوپر پرواز کر سکتا تھا۔ خدا کی قسم! اس کی شہادت نے اہل شام اور اہل مغرب (اہل مراکش) کو مغرور بنا دیا جبکہ اہل مشرق (اہل عراق) کے لوگوں کو رسوا کر دیا ہے۔ اب ہم آئندہ مالک کی مثال ہرگز نہ دیکھ سکیں گے۔ (ناسخ التواریخ، کتاب خوارج ص ۵۲۱)

مالک کی شہادت کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے دوبارہ محمد بن ابی بکر کو مصر کی حکومت سونپ دی۔ ادھر معاویہ اور عمرو بن عاص اپنے بغض کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے مکر و فریب کے ذریعے اپنی چالیں چلتے رہتے۔ ان لوگوں نے کئی بار خط کے ذریعے محمد بن ابی بکر کو لالچ دینے کے ساتھ ساتھ دھمکیاں بھی دیں مگر محمد نے ہر دفعہ انھیں دوٹوک جواب دیا اور ان سے کہا کہ وہ ہر حال میں حضرت علی علیہ السلام کا مخلص اور

---

۱۔ علامہ جواد مغنیہ نے اپنی کتاب شیعہ اور جابر حکمران، مطبوعہ مجمع علمی اسلامی میں لکھا ہے کہ امام علی علیہ السلام نے مصر کی بازیابی کے لیے مالک اشتر کی سرکردگی میں ایک بہت بڑی فوج بھیجی۔ جب یہ خبر معاویہ کو ملی تو اُس نے عریش کے ایک زمیندار کو بلوا بھیجا اور اُس سے کہا: اگر تو مالک کو زہر دیکر مار ڈالے تو تجھ کو بیس سال کا خراج معاف کر دیا جائے گا (اور اس کے پاس ابن آثال کا بنایا ہوا زہر بھیج دیا)۔ مالک جب عریش پہنچے تو زمیندار نے شہد کے شربت سے اُن کی تواضع کی۔ شربت پیتے ہی مالک کی موت واقع ہوگئی اور معاویہ کے سپاہیوں نے زمیندار کو مار ڈالا۔ جب حضرت علی علیہ السلام کو یہ اندوہناک خبر ملی تو آپ نے فرمایا: لِلْيَدَيْنِ وَالْفَمِ یہ الفاظ ایسے موقع پر کہے جاتے ہیں جب انسان بے بس ہو اور کچھ نہ کر سکتا ہو۔ (رضوانی)

وفادار رہے گا۔ معاویہ جب محمد کو لالچ دے کر اپنی طرف لانے سے مایوس ہوگیا تو اس نے محمد کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا جبکہ عمرو بن عاص نے اپنے مکر کے جادو سے اہل مصر کو محمد بن ابی بکر کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرلیا۔

محمد نے معاویہ کی تحریک کے نتیجے میں رونما ہونے والی نئی صورتحال سے حضرت علی علیہ السلام کو مطلع کیا۔ آپ نے مسجد میں اہل کوفہ کو خط کا مکمل متن پڑھ کر سنایا اور ایک بار پھر اہل کوفہ کی بے عملی اور بدنظمی کی مذمت کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے پیش آنے والی ہزیمتوں کو اہل کوفہ کی نا اہلی اور بزدلی کا نتیجہ قرار دیا۔ اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے مالک بن کعب کو دس ہزار سپاہیوں کے ہمراہ محمد بن ابی بکر کی مدد کے لیے بھیجا مگر اس عرصے میں محمد بن ابی بکر جو اپنے گنے چنے ساتھیوں کے ساتھ معاویہ بن خدیج کے خلاف برسرپیکار تھے دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے اور ان کے ساتھیوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

حضرت علیؑ ابھی مالک اشتر کی شہادت کا سوگ منا رہے تھے کہ آپ کو سقوط مصر اور محمد بن ابی بکر کی شہادت کی خبر موصول ہوئی۔ اس خبر نے آپ کے غم میں مزید اضافہ کردیا اور آپ کی چشمان مبارک سے سیل اشک رواں ہوگیا۔ آپ نے فرمایا: شام کے بدطینت لوگ مالک اشتر اور محمد بن ابی بکر کی شہادت سے جس قدر خوش ہو رہے ہیں ان کی خوشی سے ہمارا دکھ کہیں زیادہ ہے۔

بہرحال اسی طرح کے پے در پے رونما ہونے والے سانحات میں سے ہر ایک اپنی جگہ غم کا باعث بن رہا تھا۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ حاکم بصرہ معاویہ کی سازش میں آکر حضرت علی علیہ السلام کی اطاعت سے منحرف ہوا اور اس نے مکہ پر قبضہ کرنے کے لیے لشکر بھی بھجوایا۔

حقیقی مسلمانوں کی حالت روز بروز خراب تر ہوتی جا رہی تھی، ان کی تعداد بھی کم تھی اور حضرت علی علیہ السلام کی طرف سے شہروں کے دفاع کے لیے کی جانے والی نصیحتوں کا بھی کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

صفین سے واپسی کے بعد تقریباً دو سال تک مشکلات کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ ۴۰ھ میں حضرت علی علیہ السلام نے غم دل کی ترجمانی کرنے والے خطبات سے اہل کوفہ کو جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہتھیار اٹھانے کی عادت و ہمت کھو چکے تھے انھیں پھر لڑنے کی ہمت دلائی۔ حضرت علی علیہ السلام کا خود سپہ سالار لشکر کی حیثیت سے اٹھ کھڑا ہونا اور انھیں بھی اپنے شانہ بشانہ جہاد کی ترغیب دلانا آخرکار اہل کوفہ کو شرم دلانے اور قیام کرنے پر آمادہ کرنے کا سبب بن گیا۔

معاویہ سے حتمی جنگ کرنے کے لیے تقریباً بیس ہزار افراد پر مشتمل لشکر تیار ہو کر حضرت علی علیہ السلام

کے حکم پر وادی نخیلہ میں خیمہ زن ہوا۔ حضرت علی علیہ السلام نے سرداروں۔ اور حکام کو لکھا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں سے سپاہیوں کے ساتھ پوری طرح مسلح ہو کر شام پر حملے کے لیے نخیلہ پہنچیں۔ پھر کوفہ سے روانگی سے قبل راستے اور منصوبے سے متعلق احکامات کے علاوہ اپنے ماتحت حکام کو مختلف امور کے بارے میں ہدایات دیں لیکن اس موقع پر ایک نیا واقعہ رونما ہوا جس نے مسلمانوں کی تاریخ کا راستا ہی بدل ڈالا اور مذکورہ جنگی منصوبے پر عمل درآمد منسوخ کرنا پڑا۔ گروہ خوارج نے جس کے بارے میں اشارہ کیا جا چکا ہے عبداللہ بن وہب راسبی کی سرکردگی میں ایک نیا فتنہ کھڑا کر دیا۔

خوارج کے فتنے کا معاملہ حضرت علی علیہ السلام کی فوجی کونسل کے سامنے پیش کیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ اگر حضرت علی علیہ السلام کا لشکر شام پر حملے کے لیے کوفہ سے روانہ ہوگا تو یقینی طور پر خوارج کوفہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس صورت میں لشکر علیؑ کو داخلی اور خارجی دونوں محاذوں پر لڑنا پڑے گا اس لیے مصلحت اسی میں ہے کہ پہلے خوارج سے نمٹا جائے تاکہ بعد میں سکون سے شام کا قصد کیا جا سکے۔

حضرت علی علیہ السلام نے جو خونریزی سے حتیٰ الامکان گریز کیا کرتے تھے آخری بار خط کے ذریعے خوارج کو نصیحت فرمائی اور ان کو حق کا بول بالا کرنے کے لیے معاویہ کے خلاف لڑنے کی دعوت بھی دی۔

عبداللہ راسبی نے حضرت علی علیہ السلام کا خط پڑھنے کے بعد قاصد کو زبانی طور پر کہا کہ ہماری طرف سے علیؑ سے کہنا کہ تم کافر ہو۔ پہلے توبہ کرو پھر ہم سے مدد مانگو۔ اس کے بعد راسبی نے خوارج کو نہروان روانہ ہونے کا حکم دیا۔ نہروان خوارج کی چھاؤنی بن گیا تھا اور اس کے ہم عقیدہ افراد گرد و نواح سے آ کر یہاں جمع ہونے لگے تھے جن کی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

حضرت علی علیہ السلام بھی وادی نخیلہ کے فوجی مرکز سے شام جانے کے قصد کو ملتوی کر کے نہروان آ گئے۔ حضرت علی علیہ السلام کے لشکر کی نہروان آمد کے موقع پر گروہ خوارج نے یک آواز ہو کر یہ نعرہ بلند کیا: لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ کوئی حکم نہیں سوائے اللہ کے حکم کے چاہے مشرکین کو یہ بات ناپسند ہی کیوں نہ ہو۔

امیر المومنینؑ اس گروہ سے شدید نالاں تھے اور ان کے متعلق اظہار افسوس فرمایا کرتے تھے کیونکہ یہ لوگ جس عقیدے پر اڑے ہوئے تھے وہ ان کی نادانی تھی۔ اسی وجہ سے حضرت علی علیہ السلام نے خوارج کے لشکر کے سامنے کھڑے ہو کر اتمام حجت کے لیے عبداللہ راسبی اور دیگر خوارج کو مخاطب کر کے نہایت مدلل اور مشفقانہ انداز میں ان کی غلطی سے آگاہ کیا اور اپنی حقانیت میں بھی دلائل دیئے۔ اس موقع

پر بہت سے خوارج نے اپنے عقیدے سے توبہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: نہروان کے کنارے ایک سفید جھنڈا نصب کیا جائے اور خوارج میں سے توبہ کرنے والے اس کے نیچے جمع ہوجائیں چنانچہ خوارج کا دو تہائی لشکر سفید جھنڈے تلے جمع ہوگیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے انھیں معاف کردیا لیکن بقیہ لشکر جس کی تعداد چار ہزار تھی عبد اللہ بن وہب راسبی کی زیر قیادت اپنے قول پر ڈٹا رہا اس لیے حضرت علی علیہ السلام کو ان کے ساتھ جنگ کرنا پڑی۔

جنگ شروع کرنے سے قبل مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کے لیے جن کا جذبہ ایمان اور جوش جہاد معاویہ کی غارتگری کی وجہ سے قدرے کمزور ہوچکا تھا حضرت علی علیہ السلام نے خطاب فرمایا جسے امام عالی مقام کے معجزات میں سے ایک معجزہ قرار دینا مناسب ہوگا کیونکہ آپ نے اپنے خطاب میں جو پیشگوئی فرمائی تھی وہ سو فیصد درست ثابت ہوئی۔ آپ نے فرمایا: اس پورے لشکر خوارج میں سے دس افراد سے بھی کم زندہ بچیں گے جبکہ تمہارے دس سے بھی کم آدمی شہید ہوں گے۔ حضرت علی علیہ السلام نے جنگ شروع ہونے سے قبل جنگ کی جو کیفیت اور نتائج بیان کیے تھے وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوئے۔

جنگ شروع ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس گروہ کے سب لوگ مارے گئے اور صرف نو افراد بچے جو میدان سے بھاگ گئے جبکہ حضرت علی علیہ السلام کے لشکر میں سے صرف سات آدمی شہید ہوئے۔ اس جنگ کے خاتمے کے بعد حضرت علی علیہ السلام واپس کوفہ تشریف لے آئے۔ نہروان سے جو خوارج بھاگ گئے تھے ان میں ایک عبد الرحمٰن ابن ملجم تھا جس کا تعلق قبیلہ مراد سے تھا۔ وہ بھاگ کر مکہ چلا گیا۔[۱]

---

۱۔ ابن ملجم مرادی ایک گمنام شخص تھا۔ جب حضرت علی علیہ السلام جنگ صفین کے لیے کوفہ میں فوج بھرتی کر رہے تھے تو آپ کی نظر اس پر پڑی۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ کی بتائی ہوئی نشانیوں سے حضرت علی علیہ السلام نے اسے پہچان لیا اور فرمایا: کیا تم ہی عبد الرحمٰن ابن ملجم ہو؟ اس نے کہا: جی ہاں یا امیر المومنینؑ! حضرت علی علیہ السلام نے حاضرین کی طرف رخ کرکے عمرو بن معد یکرب کا یہ مصرعہ پڑھا اُرِیْدُ حَیَاتَهٗ وَیُرِیْدُ قَتْلِیْ یعنی میں اس کی زندگی چاہتا ہوں اور یہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ اصحاب نے عرض کی: مولا! حکم دیجیے تو ہم اس کو ابھی قتل کردیں۔ آپ نے فرمایا: کیا ارتکاب جرم سے پہلے قصاص لیا جاسکتا ہے؟ (مؤلف)

اگر حضرت علی علیہ السلام خوارج کی سرکوبی نہ کرتے تو تمام دین دار مسلمان آہستہ آہستہ خارجیت قبول کرلیتے اور اگر لوگ خارجی ہوجاتے تو آج نہ شیعہ اسلام ہوتا اور نہ سنی اسلام۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت نے جنگ نہروان کے بعد اپنے ایک خطبے میں جو نہج البلاغہ میں موجود ہے خدا کی حمد وثناء کے بعد فرمایا تھا: یَا اَیُّهَا النَّاسُ فَاِنِّیْ فَقَأْتُ عَیْنَ الْفِتْنَةِ وَلَمْ یَکُنْ لِیَجْتَرِئَ عَلَیْهَا اَحَدٌ غَیْرِیْ اے لوگو! میں نے فتنہ وشر کی آنکھ پھوڑ دی ہے۔ میرے سوا کسی میں اس کام کو کرنے کی جراٴت نہ تھی۔ بے روح اور بے معرفت لمبی لمبی نمازیں پڑھنے والے نام نہاد مقدس اور ظاہر بین عابدوں کی سرکوبی اتنا بڑا کام تھا کہ صرف امام علی علیہ السلام ہی اس کام کو کرنے کی جراٴت کرسکتے تھے۔ (رضوانی)

# (۷) حضرت علی علیہ السلام کی شہادت

جنگ نہروان کے بعد حضرت علی علیہ السلام واپس کوفہ تشریف لائے اور شام پر حملے کی تیاری کرنے لگے۔ آپ کے صوبائی گورنروں نے بھی آپ کے فرمان کے مطابق سپاہیوں کو بھرتی کرکے اور اسلحہ سے لیس کرکے آپ کی خدمت میں روانہ کیے۔

شعبان ۴۰ھ کے اواخر میں گرد و نواح کے علاقوں سے بھی سپاہیوں کی کوفہ آمد شروع ہوگئی۔ یہ سب وادی نخیلہ کے فوجی کیمپ میں جمع ہوئے۔ حضرت علی علیہ السلام نے آنے والے سپاہیوں کو جنگی سامان فراہم کیا اور دن رات ان کی ضرورتیں پوری کرنے میں سرگرم عمل رہے۔ آپ کے سپہ سالاروں کے دلوں میں معاویہ کے منفی کردار اور عمرو عاص کی دھوکا دہی کی وجہ سے شدید نفرت پائی جاتی تھی چنانچہ انھوں نے جنگی تیاریوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آخرکار رمضان المبارک ۴۰ھ کے دوسرے عشرے میں حضرت علی علیہ السلام نے ایک خطبہ دیا اور اپنی فوج کا حوصلہ بڑھایا اور ان کو شام پر حملے کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا مگر اسی دوران خامۂ تقدیر نے ایک ایسا فیصلہ صادر کیا کہ آپ کا منصوبہ ادھورا رہ گیا۔

نہروان سے بھاگنے والے خوارج نے مکہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا ہوا تھا۔ ان میں سے تین افراد عبد الرحمٰن ابن ملجم، برک بن عبد اللہ اور عمرو بن بکر نے ایک رات بات چیت کے دوران کہا کہ مسلمانوں کے خراب حالات کے ذمے دار علیؑ، معاویہ اور عمرو بن عاص ہیں۔ اگر ان تینوں کو قتل کردیا جائے تو ملک میں امن و امان بحال ہوجائے گا اور خونریزی رک جائے گی۔ چنانچہ عبد الرحمٰن ابن ملجم نے حضرت علی علیہ السلام کو، عمرو بن بکر نے عمرو بن عاص کو اور برک بن عبداللہ نے معاویہ کو قتل کرنے کی قسم کھائی۔ پھر ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی تلوار کو زہر آلود کیا تاکہ اس کا وار کاری ثابت ہو۔ یہ منصوبہ مکہ میں خفیہ طریقے سے تیار ہوا اور ان تینوں نے اپنے اپنے ہدف کو نشانہ بنانے کے لیے ۱۹ر رمضان المبارک کی رات چنی۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک اپنے ہدف کی جانب روانہ ہوگیا۔ عمرو بن بکر، عمرو بن عاص کو قتل

کرنے کے لیے مصر، برک بن عبداللہ، معاویہ کو قتل کرنے کے لیے دمشق اور ابن ملجم حضرت علی علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے کوفہ پہنچ گئے۔

برک بن عبداللہ ۱۹ ررمضان کی رات دمشق کی مسجد میں جا کر پہلی صف میں شامل ہوگیا۔ جب معاویہ نے سر سجدے میں رکھا تو اس نے وار کیا مگر جلد بازی میں تلوار معاویہ کے سر کی بجائے اس کی ران پر لگی اور معاویہ شدید زخمی ہوگیا۔ اسے فوراً اس کے محل میں لے جایا گیا اور برک کو گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کیا گیا۔

معاویہ: تمھیں یہ کام کرنے کی جرأت کیسے ہوئی ؟

برک : امیر اگر مجھے معافی مل جائے تو میں آپ کو ایک خوشخبری سناؤں ؟

معاویہ: کہو۔

برک : ابھی ابھی علیؑ کو قتل کر دیا گیا ہے۔

معاویہ نے اس خبر کی تحقیق تک اسے قید کر دیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی اطلاع درست تھی تو اسے چھوڑ دیا۔ شیخ مفید کے مطابق معاویہ نے اسی وقت اس کی گردن اڑا دینے کا حکم دیا تھا۔

معاویہ کے علاج معالجے کے لیے طبیب کو بلایا گیا۔ طبیب نے زخم دیکھنے کے بعد کہا کہ اگر امیر کو اولاد کی خواہش نہ ہو تو دوا سے علاج ہوسکتا ہے ورنہ زخم کی جگہ کو آہنی سلاخ سے داغنا پڑے گا۔

معاویہ نے کہا: آہنی سلاخ سے داغنے کی تکلیف میں برداشت نہیں کرسکتا، میرے لیے دو بیٹے (یزید اور عبداللہ) کافی ہیں۔

ادھر عمرو بن بکر بھی اسی رات مصر کی جامع مسجد میں جا کر پہلی صف میں شامل ہوگیا۔ اتفاق سے اس رات عمرو بن عاص شدید بخار میں مبتلا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے بیٹے کے مشورے سے قاضی شہر کو نماز کی امامت کے لیے بھیج دیا۔ نماز کی پہلی رکعت کے سجدے میں ابھی وہ گیا ہی تھا کہ عمرو بن بکر نے ایک کاری ضرب لگائی اور اس کا کام تمام کر دیا۔ مسجد میں شور وغل بلند ہوا، نماز نامکمل رہ گئی اور قاتل مصریوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا۔ جب اسے عمرو بن عاص کے سامنے پیش کرنے کے لیے لے جایا جا رہا تھا تو اہل مصر اسے عمرو بن عاص کے غصے اور اس کی سخت سزا سے ڈرانے لگے۔ عمرو بن بکر نے حیران ہو کر کہا: کیا عمرو بن عاص قتل نہیں ہوا؟ میں نے اس پر جس تلوار سے وار کیا ہے اگر وہ مرد آہن ہوتا تب بھی زندہ نہ رہتا؟ لوگوں نے اسے بتایا کہ تم نے شہر کے قاضی کو قتل کیا ہے، عمرو بن عاص کو نہیں۔

عمرو بن بکر کو یہ سن کر بڑا افسوس ہوا کہ عمرو بن عاص کی جگہ قاضی شہر مارا گیا ہے۔ وہ اپنی ناکامی پر رونے لگا۔ عمرو بن عاص نے جب اس سے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا: مجھے اپنی جان کا کوئی غم نہیں۔ مجھے قاضی شہر کی موت اور تیرے بچ جانے کا غم رلا رہا ہے کیونکہ میں اپنے ساتھیوں کی طرح اپنی ذمے داری نہیں نبھا سکا۔

عمرو بن عاص نے اس سے صورت واقعہ دریافت کی تو عمرو بن بکر نے اسے اپنی اور اپنے ساتھیوں کے خفیہ منصوبے کی تفصیلات بتائیں تو عمرو بن عاص نے اسے قتل کردیا۔ اس طرح عمرو اور معاویہ کو قتل کرنے پر مامور دونوں خوارج اپنے منصوبوں میں کامیاب نہ ہوسکے اور ہلاک ہوگئے۔

ادھر عبدالرحمٰن ابن ملجم شعبان ۴۰ھ کے اواخر میں کوفہ پہنچا اور اپنے ارادے سے کسی کو آگاہ کئے بغیر اپنے ایک دوست کے ہاں اترا اور ۱۹ رمضان کی شب کا انتظار کرنے لگا۔ ایک دن وہ اپنے کسی واقف کار سے ملنے گیا جہاں اس کی قطام سے ملاقات ہوئی۔ قطام کا باپ اور بھائی جنگ نہروان میں حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ابن ملجم پہلی نظر میں ہی اسے دل دے بیٹھا اور اس نے اس کو شادی کی پیشکش کردی۔

قطام نے کہا: تم میرے مہر میں کیا دے سکتے ہو؟

ابن ملجم: تم جو مانگو۔

قطام: میرا مہر تین ہزار درہم نقد، ایک غلام، ایک کنیز اور علی کا سر ہے۔ کتنا خطیر مہر ہے۔ شاعر کہتا ہے:

فَلَمْ اَرَ مَهْرًا سَاقَهُ ذُوْ سَمَاحَةٍ ... كَمَهْرِ قَطَامٍ مِنْ غَنِيٍّ وَ مُعْدِمٍ

ثَلَاثَةُ آلَافٍ وَ عَبْدٌ وَ قَيْنَةٌ ... وَ ضَرْبُ عَلِيٍّ بِالْحُسَامِ الْمُسَمَّمِ

وَلَا مَهْرَ اَغْلٰى مِنْ عَلِيٍّ وَاِنْ غَلَا ... وَلَا فَتْكَ اِلَّا دُوْنَ فَتْكِ ابْنِ مُلْجَمٍ

میں نے کسی دولت مند اور درویش کو نہیں دیکھا جو قطام کے مہر کی مانند کسی عورت کو مہر دے۔ اس کا مہر تین ہزار درہم نقد، ایک غلام، ایک کنیز اور مسموم تلوار سے علیؑ کو قتل کرنا ہے۔ کوئی بھی مہر کتنا ہی خطیر کیوں نہ ہو قتل علیؑ سے بھاری نہیں ہوسکتا اور کوئی بھی ملعون ابن ملجم جیسا ملعون نہیں ہوسکتا۔

بہر حال ابن ملجم نے جو مکہ سے کوفہ حضرت علی علیہ السلام کو قتل کرنے کے ارادے سے آیا تھا اپنا مقصد ظاہر کئے بغیر قطام کو آزمانے کے لیے کہا: نقد رقم، غلام اور کنیز کا مطالبہ ایسا ہے جو میں پورا کرسکتا

ہوں مگر علیؑ کو قتل کرنا میرے لیے کیونکر ممکن ہے؟

قطام نے کہا: یقیناً عام حالت میں کوئی علیؑ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انھیں غفلت میں رکھ کر قتل کیا جائے تا کہ میرے دل کو قرار اور تمھیں میرا وصال ملے۔ اگر تم اس کام کے نتیجے میں قتل ہو گئے تب بھی تمہاری آخرت دنیا سے بہتر ہوگی۔ یہ سن کر ابن ملجم سمجھ گیا کہ قطام بھی خوارج میں سے ہے چنانچہ ابن ملجم نے کہا: خدا کی قسم! میں کوفہ اسی مقصد سے آیا ہوں۔ قطام نے کہا کہ میں اس کام میں تمہاری مدد کے لیے حاضر ہوں۔ پھر اس نے وردان بن مجالد کو جو قطام ہی کے قبیلے سے تھا بلایا اور اسے ابن ملجم کی مدد کے لیے کہا۔ وردان جو حضرت علی علیہ السلام سے بغض رکھتا تھا، فوراً راضی ہوگیا۔ ابن ملجم نے قبیلہ اشجع کے ایک شخص شبیب کو اپنے ساتھ ملا لیا جو اس کا ہم عقیدہ تھا۔ پھر اس نے اشعث بن قیس کو (یعنی وہ منافق جس نے جنگ صفین میں حضرت علی علیہ السلام کو جنگ بندی پر مجبور کیا تھا) اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ اشعث نے وعدہ کیا کہ وہ مقررہ وقت پر مسجد میں اس سے آملے گا۔ آخر کار ۱۹ ر رمضان کی شب آگئی اور عبدالرحمٰن ابن ملجم اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسجد کوفہ میں پہنچ کر حضرت علی علیہ السلام کا انتظار کرنے لگا۔

ابن ملجم کے کوفہ پہنچتے ہی حضرت علی علیہ السلام نے لوگوں کو اپنی شہادت کی خبر دینا شروع کردی تھی یہاں تک کہ رمضان المبارک میں ایک دن حضرت علی علیہ السلام نے منبر پر اپنی ریش مبارک ہاتھ میں لیکر فرمایا عنقریب ایک شقی ان بالوں کو میرے سر کے خون سے رنگین کرے گا۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت علی علیہ السلام اپنی زندگی کے آخری ایام میں ہر رات اپنے کسی بیٹے یا بیٹی کے گھر مہمان ہوا کرتے۔ شب ضربت آپ اپنی چھوٹی صاحبزادی جناب امّ کلثوم کے گھر مہمان تھے۔

افطار کے وقت صرف تین لقمے تناول فرمائے اور عبادت میں مشغول ہو گئے۔ آپ نے یہ پوری رات بے چینی میں گزاری۔ کبھی آسمان کی طرف دیکھتے اور مضطرب ہوکر تضرع و زاری کرنے لگتے۔ طلوع فجر کا وقت جتنا نزدیک ہوتا جا رہا تھا آپ کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی یہاں تک کہ جناب امّ کلثوم نے پوچھا: بابا جان! آپ کی یہ بیداری اور بے چینی کس وجہ سے ہے؟ آپ نے فرمایا: بیٹی! میں نے زندگی معرکوں اور میدانوں میں بسر کی ہے، نامور بہادروں اور سورماؤں سے نبرد آزمائی کی ہے، بسا اوقات تن تنہا دشمنوں کی صفوں پر حملہ کیا ہے اور عرب کے مانے ہوئے جنگجوؤں کو خون میں نہلایا ہے۔ میں ایسے حوادث سے نہیں ڈرتا لیکن آج رات مجھے لگتا ہے کہ دیدار حق کا وقت قریب آن پہنچا ہے۔

القصہ رات کی تاریکی ختم ہونے لگی تو حضرت علی علیہ السلام گھر سے نکلنے لگے۔ اس موقع پر کچھ مرغابیاں جو گھر میں پالی ہوئی تھیں خلاف عادت آپ کے سامنے آئیں اور آپ کے قدموں پر اپنے پر پھڑپھڑانے اور چیخنے لگیں اور زبان بے زبانی سے آپ کو روکنے لگیں۔ آپ نے فرمایا: بیٹی! ابھی تو یہ مرغابیاں چیخ رہی ہیں، کچھ دیر بعد اس گھر سے چیخیں بلند ہوں گی۔ جناب امّ کلثوم نے پریشان ہوکر کہا: بابا بہتر یہی ہے کہ آج آپ تنہا نہ جائیں۔ آپ نے فرمایا: بیٹی! اگر کوئی زمینی آفت ہوتو میں اکیلا اس کا مقابلہ کرنے کی قوت رکھتا ہوں لیکن اگر آسمانی فیصلہ ہے تو پھر وہ ہوکر رہے گا۔

حضرت علی علیہ السلام تنہا مسجد میں پہنچے، گلدستۂ اذان پر کھڑے ہوکر اذان دی اور مسجد میں داخل ہوئے۔ جو لوگ سو رہے تھے انھیں جگایا اور نفل پڑھنے میں مشغول ہوگئے۔ جب امام سجدے میں گئے تو ابن ملجم لِلّٰهِ الْحُكْمُ لَا لَكَ يَا عَلِيُّ کہتا ہوا بڑھا اور حضرت کے سر اقدس پر زہر آلود تلوار سے شدید وار کیا[1] جو اسی جگہ لگا جہاں جنگ خندق میں عمرو بن عبدوَد کے وار کا زخم آیا تھا۔ ابن ملجم کے وار سے حضرت علیؑ کا فرق مبارک پیشانی تک شگافتہ ہوگیا۔ ابن ملجم اور اس کے ساتھی شبیب اور وردان وغیرہ فرار ہوگئے۔

حضرت علی علیہ السلام کے سر اقدس سے خون بہنے لگا جس سے آپ کی ریش مبارک خون سے تر ہوگئی اسی حالت میں آپ نے فرمایا: بِسْمِ اللهِ وَبِاللهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللهِ فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ پھر آپ نے مٹھی بھر خاک اٹھائی اور یہ آیت تلاوت فرمائی: مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى یعنی اسی مٹی سے[2] ہم نے تم کو پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تمھیں واپس لے جائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے۔ (سورۂ طٰہٰ: آیت ۵۵) اس موقع پر جبریل امینؑ نے زمین و آسمان کے درمیان یہ فریاد بلند کی: تَهَدَّمَتْ وَاللهِ اَرْكَانُ الْهُدٰى وَانْطَمَسَتْ اَعْلَامُ التُّقٰى وَانْفَصَمَتِ الْعُرْوَةُ الْوُثْقٰى قُتِلَ ابْنُ عَمِّ الْمُصْطَفٰى قُتِلَ عَلِيُّ نِ الْمُرْتَضٰى، قَتَلَهُ اَشْقَى الْاَشْقِيَاءِ خدا کی قسم! ہدایت کے

---

۱۔ شیخ مفید علیہ الرحمہ کی روایت کے مطابق عبدالرحمٰن ابن ملجم اور اس کے ساتھی مسجد کے دروازے کے عقب میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ جونہی حضرت علی علیہ السلام مسجد کے اندر داخل ہوئے انھوں نے اپنی تلواریں نکال کر حملہ کردیا اور چلائے لِلّٰهِ الْحُكْمُ لَا لَكَ يَا عَلِيُّ شبیب کی تلوار مسجد کی دیوار پر لگی جبکہ ابن ملجم کے وار سے حضرت علی علیہ السلام کا فرق مبارک شگافتہ ہوگیا۔

۲۔ حضرت علی علیہ السلام کا اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ نے انسان کو زمین سے پیدا کیا ہے جیسا کہ اس سے ماقبل آیت میں مذکور ہے۔ سورۂ مبارکہ ہود میں بھی آیا ہے کہ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ اس نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے۔

اس آیت کے ذیل میں استاد مرتضیٰ مطہری فرماتے ہیں: یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ اَنْشَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تم کو اللہ نے زمین پر پیدا کیا بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ تم کو زمین سے پیدا کیا۔ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ یعنی تم کو زمین کے پیٹ سے نکالا۔ گویا اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ زمین تمھاری دوسری ماں ہے۔ (سخن، مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان) رضوانی

ارکان ٹوٹ گئے۔ پرہیزگاری کے نشانات مٹ گئے۔ خدا کی مضبوط رسی ٹوٹ گئی۔ محمد مصطفیٰ ﷺ کے ابن عم قتل ہو گئے۔ علی مرتضیٰؑ قتل کر دیئے گئے۔ انھیں بدترین شقی نے قتل کر دیا ہے۔

مسجد میں شور و غل بپا تھا۔ حسنین کریمینؑ گھر سے مسجد کی طرف دوڑے۔ کچھ لوگوں نے ابن ملجم کا تعاقب کر کے اسے پکڑ لیا تھا۔ امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام بنی ہاشم کے دیگر افراد کے ساتھ مل کر حضرت علی علیہ السلام کو ایک کمبل میں لٹا کر گھر لائے اور فوراً طبیب کو بلوایا گیا۔

طبیب نے آ کر زخم کا معائنہ کیا اور بولا: مجھے افسوس ہے کہ زخم ناقابل علاج ہے کیونکہ زہر آلود تلوار نے مغز کو بھی متاثر کیا ہے اور اب بہتری کی کوئی امید نہیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے عام لوگوں کی طرح موت کا ذکر سن کر خوفزدہ ہونے کی بجائے نہایت بہادری اور بردباری سے طبیب کی گفتگو سنی۔ آپ بارہا فرما چکے تھے کہ آپ موت سے اس طرح مانوس ہیں جیسے بچہ اپنی ماں کی چھاتی سے مانوس ہوتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اپنی تمام تر حیات طیبہ میں موت سے دست بگریباں رہے۔ شب ہجرت آپ نہایت سکون کے ساتھ بستر رسولؐ پر سوئے تھے اور تمام غزوات میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے: ابو طالبؑ کے بیٹے کو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ موت پر جا گرے یا موت اس پر آ پڑے۔ پھر آپ نے حسنین کریمینؑ کو یہ وصیت فرمائی: اُوْصِيْكُمَا بِتَقْوَى اللّٰهِ وَاَنْ لَّا تَبْغِيَا الدُّنْيَا وَاِنْ بَغَتْكُمَا وَلَا تَاْسَفَا عَلٰى شَيْءٍ مِّنْهَا زُوِيَ عَنْكُمَا...

میں تم دونوں کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرتے رہنا، دنیا کے خواہشمند نہ ہونا، اگرچہ وہ تمہارے پیچھے لگے اور دنیا کی کسی ایسی چیز پر نہ کڑھنا جو تم سے روک لی جائے، جو کہنا حق کے لیے کہنا اور جو کرنا ثواب کے لیے کرنا، ظالم کے دشمن اور مظلوم کے مددگار بنے رہنا۔

میں تم کو، اپنی تمام اولاد کو، اپنے کنبہ کو اور جن جن تک میرا یہ نوشتہ پہنچے سب کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرتے رہنا، اپنے معاملات درست اور آپس کے تعلقات سلجھائے رکھنا کیونکہ میں نے تمہارے نانا رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ ''آپس کی کشیدگیوں کو مٹانا عام نماز روزے سے افضل ہے۔'' (دیکھو!) یتیموں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا، ان کے کام و دہن کے لیے فاقہ کی نوبت نہ آئے اور تمہاری موجودگی میں وہ تباہ و برباد نہ ہو جائیں۔ اپنے ہمسایوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا کیونکہ ان کے بارے میں اللہ کے پیغمبرؐ نے برابر ہدایت کی ہے اور آپ اس حد تک ان کے لیے سفارش فرماتے رہے کہ ہم لوگوں کو یہ گمان ہونے لگا کہ آپ انھیں بھی ورثہ دلائیں گے۔ قرآن کے

بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا، ایسا نہ ہو کہ دوسرے اس پر عمل کرنے میں تم پر سبقت لے جائیں۔

نماز کے بارے میں اللہ سے ڈرنا کیونکہ وہ تمہارے دین کا ستون ہے۔

اپنے پروردگار کے گھر کے بارے میں اللہ سے ڈرنا، اسے جیتے جی خالی نہ چھوڑنا کیونکہ اگر یہ خالی چھوڑ دیا گیا تو پھر (عذاب سے) مہلت نہ پاؤ گے۔

جان، مال اور زبان سے راہ خدا میں جہاد کرنے کے بارے میں اللہ کو نہ بھولنا۔

اور تم کو لازم ہے کہ آپس میں میل ملاپ رکھنا اور ایک دوسرے کی اعانت کرنا اور خبردار! ایک دوسرے کی طرف سے پیٹھ پھیرنے اور تعلقات توڑنے سے پرہیز کرنا، نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے سے کبھی ہاتھ نہ اٹھانا ورنہ بدکردار تم پر مسلط ہوجائیں گے۔ پھر دعا مانگو گے تو قبول نہ ہوگی۔

پھر ارشاد فرمایا: اے عبدالمطلب کے بیٹو! ایسا نہ ہونے پائے کہ تم ''امیرالمومنینؑ قتل ہوگئے، امیرالمومنینؑ قتل ہوگئے'' کے نعرے لگاتے ہوئے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنا شروع کردو۔

دیکھو! میرے بدلے میں صرف میرا قاتل ہی قتل کیا جائے اور دیکھو! جب میں اس ضرب سے مرجاؤں تو اس ایک ضرب کے بدلے میں ایک ہی ضرب لگانا اور اس شخص کے ہاتھ پیر نہ کاٹنا کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ ''خبردار! کسی کے بھی ہاتھ پیر نہ کاٹو، اگرچہ وہ کاٹنے والا کتا ہی ہو۔''

(نہج البلاغہ، مکتوب ۴۷)

۱۹ رمضان کی فجر کے وقت ضربت لگنے کے بعد حضرت علی علیہ السلام ۲۱ رمضان المبارک کی رات کے آخر تک صاحب فراش رہے۔ اس دوران آپ کے اہل وعیال کے علاوہ بعض اصحاب بھی آپ کی عیادت کے لیے حاضر ہوتے رہے اور آپ کی حیات مبارکہ کے آخری لحات میں بھی آپ کے کلام گہربار سے مستفید ہوتے رہے۔ امام عالی مقام کے حکیمانہ نصائح میں ایک نصیحت یہ تھی کہ **اَنَا بِالْاَمْسِ صَاحِبُكُمْ وَالْيَوْمَ عِبْرَةٌ لَكُمْ وَغَدًا مُفَارِقُكُمْ** کل تک میں تمہارا دم ساز تھا۔ آج تمہارے لیے سامان عبرت ہوں اور کل تم سے جدا ہوجاؤں گا۔

حضرت امیرالمومنینؑ کے لیے دودھ لایا گیا جس میں سے تھوڑا سا آپ نے نوش جان فرمایا اور باقی دودھ کے متعلق فرمایا۔ یہ ابن ملجم کو پلا دو۔ اسے ہرگز اذیت نہ دینا۔ اگر میں زندہ بچ گیا تو میں جانوں اور وہ جانے لیکن اگر میری مدت حیات ختم ہوگئی تو اسے صرف ایک ضربت لگانا اس لیے کہ اس نے بھی مجھے ایک ضربت لگائی ہے۔ پھر آپ نے اپنے فرزند امام حسن علیہ السلام سے فرمایا: **يَا بُنَيَّ اَنْتَ وَلِيُّ**

الْاَمْرِ مِنْ بَعْدِیْ وَوَلِیُّ الدَّمِ فَاِنْ عَفَوْتَ فَلَكَ وَاِنْ قَتَلْتَ فَضَرْبَةٌ مَكَانَ ضَرْبَةٍ اے جان پدر! میرے بعد تم ولی امر اور خون کا بدلہ لینے والے ہو۔ اگر چاہو تو اسے بخش دو اور اگر اسے قتل کرنا چاہو تو اس پر صرف ایک ہی وار کرنا کیونکہ ایک وار کا بدلہ ایک وار ہے۔

تلوار کا زہر خون کے راستے حضرت علی علیہ السلام کے پورے جسم میں سرایت کر چکا تھا اور آپ اٹھ بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ آپ نے بیٹھ کر نماز پڑھی اور مسلسل ذکر الٰہی میں مصروف رہے۔ ۲۱ رمضان کی شب جب آپ کی رحلت کا وقت نزدیک آن پہنچا تو آپ نے افراد کنبہ کو اپنے آخری دیدار کے لیے طلب فرمایا تاکہ سب کو وصیت فرمائیں۔

اولادِ علیؑ سب جمع تھی۔ سب کی آنکھیں گریہ وزاری سے سرخ تھیں۔ سب نے امام کی وصیت کو غور سے سنا۔ یہ وصیت صرف حضرت علی علیہ السلام کی اولاد ہی کے لیے نہ تھی بلکہ یہ قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے بھی مشعل راہ ہے اس لیے کہ یہ وصیت اہم اخلاقی اصول اور عملی فلسفے سے عبارت ہے۔ اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ

ابتدائے سخن کرتا ہوں خدا کی وحدانیت اور اس کے بے مثل و یکتا ہونے کی گواہی سے اور گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو میرے ابن عم بھی ہیں اللہ کے بندے اور برگزیدہ رسول ہیں۔ آپ کی بعثت اللہ کی طرف سے تھی اور آپ کے احکامات ہی مقررات الٰہی ہیں۔ آپ نے جہالت و نادانی کے صحرا میں بھٹکنے والے انسانوں کو صراط مستقیم اور راہ نجات کی طرف رہنمائی فرمائی اور لوگوں کو قیامت کے دن کے دردناک عذاب سے خبردار کیا۔

میرے بیٹو! میں تمھیں تقویٰ اور ناخوشگوار واقعات کے مقابلے میں صبر و استقلال کی وصیت کرتا ہوں۔ صرف دنیا ہی کے ہو کر نہ رہ جانا۔ جو چیز تمہارے ہاتھوں سے نکل جائے اس پر افسوس نہ کرنا، میں تمھیں اتفاق و اتحاد کی تاکید کرتا ہوں اور نفاق اور تفرقہ سے خبردار کرتے ہوئے ہمیشہ حق و حقیقت کو اپنا نصب العین قرار دینے کی تلقین کرتا ہوں۔ ہر حال میں چاہے وہ غم و ہم کا موقع ہو یا خوشی و مسرت کا عدل و انصاف کی پیروی کرنا۔

میرے بیٹو! خدا کو کبھی نہ بھولنا۔ ہمیشہ اسی کی رضا کو مدنظر رکھنا، مظلوموں کے ساتھ انصاف سے پیش آنا۔ یاد رکھنا یتیموں اور ناداروں کے لیے انفاق کرنا خدا کی خوشنودی کا باعث ہے۔ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ جو کوئی یتیموں کی اپنے بچوں کی طرح کفالت کرتا ہے

بہشت اس کے دیدار کی مشتاق ہوتی ہے اور جو کوئی یتیم کا مال کھاتا ہے جہنم اس کے انتظار میں رہتی ہے۔
لوگوں اور رشتے داروں سے صلہ رحمی اور نیکی کرنا۔ فقراء و مساکین کی مدد کرنا اور بیماروں کی عیادت کرنا۔ دنیا محل حوادث ہے اس لیے خود کو اس کی تمناؤں اور خواہشات کا غلام نہ بنانا، ہمیشہ موت اور آخرت کی فکر میں رہنا۔ اپنے ہمسایوں کے ساتھ نرم اور محبت بھرا سلوک روا رکھنا اس لیے کہ رسول خداؐ کی تاکیدات میں سے ایک تاکید حق ہمسایہ کا خیال رکھنا بھی ہے۔ احکامات الٰہیہ اور مقررات شرعیہ کو محترم جاننا اور انھیں نہایت شوق سے بجا لانا۔ نماز، زکات، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض ادا کر کے اللہ کے فرمان کی اطاعت کے ذریعے اللہ کی رضا حاصل کرنا۔
میرے بیٹو! پست اور کم مایہ لوگوں سے دور رہنا جبکہ صالح اور متقی لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا۔ اگر زندگی میں کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو جس میں تمہارا ایک قدم دنیا اور دوسرا قدم آخرت کی طرف ہو تو دنیا کی بجائے آخرت کی بہتری قبول کرنا۔ زمانے کی سختیوں اور مصیبتوں میں اللہ پر بھروسا کرنا۔ ہر کام کی بجا آوری میں اللہ ہی سے مدد مانگنا، انسانی اقدار خاص کر تقویٰ اور خدمت خلق کو شعار زندگی قرار دینا۔ بچوں کے ساتھ شفقت جبکہ بزرگوں اور بوڑھوں کا احترام کرنا۔
اولادِ علیؑ نے خاموشی سے حضرت کی باتیں سنیں۔ غم سے ان کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جناب امیر المومنینؑ کی وصیت کا یہ حصہ جو لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ پر ختم ہوتا ہے وہ درس اخلاق ہے جس پر عمل کر کے ہر انسان منزل کمال تک پہنچ سکتا ہے۔ اس کے بعد حضرت پر غشی طاری ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد آپ نے دوبارہ آنکھیں کھول کر امام حسن علیہ السلام سے فرمایا: بیٹا! میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آج میری زندگی کی آخری رات ہے۔ میری رحلت کے بعد تم خود اپنے ہاتھوں سے مجھے غسل و کفن دینا۔ تم ہی میری نماز پڑھانا اور تدفین کے امور کی نگرانی کرنا۔ رات کی تاریکی میں شہر کوفہ سے دور مجھے گمنام جگہ پر سپرد خاک کرنا تاکہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ میری قبر کہاں ہے؟
تمام بنی ہاشم خصوصاً خانوادۂ علوی کے سارے افراد جمع تھے۔ سب کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر تھیں۔ امام حسن علیہ السلام پر جو حضرت علی علیہ السلام کے نزدیک ہی بیٹھے ہوئے تھے غم کے آثار نمایاں تھے۔ حضرت علی علیہ السلام نے جب امام حسن علیہ السلام کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا: بیٹا! صبر کرو۔ میں تمھیں اور تمہارے تمام بھائیوں کو صبر کی وصیت کرتا ہوں۔ پھر فرمایا: بیٹا حسن! میرے فرزند محمد کا خاص خیال رکھنا۔ وہ بھی تمہارا بھائی اور تمہارے باپ کا بیٹا ہے اور میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔

اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام ایک بار پھر بے ہوش ہو گئے۔ پھر چند لمحوں کے بعد کروٹ بدلی اور امام حسین علیہ السلام سے فرمایا: بیٹا! تمہاری زندگی میں بھی ایک کٹھن مرحلہ آئے گا۔ اس وقت بھی صبر سے کام لینا کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الصَّابِرِیْنَ اللہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

یہی وہ لمحہ تھا جب حضرت علی علیہ السلام کی پیشانی مبارک پر موت کا پسینہ نمودار ہوا اور آپ کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔ آپ نے زندگی کی آخری سانس لیتے وقت فرمایا:

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ.

کلمہ شہادتین پڑھنے کے بعد آپ کے لب کچھ کھلے تھے جبکہ آپ کی آنکھیں بند تھیں اور آپ کی روح ملکوت اعلیٰ کی طرف پرواز کر چکی تھی۔ اس طرح حق و حقیقت کے فروغ کے سوا جس کا مقصد حیات کچھ بھی نہ تھا آپ کی روشن زندگی کا چراغ بجھ گیا۔

(مقاتل الطالبین۔ ارشاد مفید۔ اعلام الوریٰ۔ کشف الغمہ۔ بحار الانوار ج ۴۲۔ اثبات الوصیہ)

شہادت کے وقت حضرت علی علیہ السلام کی عمر مبارک ۶۳ سال تھی۔ آپ کی امامت کا زمانہ تقریباً تیس سال جبکہ حکومت کا عرصہ لگ بھگ پانچ سال تھا۔ حسنین کریمینؑ نے چند دیگر افراد کے ساتھ مل کر تجہیز و تکفین کے بعد آپ کو کوفہ کے نزدیک غری کے قصبے میں جو آج کل نجف کے نام سے مشہور ہے، دفن کیا اور تمام امور آپ کی وصیت کے مطابق انجام دیئے تاکہ خوارج آپ کے جسد اطہر کی بے حرمتی نہ کر سکیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے تک آپ کی قبر مطہر لوگوں کو معلوم نہیں تھی لیکن عباسی خلیفہ منصور نے جب امام جعفر صادق علیہ السلام کو مدینہ سے عراق بلایا تو امام جعفر صادق علیہ السلام نے کوفہ آنے کے بعد آپ کی قبر مطہر کی زیارت کی اور قبر کی جگہ کی نشاندہی فرمائی۔

شیخ مفیدؒ بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن حازم کہتا ہے کہ ایک دن ہم ہارون کے ہمراہ شکار کے لیے کوفہ سے باہر نکلے اور کوفہ کی پشت پر واقع غریین کے علاقے میں پہنچے۔ وہاں ہمیں چند جنگلی ہرن نظر آئے۔ ہم نے شکاری کتوں اور باز کو ان ہرنوں کے پیچھے چھوڑا۔ وہ کچھ دیر ہرنوں کے پیچھے بھاگتے رہے مگر ان کا شکار نہ کر سکے کیونکہ ہرنوں نے ایک ٹیلے پر پناہ لے رکھی تھی۔ کتے اس ٹیلے کے پاس جا کر واپس آگئے جبکہ باز بھی ٹیلے تک جانے کے بعد پلٹ آیا۔ کتوں اور باز کو دوبارہ بھیجا گیا مگر وہ پھر واپس پلٹ آئے۔ یہ واقعہ تین مرتبہ اسی طرح پیش آیا تو ہارون نے کہا: جاؤ اور اس علاقے میں جو بھی نظر آئے اسے میرے سامنے پیش کرو۔ ہمیں وہاں قبیلہ بنی اسد کا بوڑھا شخص ملا۔ ہم اسے ہارون کے پاس لے کر آئے۔

ہارون: اے شیخ! مجھے بتاؤ کہ اس ٹیلے پر کیا ہے؟
بوڑھا: اگر جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔
ہارون: تمھیں امان ہے۔
بوڑھا: میرے باپ کو ان کے بزرگوں نے بتایا تھا کہ اس ٹیلے پر علی بن ابی طالبؑ کی قبر ہے اور اللہ نے اس جگہ کو جائے امن قرار دیا ہے۔ جو بھی یہاں پناہ لیتا ہے اسے امان مل جاتی ہے۔

یہ سن کر ہارون گھوڑے سے اترا، اس نے پانی طلب کر کے وضو کیا اور ٹیلے کے نزدیک جا کر نماز پڑھی۔ وہاں کی خاک کو ہاتھ میں اٹھا کر کافی دیر تک روتا رہا اور پھر واپس کوفہ آ گیا۔

(ارشاد مفید ج ۱، باب ۱، فصل ۶، ح ۴)

حضرت علی علیہ السلام کی قبر مطہر سے متعلق ایک حکایت کا یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

آل عثمان کا بادشاہ سلیمان جس نے دریائے فرات سے نہر حسینیہ جاری کروائی تھی جب بھی زیارت کے لیے کربلائے معلیٰ آتا تو حضرت امیر المومنینؑ کی زیارت سے بھی مشرف ہوتا۔ اس کی عادت تھی کہ جب وہ نجف اشرف کی حدود میں پہنچتا تو گھوڑے سے اتر کر احتراماً پیدل روضۂ مبارک تک جاتا۔

ایک دفعہ قاضی شہر جو امام جماعت بھی تھا بادشاہ کے ہمراہ تھا۔ قاضی کو جب اس عادت کی خبر ہوئی تو وہ غصے سے بھرا بادشاہ کے پاس آیا اور بولا: تم زندہ سلطان ہو اور علی بن ابی طالبؑ مر چکے ہیں۔ پھر تم کیوں ان کی زیارت کرنے پیدل جاتے ہو؟ اس طرح پا پیادہ چل کر جانا سلطان کی شان کے خلاف ہے۔ (قاضی ناصبی تھا اور وہ امیر المومنینؑ سے شدید بغض رکھتا تھا)۔ اس بارے میں قاضی اور بادشاہ کے درمیان کافی بحث مباحثہ ہوا۔ آخر قاضی نے کہا: اگر سلطان معظم کو میری بات پر شک ہے تو قرآن سے استخارہ کر کے اپنے شک کو دور کر سکتے ہیں۔ سلطان کو یہ بات پسند آئی اور اس نے قرآن ہاتھ میں لیکر استخارہ کیا۔ جونہی قرآن کھولا پہلے صفحے پر یہ آیت تھی فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى پس اپنے جوتے اتار دو۔ بے شک تم طور کی مقدس وادی میں ہو۔ (سورۂ طٰہٰ: آیت ۱۲)

بادشاہ نے قاضی سے کہا: دیکھا تمہاری بات سے اب ہمیں پیدل چلنے کے ساتھ ساتھ برہنہ پا بھی چلنا پڑے گا۔ اس کے بعد بادشاہ نے جوتے اتار دیئے اور ننگے پاؤں چل کر روضۂ مبارک تک گیا۔ ریت پر ننگے پاؤں چلنے کی وجہ سے اس کے پاؤں پر چھالے پڑ گئے۔

بادشاہ جب زیارت کر چکا تو قاضی نے اس سے کہا: اسی شہر میں رافضیوں کے ایک معروف

عالم کی قبر بھی ہے۔ کیا بہتر ہوگا کہ سلطان اس کی قبر کھدوا کر اس کی بوسیدہ ہڈیوں کو آگ میں جلانے کا حکم جاری فرمائیں۔

بادشاہ نے پوچھا: اس کا نام کیا ہے؟

قاضی نے کہا: محمد بن حسن طوسی۔

بادشاہ نے کہا: قاضی صاحب! اس کو معاف کر دیجئے۔ وہ مر چکا ہے اور اللہ کے ثواب وعقاب میں سے جس چیز کا وہ مستحق رہا ہوگا اسے دے چکا ہے اس لیے قبر کشائی کی ضرورت نہیں مگر قاضی، شیخ طوسی کی قبر کشائی کے لیے اصرار کرتا رہا۔ تنگ آ کر بادشاہ نے حکم دیا کہ لکڑیاں جمع کی جائیں۔ چنانچہ لکڑیاں جمع کر کے جلائی گئیں۔ پھر بادشاہ نے حکم دیا کہ اس قاضی کو آگ میں پھینک دیا جائے۔ اس کے حکم کی تعمیل ہوئی اور اللہ نے اس ملعون کو آتش جہنم سے قبل آتش دنیا کے عذاب میں گرفتار کر دیا۔

(کتاب رنگارنگ ج ۱)

منتخب التواریخ کے مؤلف نے کتاب انوار العلویہ سے نقل کیا ہے کہ جب نادر شاہ نے حرم امیر المومنینؑ کے گنبد پر سونے کا کام کرایا تو اس سے پوچھا گیا کہ گنبد پر کون سی تحریر کندہ کی جائے۔ نادر شاہ نے فوراً کہا: يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ دوسرے دن نادر شاہ کے وزیر مرزا مہدی خان نے کہا: نادر شاہ تو ان پڑھ ہے۔ یہ کلام اس کے دل پر الہام ہوا تھا۔ اگر تم لوگوں کو یقین نہیں تو جاؤ اس سے دوبارہ پوچھو۔ چنانچہ نادر شاہ سے دوبارہ پوچھا گیا کہ گنبد پر کون سی تحریر کندہ کی جائے؟

نادر شاہ نے کہا: وہی جو میں نے کل بتائی تھی۔ (منتخب التواریخ ص ۱۴۲)

بہر حال! حسنین کریمینؑ اور ان کے ساتھ جانے والے افراد حضرت علی علیہ السلام کو دفن کرنے کے بعد واپس کوفہ آ گئے۔ پھر ۲۱ رمضان کے دن ہی امام حسن علیہ السلام نے تلوار کے ایک ہی وار سے ابن ملجم کو قتل کر دیا۔ شعراء نے حضرت علی علیہ السلام کی شہادت پر متعدد مرثیے لکھے ہیں۔ ہم ذیل میں ام ہیثم بنت اسود نخعی کے مرثیے کے چند اشعار لکھ رہے ہیں:

اَلَا يَا عَيْنُ وَيْحَكِ فَاسْعَدِيْنَا — اَلَا تَبْكِيْ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَا

رُزِئْنَا خَيْرَ مَنْ رَكِبَ الْمَطَايَا — وَخَيَّسَهَا وَمَنْ رَكِبَ السَّفِيْنَا

وَمَنْ لَبِسَ النِّعَالَ وَمَنْ حَذَاهَا — وَمَنْ قَرَءَ الْمَثَانِيْ وَالْمَئِيْنَا

وَكُنَّا قَبْلَ مَقْتَلِهٖ بِخَيْرٍ — نَرٰى مَوْلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ فِيْنَا

يُقِيمُ الدِّيْنَ لَا يُرْتَابُ فِيهِ    وَيَقْضِيْ بِالْفَرَائِضِ مُسْتَبِيْنَا
وَلَيْسَ بِكَاتِمٍ عِلْمًا لَدَيْهِ    وَلَمْ يُخْلَقْ مِنَ الْمُتَجَبِّرِيْنَا
وَيَدْعُو لِلْجَمَاعَةِ مَنْ عَصَاهُ    وَيَنْهَكُ قَطْعَ اَيْدِى السَّارِقِيْنَا
لَعَمْرُ اَبِيْ لَقَدْ اَصْحَابُ مِصْرٍ    عَلٰى طُولِ الصَّحَابَةِ اَوْجَعُوْنَا
وَ غَرُّوْنَا بِاَنَّهُمْ عُكُوفٌ    وَلَيْسَ كَذَاكَ فِعْلُ الْعَاكِفِيْنَا
اَفِيْ شَهْرِ الصِّيَامِ فَجَعْتُمُوْنَا    بِخَيْرِ النَّاسِ طُرًّا اَجْمَعِيْنَا
وَمِنْ بَعْدِ النَّبِيِّ فَخَيْرُ نَفْسٍ    اَبُو حَسَنٍ وَ خَيْرُ الصَّالِحِيْنَا
اَشَابَ ذَوَائِبِيْ وَ اَطَالَ حُزْنِيْ    اَمَامَةُ حِيْنَ فَارَقَتِ الْقَرِيْنَا
تَطُوْفُ بِهَا لِحَاجَتِهَا اِلَيْهِ    فَلَمَّا اسْتَيْأَسَتْ رَفَعَتْ رَنِيْنَا
وَعَبْرَةُ اُمِّ كُلْثُوْمٍ اِلَيْهَا    تُجَاوِبُهَا وَقَدْ رَأَتِ الْيَقِيْنَا
فَلَا تُشْمِتْ مُعَاوِيَةَ ابْنَ صَخْرٍ    فَاِنَّ بَقِيَّةَ الْخُلَفَاءِ فِيْنَا

(۱) اے آنکھ تجھ پر افسوس ہے! امیر المومنینؑ پر رونے میں میری مدد کر۔

(۲) ہم مصیبت زدوں نے سب سے بہترین فرد کو کھو دیا ہے۔

(۳) نعلین پہن کر قدم بڑھانے والوں میں وہ بہترین شخص سبع مثانی اور قرآن کا حقیقی قاری تھا۔

(۴) ان کی شہادت سے قبل ہماری زندگی شاداں تھی کیونکہ ابن عم رسولؐ ہمارے درمیان موجود تھے۔

(۵) انھوں نے دین خدا کو کسی شک و تردد کے بغیر قائم کیا اور اس کے فرائض کا علانیہ حکم دیا۔

(۶) انھوں نے اپنے علم کو کبھی نہیں چھپایا اور نہ وہ متکبر اور ظالم تھے۔

(۷) جو کوئی ان کی نافرمانی کرتا وہ اسے اور اس جیسوں کو اتفاق کی دعوت دیتے۔ نشان عبرت بنانے کے لیے آپ چوروں کے ہاتھ کاٹنے میں پرعزم تھے۔

(۸) مجھے اپنی جان کی قسم! کوفہ کے لوگوں نے ہمیں غمناک کر دیا ہے حالانکہ ہم ایک مدت سے ان کے ساتھ محبت سے رہ رہے تھے۔

(۹) ان لوگوں نے ہمارے خادم، غلام اور حلقہ بگوش رہتے ہوئے ہمیں دھوکا دیا حالانکہ یہ شریفوں کا شیوہ نہیں۔

(۱۰) کیا ان لوگوں نے ماہ رمضان میں امت کے افضل ترین فرد کو شہید کر کے ہمیں سوگوار نہیں کر دیا؟

(۱۱) ان کو جو حضرت محمدؐ کے بعد بہترین خلائق تھے یعنی جناب امیرؑ کی شہادت جو نیکو کاروں اور

صالحین کے ممتاز فرد تھے۔

(۱۲) جب امامہ کے سر سے ان کے والد کا سایہ اٹھ گیا تو غم کے مارے ان کے بال سفید ہو گئے اور میرا غم بھی طولانی ہو گیا۔

(۱۳) اس لیے کہ وہ اپنے والد کی تلاش میں تھیں۔ جب وہ علیؑ کے دیدار سے ناامید ہو گئیں تو ان کی صدائے گریہ بلند ہوئی۔

(۱۴) اور اس وقت امّ کلثوم کی آنکھوں سے جنھوں نے اپنے والد کی موت دیکھی تھی بہنے والے آنسو امامہ کے گریہ کا جواب بن گئے۔

(۱۵) اے معاویہ بن صخر! تو غم کی اس گھڑی میں ہمیں طعنے نہ دے کیونکہ ابھی ہمارے ائمہ باقی ہیں۔

(مجالس السنیہ ص ۱۸۵۔ مقاتل الطالبین ص ۳۵)

حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد مسلمانوں کی امامت و خلافت کی ذمے داری حضرت علی علیہ السلام کی وصیت کے مطابق امام حسن علیہ السلام نے سنبھال لی۔ چنانچہ ابن عباسؓ نے مسجد میں جا کر لوگوں کو صورتحال سے آگاہ کرنے کے بعد کہا: یقیناً تم سب جانتے ہو کہ حضرت علی علیہ السلام نے امام حسن علیہ السلام کو تمہارا خلیفہ مقرر فرمایا ہے لیکن امام حسن علیہ السلام کو تم سے اپنی بیعت کرانے پر اصرار نہیں۔ اگر تم ان کی بیعت کرنے کا ارادہ رکھتے ہو تو مجھے بتاؤ تاکہ میں انھیں اس کی خبر دوں اور ان کو تم سے بیعت لینے کے لیے مسجد میں لے آؤں اور اگر تم اس کے برعکس کچھ اور چاہتے ہو تو تم خود جانو۔

لوگوں کی اکثریت نے مثبت جواب دیا چنانچہ ابن عباسؓ، امام حسن علیہ السلام کو مسجد کوفہ میں لے کر آئے تاکہ لوگ ان کی بیعت کریں۔ امام حسن علیہ السلام نے منبر پر جا کر خدا کی حمد و ثنا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام کے بعد فرمایا: لَقَدْ قُبِضَ فِيْ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ رَجُلٌ لَمْ يَسْبِقْهُ الْاَوَّلُوْنَ بِعَمَلٍ وَلَا يُدْرِكُهُ الْاٰخِرُوْنَ بِعَمَلٍ... (ارشاد مفید ج ۲، باب اول۔ مقاتل الطالبین)

آج کی رات ایسا فرد فرید ہمارے درمیان سے چلا گیا ہے کہ عمل میں نہ پہلوں میں سے کوئی ان پر سبقت لے جا سکا ہے اور نہ پچھلوں میں سے کوئی ان تک پہنچ سکے گا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مل کر جہاد کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انھیں یوں اپنا علم دے کر بھیجتے کہ جبریلؑ دائیں طرف سے اور میکائیل بائیں طرف سے ان کی حفاظت کرتے اور وہ اس وقت تک واپس نہیں آتے تھے جب تک اللہ ان کے ہاتھوں پر فتح نہ دے دیتا۔ آپ کی رحلت اسی رات ہوئی جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھایا گیا اور اسی رات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصی جناب یوشع بن نون علیہ السلام کی

روح قبض ہوئی۔ آپ نے مال دنیا میں سے صرف سات سو درہم چھوڑے ہیں جس سے آپ اپنے گھر والوں کے لیے ایک غلام خریدنا چاہتے تھے۔ یہاں پہنچ کر امام حسن علیہ السلام کا گلا رندھ گیا اور آپ رونے لگے۔ آپ کے ساتھ دوسرے لوگ بھی رونے لگے۔ امام حسن علیہ السلام نے اپنے اس مختصر خطاب میں عظمت علیؑ کو بیان کیا۔ عظمت علیؑ کا یہ اظہار ایک بیٹے کی طرف سے باپ کو خراج عقیدت نہ تھا بلکہ یہ ایک امام کی زبان سے دوسرے امام کو خراج تحسین تھا جو اوروں سے زیادہ ان کی معرفت رکھتا تھا۔

امام حسن علیہ السلام نے لوگوں سے بیعت لینے کے بعد معاویہ کو خط لکھا اور اسے نصیحت کے بعد اپنی بیعت کی دعوت دی لیکن معاویہ کو یہ بات نہ ماننی تھی اور اس نے نہ مانی کیونکہ ظلم سے دستبردار ہونا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ جب تک حضرت علی علیہ السلام بقید حیات تھے اور معاویہ کی پوزیشن مضبوط نہیں تھی اس وقت بھی اس نے بیعت نہیں کی تھی۔ اب تو اس نے اپنی حکومت مستحکم کرلی تھی اور اپنی پوزیشن مضبوط کرلی تھی۔ لہٰذا اب کیونکر ممکن تھا کہ وہ امام حسن علیہ السلام کی بیعت قبول کرتا؟ بہرحال امام حسن علیہ السلام کا مکتوب معاویہ کو موصول ہوگیا اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس نے جواب دیا کہ میں تمہاری نسبت خلافت کا زیادہ اہل ہوں اس لیے تمھیں چاہیے کہ تم میری بیعت کرو۔

دوسری طرف حضرت علی علیہ السلام نے اپنی شہادت سے قبل وادی نخیلہ میں مختلف علاقوں سے جس بڑی فوج کو جمع کیا تھا وہ منتشر ہوگئی تھی اور بہت کم سپاہی وہاں باقی رہ گئے تھے لہٰذا امام حسن علیہ السلام نے جو اپنے پدر بزرگوار کے زمانے میں اہل کوفہ کی بے وفائی اور بے اصولی دیکھ چکے تھے اس صورتحال میں شام پر حملے یا معاویہ سے نتیجہ خیز جنگ کو ناممکن خیال کیا۔ بقول ابن ابی الحدید باقی ماندہ چھ ہزار سپاہیوں کے ہمراہ امام حسن علیہ السلام نے شام کا رخ کیا اور بارہ ہزار سپاہیوں کو عبید اللہ ابن عباس کی قیادت میں امن بحال کرنے والی فورس کے طور پر معاویہ کی طرف بھیجا جبکہ امام حسن علیہ السلام خود مدائن میں رک گئے تاکہ اطراف سے مزید سپاہی بھرتی کرکے شام بھجوائیں لیکن معاویہ نے دس لاکھ درہم دے کر عبید اللہ کو خرید لیا۔ عبید اللہ نے امام سے دغا کی اور رات کی تاریکی میں معاویہ کے ساتھیوں سے جا ملا۔ ادھر مدائن میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے امام حسن علیہ السلام کے سپاہیوں میں اختلاف پیدا کرنے کا باعث بن گئے چنانچہ صورتحال ایسی ہوگئی جس میں دشمن کے ساتھ لڑائی کے لیے درکار کوئی بھی شرط دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس بنا پر امام حسن علیہ السلام نے جنگ کا ارادہ ترک کردیا اور نازک ترین صورتحال کے پیش نظر مخصوص شرائط پر معاویہ کے ساتھ صلح کے عقلی اور منطقی راستے کو اپنایا۔

# حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت اور شمائل

## (۱) مفہوم شخصیت

فلسفہ کہتا ہے کہ ہر شخص کی شخصیت اس کی نفسیات سے بنتی ہے لیکن عام طور پر کہا جاتا ہے کہ آدمی کی شخصیت کا تعین اس کی خاص صفت سے ہوتا ہے مثال کے طور پر سیاسی بصیرت رکھنے والے کو سیاسی شخصیت اور علم و دانش رکھنے والے کو علمی شخصیت کہا جاتا ہے۔ چونکہ علم نفسیات میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جسمانی اور نفسیاتی صفات کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے اس لیے کسی بھی شخص کی مکمل شخصیت کے تعارف میں اس کی جسمانی اور اخلاقی و روحانی خصوصیات کا تجزیہ ضروری ہے جبکہ جسمانی اور روحانی خصوصیات کا عام طور پر علم طبیعیات میں مشاہدات و تجربات کی روشنی میں تجزیہ کیا جاتا ہے کیونکہ نفسیات کی حقیقت خود نفس کی مانند مجہول ہے۔ اسے صرف آثار ہی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لوگوں کی شخصیت کی شناخت چاہے وہ سطحی ہو یا علمی اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ خود بھی اس شخصیت جیسی صفات رکھتا ہو۔ بالفاظ دیگر انسان اپنی باطنی حالت کے ذریعے دوسروں کی نفسیاتی کیفیات کا احساس کرتا ہے مثلاً جب کوئی آدمی اپنے کسی عزیز رشتے دار کی موت پر دکھی ہوتا ہے یا جب وہ اپنے جسم کے کسی حصے میں درد محسوس کرتا ہے تو اس کے لیے ایسی صورت میں دوسروں کے دکھ درد کا احساس کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں ہر شخص کی نفسیاتی کیفیات خود اسی پر منحصر ہوتی ہیں اور ان سے جو سلسلہ تشکیل پاتا ہے اسے نفسیات کی اصطلاح میں وحدت کہتے ہیں جو طول زمانہ میں بھی محفوظ رہتی ہے اور انسان کی شخصیت کا پتا دیتی ہے۔

مذکورہ نکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر ہم حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت کا جائزہ لینا چاہیں تو چاہے یہ جائزہ آپ کی جسمانی صفات سے متعلق ہو یا نفسانی ملکات سے متعلق ہمیں ایک مشکل صورتحال کا سامنا

کرنا پڑتا ہے اس لیے کہ آپ کی اعلیٰ روحانی صفات تک ہمارے طائر فکر کی رسائی نہیں۔

حضرت علی علیہ السلام ایک بشر تھے لیکن آپ کی ذات گرامی میں جو خصوصیات تھیں وہ کسی بشر میں دکھائی نہیں دیتیں۔ امام کے کام عام لوگوں کی طرح نہیں تھے کہ لوگ ان کا اپنی ذات کے ساتھ موازنہ کرسکیں۔ حضرت علی علیہ السلام مظہر العجائب تھے کہ جس نے بشریت کو ہر زمانے میں مبہوت کیا۔ آپ کے سارے کام بڑے عجیب و غریب تھے کیونکہ جو طاقتور ہوتا ہے وہ کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتا اور دوسروں کی زیادتی پر صبر نہیں کرتا لیکن حضرت علی علیہ السلام نے پوری طاقت رکھتے ہوئے بھی صبر کا ایسا مظاہرہ کیا جسے معجزہ نہ کہیں تو پھر کیا کہیں؟

جو آدمی علم و ادب کا شہسوار ہوتا ہے وہ کم کم میدان کا بھی شہسوار ہوتا ہے اس لیے وہ میدان کارزار میں جم نہیں سکتا لیکن حضرت علی علیہ السلام نہ صرف یکتائے روزگار ادیب و خطیب تھے بلکہ ایسے مرد میدان تھے کہ ان کے سامنے بڑے بڑے سورماؤں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔

سید رضیؒ نہج البلاغہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

جب فکر و تامل کرنے والا آپ کے کلمات میں دقت نظر اور غور و فکر سے کام لے اور دل سے یہ بات نکال دے کہ یہ ارشادات اس ہستی کے ہیں جس کا مرتبہ عظیم، جس کے احکام جاری و ساری، جس کی حکومت ایک دنیا کی گردنوں پر محیط ہے تو اسے قطعاً اس میں شبہ نہ ہوگا کہ یہ ایسے شخص کا کلام ہے جو زہد و تقویٰ کے علاوہ کسی شے سے بہرہ مند نہیں اور اظہار عبودیت کے سوا اس کا کوئی مشغلہ نہیں۔ وہ کسی جھونپڑے کے گوشے میں سر بگریباں یا کسی پہاڑ کے دامن میں دنیا سے الگ تھلگ پڑا ہوا ہے، جس کے کانوں میں اپنی حس و حرکت کے علاوہ کوئی آواز نہیں پہنچتی اور اپنے سوا اسے کوئی دکھائی نہیں دیتا بھلا کیونکر اسے یقین آئے گا کہ یہ اس کا کلام ہے جو تلوار سونت کر جنگ کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے تو گردنیں کاٹ کر رکھ دیتا ہے اور شہ زوروں کو زمین پر پچھاڑ دیتا ہے اور تلوار لے کر اس طرح پلٹتا ہے کہ اس سے لہو برستا ہوتا ہے اور خون دل کی بوندیں ٹپک رہی ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود آپ زاہدوں میں ممتاز اور ولیوں میں فائق تھے۔ یہ فضیلت آپ کی ان عجیب فضیلتوں اور لطیف خصوصیتوں میں شامل ہے کہ جس کی وجہ سے آپ نے متضاد صفتوں کو سمیٹ لیا اور بکھرے ہوئے کمالات کو پیوند لگا کر جوڑ دیا۔

ابن ابی الحدید نہج البلاغہ کی شرح میں لکھتے ہیں:

ہم نے ایسا شجاع نہیں دیکھا جو اتنا بڑا سخی بھی ہو۔ اس کے بعد طلحہ و زبیر، عبد اللہ بن زبیر اور عبدالملک بن مروان کا نام لے کر وہ لکھتے ہیں کہ یہ سب شجاع تھے لیکن پرلے درجے کے بخیل اور حریص تھے مگر امیر المومنینؑ کی شجاعت و سخاوت کا کیا کہنا... ! اس کے بارے میں سب جانتے ہیں اور یہ چیز حضرت علی علیہ السلام کے حیرت انگیز کمالات میں سے ایک ہے۔

سب جانتے ہیں کہ بردبار اور متواضع لوگوں میں رعب و دبدبے کا فقدان ہوتا ہے اور وہ اپنی انکساری کی وجہ سے کسی کو مرعوب نہیں کرسکتے لیکن حضرت علی علیہ السلام جو اس درجہ انکساری سے کام لیتے تھے کہ بلا تکلف زمین پر بیٹھ جایا کرتے تھے جس کی وجہ سے آپ کا لقب بوتراب پڑا بڑی ہیبت اور رعب کے مالک تھے۔ چنانچہ ایک دن معاویہ نے قیس بن سعد سے کہا: خدا کی رحمتیں ہوں ابوالحسنؑ پر۔ آپ بے حد ہنس مکھ اور خوش مزاج تھے۔ قیس نے کہا: خدا کی قسم! اس خوش مزاجی کے ساتھ آپ کی ہیبت بھی دوسروں سے زیادہ تھی اور یہ تقویٰ کی ہیبت تھی۔[1] یہ وہ رعب نہیں تھا جو تمہارے شام کے اوباش دوسروں پر گانٹھتے ہیں۔

علاوہ بریں یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر شخص جو کسی صنف یا پیشے میں مہارت رکھتا ہے اسے اپنے فن میں ان افراد پر برتری حاصل ہوتی ہے جو چند فنون یا پیشوں کے بارے میں سطحی معلومات رکھتا ہو لیکن حضرت علی علیہ السلام تمام صفات کمالیہ اور فضائل نفسانی کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ ہر فن میں ایسے طاق تھے کہ کسی ایک صفت میں بھی کوئی آپ کی برابری کا تصور تک نہیں کرسکتا۔

---

۱۔ عدی بن حاتم طائی کے ساتھ بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا تھا۔

معاویہ نے عدی سے کہا کہ میرے لیے علیؑ کے اوصاف بیان کرو۔ عدی نے کہا مجھے معاف رکھو مگر معاویہ نہیں مانا۔ معاویہ کا اصرار دیکھ کر عدی نے کہا: خدا کی قسم! علیؑ بہت دور اندیش اور بہت بہادر تھے۔ عدل و انصاف کی بات کہتے اور اعتماد سے فیصلہ کرتے تھے۔ ان کے اطراف و جوانب سے علم اور دانائی کے چشمے پھوٹتے تھے۔ وہ دنیا کی چمک دمک سے متنفر تھے۔ وہ رات کی تاریکی اور تنہائی سے بڑے مانوس تھے۔ وہ خوف خدا میں بہت گریہ کرتے تھے۔ ہر بات میں غور و فکر سے کام لیتے تھے۔ خلوت میں اپنا محاسبہ کرتے تھے۔ گزرے ہوئے کل پر کف افسوس ملتے تھے۔ جب ہمارے درمیان ہوتے تو بالکل ہماری ہی مانند لگتے۔ اگر ہم ان سے کسی چیز کا تقاضا کرتے تو مہیا فرما دیتے۔ جب ہم ان کے حضور میں حاضر ہوتے وہ ہمیں اپنے نزدیک بٹھاتے اور ہم سے الگ نہیں بیٹھتے تھے۔ اگرچہ اس تمام تر قرب کے ساتھ جو ہمیں ان سے حاصل تھا ان کی ہیبت اتنی تھی کہ ہم ان کے سامنے بولنے کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔ ان کی جو عظمت تھی اس کی بنا پر ہم ان سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں رکھتے تھے...

یہ سن کر معاویہ رو پڑا اور اپنی آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: خدا علیؑ پر رحمت کرے وہ واقعا ایسے ہی تھے جیسا تم نے کہا ہے۔ (اقتباس از مقتل مطہر، مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان بحوالہ سفینۃ البحار جلد ۲، صفحہ ۱۷۰) رضوانی

بدن کی طاقت اور توانائی غذا کو ہضم کرنے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ اگر غذا سے حاصل ہونے والی توانائی جسم کے اندر استعمال ہونے والی توانائی سے کم ہو تو آدمی کا جسم کمزور پڑنے لگتا ہے لیکن تمام مؤرخین گواہی دیتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام موٹا جھوٹا کھانا کھاتے تھے اور آپ کی خاص غذا جَو کی روٹی تھی مگر آپ کے طاقتور بازوؤں نے خیبر کے دروازے کو اکھاڑ کر پھینک دیا تھا اور مرحب کو آپ نے ایک ہی وار میں ڈھیر کر کے سب لوگوں کو حیران کر دیا تھا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں: جو کوئی بھی دسترخوان پر میری جَو کی روٹی دیکھتا تھا اسے حیرت ہوتی تھی کہ میں اس نان جویں سے کس طرح دشمن کے جم غفیر پر حملہ کرتا ہوں اور سورماؤں کو اکیلا ہی مار گراتا ہوں۔

پھر جو بہادر میدان کارزار کے سپاہی اور تلواروں سے کھیلنے والے ہوتے ہیں ان میں رحم دلی اور رقیق القلبی خال خال نظر آتی ہے اور ان کے دل سخت ہوتے ہیں مگر حضرت علی علیہ السلام کی تلوار میدان جنگ میں عرب کے بہادروں کو موت کا مزہ چکھاتی تھی اس کے باوجود وہ نرم دل تھے۔ ان کے دل کی نرمی کا عالم یہ تھا کہ بے کس کو دیکھ کر آپ دکھی ہو جاتے اور یتیم کو دیکھ کر غمگین ہو جاتے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

اَسَدُ اللهِ اِذَا صَالَ وَصَاحَ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اَبُو الْاَیْتَامِ اِذَا جَادَ وَ بَرَّ

دشمن کو للکارتے وقت آپ شیر خدا نظر آتے مگر جود و بخشش کے وقت آپ یتیموں کے لیے باپ کی مانند نظر آتے۔

حضرت علی علیہ السلام کو اسی لیے مظہر العجائب کہا جاتا ہے کیونکہ آپ کی ذات مجموعہ اضداد تھی اور یہ امر خود ایک معجزہ ہے کیونکہ منطق کی رو سے ضدین اور نقیضین کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہیں ہوتا۔

ماہرین حیاتیات اور ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ آدمی کا دماغ اس کے فہم و شعور اور احساسات و ادراکات کا مرکز ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اگر دماغ یا اس کے کسی حصے کو کوئی نقصان پہنچے تو انداز فکر و ادراک خصوصاً آدمی کی قوت حافظہ میں خلل واقع ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں آدمی ٹھیک طرح سے بات نہیں کر سکتا لیکن یہ حضرت علی علیہ السلام کی شان اعجاز تھی کہ ابن ملجم کی زہر آلود تلوار کے وار سے آپ کا سر شگافتہ ہو گیا تھا اور زہر کے اثر سے مغز بھی متاثر ہوا تھا مگر تاریخ گواہ ہے کہ اس حالت میں بھی آپ نے اپنی وصیت میں جو گراں بہا علمی اور اخلاقی نکات بیان فرمائے ہیں ان میں اور تندرستی کے عالم میں آپ کے کلام گہربار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حیران کن امر یہ ہے کہ وصیت کے دوران حضرت علی علیہ السلام

بار بار بے ہوش ہوئے مگر ہوش میں آنے کے بعد آپ نے باقی ماندہ گفتگو اسی طرح کی کہ آپ کے اسلوب بیان اور جملوں میں کوئی خلا واقع نہیں ہوا۔

اس بنا پر جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی عظیم شخصیت کی شناخت اور توصیف ہمارے بس سے باہر ہے۔ نیز آپ کے اعمال اور کردار کو ہم اپنی ذات پر قیاس کر کے ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔ بقول مولانا رومؒ ضروری ہے کہ ہم پاک ہستیوں کو اپنی ذات پر قیاس نہ کریں بلکہ اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے یہ اقرار کریں کہ ہمارے طائر فکر کی پرواز حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت اور عظمت کے افق تک ممکن ہی نہیں۔

اگلے ابواب میں حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لیے ان کے جن مناقب کو بیان کیا جا رہا ہے درحقیقت یہ تعارف خود اپنی معلومات کے لیے ہے ورنہ حضرت علی علیہ السلام کی حقیقی شخصیت کا تعارف کرانے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام فضائل و مناقب اور ملکات نفسانی کے حوالے سے حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وارث تھے جو فضائل و کمالات کا وہ سمندر ہیں جس کی تہہ تک رسائی کی غواص فکر، توانائی ہی نہیں رکھتا۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: يَا عَلِيُّ! مَا عَرَفَ اللّٰهَ حَقَّ مَعْرِفَتِهِ غَيْرِيْ وَغَيْرُكَ وَمَا عَرَفَكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ غَيْرُ اللّٰهِ وَغَيْرِيْ اے علیؑ! اللہ کو اس کی معرفت کے ساتھ کسی نے نہیں پہچانا سوائے میرے اور تمہارے، نیز تمھیں بھی کوئی نہیں پہچان سکا سوائے اللہ کے اور میرے۔ (مناقب ابن شہر آشوب ج ۲، ص ۵۱)

یہاں پر معروف متکلم ''نظام'' کا یہ قول نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ

اے امیر المومنینؑ! آپ کی تعریف کرنا بڑا کٹھن کام ہے کیونکہ اگر میں آپ کی تعریف آپ کے مقام و مرتبے اور حق کے مطابق کروں تو غالی بن جاتا ہوں اور اگر کوتاہی کروں تو کافر ہوجاتا ہوں۔ ان دو حالتوں کے بین بین کی صورت ہی ہے جو بے حد لطیف بھی ہے اور دقیق بھی۔ نیز اس کا ادراک رب جلیل کی عطا کردہ توفیق پر منحصر ہے۔ (ناسخ التواریخ، زندگانی امام محمد باقر علیہ السلام ج ۷، ص ۱۲۷)

# (۲) حضرت علی علیہ السلام کا ایمان اور عبادت

اللہ کی اطاعت اور غیر اللہ سے منہ موڑ لینا ہی حقیقی عبادت ہے۔ نفس کی سب سے بڑی فضیلت اللہ کی حمد و ستائش اور اس کے تقرب کا حصول ہے۔ عبادت اگر اپنی خاص شرائط کے ساتھ کی جائے تو وہ انسان کے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے چنانچہ کلمہ شہادت میں لفظ عبد، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقامِ بندگی و بزرگی کو ظاہر کرتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا ذکر آپ کی عبودیت کے ذکر کے بعد ہوا ہے: اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ.

مراحل کمال کو طے کرنے کا بہترین ذریعہ تہذیب نفس ہے جو کہ عملی طور پر حقیقی عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ عبادت محض فرض کی ادائیگی نہیں بلکہ یہ عقل کی نشوونما اور ان جسمانی قوتوں کی تنظیم و توازن کو برقرار رکھتی ہے جو نفس کو مادی خباثتوں سے باز رکھتی ہیں۔ بہترین عبادت وہ ہے جو ریا کے بغیر صرف خدا کی رضا جوئی کے لیے کی جائے۔ اسی طرح تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔ تقویٰ کے بغیر عبادات قبول نہیں ہوتیں۔

تقویٰ، مادی اور فانی دنیا کے بجائے روحانیت اور عالم بقا کی طرف توجہ دینا ہے لہٰذا وہ ایمان جو زیور تقویٰ سے آراستہ ہو وہی حقیقی ایمان ہے اور خلوص سے کی گئی عبادت ہی انسان کو منزل یقین تک پہنچاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام ایمان، تقویٰ، زہد، عبادت اور یقین میں اپنی مثال آپ دکھائی دیتے ہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: لَوْ اَنَّ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ وُضِعَتَا فِیْ كِفَّةٍ وَوُضِعَ اِيْمَانُ عَلِيٍّ فِیْ كِفَّةٍ لَرَجَحَ اِيْمَانُ عَلِيٍّ اگر آسمانوں اور زمین کو ترازو کے ایک پلڑے میں اور حضرت علی علیہ السلام کے ایمان کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو یقیناً علیؑ کا ایمان ان پر بھاری ہوگا۔

(غایۃ المرام ص ۵۰۹، طبع قدیم۔ فضائل الخمسہ ج ۱، ص ۱۹۱)

حضرت علی علیہ السلام کا دل عشق الٰہی سے سرشار تھا۔ آپ کی عبادت عشق الٰہی کا مظہر تھی۔ آپ کی عبادت محض ایک فرض کی ادائیگی کے لیے نہیں ہوتی تھی بلکہ آپ اللہ کے سچے عاشق تھے۔ آپ کی نظر جمال حق کے سوا کسی چیز پر ٹھہرتی ہی نہ تھی۔

حضرت علی علیہ السلام تقویٰ اور عبادت میں اس طرح کوشاں رہتے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ کے سامنے لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام کی سختی کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا: علیؑ کی شکایت مت کرو۔ وہ اللہ کے شیدا ہیں۔ (پاسداران اسلام، مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان بحوالہ مناقب خوارزمی ص ۹۲۔ تلخیص الریاض ج ۱، ص ۲)

حضرت علی علیہ السلام جب بھی دعا و مناجات کرتے یا نماز پڑھتے تو نہ آپ کے کان کوئی بات سنتے اور نہ آپ کی آنکھیں کوئی چیز دیکھتیں۔ آپ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہوجاتے اور آپ کی ساری توجہ ذات حق کی طرف مبذول رہتی۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک جنگ میں آپ کے پاؤں پر ایک تیر لگا جسے نکالنے کی کوشش سے اتنی زیادہ تکلیف ہوتی کہ کوئی اسے نکال نہ سکا مگر جب آپ نماز میں مشغول تھے تو اس تیر کو نکال لیا گیا اور آپ کو محسوس بھی نہ ہوا۔

حضرت علی علیہ السلام جب وضو کرتے تو آپ کے جسم مبارک پر لرزہ طاری ہوجاتا اور جب محراب عبادت میں کھڑے ہوتے تو خشیت الٰہی سے کانپنے لگتے اور آپ کی ریش مبارک اشکوں سے بھیگ جاتی۔
حضرت علی علیہ السلام کے سجدے طولانی ہوتے اور سجدہ گاہ آپ کے آنسوؤں سے تر ہوجاتی۔

هُوَ الْبَكَّاءُ فِي الْمِحْرَابِ لَيْلًا ‌ ‌ ‌ ‌ هُوَ الضَّحَّاكُ إِذَا اشْتَدَّ الضِّرَابُ

آپ رات کو محراب عبادت میں بہت روتے لیکن گھمسان کی جنگ کے دوران ہنستے تھے۔

صحابیِ رسولؐ جناب ابو درداءؓ بیان کرتے ہیں:

ایک رات میں ایک نخلستان سے گزر رہا تھا۔ دیکھا کہ ایک شخص مناجات کر رہا ہے۔ نزدیک جاکر دیکھا تو وہ حضرت علی علیہ السلام تھے۔ میں ایک درخت کی آڑ میں ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ آتش جہنم کے خوف سے رو رہے ہیں اور اللہ سے عفو و درگزر کی دعا مانگ رہے ہیں۔ آپ اس قدر روئے کہ بے ہوش ہوگئے۔ میں سمجھا کہ شاید آپ کو نیند آگئی ہے چنانچہ میں آپ کے قریب آیا تو دیکھا کہ آپ چوب خشک کی طرح زمین پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ میں نے آپ کو ہلایا مگر حرکت نہ ہوئی تو میں سمجھا کہ شاید آپ چل بسے ہیں۔ میں تیزی سے آپ کے گھر پہنچا اور حضرت فاطمہؑ کو یہ خبر پہنچائی۔ حضرت فاطمہؑ نے پوچھا: تم نے ابوالحسنؑ کو کس حال میں دیکھا تھا؟ میں نے ساری تفصیل بیان کی

تو انھوں نے فرمایا: وہ فوت نہیں ہوئے بلکہ خوف الٰہی سے غش کھا گئے ہیں۔

(شیخ صدوق، امالی، مجلس ۱۸، حدیث ۹ عبارات کے خلاصہ کے ساتھ)

حضرت علی علیہ السلام واجب نمازوں کے علاوہ نفل نمازیں بھی بہت پڑھتے تھے۔ نیز آپ نے کبھی نماز شب ترک نہیں کی یہاں تک کہ جنگ کے دوران بھی آپ نماز شب ترک نہ کرتے۔[۱]

لیلۃ الھریر میں سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے پہلے حضرت علی علیہ السلام افق کا جائزہ لے رہے تھے کہ ابن عباس نے پوچھا: مولا! کیا آپ کو اس سمت سے کسی قسم کی تشویش لاحق ہے؟ کیا دشمن نے ادھر گھات لگائی ہوئی ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں! میں دیکھ رہا ہوں کہ کہیں نماز کا وقت تو نہیں آپہنچا؟

امام زین العابدین علیہ السلام کی کثرت عبادت کی وجہ سے آپ کا لقب زین العابدین پڑ گیا تھا۔ آپ سے لوگ پوچھتے کہ آپ عبادت میں اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں تو آپ فرماتے: وَمَنْ یَّقْدِرُ عَلٰی عِبَادَةِ جَدِّیْ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ؟ کون میرے جد بزرگوار علی ابن ابی طالبؑ کی طرح عبادت کر سکتا ہے؟

ابن ابی الحدید اسی بات کو دوسرے انداز سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

امام زین العابدین علیہ السلام سے جب یہ پوچھا گیا کہ آپ کی عبادت اور آپ کے دادا حضرت علیؑ کی عبادت میں کیا نسبت ہے تو آپ نے فرمایا: میری اور میرے دادا کی عبادت میں وہی فرق ہے جو میرے دادا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادت میں تھا۔ (ناسخ التواریخ، زندگانی امام محمد باقر علیہ السلام ج ۷، ص ۹۸)

حضرت علی علیہ السلام کی کنیز ام سعید سے پوچھا گیا کہ حضرت رمضان میں زیادہ عبادت کرتے تھے یا دوسرے مہینوں میں تو ام سعید نے کہا: آپ ہر رات اللہ سے راز و نیاز میں مشغول رہتے اور آپ کے

---

۱۔ اقبالؔ کے نزدیک (جو حضرت علیؑ کے بڑے مداح تھے) آہ سحر گاہی زندگی کا بہت ہی عزیز سرمایہ ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

عطارؔ ہو رومیؔ ہو رازیؔ ہو غزالیؔ ہو — کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

اقبالؔ علی الصباح اٹھنے کا بہت ہی اہتمام رکھتے تھے، سفر و حضر ہر مقام اور ہر کہیں ان کے لیے سحر خیزی ضروری تھی۔

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی — نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

صرف یہی نہیں بلکہ وہ اس کی تمنا بھی کرتے ہیں کہ خداوندا مجھ سے تو جو چاہے چھین لے لیکن لذت آہ سحر گاہی سے مجھے محروم نہ کر۔

نہ چھین لذتِ آہِ سحر گہی مجھ سے — نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز

یہی وجہ تھی کہ وہ جوانوں میں اپنی اس آہ و سوز اور درد و تپش کو دیکھنے کی تمنا کرتے تھے اور دعائیں کرتے کہ

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — تو ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

(نقوش اقبالؔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) رضوانی

لیے رمضان اور دیگر مہینے برابر تھے۔

زخمی ہونے کے بعد حضرت علی علیہ السلام کو جب گھر لے جایا جا رہا تھا تو راستے میں پَو پھوٹتے دیکھ کر حضرت نے فرمایا تھا: اے صبح! گواہ رہنا کہ علیؑ صرف آج فجر کے وقت تجھے لیٹا نظر آ رہا ہے۔

ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

حضرت علی علیہ السلام بہت بڑے عابد تھے۔ آپ اکثر دن میں روزہ رکھتے اور راتوں کو نماز پڑھتے یہاں تک کہ زمانہ جنگ میں بھی آپ کی نماز ترک نہیں ہوتی تھی۔ حضرت علی علیہ السلام وہ عالم باعمل تھے جنھوں نے لوگوں کو نوافل، دعا و مناجات اور نماز تہجد کی تعلیم دی۔

حضرت علی علیہ السلام نماز کے وقت اللہ کے حضور پاکیزہ دل اور پوری توجہ کے ساتھ راز و نیاز کرتے۔ آپ کی عبادت ان لوگوں جیسی نہ تھی جو کسی خاص مقصد کے لیے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے: اِنَّ قَوْمًا عَبَدُوا اللّٰہَ رَغْبَۃً فَتِلْكَ عِبَادَۃُ التُّجَّارِ، وَاِنَّ قَوْمًا عَبَدُوا اللّٰہَ رَھْبَۃً فَتِلْكَ عِبَادَۃُ الْعَبِیْدِ، وَاِنَّ قَوْمًا عَبَدُوا اللّٰہَ شُكْرًا فَتِلْكَ عِبَادَۃُ الْاَحْرَارِ ایک گروہ ثواب کے لالچ میں عبادت کرتا ہے۔ یہ تاجروں کی عبادت ہے۔ ایک گروہ عذاب کے ڈر سے عبادت کرتا ہے۔ یہ غلاموں کی عبادت ہے اور ایک گروہ خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے عبادت کرتا ہے۔ یہ آزاد منش لوگوں کی عبادت ہے۔

(نہج البلاغہ، کلمات قصار ۲۳۷)

حضرت علی علیہ السلام اللہ سے فرماتے ہیں: اِلٰھِیْ مَا عَبَدْتُكَ طَمَعًا لِلْجَنَّۃِ وَلَا خَوْفًا مِنَ النَّارِ بَلْ وَجَدْتُكَ مُسْتَحَقًّا لِلْعِبَادَۃِ بار الٰہا! میں بہشت کی لالچ یا جہنم کے ڈر سے تیری عبادت نہیں کرتا بلکہ میں نے تجھے اس لائق پایا ہے کہ تیری عبادت کروں۔

ہر شخص بلکہ ہر جان دار جبلی طور پر نقصان سے بچنا اور نفع کمانا چاہتا ہے مگر یہ صرف حضرت علیؑ ہیں جنھوں نے نفع (بہشت) کمانے اور نقصان (جہنم) سے بچنے کے لیے نہیں بلکہ خالص اللہ کے لیے عبادت کی اور اس طرح کی عبادت اور خلوص کا منبع وہ یقین تھا جو یقین کی معراج ہے اسی لیے حضرت علیؑ نے فرمایا تھا: لَوْ كُشِفَ الْغِطَاءُ مَا ازْدَدْتُ یَقِیْنًا اگر پردے ہٹا دیے جائیں تب بھی میرے یقین میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

حضرت علی علیہ السلام نے خود کو موج دریا کی طرح دریائے حقیقت میں فنا کر دیا تھا اسی لیے آپ کی فکر، آپ کا ذکر اور آپ کا عمل حقیقت خواہی کا مظہر تھے۔

حضرت علی علیہ السلام تزکیہ نفس کے کمال پر تھے۔ آپ کا لوح جام[1] جام جہاں نما تھا۔ آپ کی نظروں میں خدا کا جلوہ، جلوہ گر رہتا۔ آپ فرماتے : مَا رَاَیْتُ شَیْئًا اِلَّا رَاَیْتُ اللّٰهَ قَبْلَهٗ وَمَعَهٗ وَبَعْدَهٗ میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا مگر یہ کہ اس سے پہلے، اس کے ساتھ اور اس کے بعد جمال الٰہی کو دیکھا۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اِنِّیْ لَمْ اَعْبُدْ رَبًّا لَمْ اَرَهٗ یعنی میں اس خدا کی عبادت نہیں کرتا جسے میں نے دیکھا نہ ہو۔

لوگوں نے پوچھا: آپ نے خدا کو کس طرح دیکھا؟

فرمایا: میں نے حاسۂ چشم سے نہیں بلکہ چشم دل سے اسے دیکھا ہے۔

بچشم ظاہر اگر رخصت تماشا نیست      نہ بستہ است کسے شاہراہ دل ہا را

اگر چشم ظاہر سے اس کا دیدار کرنے کی اجازت نہیں تو کیا ہوا؟ شاہراہ دل پر تو کسی کا پہرہ نہیں یعنی اللہ کا بصارت سے نہیں، بصیرت سے تو مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اللہ کے حضور خضوع و خشوع کے ساتھ پیش ہونا ضروری خیال فرماتے تھے۔ آپ کی دعائیں اور مناجاتیں اسی حقیقت کو نمایاں کرتی ہیں۔

دعائے کمیل جو آپ نے اپنے ایک صحابی جناب کمیل بن زیاد کو تعلیم فرمائی تھی آپ کی عظمت اور پختہ ایمان کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس دعا کا ہر جملہ اعلیٰ معانی اور کنہ حقیقت تک رسائی کے لیے منارۂ نور ہے۔ اس دعا میں کبھی ذات احدیت کی بے پایاں رحمت کے سامنے آپ سراپا امید نظر آتے ہیں تو کبھی اللہ کی قدرت اس طرح آپ کے دل میں خوف پیدا کردیتی ہے کہ آپ بے اختیار گریہ کرنے لگتے ہیں۔ یہی حال آپ سے منسوب دعائے صباح اور دیگر مناجاتوں کا ہے۔ ان میں سے ہر دعا میں سوز و گداز، خوف و امید اور توجہ و خلوص چھلکتا نظر آتا ہے۔

ایک دن ضرار بن ضمرہ معاویہ کے پاس گیا تو معاویہ نے اس سے کہا:

علیؑ کے کچھ اوصاف تو بیان کرو۔ ضرار نے کہا: علیؑ راتوں کو زیادہ تر بیدار رہتے اور بہت کم سوتے، ہمیشہ تلاوت قرآن کرتے، اپنی جان کو راہ خدا میں قربان کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے۔ بارگاہِ ایزدی میں روتے، اپنی ذات کو ہم سے مخفی رکھتے اور سونے کے سکوں کی تھیلیاں ہم لوگوں سے بچا کر اپنے لیے ذخیرہ نہ کرتے۔ اپنے رشتے داروں کے ساتھ شفقت و مہربانی اپنی جگہ، ستم گروں کے ساتھ

---

۱۔ جام جہاں نما وہ جام ہے جو ایرانی بادشاہ جمشید کی طرف منسوب ہے۔

بھی سختی سے پیش نہ آتے۔ جب رات کی تاریکی کے پردے سرکنے اور ستارے نگاہوں سے اوجھل ہونے لگتے تو محراب عبادت میں اپنی داڑھی کو ہاتھ میں پکڑ کر مار گزیدہ شخص کی طرح تڑپ تڑپ کر خوف الٰہی سے گریہ وزاری کرتے اور کہتے: اے دنیا! کیا تو سج سنور کر اس لیے میرے سامنے آئی ہے کہ مجھے اپنا گرویدہ بنا سکے۔ خبردار! دور ہو جا! مجھے تیری ہرگز ضرورت نہیں۔ میں نے تجھے تین طلاقیں دیدی ہیں۔ اب میرے لیے تیری طرف رجوع کرنا ممکن نہیں رہا۔ پھر فرماتے: افسوس! زاد راہ کم ہے اور سفر طویل بھی ہے اور سخت بھی۔

ابھی گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ معاویہ نے رو کر کہا: اے ضرار! بس اتنا کافی ہے۔ خدا کی قسم! واقعاً علیؑ ایسے ہی تھے۔ خدا ابوالحسنؑ پر رحمت کرے۔ (شیخ صدوق، امالی، مجلس ۹۱، ح ۲)

حضرت علی علیہ السلام کی عبادت صرف نماز، روزہ اور دیگر دینی فرائض کی بجا آوری تک ہی محدود نہ تھی بلکہ آپ کی تمام حرکات وسکنات بھی عین عبادت تھیں۔ اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ اعمال کا دار و مدار نیت پر ہوتا ہے اور حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کا ہر لمحہ رضائے پروردگار کے لیے وقف تھا لہٰذا آپ کے اقوال و اعمال سب عبادت شمار ہوتے ہیں اور یہ امر خود امام کی فضیلت کی دلیل ہے۔

# (۳) حضرت علی علیہ السلام کا علم و حکمت

نبی اور امام کے علم کے متعلق لوگوں کے عقائد مختلف ہیں۔ ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ ان کا علم شرعی مسائل تک محدود ہوتا ہے اور غیب کا علم خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا جیسا کہ قرآن میں آیا ہے : وَعِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ غیب کے خزانوں کی کنجیاں اللہ کے پاس ہیں اس کے سوا کوئی ان کو نہیں جانتا۔ (سورۂ انعام : آیت ۵۹) اور یہ کہ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ اللہ تمھیں غیب کی باتوں سے مطلع نہیں کرتا۔ (سورۂ آل عمران : آیت ۱۷۹) دوسرا گروہ نبی اور امام کو تمام امور سے خواہ وہ تکوینی ہوں یا تشریعی سب سے آگاہ جانتا ہے۔

اہلسنت جو عصمت امام کے قائل نہیں وہ امام کو بھی دیگر رہنماؤں کی طرح سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسا ممکن ہے کہ نبی اور امام کو کسی چیز کا علم نہ ہو لیکن دوسروں کو علم ہو جیسے حضرت عمرؓ نے ان کو لاجواب کر دینے والی عورت سے کہا تھا : كُلُّكُمْ أَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ حَتَّى الْمُخَدَّرَاتِ فِي الْحِجَالِ تم سب عمر سے زیادہ علم رکھتے ہو یہاں تک کہ حجلہ نشین عورتیں بھی عمر سے زیادہ جانتی ہیں۔

(شب ہائے پشاور ص ۸۵۲ بحوالہ تفاسیر و کتب عامہ)

اس موضوع پر بحث، فلسفیانہ لحاظ سے اس امر سے مربوط ہے کہ آدمی کی قدر و منزلت کی پہچان کے لیے یہ دیکھا جائے کہ اس کا علم کس نوعیت کا ہے۔ مختصر یہ کہ علم — یعنی انکشاف حقائق — کی دو قسمیں ہیں ایک ذاتی اور دوسرا حصولی۔[۱] ذاتی علم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے مخصوص ہے اور ہمارے لیے اس علم کی حقیقت اور کیفیت کو جاننا ممکن نہیں جبکہ علم حصولی کا تعلق انسانوں سے ہے۔ ہر انسان دوسرے انسان سے علم حاصل کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ علم کی ایک تیسری قسم علم لدنی بھی ہے۔ یہ علم انبیاء اور اوصیاء کے لیے مخصوص ہے۔ علم کی یہ قسم نہ تو عام انسانوں کے حصولی علم کی طرح ہے اور نہ اللہ

---

۱۔ علم کی تقسیم بندی حضوری اور حصولی بھی کی گئی ہے تاہم ہمارے مقصود سے نزدیک تر یہی تقسیم یعنی ذاتی اور حصولی علم ہے۔

کے ذاتی علم کی طرح ہے بلکہ یہ وہ علم ہے جو اللہ کی طرف سے (کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ کئے بغیر) انبیاء اور اوصیاء کو حاصل ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے اذن و ارادے سے ماضی، حال اور مستقبل کے حالات کے بارے میں خبر دینے کے علاوہ لوگوں کے ہر سوال کا جواب دینے کی صلاحیت حاصل کر لیتے ہیں چنانچہ حضرت خضر کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا** یعنی ہم نے ان کو اپنی طرف سے علم لدنی سکھایا تھا۔ (سورۂ کہف: آیت ۶۵) اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو اللہ تعالیٰ سے علم لدنی لے کر آئے تھے فرمایا کرتے تھے: **وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ** میں تم کو بتاتا ہوں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۴۹)

اس بنا پر وہ آیات جو غیر اللہ کے علم غیب کی نفی کرتی ہیں اس سے مراد ذات احدیت کا ذاتی علم ہے لیکن وہ مقامات جہاں دوسروں کے لیے علم غیب ثابت کیا گیا ہے وہاں وحی اور الہام کے ذریعے ودیعت کیا جانے والا علم لدنی مراد ہے جس سے صاحبان علم لدنی اللہ کے ارادے سے غیبی امور سے آگاہ ہوجاتے ہیں چنانچہ قرآن کہتا ہے: **عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ○ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ** اللہ عالم الغیب ہے اور وہ اپنے علم غیب کو اپنے پسندیدہ رسول کے سوا کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔

(سورۂ جن: آیت ۲۵۔۲۶)

مذکورہ آیات پر اگر غور کیا جائے تو سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو عالم امکان کے سلسلہ وجود کا سرچشمہ ہیں اور جن کو اللہ کے حضور سب سے زیادہ تقرب حاصل ہے یقینی طور پر ایسی ہستی ہیں جنھیں اللہ کی طرف سے سب سے زیادہ علم عطا کیا جانا ایک مسلمہ امر ہے۔ اس ضمن میں قرآن کی یہ نص قرآنی بھی موجود ہے کہ **عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ○** ان کو عظیم قوت والے نے تعلیم دی ہے۔ (سورۂ نجم: آیت ۵) اس صورت میں لامحالہ ماننا پڑتا ہے کہ کائنات کے وجود اور اسرار و رموز کے سب سے بڑے عالم رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور حضرت علی علیہ السلام نے جن کے علم پر ہم گفتگو کر رہے ہیں ان ہی سے علم حاصل کیا ہے اور آپ علم نبوت کا دروازہ ہیں۔ شیعہ اور سنی مورخین و مفسرین نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا فَمَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْيَاْتِ الْبَابَ** میں شہر علم ہوں اور علیؑ اس شہر کا دروازہ ہیں جو شہر میں آنا چاہتا ہے وہ دروازے سے آئے۔ (مناقب ابن مغازلی ص ۸۰۔ کفایۃ الطالب ص ۱۲۲۔ فصول المہمہ ص ۱۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث بھی منقول ہے: **اَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا** میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔ (ذخائر العقبیٰ ص ۷۷۔ کشف الغمہ ص ۳۳)

خود حضرت علیؑ کا ارشاد گرامی ہے: لَقَدْ عَلَّمَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اَلْفَ بَابٍ کُلُّ بَابٍ یَفْتَحُ اَلْفَ بَابٍ بتحقیق رسول اللہؐ نے مجھے علم کے ایک ہزار ابواب سکھائے اور ان میں سے ہر باب کے ایک ہزار ابواب کھلتے ہیں۔ (خصال صدوق ج ۲، ص ۱۷۶)

شیخ سلیمان قندوزی لکھتے ہیں: حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: سَلُوْنِیْ عَنْ اَسْرَارِ الْغُیُوْبِ فَاِنِّیْ وَارِثُ عُلُوْمِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ اسرار غیب کے متعلق مجھ سے پوچھو کیونکہ میں انبیاء و مرسلین کے علوم کا وارث ہوں۔ (ینابیع المودۃ، باب ۱۴، ص ۶۹)

موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: علم و حکمت کو دس حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ان میں سے نو حصے علیؑ کو دیئے گئے اور باقی ایک حصہ دوسرے لوگوں کو دیا گیا اور اس ایک حصے میں بھی علیؑ دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ علم رکھتے ہیں۔ (ینابیع المودۃ، باب ۱۴، ص ۷۰۔ کشف الغمہ ص ۳۳)

ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ اَعْلَمُ اُمَّتِیْ، وَاَقْضَاهُمْ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ مِنْ بَعْدِیْ علیؑ میری امت میں سب سے زیادہ صاحب علم ہیں اور میرے بعد ہر اختلافی مسئلے کا بہترین فیصلہ کرنے والے ہیں۔ (ارشاد مفید ج ۱، باب ۲، فصل ۱، ح ۱)

ابن ابی الحدید معتزلی کہتے ہیں کہ تمام اسلامی علوم حضرت علی علیہ السلام ہی سے پروان چڑھے ہیں، انھوں نے ہی معارف اسلام کو اپنے خطبات میں نہایت بلیغ انداز سے بیان فرمایا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے برسر منبر اعلان فرمایا تھا: سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ مجھ سے پوچھ لو جو پوچھنا چاہو اس سے قبل کہ تم مجھے کھو دو۔ یہ مختصر سا جملہ حضرت علی علیہ السلام کے علم کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے کیونکہ آپ نے کسی موضوع کی کوئی قید نہیں لگائی اور دائرہ سوالات کو بھی محدود نہیں کیا بلکہ لوگوں کو ہر قسم کے علمی سوالات پوچھنے کی آزادی دی تھی۔ یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کائنات اور خلقت کائنات کے جملہ رازوں سے واقف تھے۔ نیز اس طرح کا دعویٰ آپ کے علاوہ کسی اور سے نہیں سنا گیا۔ چنانچہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں: تمام لوگوں کا اس امر پر اجماع ہے کہ صحابہ کرام اور علمائے اعلام میں سے کسی نے بھی حضرت علی علیہ السلام کے سوا سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ کا دعویٰ نہیں کیا۔

(شرح نہج البلاغہ ج ۲، ص ۲۷۷۔ کفایۃ الخصام ص ۶۷۳)

شیعہ اور سنی علماء اور مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: مجھ سے پوچھو اس سے قبل کہ میں تمہارے درمیان نہ رہوں۔ خدا کی قسم! اگر میں مسند قضاوت پر بیٹھ جاؤں تو اہل تورات کو تورات،

اہل انجیل کو انجیل، اہل زبور کو زبور اور اہل قرآن کو قرآن سے ایسا فیصلہ سناؤں گا کہ اگر خدا ان کتابوں کو زبان عطا کر دے تو سب یہی کہیں گی کہ علیؑ نے وہی فیصلہ کیا ہے جو ہمارے اندر موجود ہے۔ پھر فرمایا: جو چاہو مجھ سے پوچھو اس سے پہلے کہ مجھے نہ پاؤ۔ اس خدا کی قسم جو زمین کے اندر دانے شگافتہ کرتا ہے اور جس نے انسان کو پیدا کیا ہے اگر تم مجھ سے ایک ایک آیت قرآن کے بارے میں پوچھو تو میں تم کو اس کی شان نزول اور زمانہ نزول کے ساتھ یہ بھی بتاؤں گا کہ وہ ناسخ ہے یا منسوخ، عام ہے یا خاص، محکم ہے یا متشابہ، مکہ میں نازل ہوئی یا مدینہ میں...

(ینابیع المودۃ ص ۷۴۔ ارشاد مفید ج ۱، باب ۲، فصل ۱، ح ۴۔ شیخ صدوق، امالی، مجلس ۵۵، ح ۱۔ مناقب خوارزمی)

حضرت علی علیہ السلام سراپا علم تھے لیکن آپ سے آپ کے چند اصحاب خاص کے سوا کسی نے علم حاصل نہ کیا کیونکہ آپ جن لوگوں کے درمیان زندگی بسر کر رہے تھے ان کی اکثریت نااہل تھی۔ بقول سعدیؔ

عالم اندر میانۂ جہّال　　مَثَل گفته اند صدّیقان

شاهدی درمیان کوران است　　مصحفی در سرائے زندیقان

جاہلوں کے درمیان ایک عالم کی موجودگی پر یاروں نے سچی مثل بیان ہے کہ وہ نابیناؤں کے درمیان بینا اور کافروں کے گھر میں موجود قرآن کی مانند ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کی ہمیشہ یہی آرزو رہی کہ صاحبان کمال آپ کو میسر ہوں تا کہ آپ کائنات اور اس کے اسرار کے بارے میں ان کو تعلیم دیں۔ آپ اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے تھے: اِنَّ هٰهُنَا لَعِلْمًا جَمًّا دیکھو! اس سینے میں علم کا خزانہ ہے مگر افسوس کسی میں اسے سمجھنے اور اس سے اکتساب فیض کرنے کی اہلیت نہیں تھی۔

طبیعی قوانین کہ جن پر یورپی محققین کی تحقیق جاری ہے حضرت علی علیہ السلام کے خطبات اور کلام میں پوری طرح نمایاں نظر آتے ہیں۔ نیز آپ کے خطبات میں فلسفیانہ حقائق اور اسلامی معارف کا سمندر موجزن ہے اور اسی سے ملا صدرا جیسے عظیم فلسفیوں نے استفادہ کیا ہے۔

خلفائے ثلاثہ بھی جنھوں نے پچیس سال تک حکومت کی اپنے اپنے دور میں جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں علمی اور عدالتی مشکلات میں حضرت علی علیہ السلام سے ہی مدد طلب کرتے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام کے عہد حکومت میں ایک یونانی اور ایک یہودی فلسفی نے آپ سے ملاقات کی اور تبادلۂ خیال کیا۔ راستے میں یونانی فلسفی نے کہا: یہ علیؑ تو سقراط اور ارسطو سے بھی بہتر فلسفہ جانتے ہیں۔

یہودی فلسفی نے کہا: انھیں تو فلسفہ کے تمام پہلوؤں پر عبور حاصل ہے۔[۱] (کتاب افکار امام)

اسلام کی نظر میں بہترین علم مبدا و معاد کا علم ہے اور حضرت علی علیہ السلام کے کلام میں اسے نہایت ہی عمدہ انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور ان کے اسرار و رموز کی تشریح نہیں کرسکتا۔

کمیل بن زیاد نخعی سے حضرت علی علیہ السلام نے جو حدیث نفس اور حدیث حقیقت بیان فرمائی تھی علمائے عرفان و حکمت نے ان کی شرح میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اب بھی عالم بشریت کے لیے وقت ہے کہ وہ اس عظیم ہستی کے کلام گہربار سے فیض حاصل کرے۔ حضرت علی علیہ السلام کے تقریباً گیارہ ہزار مختصر اقوال ہیں جن میں مختلف عقلی، دینی، معاشرتی اور اخلاقی باتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام اسلام میں وہ پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے فلسفہ الٰہیات پر بات کی اور ان مسائل کو بھی جن کی طرف توجہ ہی نہیں دی جاتی تھی آسان استدلال اور منطقی دلائل کے ذریعے اپنے زمانے کے فلاسفہ کے سامنے پیش کیا اور اسلامی علوم و معارف سے سرشار ایک پورے گروہ کی تربیت فرمائی جن میں **اُویس قرنی**، **کمیل بن زیاد**، **میثم تمار** اور **رُشید هجری** جیسے زاہد اور عارف شامل ہیں اور جنھیں مسلمان عارفین کے درمیان عرفان کے منبع کے طور پر جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ (شیعہ در اسلام ص ۲۰، مؤلفہ علامہ سید محمد حسین طباطبائی)

حضرت علی علیہ السلام کو عربی ادبیات کا ''بحر ذخار'' قرار دیا جاسکتا ہے۔ آپ نے ہی عربی علوم کے قواعد اور اصول مرتب فرمائے اور علم نحو کی بنیاد رکھی۔ آپ پیچیدہ اور مشکل مطالب کو مختصر کلمات کے ذریعے نہایت آسان پیرائے میں بیان فرماتے۔ آپ سے کسی بھی علم کے متعلق سوال کیا جاتا، چاہے ریاضی ہو، طبیعیات ہو یا دیگر علوم۔ آپ ہر سوال کا بلا تامل جواب دیتے اور جواب میں کبھی غلطی نہ ہوتی۔ کسی نے حضرت علی علیہ السلام سے پوچھا کہ ایک سے دس تک اعداد کا ذو اضعاف اقل کیا ہے؟

حضرت نے فوراً جواب دیا: اِضْرِبْ اَیَّامَ اُسْبُوْعِكَ فِیْ اَیَّامِ سَنَتِكَ ہفتے کے دنوں کو سال کے دنوں سے ضرب دو۔ جو جواب آئے وہی تمہارا مطلوبہ عدد ہے جو ایک سے دس تک تمام اعداد کے لیے قابل تقسیم ہے۔[۲]

---

۱۔ ارسطو جیسے فلاسفہ کا حضرت علی علیہ السلام سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ہم بتا چکے ہیں کہ امام علی علیہ السلام کے پاس علم لدنی تھا جبکہ علماء اور دانشوروں کا علم حصولی اور اکتسابی ہوتا ہے۔ اس فلسفی نے جو بات کہی اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اس کی نظر میں سقراط اور ارسطو سے بڑا کوئی فلسفی نہیں تھا۔

۲۔ ہفتے کے سات دنوں کو قمری سال کے ۳۶۰ دنوں سے ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب ۲۵۲۰ آتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کی تیزیٔ ادراک سے سب لوگ حیرت زدہ ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے کہا: یا علیؑ! مجھے اس بات پر حیرت نہیں کہ آپ تمام علمی، فقہی اور عدالتی مسائل پر مکمل عبور رکھتے ہیں بلکہ میں حیران اس بات پر ہوں کہ آپ کس طرح مشکل ترین سوال کا جواب بغیر سوچے فوراً دیدیتے ہیں۔

حضرت علیؑ نے فرمایا: اے عمر! بتاؤ میرے ہاتھ میں کتنی انگلیاں ہیں؟

حضرت عمرؓ نے کہا: پانچ انگلیاں۔

حضرت علیؑ نے فرمایا: تم نے میرے سوال کے جواب میں سوچ بچار سے کام کیوں نہیں لیا؟

حضرت عمرؓ نے کہا: یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔ اس میں سوچنے والی کیا بات ہے؟

حضرت علیؑ نے فرمایا: تمام مسائل میرے لیے ان انگلیوں کی طرح ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام اسرارِ ہستی اور نظامِ کائنات کے بارے میں حکیمانہ انداز سے غور و فکر فرماتے چنانچہ توحید اور الٰہیات اور مابعد الطبیعیات کے بارے میں آپ نے یادگار خطبات چھوڑے ہیں جو نہج البلاغہ اور آپ کے دیگر علمی آثار میں موجود ہیں۔

# (۴) حضرت علی علیہ السلام کی ہیبت و شجاعت

شجاعت ایک نفسانی کیفیت ہے۔ اس کا تعلق خطرات اور مشکل حالات کے سامنے ڈٹ جانے سے ہے۔ شجاعت کا مطلب ہے کہ ہمت شکن حالات میں بھی انسان ثابت قدم رہے۔ حضرت علی علیہ السلام مطالعہ تاریخ میں اس صفت کا حقیقی مصداق نظر آتے ہیں۔

اگرچہ ہم حضرت علی علیہ السلام کی عسکری خدمات کے ضمن میں عہد رسولؐ یا عہد علیؑ میں لڑی جانے والی جنگوں میں حضرت علی علیہ السلام کی شجاعت کا ذکر کر چکے ہیں تاہم اس موضوع پر جتنا بھی لکھا جائے آپ کی بے مثل شجاعت کو پوری طرح بیان نہیں کیا جاسکتا۔

مؤرخین لکھتے ہیں: آپ کا رنگ گندمی، آنکھیں چمک دار، ابرو گھنے اور دانت موتیوں کی طرح سفید اور مضبوط تھے۔ آپ کے بازو، ہاتھ اور کلائیاں بے حد طاقت ور تھیں۔ ایسے لگتا تھا کہ جیسے آپ کے بازوؤں کو گوشت، جلد اور ہڈیوں کو کوٹنے کے بعد بنایا گیا ہو۔ آپ کا قد درمیانہ اور جسم مثل فولاد سخت تھا۔ عام طور پر مؤرخین کا خیال ہے کہ حضرت علی علیہ السلام شجاعت اور قوت کے اعتبار سے پورے عرب میں اپنی مثال آپ تھے۔ حضرت ابو طالبؑ عرب نوجوانوں کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام کو کشتی لڑاتے تھے اور آپ کمسن ہونے کے باوجود بڑی تیزی سے انھیں زمین پر گرا دیتے تھے۔

زبیر بن عوام قسم کھا کر کہتے ہیں کہ میں جنگوں میں کسی بہادر سے نہیں ڈرا مگر حضرت علی علیہ السلام کے سامنے میرے اوسان خطا ہوجاتے تھے۔ صرف زبیر کا ہی نہیں، تمام جنگجوؤں کا یہی عالم تھا کہ آپ کے مقابلے پر آتے ہی وہ حواس باختہ ہوجاتے تھے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

کُلُّ مَنْ جَرَّدَ سَیْفًا وَ شَهَرَ      اَغْمَدَ السَّیْفَ مَتٰی قَابَلَهُ

تمام تیغ زن بہادر جب علیؑ کے سامنے آتے تو اپنی تلواریں نیام کر لیتے۔

حضرت علی علیہ السلام کی یہی ہیبت آپ کے مدمقابل سے اس کی تمام قوتیں سلب کر لیتی اور وہ نہایت

آسانی کے ساتھ مغلوب ہوجاتا۔ حضرت علی علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ آپ اپنے مدمقابل پر اتنی آسانی سے کیسے قابو پالیتے ہیں؟ فرمایا: قِیْلَ لَهُ بِاَیِّ شَیْءٍ غَلَبْتَ الْاَقْرَانَ؟ فَقَالَ عَلَیْهِ السَّلَامُ: مَالَقِیْتُ رَجُلًا اِلَّا اَعَانَنِیْ عَلٰی نَفْسِهٖ میں جس شخص کا بھی مقابلہ کرتا ہوں وہ خود ہی اپنے خلاف میری مدد کرتا ہے۔

(نہج البلاغہ، کلمات قصار ۳۱۸)

سید رضیؒ نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کے اس کلام کے ذیل میں لکھتے ہیں:

حضرت علی علیہ السلام کا مقصود یہ ہے کہ میرا حریف میری ہیبت سے مرعوب ہوجاتا ہے۔

اسلامی غزوات میں حضرت علی علیہ السلام نے جس دلاوری اور فداکاری کا مظاہرہ کیا اس نے سب لوگوں کو حیرت زدہ کردیا۔ شب ہجرت بستر رسولؐ پر بے خوف سو جانا آپ کی بہادری اور فداکاری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میدان کارزار میں حضرت علی علیہ السلام کی طرح ثابت قدم رہنا اور دشمنوں کے ہر حملے کے سامنے سینہ سپر رہنا کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔

ایک دفعہ معاویہ نے حضرت علی علیہ السلام کے سفیر طرماح کے سامنے اپنے منشی سے کہا کہ علیؑ کو لکھو کہ میں نے آپ سے لڑنے کے لیے ایک لشکر جرار تیار کرلیا ہے۔ یہ سن کر طرماح نے کہا: آپ اپنے لشکر کی کثرت سے حضرت علی علیہ السلام کو ڈرانے کی جو کوشش کررہے ہیں یہ بالکل ایسے ہے جیسے کسی مرغابی کو پانی کی کثرت سے ڈرایا جائے۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے دربار یزید میں اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا تھا:

میں اس کا پوتا ہوں جو بے حد قوی، شجاع، ثابت قدم اور عزم صمیم کے مالک تھے۔ جو رزم گاہ میں شیر تھے، جو نیزہ برداروں اور سواروں کو ہوا میں اچھال دیتے تھے اور آندھی بن کر حملہ کرتے تو دشمنوں کو خشک پتوں کی طرح بکھیر کر رکھ دیتے تھے۔ (بحار الانوار ج ۴۵، ص ۱۳۸)

امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنے جد بزرگوار کی شجاعت کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے یہ صرف ایک پوتے کی زبان سے دادا کی تعریف نہیں بلکہ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے جسے ایک امام نے دوسرے امام کے بارے میں بیان کیا ہے کیونکہ ایک امام ہی حضرت علی علیہ السلام کی قدر و منزلت جان سکتا ہے۔

کوئی بھی ماہر جنگجو اور تجربہ کار تیغ زن ایسا نہیں دیکھا گیا جو ہر جنگ میں فتحیاب اور کامیاب رہا ہو۔ شیخ مفید حضرت علی علیہ السلام کی شجاعت کو ایک قسم کا معجزہ جانتے ہیں۔ فرماتے ہیں: اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ جنگجو کبھی اپنے دشمن پر غالب آجاتا ہے اور کبھی شکست کھا جاتا ہے لیکن کوئی بہادر تیغ آزما ایسا نہیں

دیکھا گیا کہ اس کے وار سے ہمیشہ دشمن نے زک اٹھائی ہو۔ یہ صرف حضرت علی علیہ السلام ہیں جنھوں نے جس پر وار کیا اسے ہلاک بھی کیا۔ یہ حضرت علی علیہ السلام کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ ان کا وجود مبارک خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھا۔ (ارشاد مفید ج ۱، باب ۳، فصل ۵۶)

حضرت علی علیہ السلام کی قوت جس کا سرچشمہ ایمان اور یقین محکم تھا اتنی عظیم تھی کہ اس کی جھلک بھی کسی دوسرے میں نہیں دیکھی گئی۔ جنگ صفین میں ایک دن حضرت علی علیہ السلام اپنے چہرۂ اقدس پر نقاب ڈال کر لشکر شام کے سامنے آئے اور مبارز طلب کیا تو اہل شام کے کئی بہادر مقابلے کے لیے نکلے لیکن آپ کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ اتر گئے تو معاویہ نے عمرو بن عاص سے کہا:

یہ شیر دل کون ہے؟

عمرو بن عاص: یا تو وہ ابن عباسؓ ہے یا علیؑ ہے۔

معاویہ: اب یہ کیسے معلوم ہو کہ وہ کون ہے؟

عمرو بن عاص: یقیناً ابن عباسؓ بھی بہت بہادر ہیں لیکن اتنے بڑے لشکر کے عام حملے کے مقابلے میں وہ نہیں ٹھہر سکیں گے۔ سپاہیوں کو حکم دو کہ سب مل کر حملہ کردیں۔ اگر عام حملے سے اس کے قدم اکھڑ جائیں اور وہ واپس چلا جائے تو سمجھ لو کہ ابن عباسؓ ہے اور اگر میدان میں جما رہے اور نہ بھاگے تو پھر وہ علیؑ ہے اس لیے کہ علیؑ کے مقابلے میں ہمارے سپاہی تو کیا پورا عرب بھی آجائے تو وہ اپنی جگہ سے ہٹنے والے نہیں۔

معاویہ نے آزمانے کے لیے سپاہیوں کو عام حملے کا حکم دیا۔ پورا لشکر اس نقاب پوش پر ٹوٹ پڑا مگر وہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ کھڑا رہا۔ چنانچہ اسے پتا چل گیا کہ علیؑ خود میدان میں آئے ہیں لہٰذا اس نے لشکر کو واپس آنے کا حکم دیدیا۔[۱]

میدان جنگ میں جب حضرت علی علیہ السلام کی صدائے تکبیر بلند ہوتی تو بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہوجاتا۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں کئی بار حضرت علی علیہ السلام نے تن تنہا مخالفین کی فوج پر حملہ کیا اور ان کی صفوں کو درہم برہم کرڈالا۔

دوست اور دشمن سب اقرار کرتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام مرد جری، غیر فرار اور اسد اللہ الغالب

---

۱۔ حضرت علی علیہ السلام نے عثمان بن حنیف کے نام ایک خط میں لکھا تھا: وَاللّٰهِ لَوْ تَظَاهَرَتِ الْعَرَبُ عَلٰى قِتَالِيْ لَمَا وَلَّيْتُ عَنْهَا خدا کی قسم! اگر تمام عرب مل کر میرے ساتھ جنگ کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوں تب بھی میں ان کو پشت نہیں دکھاؤں گا۔
(نہج البلاغہ، مکتوب ۴۵)

علیٰ کل غالب تھے۔ آپ کی زرہ آپ کا لباس جنگ تھی جو چند حلقوں والی زنجیر کے ذریعے صرف آپ کے سامنے کی طرف کندھوں سے ملی ہوتی تھی جبکہ پشت کی طرف سے خالی ہوتی تھی۔ جب اس کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: میں کبھی بھی دشمن کو پیٹھ نہیں دکھاتا اس لیے مجھے پشت کی طرف زرہ باندھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ شیخ سعدی کہتے ہیں:

مردی که در مصاف زره پیش بسته بود　　　تاپیش دشمنان نکند پشت برغزا

وہ مرد جس نے جنگ میں صرف سامنے کی طرف زرہ باندھی ہوئی تھی وہ ایسا اس لیے کرتا تھا کہ جنگ کے دوران دشمنوں کو پیٹھ نہ دکھانی پڑے۔

کسی جنگ میں آپ کے ایک سالار لشکر نے پوچھا: مولا! اگر ہم جنگ ہار گئے اور ہمارے سپاہی منتشر ہو جائیں تو آپ کہاں ہوں گے۔ بہتر یہ ہے اس جگہ کی نشاندہی کر دیں تاکہ سب وہاں جمع ہو سکیں۔ آپ نے فرمایا: تم لوگ مجھے جہاں بھی چھوڑ کر جاؤ گے میں تمھیں وہیں ملوں گا اور اپنی جگہ سے نہیں ہلوں گا۔ (افکار امم)

ایک صحابی نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا: مولا! جنگ کے لیے ایک تیز رفتار گھوڑا لے لیجیے کیونکہ ایسا گھوڑا اپنے مالک کو خطرناک صورتحال سے نکال لاتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: میں دشمن کے مقابلے سے نہیں بھاگتا اس لیے مجھے تیز رفتار گھوڑے کی ضرورت نہیں جو مجھے خطرات سے نکال لائے۔ علاوہ ازیں میں بھاگ جانے والے دشمن کا تعاقب بھی نہیں کرتا کہ مجھے تیز رفتار گھوڑے کی ضرورت پڑے لہٰذا سواری میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ (شیخ صدوق، امالی، مجلس ۳۲، ح ۴)

ابن ابی الحدید کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام وہ مرد شجاع تھے جنھوں نے ماضی کے بہادروں کے نام فراموش کرا دیئے اور مستقبل والوں کے لیے بھی جگہ نہیں چھوڑی۔ کلائیوں کی قوت اور بازوؤں کی طاقت میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ آپ کا ایک وار ہی بڑے بڑے سورماؤں کے لیے کافی ہوتا تھا۔ اس لیے آپ کا کوئی بھی مدمقابل آپ سے جان نہ بچا سکا اور آپ کو کبھی دشمن پر دوسرا وار نہیں کرنا پڑا۔ حضرت علی علیہ السلام دشمن خدا کو قتل کرنے کے بعد نعرۂ تکبیر بلند کرتے۔ جنگ صفین کی ایک رات (لیلۃ الهریر) میں آپ نے ۵۲۳ بار نعرۂ تکبیر بلند کیا جس سے معلوم ہوا کہ اس رات آپ نے تن تنہا ۵۲۳ دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ (کشف الغمہ ص ۷۳)

جنگ احد میں جب قبیلہ بنی عبد الدار کے کئی سپوت حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے تو

اسی قبیلے کے ایک حبشی غلام صواب نے غم و غصے کی حالت میں قسم کھائی کہ اپنے قبیلے کے مقتولین کے بدلے وہ خود رسول اللہ ﷺ کو قتل کرے گا۔ یہ غلام بہت نڈر اور بڑے ڈیل ڈول کا مالک تھا۔ مسلمان اس کے سامنے جانے سے ڈرتے تھے مگر حضرت علی علیہ السلام نے اس کی کمر پر ایسا زوردار وار کیا کہ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس کا نچلا حصہ زمین پر ٹکا رہا جبکہ بالائی دھڑ کٹ کر زمین پر آ گرا۔ اس کیفیت کو دیکھ کر لوگ مبہوت رہ گئے اور مسلمان بہت خوش ہو گئے۔ (منتہی الآمال ج ۱، ص ۴۴ نقل مفہوم)

حضرت علی علیہ السلام کا جہاد صرف اللہ کے لیے ہوتا تھا۔ آپ کے وجود کی برکت سے مسلمانوں کی پریشانی دور ہو جاتی تھی۔ جب آپ قبضۂ ذوالفقار پر ہاتھ ڈالتے تو مسلمانوں کی فتح یقینی ہو جاتی۔ مشرکین کی طرف سے جب بھی رسالت مآب ﷺ کو اذیت دینے یا قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جاتا اس موقع پر حضرت علی علیہ السلام ہی رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک سے غم و حزن کے آثار کو دور کرنے کا سبب بنتے۔ اسی وجہ سے آپ کو اَلْکَاشِفُ الْکُرَبِ عَنْ وَجْهِ رَسُوْلِ اللّٰهِ کہا جاتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کی شجاعت اور قوت بازو کا ہر طرف چرچا تھا۔ آپ کے دشمن بھی آپ کی شجاعت کو سراہتے۔ یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی دو انگلیوں سے خالد بن ولید کی گردن کو موڑا تو خالد کی چیخ نکل گئی اور قریب تھا کہ وہ مر جاتا۔ اسلامی غزوات میں اکثر ایسے مواقع آئے کہ اگر حضرت علی علیہ السلام نہ ہوتے تو مسلمانوں کا نام و نشان مٹ جاتا۔

حضرت علی علیہ السلام کی لغت میں خوف کا لفظ تھا ہی نہیں۔ آپ نہ تو جنگ سے ڈرتے تھے اور نہ موت سے۔ آپ پوری زندگی مکمل "موت کی آغوش" میں رہے۔ موت کے خطرات سے کھیلتے رہے۔ آپ فرماتے تھے: وَاللّٰهِ لَابْنُ اَبِيْطَالِبٍ آنَسُ بِالْمَوْتِ مِنَ الطِّفْلِ بِثَدْيِ اُمِّهٖ خدا کی قسم! ابو طالبؑ کا بیٹا موت سے اتنا مانوس ہے جتنا بچہ اپنی ماں کی چھاتی سے مانوس ہوتا ہے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۵)

جنگ صفین میں حضرت علی علیہ السلام بغیر زرہ کے دونوں لشکروں کے درمیان گشت کر رہے تھے۔ امام حسن علیہ السلام نے عرض کی: بابا جان! کیا جنگ کے دوران یہ عمل بے احتیاطی نہیں؟ آپ نے فرمایا: یَا بُنَیَّ اِنَّ اَبَاكَ لَا یُبَالِیْ وَقَعَ عَلَی الْمَوْتِ اَوْ وَقَعَ الْمَوْتُ عَلَیْهِ جان پدر! تیرے باپ کو کوئی پروا نہیں کہ وہ موت پر جا گرے یا موت اس پر آ پڑے۔ (بحار الانوار ج ۴۱، ص ۲ منقول از مناقب آل ابی طالبؑ)

حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب آپ کی اس دلیری اور بے خوفی کی وجہ سے بہت پریشان رہتے تھے کہ کہیں دشمن آپ کو کوئی گزند نہ پہنچا دے۔ چنانچہ انھوں نے عرض کی: مولا! آپ جنگ کے موقع

پر احتیاط نہیں فرماتے۔ آپ کسی بھی متوقع صورتحال سے خوف زدہ نہیں۔ کیوں؟

حضرت علیؑ نے فرمایا:

أَيَّ يَوْمَيَّ مِنَ الْمَوْتِ أَفِرّ

يَوْمَ مَا قُدِّرَ أَمْ يَوْمَ قُدِرَ

يَوْمَ مَا قُدِّرَ لَا أَخْشَى الْوَغَا

يَوْمَ قَدْ قُدِّرَ لَا يُغْنِي الْحَذَرَ

یعنی دو دن ایسے ہیں جن میں موت سے بالکل نہیں ڈرنا چاہیے۔ ایک وہ دن جس دن قضا نہیں لکھی گئی اور دوسرا وہ دن جب موت نے آنا ہے کیونکہ جس دن موت آئے گی اس دن کوئی کوشش فائدہ نہیں دے گی اور جس دن قضا نہیں لکھی اس دن موت آ نہیں سکتی۔

جو بہادر حضرت علیؑ کے ہاتھوں قتل ہوجاتا وہ اپنے قبیلے کے لیے باعث افتخار بن جاتا اور اس کے قبیلے والے اپنے مقتول کا حضرت علیؑ جیسے مرد جری کے مقابلے میں جانے پر اسے داد دیتے۔

غزوۂ خندق میں جب عمرو بن عبد ود حضرت علیؑ کے ہاتھوں مارا گیا تو اس کی بہن نے کہا تھا:

اگر علیؑ کے سوا کسی اور نے عمرو کو قتل کیا ہوتا تو میں زندگی بھر روتی لیکن علیؑ وہ ہیں جن کی شجاعت و دلیری کا لوہا پوری دنیا مانتی ہے اس لیے ان کے ہاتھوں عمرو کا قتل ہونا فخر کی بات ہے۔

ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں لکھتے ہیں:

ایک دن معاویہ سو رہا تھا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ عبد اللہ بن زبیر اس کے تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ عبد اللہ نے مزاحاً کہا: اگر میں چاہتا تو سوتے میں تمھیں قتل کر سکتا تھا۔ معاویہ نے کہا: میرے مرنے کے بعد اظہار شجاعت کرنا۔ عبداللہ نے کہا: تم میری شجاعت سے کیوں انکار کر رہے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں ہی علی بن ابی طالبؑ سے مقابلے کے لیے میدان میں گیا تھا۔ معاویہ نے کہا: اگر تم واقعاً ایسی جرأت کرتے تو علیؑ تم کو اور تمہارے باپ کو اپنے بائیں ہاتھ سے قتل کر دیتے اور اپنے دائیں ہاتھ کا کمال دکھانے کے لیے کسی دوسرے کو تلاش کرتے۔ (بحار الانوار ج ۴۱، ص ۱۴۳)

بلاشبہ حضرت علیؑ ضیغم الغزوات (غزوات کے شیر) اور اسد اللہ الغالب ہیں۔ آپ جب بھی میدان میں اترتے تو دشمنوں کی سانسیں سینوں میں رک جاتیں۔ آپ جس گروہ پر بھی حملہ کرتے، موت اس کی منتظر ہوتی۔ درج ذیل رباعی حضرت علیؑ سے منسوب ہے:

صَيْدُ الْمُلُوْكِ اَرَانِبُ وَ ثَعَالِبُ وَ اِذَا رَكِبْتُ فَصَيْدِیِ الْاَبْطَالُ
صَيْدِیِ الْفَوَارِسُ فِی اللِّقَاءِ وَ اِنَّنِیْ عِنْدَ الْوَغَاءِ لَغَضَنْفَرٌ قَتَّالٌ

یعنی دنیا کے بادشاہوں کا شکار خرگوش اور لومڑیاں ہوتی ہیں مگر جب میں سوار ہو کر نکلتا ہوں تو میرا شکار عرب کے شجاع اور بہادر ہوتے ہیں۔ جنگ کے موقع پر میرا شکار شہسوار ہوتے ہیں اور اس وقت میں شیر نیستاں ہوتا ہوں۔

سفیان ثوری کہتے ہیں:

حضرت علی علیہ السلام مسلمانوں کے لیے ابریشم کی طرح نرم لیکن کفار و منافقین کے لیے فولاد سے بھی سخت تھے۔ خدا نے مسلمانوں کی عزت اور مشرکین کی رسوائی آپ کے ہاتھوں لکھی تھی۔

یہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شجاعت ہی کا ثمر ہے کہ دین حنیف اسلام اتنی تیزی سے پھیلا اور احکامات الٰہیہ کی پیشرفت سے کفر و بت پرستی کی تاریکی چھٹ گئی۔

# (۵) حضرت علی علیہ السلام کا صبر

صبر وتحمل انسان کی بہترین صفات میں سے ہیں۔ یہ صفت انسان کی جواں ہمتی ، بلند فکری اور خود خواہی پر غلبہ پانے کی صلاحیت کی نشاندہی کرتی ہیں نیز ان ہی صفات کے ذریعے انسان روحانی مشکلات و مصائب میں تسکین حاصل کرتا ہے۔

صبر کا مطلب نامساعد حالات کا جم کر مقابلہ کرنا یا واجبات کی ادائیگی اور محرمات سے بچنا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ خود کو زیور صبر سے آراستہ کرے کیونکہ یہ آدمی کی زینت ہے۔

حضرت علی علیہ السلام صبر وتحمل میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ جنگوں میں بھی صبر اور بردباری کا اس حد تک مظاہرہ فرماتے کہ دشمن اپنی ڈھٹائی اور جارحیت کا کھلم کھلا اظہار کرتا۔

حضرت علی علیہ السلام کا صبر حد کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ آپ جب تک دین کی حرمت اور انسانی شرافت و اقدار کو معرض خطر میں نہ دیکھتے صبر سے کام لیتے لیکن حق کے دفاع پر سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔

اگرچہ معاویہ کے لیے بھی کہا گیا ہے کہ وہ بڑا بردبار تھا تاہم معاویہ کی بردباری اپنی سیاست کو چمکانے کا حربہ تھا جبکہ حضرت علی علیہ السلام کی بردباری ایک اخلاقی فضیلت تھی جو کہ دین کی پیشرفت اور گمراہوں کی ہدایت کے لیے تھی۔

عہد رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تمام غزوات میں حضرت علی علیہ السلام نے طرح طرح کی سختیاں جھیلتے ہوئے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت کی اور دین کی ترقی کی خاطر ہر تکلیف خندہ پیشانی سے برداشت کی۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد خلافت کے جھگڑوں اور امت کی بیوفائی سے حضرت علی علیہ السلام کو آگاہ کرتے ہوئے آپ کو صبر کی تلقین فرمائی تھی اور آپ نے بھی اسلام کی خاطر پچیس سال تک نامساعد حالات میں صبر سے کام لیا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں: فَصَبَرْتُ وَفِي الْعَيْنِ قَذًى وَفِي الْحَلْقِ شَجًى یعنی میں نے اس شخص کی طرح صبر کیا جس کی آنکھ میں کانٹا چبھ گیا ہو اور حلق میں ہڈی پھنس گئی ہو۔

حضرت علی علیہ السلام اپنا حق واپس لینے کی طاقت رکھتے تھے مگر آپ نے اسلام کی خاطر صبر سے کام لیا اور یہ بہت بڑی مظلومیت ہے جسے حضرت علی علیہ السلام کے سوا کوئی اور برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ آپ فرماتے ہیں: میں نے کئی بار سوچا کہ اکیلا ہی ان ظالموں کے خلاف جنگ کروں اور اپنا حق واپس لے لوں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کی وصیت اور دین کی حفاظت کی خاطر میں نے اپنے حق کو نظر انداز کردیا۔

اس سے بڑھ کر اور کیا صبر ہوگا کہ مغیرہ بن شعبہ اور خالد بن ولید جیسے کم ظرف لوگ حضرت علیؑ کے بیت الشرف پر چڑھائی کریں اور آپ کو حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے لیے مسجد میں کھینچ کر لے جائیں اور آپ مزاحمت بھی نہ کریں حالانکہ اگر شاہ لافتیٰ ذوالفقار اٹھاتے تو پورے عرب میں آپ کا کوئی ایک مخالف بھی باقی نہ بچتا۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کو کھینچ کر ابوبکرؓ کی بیعت کے لیے مسجد کی طرف لے جایا جارہا تھا۔[۱] جب ایک یہودی نے یہ روح فرسا منظر دیکھا تو بے اختیار کلمۂ شہادت پڑھا اور مسلمان ہوگیا۔ جب اس سے مسلمان ہونے کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے کہا: میں علیؑ کو پہچانتا ہوں۔ کیا یہ وہی علیؑ نہیں جو میدان میں اترتے تو شیر دل پہلوانوں کے دل ڈوب جاتے۔ جنھوں نے خیبر کے آہنی دروازے کو جسے کئی افراد مل کر کھولتے اور بند کرتے تھے، ایک جھٹکے سے اکھاڑ کر زمین پر پھینک دیا تھا لیکن آج وہی علیؑ ان مٹھی بھر فتنہ بازوں کے مقابلے میں خاموش ہیں۔ یقیناً ان کی خاموشی بغیر کسی مصلحت کے نہیں ہوسکتی۔ ان کی خاموشی کا راز دین کی حفاظت ہے۔ اگر اس دین میں کوئی حقیقت نہ ہوتی تو اتنا بڑا بہادر اس اہانت کو اس طرح ہرگز برداشت نہ کرتا۔ ان کے اس صبر سے مجھ پر اسلام کا دین حق ہونا آشکار ہوگیا اور میں مسلمان ہوگیا۔

اس سے بڑھ کر اور کیا مظلومیت ہوگی کہ نصیحتوں کے باوجود ان کے اپنے لشکر والے بیوفائی سے باز نہ آئے۔ بقول شیخ سعدیؔ آپ کی سانسوں کی گرمی ان کے ٹھنڈے دل و دماغ پر اثر نہ کرسکی۔

---

۱۔ معاویہ کے خط کے جواب میں جو اس نے ابو امامہ باہلی کے ہاتھ حضرت علی علیہ السلام کے پاس کوفہ بھیجا تھا آپ نے لکھا تھا:
تم نے لکھا ہے کہ مجھے بیعت کے لیے یوں کھینچ کر لایا جاتا تھا جس طرح نکیل پڑے اونٹ کو کھینچا جاتا ہے تو خالق کی ہستی کی قسم! تم اترے تو برائی کرنے پر تھے کہ تعریف کرنے لگے۔ چاہا تو تم نے یہ تھا کہ مجھے رسوا کرو کہ خود ہی رسوا ہوگئے۔ بھلا مسلمان کے لیے اس میں کون سی عیب کی بات ہے کہ وہ مظلوم ہو جبکہ وہ نہ اپنے دین میں شک کرتا ہو، نہ اس کا یقین ڈانواں ڈول ہو اور میری اس دلیل کا تعلق اگرچہ دوسروں سے ہے مگر جتنا بیان یہاں مناسب تھا تم سے کردیا۔
(نہج البلاغہ، مکتوب ۲۸) رضوانی

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ ان کی غداری سے تنگ آ کر حضرت علی علیہ السلام موت کی آرزو کیا کرتے تا کہ ان لاپروا اور بے اصول کوفیوں سے چھٹکارا پا سکیں۔

حضرت علی علیہ السلام رحلت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مسلسل مشکلات اور مصائب میں گھرے رہے مگر صبر سے سب کچھ برداشت کرتے رہے۔ ابن ابی الحدید کہتے ہیں: حضرت علی علیہ السلام نے ایک شخص کی فریاد سنی جو کہہ رہا تھا کہ میں مظلوم ہو گیا ہوں۔ آپ نے اس سے فرمایا: **هَلُمَّ فَلْنَصْرُخْ مَعًا فَاِنِّيْ مَا زِلْتُ مَظْلُوْمًا** آؤ ہم دونوں مل کر فریاد کریں کیونکہ میں تو ہمیشہ مظلوم رہا ہوں۔

آ عندلیب مل کر کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

رحلت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت علی علیہ السلام کی مظلومیت اور صبر کا اندازہ **خطبہ شقشقیہ** سے لگایا جا سکتا ہے جس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے تا کہ آپ خود امام کی زبانی ان کے صبر کی داستان سن سکیں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

خدا کی قسم! فرزند ابو قحافہ نے پیراہن خلافت پہن لیا حالانکہ وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرا خلافت میں وہی مقام ہے جو چکی کے اندر اس کی کیلی کا ہوتا ہے۔ میں وہ (کوہِ بلند ہوں) جس پر سے سیلاب کا پانی گزر کر نیچے گر جاتا ہے اور مجھ تک پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ (اس کے باوجود) میں نے خلافت کے آگے پردہ لٹکا دیا اور اس سے پہلو تہی کر لی اور سوچنا شروع کیا کہ اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں سے حملہ کروں یا اس سے بھیانک تیرگی پر صبر کر لوں جس میں سن رسیدہ بالکل ضعیف اور بچہ بوڑھا ہو جاتا ہے اور مومن اس صورتحال میں جدوجہد کرتا ہوا اپنے پروردگار کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

مجھے اس اندھیر پر صبر ہی قرین عقل نظر آیا لہٰذا میں نے صبر کیا حالانکہ آنکھوں میں (غبار اندوہ کی) خلش تھی اور حلق میں (رنج و غم کے) پھندے لگے ہوئے تھے۔ میں اپنی میراث کو لٹتے دیکھ رہا تھا یہاں تک کہ پہلے نے اپنی راہ لی اور اپنے بعد خلافت ابن خطاب کو دے گیا۔ پھر حضرت نے بطور تمثیل اعشیٰ ہمدانی کا یہ شعر پڑھا:

کہاں وہ دن جو گزرتا تھا میرا اونٹوں پر
کہاں یہ دن کہ میں حیان کے جوار میں ہوں

تعجب ہے کہ وہ زندگی میں تو خلافت سے سبکدوش ہونا چاہتا تھا لیکن اپنے مرنے کے بعد اس

کی بنیاد دوسرے کے لیے استوار کرتا گیا۔ بے شک ان دونوں نے سختی کی ساتھ خلافت کے تھنوں کو آپس میں بانٹ لیا، اس نے خلافت کو ایک سخت و درشت محل میں رکھ دیا، جس کے چرکے کاری تھے، جس کو چھو کر بھی درشتی محسوس ہوتی تھی، جہاں بات بات پر ٹھوکر کھانا اور پھر عذر کرنا تھا۔ جس کا اس سے سابقہ پڑے وہ ایسا ہے جیسے سرکش اونٹنی کا سوار کہ اگر مہار کھینچتا ہے تو (اس کی منہ زوری سے) اس کے ناک کا درمیانی حصہ ہی شگافتہ ہوا جاتا ہے (جس کے بعد مہار دینا ہی ناممکن ہو جائے گا) اور اگر باگ کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے تو وہ اس کے ساتھ مہلکوں میں پڑ جائے گا۔ اس کی وجہ سے بقائے ایزد کی قسم! لوگ کجروی، سرکشی، متلون مزاجی اور بے راہ روی میں مبتلا ہو گئے۔ میں نے اس طویل مدت اور شدید مصیبت پر صبر کیا یہاں تک کہ دوسرا بھی اپنی راہ لگا اور خلافت کو ایک جماعت میں محدود کر گیا اور مجھے بھی اس جماعت کا ایک فرد خیال کیا۔ اے اللہ! مجھے اس شوریٰ سے کیا لگاؤ؟ ان میں کے سب سے پہلے کے مقابلہ ہی میں میرے استحقاق وفضیلت میں کب شک تھا جو اب ان لوگوں میں میں بھی شامل کر لیا گیا ہوں مگر میں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جب وہ زمین کے نزدیک ہو کر پرواز کرنے لگیں تو میں بھی ایسا ہی کرنے لگوں اور جب وہ اونچے ہو کر اڑنے لگیں تو میں بھی اسی طرح پرواز کروں (یعنی حتی الامکان کسی نہ کسی صورت سے نباہ کرتا رہوں)۔ ان میں سے ایک شخص تو کینہ وعناد کی وجہ سے مجھ سے منحرف ہو گیا اور دوسرا دامادی اور بعض ناگفتہ بہ باتوں کی وجہ سے ادھر جھک گیا یہاں تک کہ اس قوم کا تیسرا شخص پیٹ پھلائے، سرگین اور چارے کے درمیان کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ اس کے بھائی بند اٹھ کھڑے ہوئے۔ جو اللہ کے مال کو اس طرح نگلتے تھے جس طرح اونٹ فصل ربیع کا چارہ چرتا ہے یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا جب اس کی بٹی ہوئی رسی کے بل کھل گئے اور اس کی بداعمالیوں نے اس کا کام تمام کر دیا اور شکم پُری نے اسے منہ کے بل گرا دیا۔

اس وقت مجھے لوگوں کے ہجوم نے دہشت زدہ کر دیا جو میری جانب بجو کے ایال کی طرح ہر طرف سے لگاتار بڑھ رہا تھا یہاں تک کہ عالم یہ ہوا کہ حسنؑ و حسینؑ کچلے جا رہے تھے اور میری ردا کے دونوں کنارے پھٹ گئے تھے وہ سب میرے گرد بکریوں کے گلے کی طرح گھیرا ڈالے ہوئے تھے مگر اس کے باوجود جب میں امر خلافت کو لے کر اٹھا تو ایک گروہ نے بیعت توڑ ڈالی اور دوسرا دین سے نکل گیا اور تیسرے گروہ نے فسق اختیار کر لیا گویا انھوں نے اللہ کا یہ ارشاد سنا ہی نہ تھا کہ "آخرت کا گھر ہم نے ان لوگوں کے لیے قرار دیا ہے جو دنیا میں نہ (بیجا) بلندی چاہتے ہیں نہ فساد پھیلاتے ہیں اور اچھا

انجام پرہیز گاروں کے لیے ہے۔" ہاں ہاں خدا کی قسم! ان لوگوں نے اس آیت کو سنا تھا اور یاد کیا تھا لیکن ان کی نگاہوں میں دنیا کا جمال کھب گیا اور اس کی سج دھج نے انھیں لبھا دیا۔

اس ذات کی قسم! جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور ذی روح چیزوں کو پیدا کیا۔ اگر بیعت کرنے والوں کی موجودگی اور مدد کرنے والوں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہوگئی ہوتی اور وہ عہد نہ ہوتا جو اللہ نے علماء سے لے رکھا ہے کہ وہ ظالم کی شکم پُری اور مظلوم کی گرسنگی پر سکون و قرار سے نہ بیٹھیں گے تو میں خلافت کی باگ ڈور اسی کے کندھے پر ڈال دیتا اور اس کے آخر کو اسی پیالے سے سیراب کرتا جس پیالے سے اس کے اول کو سیراب کیا تھا اور تم اپنی دنیا کو میری نظروں میں بکری کی رینٹ سے بھی زیادہ ناقابل اعتنا پاتے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۳)

حضرت علی علیہ السلام نے اس خطبہ میں اپنے غم دل اور صبر و تحمل کی مختصر روداد بیان فرمائی ہے جو آپ کی مظلومیت کی ایک داستان ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اس طرح کی مظلومیت کے عالم میں صبر کرنا کس قدر دشوار ہوتا ہے؟ اس سے زیادہ مظلومیت اور کیا ہوگی کہ حضرت علی علیہ السلام جو اوصاف حمیدہ کی معراج پر تھے انھیں سعد بن ابی وقاص اور معاویہ بن ابی سفیان جیسے لوگوں کی صف میں لا کھڑا کر دیا گیا اور یہ منطق لحاظ سے اضداد کو جمع کرنے کے مترادف ہے جو کہ غلط ہے۔ چنانچہ خود حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ زمانے نے مجھے اتنا گرایا کہ معاویہ بھی خود کو مجھ جیسا سمجھنے لگا۔

اس ناخوشگوار صورتحال کو حضرت علی علیہ السلام نے صرف دین کی خاطر برداشت کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ضربت لگنے کے بعد آپ نے فرمایا تھا: فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہوگیا۔

# (۶) حضرت علی علیہ السلام کی سخاوت

سخاوت کی بنیاد فطری شرافت پر ہے۔ یہ معاشرے میں محبت کے فروغ کی ضامن ہے۔ سخی اور دریا دل آدمی چاہے کتنے ہی عیب رکھتا ہو لوگ اس سے محبت کرتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام محتاجوں، بیکسوں اور ناداروں کی آرزوؤں کا ملجا و ماویٰ تھے۔ ہر محتاج حضرت علی علیہ السلام کے پاس اپنی حاجت لے کر آتا اور آپ اپنی شرافت و نجابت کی بنا پر کبھی گوارا نہ کرتے کہ کسی سائل کی عزت نفس مجروح ہو۔

ایک دفعہ حارث ہمدانی نے حضرت علی علیہ السلام سے کچھ مانگا تو آپ نے فرمایا:

کیا تم نے مجھے کچھ دینے کے لائق سمجھا ہے؟

حارث نے کہا: جی ہاں یا امیرالمومنینؑ!

آپ نے فوراً چراغ بجھا دیا اور فرمایا: میں نے یہ کام اس لیے کیا ہے تاکہ تمھیں اپنی حاجت بیان کرنے میں شرم محسوس نہ ہو۔

ایک دن ایک حاجت مند حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں آیا اور کچھ رقم کا سوال کیا۔ آپ نے اپنے غلام سے فرمایا: اسے ایک ہزار دینار دے دو۔

غلام نے پوچھا: مولا! چاندی کے یا سونے کے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: میرے لیے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ جو یہ مانگتا ہے وہی دیدو۔

معاویہ نے ایک دفعہ کسی شخص سے پوچھا: کہاں سے آرہے ہو؟ اس نے خوشامدانہ انداز میں کہا کہ بخیل ترین شخص علیؑ کے پاس سے۔

معاویہ نے کہا: وائے ہو تجھ پر! علیؑ سے زیادہ سخی تو کوئی ہے ہی نہیں۔ اگر علیؑ کے پاس ایک طرف سونے کا ڈھیر لگا ہو اور دوسری طرف خشک گھاس کا، تو وہ خشک گھاس سے پہلے سونے کا ڈھیر

لوگوں میں تقسیم کردیں گے۔

حضرت علی علیہ السلام نے کبھی کسی سوالی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹایا۔ آپ فرماتے تھے: جب میں محسوس کرتا ہوں کہ کوئی شخص مجھ سے کچھ مانگنا چاہتا ہے تو میں اس کے مانگنے سے پہلے ہی اس کی حاجت پوری کردیتا ہوں کیونکہ حقیقی سخاوت یہی ہے کہ مانگنے سے پہلے دے دیا جائے۔

حضرت علی علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ حاجت مند اپنی حاجت کاغذ پر لکھ دیا کریں تاکہ ان کی عزت نفس مجروح نہ ہوں۔ حضرت علی علیہ السلام کے پاس ایک دن چار درہم تھے۔ آپ نے ایک درہم رات میں، دوسرا دن میں، تیسرا علانیہ اور چوتھا پوشیدہ طور پر راہ خدا میں دیدیا۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ جولوگ اپنا مال رات اور دن میں چھپا کر اور آشکارا طور پر انفاق کرتے ہیں ان کا اجر اللہ کے پاس ہے اور ان کے لیے کوئی خوف اور غم نہیں ہے۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۷۴) اس آیت کی شان نزول میں تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ (کشف الغمہ ص ۹۳۔ ینابیع المودۃ ص ۹۲، مناقب ابن مغازلی ص ۲۸۰)

قتل عثمان کے بعد جب حضرت علی علیہ السلام مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے تو ایک اعرابی نے آپ کی خدمت میں آکر عرض کی:

مولا! میں تین بیماریوں میں مبتلا ہوں۔ نفس کی بیماری، جہالت کی بیماری اور غربت کی بیماری۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: بیماری کے علاج کے لیے طبیب، جہالت کے علاج کے لیے عالم اور غربت کے علاج کے لیے غنی سے رجوع کرو۔

اعرابی نے عرض کی: مولا! طبیب بھی آپ ہیں، عالم بھی اور غنی بھی آپ ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے حکم دیا کہ بیت المال سے اسے تین ہزار درہم دیئے جائیں۔ پھر فرمایا: ایک ہزار درہم بیماری کے علاج کے لیے ہیں، ایک ہزار غربت دور کرنے کے لیے اور ایک ہزار جہالت کے علاج کے لیے ہیں۔ (جامع الاخبار ص ۱۶۲)

تمام شیعہ اور سنی علماء اور مفسرین لکھتے ہیں کہ ایک دن حضرت علی علیہ السلام مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ رکوع میں پہنچے تو ایک سائل سوال کرتا ہوا آپ کے نزدیک آیا۔ آپ نے اشارے سے اپنی انگوٹھی اسے عطا فرمائی۔ سائل جب انگوٹھی لے کر باہر نکل رہا تھا تو اس کی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ سے ملاقات ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے اس سے پوچھا یہ انگوٹھی تمھیں کس نے دی ہے؟ سائل نے حضرت علی

کی طرف اشارہ کر کے کہا: اس شخص نے جو حالت رکوع میں ہے۔ عین اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی: إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ وَرَسُولُهُ..(سورۂ مائدہ : آیت ۵۵) یہ آیت، آیت ولایت کہلاتی ہے اور اس میں انگوٹھی عطا کرنے کا بھی ذکر آیا ہے۔ (مناقب ابن مغازلی ص ۳۱۳۔ کفایۃ الطالب ص ۲۵۰)

حضرت علی علیہ السلام صرف مال کی عطا پر ہی اکتفا نہیں فرماتے تھے بلکہ اپنی جان تک راہ حق میں قربان کرنے کے لیے آمادہ رہتے تھے۔ شب ہجرت آپ اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے موت کے بستر پر سو گئے۔ ایثار کا حقیقی معنی بھی یہی ہے جس تک حضرت علی علیہ السلام کے سوا کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

ایثار اپنے نفس پر دوسروں کو مقدم جاننا ہے اور جب تک کسی کا نفس مکمل طور پر اس کے اختیار میں نہ ہو وہ اپنا مال اور اپنی جان دوسروں کے حوالے نہیں کر سکتا۔ یہ صفت ایک ایسا اخلاقِ حسن اور ملکوتی کمال ہے جو ہر انسان میں پیدا نہیں ہوتا۔

ایک دن حضرت علی علیہ السلام محنت مزدوری سے کچھ رقم کما کر گھر جا رہے تھے تاکہ بال بچوں کے لیے کھانے کا انتظام کریں کہ راستے میں ایک سائل مل گیا۔ اس نے اپنی حاجت بیان کی تو آپ نے اپنی ساری کمائی اسے دیدی اور خود خالی ہاتھ گھر آ گئے۔

ایک دن حضرت علی علیہ السلام اپنے غلام قنبر کے ساتھ بازار گئے اور دو پوشاکیں خریدیں۔ ایک مہنگی اور دوسری سستی۔ مہنگی پوشاک آپ نے قنبر کو دیدی اور سستی خود رکھ لی۔

محدثین، مؤرخین اور مفسرین نے سورۂ دہر کی تفسیر میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ لکھا ہے: ایک مرتبہ حسنین کریمینؑ بیمار ہو گئے تو حضرت علی علیہ السلام اور حضرت فاطمہؑ بلکہ خود حسنین کریمینؑ نے بھی منت مانی کہ صحت یاب ہو کر شکرانے کے طور پر تین روزے رکھیں گے۔ گھر کی خادمہ حضرت فضہؓ نے بھی ان کی پیروی میں منت مان لی۔ جب اللہ نے حسنین کریمینؑ کو صحت دی تو انھوں نے اپنی منت پوری کرنے کے لیے روزے رکھنے شروع کیے۔ حضرت علی علیہ السلام اپنے یہودی ہمسایہ ''شمعون'' سے تین صاع جَو قرض لے کر آئے اور حضرت زہراؑ نے جَو کے تین حصے کیے اور ایک حصے کو پیس کر پانچ روٹیاں بنائیں۔ افطار کے وقت دروازے پر کسی سائل نے آواز دی اے اہلبیت رسولؐ! میں مسکین ہوں اور بھوکا بھی ہوں مجھے کھانا کھلاؤ۔ اللہ تمھیں بہشتی کھانے دے۔ اہلبیت رسولؐ نے پانچوں روٹیاں اس مسکین کو دے دیں اور پانی سے روزہ افطار کیا۔

اگلے دن حضرت فاطمہؑ نے جَو کے دوسرے حصے سے پانچ روٹیاں پکائیں۔ افطار کا وقت ہوا تو

ایک یتیم نے صدا دی کہ میں بھوکا ہوں چنانچہ اہلبیتؑ نے اپنی روٹیاں اس کو دے دیں اور پانی سے افطار کیا۔ تیسرے دن بھی حضرت زہراؑ نے پانچ روٹیاں پکائیں مگر اس دن بھی ایک قیدی در اہلبیتؑ پر آیا اور روٹی کا سوال کیا۔ اہلبیتؑ نے روٹیاں اٹھا کر اسے دے دیں اور پانی سے روزہ افطار کیا۔ بقول میرؔ

دے صدا اے دل نقش قدم کو دیکھ کر
ایسے بھی در ہیں جن پہ کبھی کوئی سائل نہ تھا

چوتھے دن شدید نقاہت کی وجہ سے حسنین کریمینؑ کے جسم مبارک پر رعشہ طاری تھا۔ رسول خداؐ نے جب ان کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا: خدا کی پناہ! تم تین دن سے بھوکے روزے رکھ رہے ہو... اسی وقت جبریلؑ اہلبیتؑ کی شان میں سورۂ ہل اتیٰ لے کر نازل ہوئے **وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ○** یہ اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔ (سورۂ دہر: آیت ۸) جبریل امینؑ نے بہشت میں ان کے مقام اور درجات سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آگاہ فرمایا۔

اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیات میں ان کے بے ریا اور اخلاص بھرے عمل کو سراہتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **إِنَّ هَٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا** یہ (جنت) تمہاری جزا ہے اور تمہارا عمل قابل قدر ہے۔ (سورۂ دہر: آیت ۲۲)

(شواہد التنزیل ج ۲، ص ۳۰۰۔ شیخ صدوق، امالی، مجلس ۴۴، ح ۱۱۔ کشف الغمہ ص ۸۸)

# (۷) حضرت علی علیہ السلام کی فصاحت و بلاغت

علم منطق کی رو سے نطق انسان کو دوسرے حیوانات سے ممیز کرتا ہے اور خدا نے اپنی حکمت بالغہ سے اسے انسان کے امتیاز کا ذریعہ قرار دیا ہے چنانچہ فرماتا ہے: خَلَقَ الْاِنْسَانَ ○ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ○ اس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔ (سورۂ رحمٰن : آیت ۳۔۴)

نفس کا جوہر جو آدمی کی حقیقت ہے اس کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ بقول سعدی

تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

آدمی جب تک بولتا نہیں اس کی خوبیاں اور خامیاں چھپی رہتی ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: اَلْمَرْءُ مَخْبُوْءٌ تَحْتَ لِسَانِهٖ انسان اپنی زبان کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ اس کا کلام جتنا دل نواز ہوگا اتنا ہی سننے والے کے دل پر اثر کرے گا۔

دور جاہلیت میں عرب میں امراء القیس جیسے فصحاء موجود تھے جو سحر انگیز اشعار کہتے تھے لیکن حضرت علی علیہ السلام کے کلام کی فصاحت نے تمام فصحائے عرب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا اور سب نے آپ کے کلام کے مقابلے میں اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کو ''امیر سخن'' کا لقب دیا۔[۱]

ابن ابی الحدید کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام صاحبان فصاحت کے پیشوا اور صاحبان بلاغت کے استاد ہیں۔ آپ کے کلام کے بارے میں کہا گیا ہے کہ خالق کے کلام سے کم تر اور مخلوق کے کلام سے برتر ہے۔ تمام صاحبان فصاحت نے خطابت و تقریر کا فن امام کے کلام اور خطبات سے سیکھا ہے۔ وہ مزید

---

۱۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

معلوم ہونا چاہیے کہ زبان انسان کے بدن کا ایک ٹکڑا ہے۔ جب انسان کا ذہن رک جائے تو پھر کلام اس کا ساتھ نہیں دیتا اور جب اس کی معلومات وسیع ہوں تو پھر کلام زبان کو رکنے کا موقع نہیں دیتا۔ ہم ''امیر سخن'' ہیں۔ سخنوری ہماری رگوں میں سمائی ہوئی ہے اور اس کی شاخیں ہمارے سروں پر سایہ فگن ہیں۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۲۳۰) رضوانی

کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کی بے مثال فصاحت و بلاغت کا ثبوت نہج البلاغہ ہے جس کی شرح میں لکھ رہا ہوں کیونکہ صحابہ کرام میں سے کوئی بھی حضرت علی علیہ السلام کے کلام کی فصاحت کے عشر عشیر بھی نہ تھا۔

(ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۱۲)

ایک اور مقام پر موصوف لکھتے ہیں:

حیرت ہے کہ کوئی مکہ میں پیدا ہو، اسی شہر میں پلا بڑھا ہو اور کسی دانشور، ادیب اور عالم کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کئے بغیر فن خطابت میں ایسا کمال رکھتا ہو کہ الفاظ اس طرح اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں کہ وہ جس لفظ کو چاہتا ہے، فصیح انداز میں بیان کرتا ہے۔

علامہ سید ہبۃ الدین شہرستانی اپنی کتاب **مَاھُوَ نَھجُ الْبَلَاغَہ؟** میں لکھتے ہیں:

ایک شخص نے عیسائی دانشور امین نخلہ سے تقاضا کیا کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کے ایک سو (۱۰۰) اقوال منتخب کرکے اسے دے تاکہ وہ ان کو اپنی کتاب میں شائع کرے۔ امین نخلہ نے اسے لکھا:

تم نے مجھ سے عرب کی بلیغ ترین شخصیت کے ایک سو کلمات منتخب کرنے کی فرمائش کی ہے تاکہ اسے اپنی کتاب میں چھاپ سکو۔ میرے پاس حضرت علی علیہ السلام کا سارا کلام موجود نہیں ہے البتہ ان کے کلام کا ایک مجموعہ نہج البلاغہ ہے۔ اسے دیکھتا ہوں۔

وہ دانشور کہتا ہے کہ جب میں نے نہج البلاغہ کو پڑھنا شروع کیا تو خدا کی قسم! میں نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ حضرت علی علیہ السلام کے ان سینکڑوں اقوال میں سے کس طرح سو اقوال منتخب کروں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس فصیح کلام کے ایک جملے کو دوسرے سے کس طرح علیحدہ کروں کیونکہ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک یاقوت کے دانے کو چھوڑوں اور دوسرے یاقوت کے دانے کو اٹھا لوں وہ بھی اس حالت میں کہ میرے سامنے چمکتے یاقوت کا ڈھیر لگا ہوا ہو اور ان کی چمک نے مجھے خیرہ کردیا ہو۔ تمھیں یقین نہیں آئے گا کہ میں نے معدن بلاغت میں سے کتنی مشکل سے ایک ایک قول کا انتخاب کیا ہے۔ تم یہ سو کلمات مجھ سے لے لو اور اس بات کو یاد رکھو کہ یہ سو اقوال نور بلاغت کا پرتو اور چمن فصاحت کے مہکتے پھول ہیں۔

یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ خدا نے حضرت علی علیہ السلام کے کلام کے ذریعے عربی معاشرے اور عربی زبان و ادب پر جن نعمتوں کی بارش کی ہے وہ ان سو کلمات سے ہزار گنا زیادہ ہیں۔

(نہج البلاغہ چیست از مؤلف ص ۲۸)

علامہ شہرستانی ایک اور کتاب میں لکھتے ہیں :

علی گڑھ یونیورسٹی ہندوستان میں عربی ادبیات کے انگریز لیکچرار مسٹر گرینکوی سے جب اعجاز قرآن کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے وہاں موجود استادوں اور ادیبوں کے سامنے کہا تھا : قرآن کا ایک چھوٹا بھائی بھی ہے جس کا نام نہج البلاغہ ہے۔ کیا کسی کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس ''چھوٹے بھائی'' کی مثال پیش کرسکے ؟ اگر ایسا ممکن ہوجائے تب ہمارے لیے اس کے بڑے بھائی (قرآن) کے بارے میں بحث اور اس کی مثال پیش کرنا ممکن ہوسکتا ہے۔ (نہج البلاغہ چیست از مؤلف ص ۶)

حضرت علی علیہ السلام اپنی گفتگو میں فصاحت اور بلاغت کے قواعد کے پابند نہ تھے بلکہ آپ کے کلام کی مٹھاس اور گہرائی سے ان قواعد نے جنم لیا۔ اس لیے فصاحت کے قواعد کو کلام امام سے استخراج کیا جانا چاہیے نہ کہ امام کے کلام کو فصاحت کے قواعد وضوابط پر پرکھا جائے۔

امام علی علیہ السلام کا کلام حقیقت و واقعیت کا ترجمان ہے۔ امام کے تمام اجزائے کلام متناسب بھی ہیں اور ایک دوسرے سے متصل بھی۔ جمال صورت اور کمال معنی باہم مربوط ہیں۔ اس کے دلائل محکم اور اس کی منطق لاجواب ہے۔

معاویہ کہتا تھا کہ قریش میں علیؑ کے سوا کسی اور نے فصاحت و بلاغت کا باب نہیں کھولا۔ علیؑ کے سوا کسی اور نے قانون سخن کی تعلیم نہیں دی۔ عرب کے نامی گرامی ادیبوں نے اقرار کیا ہے کہ عدالتی فیصلے اور فرمان نویسی کا طریقہ آپ کے خطبات ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔

قوت فکر اور فراست، بلاغت کا لازمہ ہے تاکہ خطیب معانی کی باریکیوں تک رسائی حاصل کرسکے۔ حضرت علی علیہ السلام قوت ادراک اور ذہانت و فطانت میں بے مثال تھے۔ جب آپ کسی پیچیدہ موضوع پر لب کشائی کرتے تو اس کی تمام باریکیوں کو اپنے فروغ فکر سے روشن کردیتے۔

آپ کے کلام میں جملوں کے درمیان منطقی تسلسل موجود ہے۔ جو بات بھی آپ کہنا چاہتے اسے نہایت عمدہ پیرائے میں بیان فرماتے۔ اس کے بیان میں آپ کو کوئی دشواری نہ ہوتی۔

ابن شہر آشوب لکھتے ہیں :

ایک دن اصحاب رسولؐ نے مسجد میں محفل علم و ادب سجائی ہوئی تھی۔ دوران گفتگو کسی نے کہا کہ اکثر کلام میں الف کا حرف ضرور ہوتا ہے اور ایسا کلام شاذ ہی ہوتا ہے جس میں الف نہ ہو۔ حضرت علیؑ بھی اس محفل میں موجود تھے۔ جب آپ نے یہ بات سنی تو فوراً اٹھ کر ایک فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا

جس میں بغیر الف کے تقریباً سات سو الفاظ تھے۔

اسی طرح ادبی صنعتوں میں سے صنعت غیر منقوط ہے۔ اسے بے نقطہ بھی کہتے ہیں۔ یہ بڑی مشکل صنعت ہے جس میں بہت کم شعراء اور ادیب پوری طرح کامیاب ہوتے ہیں۔ امام علی علیہ السلام نے بھی ایک بے نقطہ خطبہ ارشاد فرمایا ہے جو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْمَلِکِ الْمَحْمُوْدِ وَ الْمَالِکِ الْوَدُوْدِ وَمُصَوِّرِ کُلِّ مَوْلُوْدٍ سے شروع ہوتا ہے اور اَلْحَمْدُ السَّرْمَدُ وَالْمَدْحُ لِرَسُوْلِہٖ اَحْمَدَ پر ختم ہوتا ہے۔

ایک شخص نے حضرت علی علیہ السلام سے پوچھا: واجب کیا ہے اور واجب تر کیا ہے؟ عجیب کیا ہے اور عجیب تر کیا ہے؟ مشکل کیا ہے اور مشکل تر کیا ہے؟ نزدیک کیا ہے اور نزدیک تر کیا ہے؟

حضرت علی علیہ السلام نے اسے فوراً منظوم جواب دیا:

وَجَبَ عَلَی النَّاسِ اَنْ یَّتُوْبُوْا — لٰکِنَّ تَرْکَ الذُّنُوْبِ اَوْجَبُ

وَ الدَّهْرُ فِیْ صَرْفِهٖ عَجِیْبٌ — وَ غَفْلَةُ النَّاسِ فِیْهِ اَعْجَبُ

وَالصَّبْرُ فِی النَّائِبَاتِ صَعْبٌ — لٰکِنَّ فَوْتَ الثَّوَابِ اَصْعَبُ

وَ کُلُّ مَا یُرْتَجٰی قَرِیْبٌ — وَالْمَوْتُ مِنْ کُلِّ ذَاكَ اَقْرَبُ

واجب یہ ہے کہ گناہوں سے توبہ کی جائے مگر گناہوں کا ترک کرنا واجب تر ہے۔ زمانے کی گردش عجیب ہے اور لوگوں کی غفلت عجیب تر ہے۔ مصیبت پر صبر کرنا مشکل ہے مگر صبر کا ثواب کھو دینا اس سے بھی مشکل تر ہے۔ ہر وہ چیز جس کی آرزو کی جائے قریب ہے اور موت ہر چیز سے قریب تر ہے۔

(دیوان منسوب بہ حضرت علیؑ)

ظاہر ہے کہ جو فی البدیہہ ایسا جواب دے یا فوراً ایسا خطبہ دے جس کے تمام الفاظ میں الف نہ ہو یا نقطہ نہ ہو اسے فصاحت و بلاغت میں کس قدر کمال اور ادبیات عرب پر کتنا عبور حاصل ہوگا اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

بہرحال ہم اس کتاب کے آخر میں تبرکاً حضرت علی علیہ السلام کے کلام گہربار سے چند اقتباسات پیش کریں گے۔

# (۸) حضرت علی علیہ السلام کی خوراک اور پوشاک

اگر حضرت علی علیہ السلام کا خوراک اور پوشاک میں دوسروں کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو کوئی بھی ایسا شخص نہیں ملے گا جو اس معاملے میں آپ کی برابری کر سکے۔ آپ کی غذا نہایت سادہ اور کم تھی اور دور خلافت میں معمول کی یہ غذا آپ نے مزید کم کردی تھی۔

حضرت علی علیہ السلام کبھی دو غذائیں ایک ساتھ تناول نہیں فرماتے تھے۔ شب ضربت آپ کی صاحبزادی جناب امّ کلثوم نے افطار کے وقت آپ کی خدمت میں روٹی، دودھ اور نمک پیش کیا تو آپ نے فرمایا: بیٹی! کیا تمھیں معلوم نہیں کہ تمہارے باپ نے آج تک دو غذائیں ایک ساتھ استعمال نہیں کیں۔ دودھ اٹھالو اور یہ روٹی و نمک رہنے دو۔[۱]

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: خدا کی قسم! حضرت علی علیہ السلام غلاموں کی طرح زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ دو جوڑے خریدتے اور عمدہ جوڑا اپنے غلام کو دیدیتے اور دوسرا والا خود زیب تن فرماتے۔ اگر اس لباس کی آستینیں یا دامن لمبا ہوتا تو اسے کاٹ ڈالتے۔ پانچ سالہ دور خلافت میں نہ تو آپ نے گھر کی تعمیر میں ایک اینٹ لگائی نہ ہی سونا چاندی جمع کیا۔ لوگوں کو گندم کی روٹی اور گوشت کھلاتے مگر خود سرکہ کے ساتھ جَو کی روٹی تناول فرماتے۔ جب کبھی خدا کے پسندیدہ دو کام سامنے آتے تو مشکل کام کا انتخاب کرتے۔ انھوں نے اپنی محنت کی کمائی سے ایک ہزار غلاموں کو آزاد کیا۔ محنت کی وجہ سے آپ کے ہاتھ خاک آلود رہتے اور آپ کا چہرہ پسینے سے بھیگ جاتا۔ (امالی صدوق، مجلس ۴۷، ح ۱۴)

---

۱۔ وفی البحار: عَنْ لُوطِ بْنِ يَحْيَى عَنْ أَشْيَاخِهِ وَأَسْلَافِهِ فی حدیث طویل فی کیفیۃ شہادۃ علی علیہ السلام الی ان قال لابنتہ ام کلثوم علیہا السلام - أَتَأُرِيدُ أَنْ أَتَّبِعَ أَخِي وَابْنَ عَمِّي رَسُولَ اللّٰهِ (ص) مَا قُدِّمَ إِلَيْهِ إِدَامَانِ فِي طَبَقٍ وَاحِدٍ إِلَى أَنْ قَبَضَهُ اللّٰهُ بحار الانوار میں حضرت علی علیہ السلام کی شہادت سے متعلق ایک طویل حدیث میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی بیٹی جناب ام کلثوم سے فرمایا تھا: میں اپنے بھائی اور ابن عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایک طباق میں دو "سالن" کبھی نہیں لائے گئے یہاں تک کہ وہ رحلت فرماگئے۔

(سنن النبیؐ از علامہ سید محمد حسین طباطبائی) رضوانی

ابن جوزی لکھتے ہیں : ایک دن عبد اللہ بن رزین حضرت علی علیہ السلام کے دولت کدہ پر حاضر ہوا۔ اس نے دیکھا کہ آپ تھوڑا سا گوشت اور جَو کا آٹا ابال رہے ہیں۔ عبد اللہ نے کہا : یا امیرالمومنینؑ ! یہ آپ کیسی غذا کھاتے ہیں ؟ آپ خلیفۃ المسلمین ہیں ، بیت المال آپ کے اختیار میں ہے اور آپ کو اجازت حاصل ہے کہ آپ حسب ضرورت اچھی اور طاقت بخش غذا کھائیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا : مسلمانوں کے حاکم کے لیے اس سے زیادہ لینا جائز نہیں۔

عبد اللہ بن رافع کہتے ہیں : عید کے دن میں حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ امام نے ایک مہر شدہ چرمی تھیلا منگوایا جس میں جَو کی خشک روٹی تھی۔ امام نے اسے نکال کر تناول فرمایا۔ میں نے عرض کی : یا امیرالمومنینؑ ! کیا آپ نے اس تھیلے پر اس لیے مہر لگا دی ہے کہ کوئی اسے نکال نہ سکے ؟ آپ نے فرمایا : نہیں ! خِفْتُ هٰذَيْنِ الْوَلَدَيْنِ اَنْ يُلِيْتَا بِسَمْنٍ اَوْ زَيْتٍ میں نے اس خیال سے اسے مہر بند کیا ہے کہ مبادا حسنؑ ، حسینؑ اس میں گھی یا تیل نہ ملا دیں۔

حضرت علی علیہ السلام کھانے میں اکثر جَو کی روٹی کے ساتھ سرکہ یا نمک (ملا پانی) اور کبھی کبھی ترکاری یا تھوڑا سا دودھ استعمال فرماتے تھے۔ گوشت بہت کم کھاتے۔ آپ فرماتے : لَا تَجْعَلُوْا بُطُوْنَكُمْ مَقَابِرَ الْحَيَوَانِ اپنے پیٹ کو جانوروں کا قبرستان مت بناؤ۔ (ینابیع المودۃ ، باب ۵۱ ، ص ۱۵۰۔ بحار الانوار ج ۴۱ ، ص ۱۴۸)

**ذخیرۃ الملوک** میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام مسجد کوفہ میں اعتکاف فرما تھے۔ افطار کے وقت ایک اعرابی آپ کے پاس آیا۔ آپ نے اپنے چرمی تھیلے سے مٹھی بھر ستو اسے دیئے۔ اس نے ستو کھانے کے بجائے اپنے عمامہ کے ایک پلّے میں باندھ دیئے اور وہاں سے حسنین کریمینؑ کے پاس آیا اور دونوں شہزادوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ اعرابی نے کہا : میں نے مسجد میں ایک بزرگ مسافر کو دیکھا ہے جس کے پاس ستو کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ مجھے اس شخص پر رحم آتا ہے۔ میں اس کھانے میں سے کچھ حصہ اس شخص کے پاس لے جانا چاہتا ہوں تاکہ وہ بھی پیٹ بھر کر کھانا کھائے۔ یہ سن کر حسنؑ و حسینؑ نے کہا : وہ ہمارے بابا امیرالمومنینؑ ہیں۔ اسی طرح وہ اپنے نفس سے جہاد کرتے ہیں۔ (ینابیع المودۃ ، باب ۵۱ ، ص ۱۴۷)

سوید بن غفلہ روایت کرتا ہے کہ میں ایک دن حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ امام کے سامنے ایک برتن میں کھٹا دودھ رکھا ہے اور جَو کی خشک روٹی جس کے آٹے میں سے چھلکے بھی نہیں نکالے گئے تھے آپ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ روٹی اتنی سخت تھی کہ آپ اسے اپنے زانوئے مبارک سے توڑ کر اس کھٹے دودھ میں ڈبو کر نرم کر کے کھا رہے ہیں۔ امام نے فرمایا : آؤ ! تم بھی

ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوجاؤ۔ میں نے عرض کی: مولا! میں روزے سے ہوں۔ امام نے فرمایا: میں نے اپنے حبیب رسول خدا ﷺ سے سنا ہے کہ جو شخص روزہ دار ہو اور دل چاہتے ہوئے بھی اللہ کی خاطر کوئی چیز نہ کھائے اللہ اسے بہشتی غذا کھلائے گا اور بہشتی مشروب پلائے گا۔

سوید کہتا ہے کہ مجھے امام کی یہ حالت دیکھ کر بے حد دکھ ہوا۔ میں نے آپ کی کنیز فضہؓ سے کہا: خدا سے ڈرو! تم نے آٹے سے چھلکے بھی نہیں نکالے؟ فضہؓ نے کہا: خدا کی قسم! ایسی بات نہیں بلکہ خود امام کا حکم ہے کہ بغیر چھلکا نکالے روٹی پکائی جائے۔ حضرت نے میری طرف دیکھ کر فرمایا: تم نے فضہؓ سے کیا کہا ہے؟ میں نے عرض کی: میں فضہؓ سے کہہ رہا تھا کہ تم آٹے سے چھان علیحدہ کیوں نہیں کرتی؟ حضرت نے فرمایا: میرے ماں باپ فدا ہوں رسول خدا ﷺ پر! آپ بھی چھان نہیں نکلواتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے کبھی تین دن مسلسل گندم کی روٹی سیر ہو کر نہیں کھائی یہاں تک کہ آپ نے دنیا سے قضا کی۔ (کشف الغمہ ص ۴۷۔ تاریخ طبری)

عدی بن حاتم طائی حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں آئے تو آپ کھانا تناول فرما رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ ایک کاسہ آب، جَو کی روٹی کے چند ٹکڑے اور تھوڑا سا نمک آپ کی خوراک ہے۔

عدی نے عرض کی: یا امیر المومنینؑ! آپ کا سارا دن مشقت میں اور ساری رات عبادت میں گزرتی ہے مگر آپ کی غذا اتنی مختصر ہے؟ حضرت نے فرمایا: سرکش نفس کو ریاضت کا عادی بنانا ضروری ہے تاکہ وہ نافرمانی نہ کرے۔ پھر امام نے یہ شعر پڑھا:

عَلِّلِ النَّفْسَ بِالْقُنُوْعِ وَ اِلَّا　　　طَلَبَتْ مِنْكَ فَوْقَ مَا يَكْفِيْهَا

اپنے نفس کو قناعت کے ذریعے قابو میں رکھو ورنہ وہ تم سے اپنے استحقاق سے بھی زیادہ طلب کرے گا۔ (بحار الانوار ج ۴۰، ص ۳۴۵)

ایک امیر آدمی نے حلوہ پکا کر تھوڑا سا حلوہ حضرت علی علیہ السلام کو بھجوایا۔ حضرت نے برتن پر پڑے ہوئے کپڑے کو ہٹا کر دیکھا تو وہ خوش رنگ اور خوشبو دار تھا۔ آپ نے فرمایا: تیرے رنگ و بو سے معلوم ہوتا ہے کہ تو خوش مزہ بھی ہوگا مگر میں اپنی زبان تیری لذت سے آشنا نہیں کرسکتا کیونکہ ممکن ہے میرے قلمرو میں کوئی ایسا شخص بھی ہو جو رات کو بھوکا ہی سو گیا ہو؟

احنف بن قیس کہتا ہے:

میں معاویہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ کھانے کا وقت ہوگیا۔ معاویہ کے لیے رنگا رنگ کھانوں سے

سجا دستر خوان چن دیا گیا کیونکہ وہ بہت پُر خور تھا۔ معاویہ کے دستر خوان کو دیکھ کر احنف رونے لگا۔ معاویہ نے پوچھا کہ تو کیوں روتا ہے؟ احنف نے کہا: مجھے علیؑ کی حالت پر رونا آتا ہے۔ ایک دن میں علیؑ کی خدمت میں حاضر تھا کہ افطار کا وقت ہوگیا۔ انھوں نے مجھے روکے رکھا تاکہ حسنینؑ کے ساتھ مل کر افطار کریں۔ جب ان کی مخصوص غذا لائی گئی تو میں نے دیکھا کہ وہ مہر شدہ تھیلا تھا۔ آپ نے مہر ہٹائی اور اس میں سے خشک روٹی کے چند ٹکڑے سرکہ میں بھگو کر کھائے۔ اس کے بعد پھر تھیلے پر مہر لگا دی اور اسے فضہؓ کے حوالے کر دیا تو میں نے کہا: آپ کے سوا کوئی یہ روٹی نہیں کھا سکتا پھر آپ نے تھیلے کو سربمہر کیوں رکھا ہے؟ انھوں نے کہا: یہ مہر بخل کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ اس خیال سے لگائی ہے کہ کہیں میرے بیٹے اس روٹی پر گھی یا تیل نہ لگا دیں۔

معاویہ نے کہا: سچ کہتے ہو۔ علیؑ جیسا کوئی نہیں ہو سکتا اور ان کی فضیلت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت علی علیہ السلام کا لباس بھی نہایت سادہ ہوتا تھا۔ آپ موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے تھے حالانکہ شام کے سوا تمام بلاد اسلامی آپ کے زیر نگیں تھے۔ آپ بلاتکلف زمین پر بیٹھ جاتے تھے اسی لیے آپ کا لقب ابوتراب پڑا۔ آپ چٹائی پر سو جاتے، اپنا جوتا خود گانٹھتے اور اپنے کام بھی خود کرتے تھے۔ آپ فرماتے تھے: خدا کی قسم! میری عبا میں اس قدر پیوند لگے ہوئے ہیں کہ مجھے رفوگر سے بھی حیا آتی ہے۔

وَاللهِ لَقَدْ رَقَعْتُ مِدْرَعَتِي هٰذِهٖ حَتّٰى اسْتَحْيَيْتُ مِنْ رَّاقِعِهَا۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵۸)

حضرت علی علیہ السلام نے والیٔ بصرہ عثمان بن حنیف کو لکھا تھا:

میں جو تمہارا امام ہوں صرف دو پرانی چادروں اور دو روٹیوں پر قناعت کرتا ہوں حالانکہ اگر میں چاہتا تو مصفّٰی شہد، عمدہ گیہوں اور ریشمی کپڑے پہن سکتا ہوں۔ میں بھی لذیذ اور مقوی غذائیں کھا سکتا ہوں مگر ایسا نہیں ہو سکتا کہ خواہشات مجھے مغلوب کر لیں۔ أَأَقْنَعُ مِنْ نَفْسِي بِأَنْ يُقَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ وَلَا أُشَارِكُهُمْ فِي مَكَارِهِ الدَّهْرِ کیا میں اسی پر قناعت کر لوں کہ مجھے امیر المومنین کہا جا رہا ہے اور میں زمانے کی سختیوں میں لوگوں کا ہمدم نہ بنوں؟ (نہج البلاغہ، مکتوب ۴۵ عثمان بن حنیف کے نام)

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: میں خوراک اور پوشاک میں ایسا ہوں کہ اگر مجھے غریب دیکھے تو اپنے فقر و فاقہ پر صبر کر سکے اس لیے کہ جب وہ اپنے امام کو اس حالت میں دیکھے گا تو اسے اپنی حالت پر قرار آ جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی میری طرح زندگی نہیں گزار سکتا تاہم رہبر اور عوام کے درمیان کچھ تو قدر مشترک ہونی چاہیے اس لیے جتنا ہو سکے میری پیروی کرو۔

# (۹) حضرت علی علیہ السلام کی انصاف پسندی

حضرت علی علیہ السلام عدل و انصاف پر اتنی سختی سے کاربند تھے کہ اپنے بیٹوں اور سیاہ فام حبشی غلاموں کو ایک آنکھ سے دیکھتے تھے۔ اپنے کارندوں اور عاملوں سے باز پرس فرماتے تھے، ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچاتے اور مظلوموں کو ان کا حق دلواتے تھے۔ فرماتے تھے:

نادار اور کمزور میری نظر میں طاقتور ہیں اور ظالم و ستمگر میرے نزدیک حقیر اور کمزور ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کی حکومت عدل و انصاف، تقویٰ، مساوات اور مواسات کی بنیادوں پر استوار تھی۔ آپ مسند قضا پر جلوہ افروز ہوکر سوائے حق کے کوئی حکم نہیں دیتے تھے، کوئی بھی چیز چاہے کتنی بھی خطرناک اور قوی کیوں نہ ہو آپ کو راہ حق سے منحرف نہیں کرسکتی تھی۔

حضرت علی علیہ السلام حقوق العباد کے حوالے سے خود کو اللہ کے سامنے جوابدہ سمجھتے تھے۔ آپ کا اہم ترین مقصد سماجی انصاف قائم کرنا تھا۔ آپ اپنے اقرباء کو بھی رعایت دینے کے روادار نہیں تھے۔ چنانچہ آپ کے سگے بھائی عقیل شدید اصرار کے باوجود بیت المال سے اپنے وظیفے میں اضافہ نہ کراسکے۔ اس معاملے کا خود حضرت علی علیہ السلام کے کلام میں بھی ذکر آیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: وَاللّٰہِ لَاَنْ اَبِیْتَ عَلٰی حَسَکِ السَّعْدَانِ مُسَھَّدًا اَوْ اُجَرَّ فِی الْاَغْلَالِ مُصَفَّدًا اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اَلْقَی اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ ظَالِمًا لِبَعْضِ الْعِبَادِ وَغَاصِبًا لِشَیْءٍ مِنَ الْحُطَامِ... خدا کی قسم! اگر مجھے سعدان کے کانٹوں پر جاگتے ہوئے رات گزارنا اور طوق و زنجیر میں مقید ہوکر گھسیٹا جانا اس سے کہیں زیادہ پسند ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے اس حالت میں ملاقات کروں کہ میں نے کسی بندے پر ظلم کیا ہو یا مال دنیا میں سے کوئی چیز غصب کی ہو، میں اپنی ذات کی خاطر کیونکر کسی پر ظلم کرسکتا ہوں جو جلد ہی فنا کی طرف پلٹنے والی اور مدتوں تک مٹی کے نیچے دبی رہنے والی ہے۔

وَاللّٰہِ لَقَدْ رَاَیْتُ عَقِیْلًا وَقَدْ اَمْلَقَ حَتّٰی اسْتَمَاحَنِیْ مِنْ بُرِّکُمْ صَاعًا... بخدا! میں نے (اپنے

بھائی) عقیل کو سخت فقر و فاقہ کی حالت میں دیکھا یہاں تک کہ وہ تمہارے (حصے کے) گیہوں میں سے ایک صاع مجھ سے مانگتے تھے اور میں نے ان کے بچوں کو بھی دیکھا جن کے بال غربت کی وجہ سے بکھرے ہوئے چہرے تیرگی مائل ہو چکے تھے گویا ان کے چہرے نیل چھڑک کر سیاہ کر دیئے گئے ہیں۔ وہ اصرار کرتے ہوئے میرے پاس آئے اور اس بات کو بار بار دہرایا میں نے ان کی باتوں کو کان دے کر سنا تو انھوں نے یہ خیال کیا کہ میں ان کے ہاتھ اپنا دین بیچ ڈالوں گا اور اپنی روش چھوڑ کر ان کی کھینچ تان پر ان کے پیچھے ہو جاؤں گا لیکن میں نے فَاَحْمَیْتُ لَهٗ حَدِیْدَةً ثُمَّ اَدْنَیْتُهَا مِنْ جِسْمِهٖ لِیَعْتَبِرَ بِهَا... ان کے لیے ایک لوہے کے ٹکڑے کو تپایا اور پھر ان کے جسم کے قریب لے گیا تا کہ عبرت حاصل کریں۔ چنانچہ وہ اس طرح چیخے جس طرح کوئی بیمار درد و کرب سے چیختا ہے اور قریب تھا کہ ان کا جسم اس داغ دینے سے جل جائے۔ پھر میں نے ان سے کہا: اے عقیل! رونے والیاں تم پر روئیں! کیا تم اس لوہے کے ٹکڑے سے چیخ اٹھے جسے ایک انسان نے ہنسی مذاق میں (بغیر جلانے کی نیت سے) تپایا ہے اور تم مجھے اس آگ کی طرف کھینچ رہے ہو جسے خدائے قہار نے اپنے غضب سے بھڑکایا ہے۔ تم تو اذیت سے چیخو اور میں جہنم کے شعلوں سے نہ چلاؤں۔

اس سے بھی عجیب تر واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص (اشعث بن قیس جو منافقین میں سے تھا) رات کے وقت شہد میں گندھا ہوا حلوہ ایک سر بند برتن میں لیے ہوئے ہمارے گھر پر آیا جس سے مجھے ایسی نفرت تھی کہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ سانپ کے تھوک یا اس کی قے میں گوندھا گیا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ کیا یہ کسی بات کا انعام ہے؟ یا زکات ہے یا صدقہ ہے جو ہم اہلبیت پر حرام ہے؟ تو اس نے کہا کہ نہ یہ ہے نہ وہ ہے بلکہ یہ تحفہ ہے تو میں نے کہا کہ تیری ماں تیرے سوگ میں روئے! کیا تو دین کی راہ سے مجھے فریب دینے کے لیے آیا ہے؟ کیا تو بہک گیا ہے؟ یا پاگل ہو گیا ہے؟ یا یونہی ہذیان بک رہا ہے؟ وَاللّٰهِ لَوْ اُعْطِیْتُ الْاَقَالِیْمَ السَّبْعَةَ بِمَا تَحْتَ اَفْلَاكِهَا عَلٰٓى اَنْ اَعْصِیَ اللّٰهَ فِیْ نَمْلَةٍ اَسْلُبُهَا جِلْبَ شَعِیْرَةٍ مَا فَعَلْتُهٗ... خدا کی قسم! اگر ہفت اقلیم ان چیزوں سمیت جو آسمانوں کے نیچے ہیں مجھے دے دیئے جائیں کہ صرف اللہ کی اتنی معصیت کروں کہ میں چیونٹی سے جَو کا ایک چھلکا چھین لوں تو کبھی بھی ایسا نہ کروں گا۔ یہ دنیا تو میرے نزدیک اس پتی سے بھی زیادہ بے قدر ہے جو ٹڈی کے منہ میں ہو کہ جسے وہ چبا رہی ہو۔ علیؑ کو فنا ہونے والی نعمتوں اور مٹ جانے والی لذتوں سے کیا واسطہ!

(نہج البلاغہ، خطبہ ۲۲۱)

عبد اللہ بن ابی رافع خلافت علیؑ میں بیت المال کا نگران تھا۔ اس نے عید کے موقع پر تھوڑی دیر کے لیے بیت المال سے ایک ہار بنت علیؑ کو عاریتاً دیا۔ جب حضرت کی نظر اس ہار پر پڑی تو آپ نے بلند آواز میں پوچھا: بیٹی! تم نے یہ ہار کہاں سے لیا ہے؟ اس نے لرزتے ہوئے کہا: ابن ابی رافع سے عاریتاً لیا ہے۔

حضرت نے فوراً عبداللہ کو طلب کیا اور پوچھا کہ تم نے مسلمانوں کے بیت المال میں خیانت کیوں کی؟ عبداللہ نے عرض کی: یا امیرالمومنینؑ! میں اس بات سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے ساتھ خیانت کروں؟ حضرت نے فرمایا: تم نے یہ ہار بیت المال سے میری اجازت اور مسلمانوں کی رضا مندی کے بغیر میری بیٹی کو کیوں دیا؟ عبد اللہ نے کہا: یا امیرالمومنینؑ! وہ آپ کی بیٹی ہے۔ اس نے بطور امانت یہ کہہ کر ہار مجھ سے لیا ہے کہ وہ جلد اسے لوٹا دے گی۔ پھر میں اس ہار کو اس کی جگہ واپس پہنچانے کا ضامن ہوں۔ حضرت نے فرمایا: آج ہی اسے اپنی جگہ پر واپس رکھ دو اور خبردار! آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا ورنہ تمھیں سزا بھگتنا ہوگی۔ اگر اس نے یہ ہار عاریتاً نہ لیا ہوتا تو یہ بنی ہاشم کی پہلی عورت ہوتی جس کا میں ہاتھ کاٹ ڈالتا۔ آپ کی بیٹی نے جب یہ سنا تو کہا: یا امیرالمومنینؑ: میں آپ کی بیٹی ہوں۔ کیا مجھ سے زیادہ بھی کوئی اس کا حقدار ہے؟ آپ نے فرمایا: اے بنت علیؑ! تمھیں خواہش نفس، راہ حق سے دور نہ کرنے پائے۔ کیا تمام مہاجرین کی خواتین عید پر اسی طرح کا ہار پہنتی ہیں؟ اس کے بعد آپ نے ہار اپنی بیٹی سے لیا اور اسے اس کی جگہ واپس رکھوا دیا۔ (بحار الانوار ج ۴۰، ص ۳۷۷)

طلحہ اور زبیر دولت مند ہونے کے باوجود حضرت علی علیہ السلام کی خلافت میں آپ سے زائد وظیفہ کی امید رکھتے تھے۔ آپ نے ان سے فرمایا: تم کس دلیل کی بنیاد پر خود کو دوسروں سے برتر سمجھتے ہو؟

طلحہ و زبیر نے کہا: حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہمارا وظیفہ عام مسلمانوں سے زیادہ تھا۔

حضرت علی علیہ السلام نے کہا: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تمہارا وظیفہ کتنا تھا؟

انھوں نے کہا: دوسرے لوگوں کے برابر۔

حضرت علی علیہ السلام نے کہا: اب بھی تمہارا وظیفہ دوسرے لوگوں کے برابر ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ میں عمرؓ کی پیروی کروں یا اللہ کے رسولؐ کی؟

لاجواب ہو کر ان دونوں نے کہا: اسلام کے لیے ہماری خدمات بہت زیادہ ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے کہا: میری خدمات تمام مسلمانوں سے زیادہ ہیں اور اس وقت میں تمہارا

خلیفہ بھی ہوں لیکن اس کے باوجود میں اپنے اور غریبوں کے درمیان کسی فرق کا قائل نہیں۔ آخرکار وہ لوگ ناامید ہوکر واپس چلے گئے۔

حضرت علی علیہ السلام نے ہر وقت عدل و انصاف کا بول بالا کیا اور ظلم وستم سے بیزاری کا اظہار کیا۔ آپ حق کے پیروکار تھے۔ جو حق ہوتا اسی کو انجام دیتے۔ آپ نے اپنے عاملوں اور گورنروں کو جو فرمان جاری کئے وہ ایسے قانونی اور اخلاقی نکات پر مشتمل ہوتے تھے جن سے دنیا بھر کے قانون دانوں نے استفادہ کیا ہے اور آپ کی حق پسندی و حقیقت خواہی کا برملا اعتراف کیا ہے۔

جرجی زیدان اپنی مشہور کتاب ''تاریخ تمدن اسلام'' میں لکھتے ہیں:

ہم نے علی بن ابی طالبؑ اور معاویہ بن ابی سفیان کو نہیں دیکھا ہے پھر ہم کس طرح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کس کا قد کاٹھ بڑا تھا؟ اس سوال کا جواب ہم علیؑ اور معاویہ کے کلام، مکتوبات اور آثار سے چودہ سو سال کے بعد بھی حاصل کرسکتے ہیں۔

معاویہ نے اپنے عمال اور حکام کو جو خطوط لکھے ان میں ہر جگہ یہی لکھا نظر آتا ہے کہ وہ علاقوں پر قبضہ کریں، مال لوٹیں اور دولت جمع کریں اور اپنے حصے کی کٹوتی کرکے باقی اسے بھیج دیں مگر حضرت علیؑ نے اپنے مکتوبات میں عمال اور حکام کو سب سے پہلے تقویٰ، خوف خدا، باقاعدگی سے نماز پڑھنے، روزہ رکھنے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ادائیگی، رعایا سے مہربانی کا سلوک کرنے، ناداروں، یتیموں، مقروضوں اور محتاجوں سے ہرگز غفلت نہ برتنے کا حکم دیتے ہوئے انھیں لکھا کہ وہ اس بات کو یاد رکھیں کہ اللہ ان کے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے اور اس زندگی کا انجام اس دنیا سے کوچ کر جانا ہے۔

انسانی حقوق کے علمبرداروں میں سے کسی نے بھی حضرت علی علیہ السلام کی طرح معاشرے کے مختلف طبقات نیز عوام اور سرکاری عہدیداروں کے درمیان باہمی روابط کو بیان نہیں کیا۔ حضرت علی علیہ السلام کا سچائی، انصاف اور مساوات کے فروغ کے سوا کوئی مقصد نہ تھا۔ آپ ہر طرح کے دھوکا وفریب سے دور رہتے تھے۔ جب آپ خلیفہ بنے تو آپ نے عثمانی دور کے حکام اور عمال کو معزول کردیا۔ آپ کے اکثر اصحاب نے عرض کیا کہ آپ فی الحال معاویہ کو معزول نہ کریں اس لیے کہ وہ فتنہ پرور شخص ہے اور آسانی سے شام کا اقتدار نہیں چھوڑے گا مگر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: میں ایک لمحے کے لیے بھی کسی فاجر اور بے دین شخص کو مسلمانوں کا حاکم نہیں دیکھ سکتا۔

کچھ کم نظر لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت علی علیہ السلام سیاست نہیں جانتے تھے اس لیے کہ اگر آپ

معاویہ کو فوری طور پر معزول نہ کرتے تو بعد میں اسے آسانی سے معزول کیا جاسکتا تھا۔ اگر آپ چھ رکنی شوریٰ میں عبد الرحمٰن بن عوف کی بات مان لیتے تو خلافت حضرت عثمانؓ کے پاس نہ جاتی، اگر جنگ صفین میں عمرو بن عاص کو قتل کر دیتے تو معاویہ پر بآسانی فتح پاسکتے تھے اس طرح ثالثی کا جھگڑا پیدا ہی نہ ہوتا۔

ایسے لوگوں کی باتیں ظاہری طور پر ٹھیک لگتی ہیں مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ حضرت علی علیہ السلام ایک کریم، پاک نفس اور حق و حقیقت کے علمبردار تھے۔ آپ کسی صورت میں بھی معاویہ جیسے افراد کو مسلمانوں پر حاکم مقرر نہیں کرسکتے تھے اس لیے کہ آپ کی حکومت، حکومت الٰہیہ تھی جو دوسروں کی حکومت سے مختلف تھی۔ حکومت الٰہیہ میں اعلیٰ اخلاقی اقدار پر خاص توجہ دی جاتی ہے جیسے عدل و انصاف، تقویٰ وغیرہ۔ اس حکومت میں مسلمانوں کے انفرادی اور معاشرتی مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے حق و انصاف کے منافی چیزوں سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام مظہر کبریا اور روئے زمین پر اللہ کے نمائندہ تھے لہٰذا وہ جو بھی کام کریں اس کا حقیقت اور حکم خدا کے مطابق ہونا لازمی تھا۔[1]

چالیں چلنا، سازشیں کرنا اور دھوکا دینا مکار لوگوں کا شیوہ ہے اور اس طرح کے کام حضرت علیؑ کی شایان شان نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ امام دوسروں کی طرح چالیں نہیں چل سکتے تھے۔ آپ نے فرمایا تھا: **وَاللهِ مَا مُعَاوِيَةُ بِأَدْهَى مِنِّي وَلٰكِنَّهُ يَغْدِرُ وَيَفْجُرُ** خدا کی قسم! معاویہ مجھ سے زیادہ زیرک اور چالاک نہیں مگر یہ کہ وہ مکاری اور حق سے تجاوز کرتا ہے۔

**وَلَوْلَا كَرَاهِيَةُ الْغَدْرِ لَكُنْتُ مِنْ أَدْهَى النَّاسِ** اگر مجھے مکاری سے نفرت نہ ہوتی تو میں مکر و حیلہ میں سب لوگوں سے زیادہ ہوشیار کہلاتا۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۸)

---

۱۔ اخلاق مطلق Absolute ہوتا ہے یا نسبی Relative ہوتا ہے اس سلسلے میں مرتضیٰ مطہری اپنی کتاب **سیری در سیرۂ نبویؐ** میں لکھتے ہیں: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ سے لے کر امام حسن عسکری علیہ السلام تک تمام دینی رہبروں نے ''باطل اخلاقی اصولوں'' کو مسترد کیا ہے کیونکہ ایسے اصولوں کو ہر صورت میں مسترد کر دینا چاہیے۔ وہ لوگ جو اخلاق کو ایک نسبی چیز بتاتے ہیں ''دھوکا دہی کا اصول'' ان کے نزدیک کیسا ہے؟ دنیا کے تقریباً تمام سیاست دان دھوکا دیتے ہیں۔ بعض سیاست دانوں کی تو پوری سیاست ہی دھوکا دہی پر مبنی ہوتی ہے جبکہ بعض کبھی کبھی دھوکا دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سیاست میں ''اخلاقیات'' بے معنی چیز ہے۔ ایک سیاست دان وعدہ کرتا ہے اور قسم کھاتا ہے لیکن وہ اپنے وعدے اور قسم پر اُس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک اُس کا مفاد ہوتا ہے۔ مفاد حاصل ہوتے ہی وہ اپنا وعدہ توڑ دیتا ہے۔ اُن کے بقول وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے۔

امام علی علیہ السلام اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے پاسبان تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ میری حکومت کا مقصد ان اصولوں کی حفاظت کرنا ہے۔ سچائی کی حفاظت، امانت کی حفاظت، ایفائے عہد کی حفاظت اور میں ان ہی باتوں کے لیے خلیفہ بنا ہوں۔ میں کیسے ان اصولوں کو پامال کردوں؟! (رضوانی)

حضرت علی علیہ السلام تو سراپا حق تھے۔ حق حضرت علی علیہ السلام کے وجود سے ہی ظاہر ہوا۔ حضرت علی علیہ السلام حق بات کہتے، حق پر نظر رکھتے، حق کی طرف بڑھتے اور حق کا دفاع کرتے (اَلْحَقُّ مَعَ عَلِیٍّ وَ عَلِیٌّ مَعَ الْحَقِّ)

حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد سودہ بنت عمارہ ہمدانی معاویہ کے عامل بسر بن ابی ارطات کے ظلم کے خلاف فریاد لے کر معاویہ کے پاس گئی۔ سودہ جنگ صفین میں حضرت علی علیہ السلام کی حمایت میں لوگوں کو معاویہ کے خلاف اکساتی تھی اس لیے معاویہ نے پہلے اس حوالے سے اس کو ملامت کی۔ پھر پوچھا: کیا حاجت لے کر آئی ہو؟

سودہ نے کہا: بسر نے ہمارے قبیلے کے اموال لوٹ لیے ہیں اور ہمارے مردوں کو قتل کر ڈالا ہے۔ تم اللہ کے حضور اس کے اعمال کے لیے جوابدہ ہو جبکہ ہم نے تمہاری خاطر اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا اس لیے تمہارے پاس اس کی شکایت لے کر آئی ہوں۔ اگر تم نے ہماری داد رسی کی تو ہم تمہارے شکر گزار ہوں گے اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہاری مخالفت کریں گے۔

معاویہ نے کہا: کیا تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟

سودہ چند لمحے سر جھکائے خاموش رہی۔ پھر اس نے سر اٹھا کر کہا:

صَلَّی الْاِلٰهُ عَلٰی رُوْحٍ تَضَمَّنَهَا ۔۔۔ قَبْرٌ فَاَصْبَحَ فِیْهَا الْعَدْلُ مَدْفُوْنًا

اللہ کا سلام ہو اس کی روح پر جسے قبر نے اپنی آغوش میں کیا لیا کہ انصاف بھی اس کے ساتھ دفن ہو گیا۔

معاویہ نے کہا: اس سے تمہاری مراد کون ہے؟

سودہ نے کہا: خدا کی قسم! وہ علیؑ ہیں جنھوں نے اپنی خلافت میں محصولات وصول کرنے کے لیے ہماری طرف اپنا نمائندہ بھیجا۔ اس نے عدل سے ہٹ کر رویہ اپنایا تو میں اس کی شکایت لے کر ان کے پاس گئی۔ جب میں وہاں پہنچی تو علیؑ مصلائے عبادت پر کھڑے تکبیر کہنا ہی چاہتے تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھ کر نہایت شفقت سے پوچھا: کیا کوئی حاجت ہے؟ میں نے آپ کے عامل کے ظلم کی شکایت کی تو علیؑ نے روتے ہوئے آسمان کی طرف رخ کر کے فرمایا: اے خدائے قاہر و قادر! تو جانتا ہے کہ میں نے اس عامل کو تیرے بندوں پر ظلم کرنے کے لیے نہیں بھیجا تھا۔ پھر انھوں نے اپنی جیب سے چمڑے کا ایک ٹکڑا نکالا جس پر اس عامل کی مذمت قرآنی آیات سے فرمائی اور اسے لکھا کہ اس خط کے ملتے ہی صدقات جمع کرنا بند کر دو۔ اب تک تم نے جو کچھ جمع کیا ہے اسے اپنے پاس رکھو یہاں تک کہ میرا دوسرا

نمائندہ آکر اسے اپنی تحویل میں لے لے۔ امام نے یہ خط مجھے دیا اور اس طرح اس کے ظلم کا خاتمہ کر دیا۔
معاویہ نے جب یہ سنا تو اپنے کاتب کو حکم دیا کہ بسر بن ابی ارطات کو لکھو کہ اس نے سودہ کے قبیلے سے جتنا مال لیا ہے، واپس کر دے۔ (کشف الغمہ ص ۵۰)

واقعاً جرجی زیدان کی بات سچ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے عمال کو جتنے بھی خطوط لکھے ان میں راہ حق کی نشاندہی کرتے ہوئے انھیں انصاف کرنے اور تقویٰ اپنانے کی تلقین فرمائی ہے۔ اگر حضرت علی علیہ السلام کو چند سال اور حکومت کرنے کا موقع مل جاتا اور آپ کو داخلی جنگوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا تو بلاشبہ مسلمانوں کی معاشرتی صورتحال کچھ اور ہوتی، دین و دنیا کی سعادتیں ان کا مقدر بن جاتیں اس لیے کہ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کی بنیاد ہی عدل پر تھی جس کا سرچشمہ تقویٰ اور حق پسندی تھا۔ اس حقیقت کو پوری طرح واضح کرنے کے لیے ہم ذیل میں اس دستاویز سے کچھ اقتباسات پیش کر رہے ہیں جو حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر نخعی کو مصر کا گورنر مقرر کرنے کے بعد تحریر فرمائی تھی۔

اے مالک! یاد رکھنا کہ میں نے تمھیں ایسے علاقے کی طرف بھیجا ہے جہاں ظلم پیشہ حکمرانوں کی حکومتیں رہی ہیں۔ لوگ تمہارے معاملات کو اس نظر سے دیکھ رہے ہیں جس طرح تم سابقہ حکمرانوں کے کاموں کے بارے میں سوچتے ہو۔ لوگ تمہارے بارے میں وہی کہیں گے جو تم دوسروں کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ نیک بندوں کی شناخت اس ذکر خیر سے ہوتی ہے جو ان کے لیے لوگوں کی زبانوں پر جاری ہوتا ہے لہٰذا تمہارا محبوب ترین ذخیرہ عمل صالح ہونا چاہیے۔

اے مالک! اپنی خواہشات کو لگام دو۔ جو چیز حلال نہ ہو اس کے بارے میں نفس کو صرف کرنے سے بخل کرو۔ یہی بخل اس کے حق میں انصاف ہے چاہے اسے اچھا لگے یا برا۔ رعایا کے ساتھ محبت و شفقت کو اپنے دل کا شعار بنالو اور خبردار ان کے حق میں پھاڑ کھانے والے درندے کے مثل نہ ہوجانا کہ انھیں کھا جانے ہی کو غنیمت سمجھنے لگو اس لیے کہ مخلوقات خدا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ دوسرے وہ جو خلقت میں تمہارے جیسے بشر ہیں۔[1] ان سے لغزشیں بھی ہوجاتی ہیں اور انھیں خطاؤں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے اور جان بوجھ کر یا دھوکے سے ان سے غلطیاں بھی ہوجاتی

---

۱۔ اگرچہ عصر حاضر میں حقوق انسانی کے حوالے سے بہت زیادہ باتیں کی جاتی ہیں تاہم آج بھی ترقی یافتہ اقوام میں نسل پرستی موجود ہے جبکہ حضرت علی علیہ السلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس طرح کے امتیازات کو ہیچ اور بے وقعت شمار کرتے ہوئے فرمایا کہ لوگ چاہے کسی مذہب و مسلک یا طبقے سے تعلق رکھتے ہوں معاشرتی عدالت میں برابر اور یکساں ہیں۔ ایک ایسے زمانے میں، جب انسان کے فطری حقوق کی کسی کو خبر تک نہ تھی اس طرح کا کلام خود ایک معجزہ ہے۔ مؤلف

ہیں لہٰذا انھیں ایسے ہی معاف کر دینا جس طرح تم چاہتے ہو کہ پروردگار تمہاری غلطیوں سے درگزر فرمائے کیونکہ تم ان سے بالاتر ہو اور تمہارا ولی امر تم سے بالاتر ہے اور پروردگار تمہارے والی سے بھی بالاتر ہے اس نے تم سے ان کے معاملات کی انجام دہی کا مطالبہ کیا ہے اور اسے تمہارے لیے ذریعہ آزمائش بنا دیا ہے لہٰذا خبردار! اپنے نفس کو اللہ کے مقابلے پر نہ اتار دینا۔

اے مالک! خبردار! تمہارے پاس اللہ کے عذاب سے بچنے کی طاقت نہیں ہے اور تم اس کے عفو و رحم سے بے نیاز بھی نہیں ہو۔ خبردار! کسی کو معاف کر دینے پر نادم نہ ہونا اور کسی کو سزا دے کر اکڑ نہ جانا۔ غصے کے اظہار میں جلدی نہ کرنا اگر اس کے ٹال دینے کی گنجائش پائی جاتی ہو۔ خبردار! یہ نہ کہنا کہ مجھے حاکم بنایا گیا ہے لہٰذا میری شان یہ ہے کہ میں حکم دوں اور میری اطاعت کی جائے کیونکہ اس طرح دل میں فساد داخل ہو جائے گا اور دین کمزور پڑ جائے گا اور اس سے انسان تغیرات زمانہ سے قریب تر ہوتا جائے گا۔ اگر کبھی سلطنت و حکومت کو دیکھ کر تمہارے دل میں عظمت و کبریائی اور غرور پیدا ہونے لگے تو پروردگار کے عظیم ترین ملک پر غور کرنا اور یہ دیکھنا کہ وہ تمہارے اوپر تم سے زیادہ قدرت رکھتا ہے اس طرح تمہاری سرکشی دب جائے گی، تمہاری طغیانی رک جائے گی اور تمہاری گئی ہوئی عقل واپس آجائے گی۔ خبردار! اللہ سے اس کی عظمت میں مقابلہ اور اس کے جبروت میں تشابہ کی کوشش بھی نہ کرنا کیونکہ وہ ہر جبار کو ذلیل کر دیتا ہے ہر مغرور کو پست۔

اے مالک! اپنی ذات، اپنے اہل و عیال اور رعایا میں جن سے تمھیں تعلق خاطر ہے، سب کے سلسلے میں اپنے نفس اور اپنے پروردگار سے انصاف کرنا۔ ایسا نہ کرو گے تو ظالم ہو جاؤ گے اور جو اللہ کے بندوں پر ظلم کرے گا اس کے دشمن بندے نہیں خود اس کا پروردگار ہوگا اور جس کا دشمن پروردگار ہو جائے اس کی ہر دلیل باطل ہو جائے گی اور وہ پروردگار کا مدمقابل شمار ہوگا۔ جب تک کہ وہ اپنے ظلم سے باز نہ آجائے یا توبہ نہ کرلے اللہ کی نعمتوں کی بربادی اور اس کے عذاب میں عجلت کا کوئی سبب ظلم پر قائم رہنے سے بڑا نہیں ہے اس لیے کہ وہ مظلوموں کی فریاد سننے والا ہے اور ظالموں کے لیے موقع کا انتظار کر رہا ہے۔ رعایا میں سب سے زیادہ دور اور تمہارے نزدیک مبغوض اس شخص کو ہونا چاہیے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے عیوب تلاش کرتا ہو اس لیے کہ لوگوں میں بہرحال کمزوریاں پائی جاتی ہیں اور ان کی پردہ پوشی کی سب سے بڑی ذمے داری حاکم پر ہے لہٰذا خبردار! جو عیب تمہارے سامنے نہیں ہے اس کا انکشاف نہ کرنا۔ تمہاری ذمے داری صرف عیوب کی اصلاح کرنا ہے اور پوشیدہ باتوں کا فیصلہ کرنے والا

پروردگار ہے اس لیے جہاں تک ممکن ہو لوگوں کے ان تمام عیوب کی پردہ پوشی کرتے رہو جن کی پردہ پوشی کے لیے تم پروردگار سے تمنا کرتے ہو۔

اے مالک ! لوگوں کی طرف سے کینہ کی ہر گرہ کو کھول دو اور دشمنی کی ہر رسی کو کاٹ دو اور جو بات تمہارے لیے واضح نہ ہو اس سے انجان بن جاؤ اور ہر چغل خور کی تصدیق میں عجلت سے کام نہ لو کیونکہ چغل خور ہمیشہ خیانت کار ہوتا ہے چاہے وہ مخلصین کے بھیس میں ہی کیوں نہ آئے۔ دیکھو ! اپنے مشورے میں کسی بخیل کو شامل نہ کرنا کیونکہ وہ تمھیں فضل و کرم کے راستے سے ہٹا دے گا اور فقر و فاقہ کا خوف دلاتا رہے گا۔ اسی طرح بزدل سے بھی مشورہ نہ کرنا کیونکہ وہ ہر معاملے میں تمھیں کمزور بنا دے گا۔ نیز کسی حریص سے بھی مشورہ نہ کرنا کہ وہ تمھیں ظالمانہ طریقے سے مال جمع کرنے کے طریقے کو بھی تمہاری نگاہوں میں آراستا کردے گا۔ اگرچہ بخل ، بزدلی اور طمع الگ الگ خصلتیں ہیں تاہم ان سب میں قدر مشترک اللہ سے بدگمانی ہے جس کے بعد ان خصلتوں کا ظہور ہوتا ہے۔

اے مالک ! اہل تقویٰ اور اہل صداقت سے جہاں تک ممکن ہو سکے قریبی رابطہ رکھو اور انھیں اس بات کی تربیت دو کہ وہ بلا وجہ تمہاری تعریف نہ کریں اور کسی ایسے بے بنیاد عمل کا تم میں غرور پیدا نہ کرائیں جو تم نے انجام نہ دیا ہو کیونکہ زیادہ تعریف سے غرور پیدا ہوتا ہے اور غرور انسان کو سرکشی سے قریب تر لے جاتا ہے۔ نیک کردار اور بد کردار تمہارے نزدیک یکساں نہ ہونے پائیں کہ اس طرح نیک کرداروں میں نیکی سے بددلی پیدا ہوگی اور بد کرداروں میں بد کرداری کا حوصلہ بڑھے گا۔ ہر شخص کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرو جس کے قابل اس نے خود کو بنایا ہے۔ تمہارے لیے ضروری ہے کہ اپنے ان تمام فرائض کو جو صرف اور صرف اللہ کے لیے انجام دیتے ہو انھیں مخصوص وقت پر بجا لاؤ تاکہ ان کے ذریعے اپنے دین کو خالص بنا سکو۔ رات اور دن دونوں میں ایک حصہ اللہ کی عبادت کے لیے قرار دینا اور جس کام کے ذریعے تم اللہ کا تقرب چاہتے ہو اسے مکمل طور پر انجام دینا۔ اس میں کوئی نقص اور رخنہ نہ پڑنے پائے چاہے اس کی بجا آوری میں تمہارے بدن کو کتنی ہی زیادہ زحمت کیوں نہ اٹھانی پڑے۔

جب لوگوں کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرو تو نہ اس طرح نماز پڑھو کہ لوگ بیزار ہو جائیں اور نہ ہی اس طرح کہ نماز برباد ہو جائے (یعنی رکوع ، سجود اور قنوت کو اتنا لمبا کر دو کہ لوگ تنگ آجائیں نہ ہی نماز کے واجبات میں کوئی کمی آنے پائے کہ نماز ہی اکارت چلی جائے بلکہ صحیح طریقے سے واجبات ادا کرنے پر اکتفا کرو) اس لیے کہ لوگوں میں بیمار اور ضرورتمند افراد بھی ہوتے ہیں انھیں جلدی کام انجام

دیئے ہوتے ہیں۔ دیکھو اپنے نفس کو خود پسندی سے بھی محفوظ رکھنا۔ اپنی پسند پر بھروسا بھی نہ کرنا۔ اس بات کو ہرگز پسند نہ کرنا کہ لوگ تمہاری زیادہ تعریف کریں اس لیے کہ یہ سب باتیں شیطان کی فرصت کے لیے بہترین وسائل ہیں جن کے ذریعے وہ نیک کردار والوں کے عمل کو تباہ کر دیا کرتا ہے۔ رعایا پر نہ تو احسان جتانا اور نہ ہی ان سے جو سلوک کیا ہے اسے زیادہ سمجھنے کی کوشش کرنا۔ ان سے کوئی وعدہ کر کے بعد میں وعدہ خلافی بھی نہ کرنا کیونکہ یہ طرز عمل نیکی کو برباد کر دیتا ہے اور زیادتی عمل کا غرور حق کی نورانیت کو فنا کر دیتا ہے۔ وعدہ خلافی اللہ اور اس کے بندوں کو ناراض کرنے کا باعث ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: اللہ کے نزدیک یہ بڑی ناراضگی کی بات ہے کہ تم کوئی بات کہو اور اس کے مطابق عمل نہ کرو۔ خبردار! وقت سے پہلے کاموں میں جلدی نہ کرنا اور وقت آ جانے پر سستی کا مظاہرہ نہ کرنا۔ بات اگر سمجھ میں نہ آئے تو جھگڑا نہ کرنا اور واضح ہو جائے تو کمزوری کے اظہار سے گریز کرنا۔ ہر چیز کو اس کی جگہ اور ہر کام کو اس کے محل پر برقرار رکھنا۔

اے مالک! تم پر لازم ہے کہ ماضی میں گزر جانے والی عادلانہ حکومت اور فاضلانہ سیرت کو یاد رکھو۔ رسول خدا ﷺ کے آثار اور کتاب خدا کے احکام ہمیشہ اپنی نگاہوں میں رکھو۔ جس طرح تم نے ہمیں عمل کرتے دیکھا ہے اسی طرح ہمارے نقش قدم پر چلو اور جو کچھ ہم نے تمھیں اس عہد نامے میں بتایا ہے اس پر عمل کرنے کی سعی کرو کیونکہ میں نے تم پر اس عہد نامے کے ذریعے اپنی حجت کو مستحکم کر دیا ہے تاکہ جب کہیں تمہارا نفس خواہشات کی طرف تیزی سے بڑھنے کا خواہاں ہو تو تمہارے پاس کوئی عذر یا بہانہ نہ رہے۔ اگرچہ اللہ کے سوا کوئی بھی کسی کو برائی سے محفوظ نہیں رکھ سکتا اور سوائے اس اللہ کے کوئی نیکی کی توفیق دینے والا بھی نہیں۔

رسول خدا ﷺ نے اپنی وصیتوں میں جن جن باتوں کی تاکید و تلقین فرمائی تھی وہ نماز، زکات، بندگان خدا سے شفقت و محبت اور رعایا سے حسن سلوک ہی کی ترغیب سے عبارت تھیں۔ چنانچہ میں نے بھی وہی باتیں اس عہد نامے میں تمھیں لکھی ہیں اور ان کی پابندی کی تاکید کی ہے اور اسی پر میں اسے ختم کرتا ہوں۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔ (نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳ سے اقتباسات)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے تمام احکامات تقویٰ، انصاف، حق پسندی اور لوگوں سے شفقت و مہربانی سے پیش آنے کی تاکید پر مبنی ہیں اور یہ صرف مالک اشتر کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام عمال اور حکام کو حضرت علی علیہ السلام نے ایسے ہی احکامات دیئے تھے۔

# (۱۰) حضرت علی علیہ السلام کی شفقت

ہر معاشرے کی بقا اس کے افراد کے باہمی تعاون اور احساسات سے وابستہ ہے۔ محبت اور ہمدردی کا احساس، صاف اور پاک دل میں پرورش پاتا ہے۔ جس شخص میں ایسی اعلیٰ صفات پائی جاتی ہیں وہ دوسروں کی بھلائی کی فکر میں رہتا ہے اور اپنے آرام کو دوسروں کے آرام کے لیے قربان کر دیتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام دردمندوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ آپ غمخواری و ہمدردی کا پیکر تھے۔ آپ محنت مشقت کرتے اور اپنی مزدوری بے سہارا لوگوں پر خرچ کر دیتے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام محتاجوں اور مظلوموں کے لیے ایک عظیم پناہ گاہ تھے۔ آپ یتیموں کے لیے شفیق باپ، بیوگان کی فریادرسی کرنے والے، بے آسرا لوگوں کی دستگیری کرنے والے اور کمزوروں کے ملجا و ماویٰ تھے۔ اپنی حکومت کے دور میں آپ رات کو نکلتے اور مسکینوں اور بیواؤں کے گھروں پر کھجوریں اور روٹیاں پہنچاتے اور کسی کو یہ علم ہی نہ ہوتا کہ یہ غریب پرور شخص کون ہے؟

حضرت علی علیہ السلام جب کسی یتیم کو دیکھتے تو ایک باپ کی طرح اس کے سر پر دست شفقت رکھتے اور اسے خوراک و پوشاک فراہم فرماتے۔ ایک دن آپ ایک گلی سے گزر رہے تھے تو دیکھا ایک عورت اپنے کاندھے پر پانی سے بھری مشک اٹھائے جا رہی ہے لیکن مشک بھاری ہونے کی وجہ سے اسے کافی تکلیف ہو رہی ہے۔ آپ نے آگے بڑھ کر مشک اس عورت سے لے لی اور اس کے گھر تک پہنچائی۔ آپ نے اس عورت سے اس کے گزر بسر کے بارے میں پوچھا۔ وہ آپ کو نہیں پہچانتی تھی۔ اس نے کہا: میرا شوہر علیؑ کے ساتھ جنگ لڑتے ہوئے شہید ہو گیا ہے چنانچہ میں بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہوں۔

حضرت علی علیہ السلام اس عورت کی باتیں سن کر اس قدر آزردہ خاطر ہوئے کہ آپ کی ساری رات بے چینی میں گزری۔ صبح ہوئی تو آپ ایک ٹوکری خرما اور ایک تھیلا آٹا لیکر اس عورت کے گھر پہنچے اور

دروازے پر دستک دی۔ عورت نے پوچھا کون ہے؟ آپ نے فرمایا میں وہی شخص ہوں جس نے کل پانی کی مشک اٹھانے میں تمہاری مدد کی تھی۔ اس عورت نے دروازہ کھولا تو آپ نے اسے کھانے کا سامان دیا۔ اس نے آپ کا شکریہ ادا کیا اور کہا: اللہ میرے اور علیؑ کے درمیان فیصلہ فرمائے جن کی وجہ سے میرے بچے یتیم اور محتاج ہو گئے ہیں۔ حضرت نے گھر میں آنے کی اجازت مانگی اور داخل ہوتے ہوئے فرمایا کہ میں اللہ کی خاطر تمہاری خدمت کرنے کے لیے حاضر ہوں۔ میں تمہارے بچوں کو بہلاتا ہوں تم روٹیاں پکالو۔ وہ عورت روٹی پکانے لگی اور حضرت اس کے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگے۔ آپ نے ان کو اپنے زانوؤں پر بٹھایا اس حالت میں کہ آپ کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ آپ بچوں کے منہ میں خرما بھی ڈال رہے تھے اور ساتھ ہی فرماتے جارہے تھے: اے میرے بچو! اگر علیؑ تمہارے کام نہیں آسکا تو اسے معاف کر دینا کیونکہ علیؑ نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ جب تنور گرم ہو گیا اور آگ کی حرارت آپ کے چہرۂ مبارک تک پہنچی تو آپ نے اپنے آپ سے کہا: اے علی! آگ کی گرمی چکھو اور دوزخ کی آگ سے ڈرو۔ یہ ہے اس شخص کی سزا جو یتیموں اور بیواؤں کی حالت سے بے خبر رہتا ہے۔

اسی اثنا میں پڑوسن وہاں آگئی۔ اس نے حضرت علی علیہ السلام کو پہچان لیا۔ اس نے عورت سے کہا: وائے ہو تم پر! یہ علیؑ ہیں جن سے تم کام کرا رہی ہو۔ وہ بیوہ بھاگتی ہوئی آئی اور عرض کی: یا امیر المومنینؑ! مجھ سے نادانی میں گستاخی ہو گئی ہے۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ یہ میری ذمے داری ہے کہ میں یتیموں اور بیواؤں کے کام آؤں اور ان کا خیال رکھوں۔

(بحار الانوار ج ۴۱، ص ۵۲)

حضرت علی علیہ السلام لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے۔ آپ اتنے شفیق اور مہربان تھے کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کی عظمت و بزرگی زباں زد خاص و عام تھی۔ آپ کے دشمن بھی آپ کی ان صفات حمیدہ کے معترف تھے۔

شَهِدَ الْأَنَامُ بِفَضْلِهِ حَتَّى الْعِدٰى　　　وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ

تمام لوگ یہاں تک کہ دشمن بھی آپ کے فضل کی گواہی دیتے اور حقیقی فضیلت وہی ہے جس کی دشمن بھی گواہی دے۔

معاویہ جو حضرت علی علیہ السلام کا کٹر دشمن تھا وہ بھی کہتا تھا کہ اگر میں نے شکست کھائی اور علیؑ مجھ پر غالب آگئے تب بھی مجھے کوئی دھڑکا نہیں کیونکہ میری جان بخشی کے لیے یہی کافی ہوگا کہ میں ان سے

درگزر کا تقاضا کروں۔ میں جانتا ہوں وہ اتنے کریم النفس ہیں کہ مجھے ضرور معاف کر دیں گے۔

حضرت علی علیہ السلام ہمیشہ اپنے سپاہیوں سے فرمایا کرتے تھے کہ بھاگ جانے والے دشمن کا ہرگز پیچھا نہ کرنا اور زخمیوں کی مرہم پٹی اور قیدیوں کی نگہداشت سے غافل نہ ہونا۔ جنگ جمل میں جب آپ کو فتح حاصل ہوئی تو آپ نے بی بی عائشہؓ کو نہایت احترام کے ساتھ مدینہ بھیجا جبکہ عبد اللہ ابن زبیر اور مروان بن حکم کو آزاد کر دیا جنھوں نے اس جنگ کی آگ بھڑکانے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔

حضرت علی علیہ السلام سب کے ساتھ محبت و ہمدردی سے پیش آتے اور لوگوں کو عفو و درگزر اور رحم کرنے کی تلقین فرماتے یہاں تک کہ آپ نے اپنے قاتل کے بارے میں بھی وصیت فرمائی تھی کہ اس کی دیکھ بھال کی جائے اور اسے بھوکا پیاسا نہ رکھا جائے۔ مختصر یہ کہ اس طرح کے اعلیٰ احساسات و جذبات صرف حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے پاک دل میں جاگزین ہو سکتے ہیں۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں حضرت علی علیہ السلام نفسانی ملکات اور اعلیٰ اخلاقی صفات میں اپنی مثال آپ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن ابی الحدید کہتے ہیں: سبحان اللہ! ایک فرد اور اس میں یہ تمام فضائل؟ حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت کا احاطہ کرنا اور ان کے فضائل کو بیان کرنا ہم جیسے انسانوں کے لیے ممکن ہی نہیں۔ یہ جو گزشتہ ابواب میں اس انسان کامل کے حوالے سے چند باتیں تحریر کی گئی ہیں یہ ہمارے فہم و ادراک میں آ جانے والی باتیں ہیں ورنہ سمندر کو کوزے میں بند کرنا کیسے ممکن ہے۔ شکاری کے جال میں ''عنقا'' کبھی نہیں آ سکتا۔

یہاں ہم مدح مولا میں ملا مہر علی خوئی کے قصیدے کے چند اشعار پیش کر رہے ہیں:

هَا عَلِيٌّ بَشَرٌ كَيْفَ بَشَر — رَبُّهُ فِيهِ تَجَلّٰى وَ ظَهَر

عِلَّةُ الْكَوْنِ وَ لَوْلَاهُ لَمَا — كَانَ لِلْعَالَمِ عَيْنٌ وَ اَثَر

وَلَهُ اُبْدِعَ مَا تَعْقِلُهُ — مِنْ عُقُوْلٍ وَ نُفُوْسٍ وَ صُوَر

فَلَكٌ فِی فَلَكٍ فِيهِ نُجُوْمٌ — صَدَفٌ فِیْ صَدَفٍ فِيهِ دُرَر

مَارَمٰى رَمْيَةً اِلَّا وَكَفٰى — مَاغَزَا غَزْوَةً اِلَّا وَ ظَفَر

اَغْمَدَ السَّيْفَ مَتٰى قَابَلَهُ — كُلُّ مَنْ جَرَّدَ سَيْفًا وَ شَهَر

اَسَدُاللهِ اِذَا صَالَ وَ صَاحَ — اَبُو الْاَيْتَامِ اِذَا جَادَ وَ بَرّ

حُبُّهُ مَبْدَءُ خُلْدٍ وَ نِعَمٍ — بُغْضُهُ مَنْشَاءُ نَارٍ وَ سَقَر

هُوَ فِی الْكُلِّ اِمَامُ الْكُلِّ — مَنْ اَبُوبَكْرٍ وَمَنْ كَانَ عُمَر ؟

لَيْسَ مَنْ اَذْنَبَ يَوْمًا بِاِمَامٍ — كَيْفَ مَنْ اَشْرَكَ دَهْرًا وَ كَفَر ؟

| | |
|---|---|
| کُلُّ مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَعْرِفْهُ | مَوْتُهُ مَوْتُ حِمَارٍ وَ بَقَر |
| خَصْمُهُ اَبْغَضَهُ اللّٰهُ وَلَوْ | حَمِدَ اللّٰهَ وَ اَثْنٰی وَ شَکَر |
| مَنْ لَهُ صَاحِبَۃٌ کَالزَّهْرَاءِ | اَوْ سَلِیْلٌ کَشُبَیْرٍ وَ شَبَر |
| عِنْدَهُ دِیْوَانُ عُلُوْمٍ وَ حِکَمٍ | فِیْهِ طُوْمَارُ عِظَاتٍ وَ عِبَر |
| بُو تُرَابٍ وَ کُنُوْزُ الْعَالَمِ | عِنْدَهُ نَحْوُ سِفَالٍ وَ مَدَر |
| وَهُوَ النُّوْرُ وَ اَمَّا الشُّرَکَاءُ | کَظَلَامٍ وَ دُخَانٍ وَ شَرَر |
| اَیُّهَا الْخَصْمُ تَذَکَّرْ سَنَدًا | مَتْنُهُ صَحَّ بِنَصٍّ وَ خَبَر |
| اِذْاَتٰی اَحْمَدُ فِی خُمِّ غَدِیْرٍ | بِعَلِیٍّ وَ عَلَی الرَّحْلِ نَبَر |
| قَالَ مَنْ کُنْتُ اَنَا مَوْلَاهُ | فَعَلِیٌّ لَهُ مَوْلًا وَ مَفَرّ |
| قَبْلَ تَعْیِیْنِ وَصِیٍّ وَ وَزِیْرٍ | هَلْ تَرٰی فَاتَ نَبِیٌّ وَ هَجَر؟ |
| مَنْ اَتٰی فِیْهِ نُصُوْصٌ بِخُصُوْصٍ | هَلْ بِاِجْمَاعِ عَوَامٍ یُنْکَر؟ |
| آیَۃُ اللّٰهِ وَهَلْ یَجْحَدُ مَنْ | خَصَّهُ اللّٰهُ بِآیٍ وَ سُوَر؟ |
| وُدُّهُ اَوْجَبُ مَا فِی الْقُرْآنِ | اَوْجَبَ اللّٰهُ عَلَیْنَا وَ اَمَر |
| مُدَّعِی حُبِّ عَلِیٍّ وَ عِدَاهُ | مِثْلُ مَنْ اَنْکَرَ حَقًّا وَ اَقَر |

(۱) جان لو کہ علیؑ انسان ہیں مگر کیسے انسان؟ ایسے انسان جو مظہر کبریا ہیں۔

(۲) آپ باعث تخلیق کون و مکان ہیں۔ اگر آپ نہ ہوتے تو دنیا کی کوئی حقیقت نہ ہوتی۔

(۳) عالم عقل، عالم مثال اور دنیا کی خوبصورتی کے بارے میں جو کچھ سوچا جاسکتا ہے وہ سب آپ کے صدقے میں ہی پیدا کیا گیا ہے۔

(۴) علیؑ آسمان پر ایک برج ہیں جس کے اپنے ستارے ہیں۔ گویا ایک صدف کے اندر دوسرا صدف ہے جو درخشندہ موتیوں سے بھرا ہے (یعنی حضرت علیؑ رسول خداؐ کے اوصاف حمیدہ کے وارث ہیں اور دیگر ائمہؑ آپ کی نسل سے ہیں)۔

(۵) آپ نے جو وار کیا اس نے دشمن کو ہلاک کیا اور آپ نے جس جنگ میں شرکت کی وہ فتح ہوئی۔

(۶) بڑے بڑے سورما آپ کے سامنے اپنی جان کے خوف سے تلواریں نیام کر لیا کرتے تھے۔

(۷) جب آپ دشمن پر حملہ کرتے اور للکارتے تو شیر خدا نظر آتے لیکن جب احسان اور عطا و بخشش کا موقع ہوتا تو آپ یتیموں کے لیے شفیق باپ کی مانند تھے۔

(۸) امام کی محبت اور دوستی جنت اور نعمات جنت کا سرچشمہ ہے اور آپ کی دشمنی دوزخ اور آتش دوزخ میں جانے کا سبب ہے۔

(۹) علیؑ ہی رسولؐ کے بعد تمام جہاں کے رہبر و امام ہیں۔ ابوبکر اور عمر آپ کی برابری کا دعویٰ کرنے والے کون ہیں؟

(۱۰) جو ایک دن بھی گناہ کرتا ہے وہ امامت کا اہل نہیں ہوتا تو جس نے اپنی زندگی کا ایک حصہ کفر و شرک میں گزارا ہو وہ کیونکر اس منصب کا اہل ہوسکتا ہے؟

(۱۱) جو امام کو پہچانے بغیر مر جائے اس کی موت گدھے اور جانوروں کی موت کی مانند ہے۔ (یہ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے مَنْ مَّاتَ وَلَمْ یَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِهٖ فَقَدْ مَاتَ مِیْتَةَ الْجَاهِلِیَّةِ)۔

(۱۲) آپ کے دشمن پر اللہ کا غضب ہوتا ہے چاہے وہ کتنی ہی اللہ کی حمد و ثنا کرنے والا اور اس کا شکر بجا لانے والا ہو۔

(۱۳) علیؑ کے سوا کون ہے جس کی زہراؑ جیسی ہمسر اور حسنینؑ جیسے بیٹے ہوں۔

(۱۴) علم و دانش کا سرچشمہ آپ ہیں اور نصیحتوں کے دفتر آپ ہی کے پاس ہیں۔

(۱۵) علیؑ ایسے بوتراب ہیں کہ دنیا کے خزانے ان کے نزدیک کنکر پتھر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

(۱۶) علیؑ تو روشنی ہیں اور ان کے دشمن تاریکی، دھواں اور چنگاریاں ہیں۔

(۱۷) اے دشمن علیؑ! اس حدیث کو یاد کر جس کا متن تیری اپنی روایات کے مطابق بھی صحیح ہے۔

(۱۸) جب غدیر خم کے میدان میں رسولؐ نے علیؑ کو بلایا اور پالان شتر کے منبر پر بلند کیا۔

(۱۹) اور فرمایا تھا کہ جس جس کا میں مولا ہوں اُس اُس کا یہ علیؑ مولا ہے۔

(۲۰) کیا کوئی پیغمبر ایسا ہے جو اپنا وصی مقرر کرنے سے پہلے فوت ہوا ہو یا اس نے ہجرت کی ہو؟

(۲۱) جس کے بارے میں روایات و آیات موجود ہوں کیا اس کی منزلت سے مٹھی بھر افراد کے اجماع کے ذریعے انکار کیا جاسکتا ہے؟

(۲۲) کیا کوئی اس سے انکار کرسکتا ہے کہ علیؑ اللہ کی عظیم نشانی ہیں؟ آپ وہ ہیں جس کے لیے اللہ نے آیات اور سورے نازل کئے ہیں۔

(۲۳) قرآن نے آپ کی محبت کو اوجب کہا ہے اور اللہ نے اسے ہمارے لیے واجب قرار دیا ہے۔

(۲۴) جو حب علیؑ کا دعوے کرے اور آپ کی مخالفت بھی کرے وہ ایسا ہے جو حق کا انکار بھی کرتا ہے اور اقرار بھی کرتا ہے۔

# حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بلافصل

## (ا) امامت پر بحث

شیعہ اور سنی دونوں اس بات کو مانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ایک ایسے امام (حاکم) کا وجود ضروری ہے جو پوری ملت کی رہنمائی کرے پوری ملت کے لیے واجب الاطاعت ہو اس لیے کہ کوئی بھی ادارہ یا نظام قائد اور رہبر کے بغیر نہیں چل سکتا تاہم قابل بحث بات یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد امت کا امام کسے ہونا چاہیے اور اسے کون نامزد کرے؟ برادران اہلسنت ہر اس حکومت کو اسلامی خلافت کہتے ہیں جس کا حاکم مسلمان ہو۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جانشین رسولؐ کا انتخاب عوام کرتے ہیں۔ وہ امام کی عصمت کے قائل نہیں ہیں اور اسلامی خلافت کو بھی دنیاوی حکومت جانتے ہیں۔ اس ضمن میں بھی ان کی نظر خلفاء کے طرز جہانبانی پر ہوتی ہے یعنی خلفاء لوگوں کے ساتھ انصاف سے پیش آئیں۔ لیکن ہم شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ امامت ایک خدائی منصب ہے جو کہ نبوت کا لاحقہ ہے۔ جس طرح نبی اور رسول کو اللہ مبعوث کرتا ہے اسی طرح امام اور خلیفہ کو بھی اللہ مقرر کرتا ہے۔ چنانچہ امام وخلیفہ کے لیے امت کے سب لوگوں سے برتر ہونے کے ساتھ ساتھ تمام اخلاقی خصائل اور نفسانی فضائل سے متصف ہونا اور صاحب عصمت ہونا اولین شرط ہے۔ اس منصب پر عوام کسی کو فائز نہیں کرسکتے۔ اس بنا پر اجماع اور انتخاب کی شرط سے یا مسلمانوں کا اسے امام ماننے یا نہ ماننے سے اس کی امامت پر کوئی فرق نہیں پڑتا اگرچہ امام دین کی حفاظت کے لیے تقیہ کرنے اور کسی کی بیعت کرنے پر مجبور ہی کیوں نہ ہو۔

البتہ لغت کے اعتبار سے ہر پیشوا کو امام کہا جاسکتا ہے جیسے امام جماعت وغیرہ۔ کافروں کے قائد کے لیے بھی لفظ امام استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں آیا ہے: **فَقَاتِلُوٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ** کفر کے اماموں سے لڑو کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ (سورۂ توبہ: آیت ۱۲)

تاہم علم کلام میں لفظ امام رسول خدا ﷺ کے جانشین کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس سے

مراد تمام مسلمانوں پر ان کے دینی و دنیاوی امور میں حکومت الٰہیہ ہے اور امت پر واجب ہے کہ وہ ایسے امام کی پیروی و اطاعت کریں۔ بالفاظ دیگر نبی کے جانشین اور امام کا اسلامی معاشرے کا رہبر و قائد ہونا تین لحاظ سے ضروری ہے چاہے وہ حکومت ہو یا معارف و احکامات دین کے بیان یا پھر روحانی زندگی کی رہبری کے لحاظ سے ہو۔ اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس منصب پر وہی شخص فائز ہوسکتا ہے جس کا تقرر خود اللہ تعالیٰ کرے اور اسے الہامات ربانی کی تائید بھی حاصل ہو اس لیے کہ جس طرح کسی دین کو معرض وجود میں لانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی مبعوث ہوتا ہے، اسی طرح اس دین کی حفاظت اور بقا کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کے لطف سے امام کا معین کیا جانا لازمی ہے۔

اپنے عقیدے کی صحت پر شیعوں نے بہت سی دلیلیں پیش کی ہیں۔ ان میں معروف ترین دلیل دلیل لطف ہے یعنی معاشرے کا نظم ونسق قانون الٰہی کے بغیر برقرار نہیں رکھا جاسکتا۔ کسی قانون کے بغیر معاشرے میں انتشار، بے راہ روی اور افراتفری پیدا ہوجاتی اس لیے لوگوں کے باہمی روابط کے حدود، ان کے فرائض اور اخلاقی ذمے داریوں کا تعین کیا جانا ضروری تھا تاکہ وہ سعادت ابدی حاصل کرسکیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف وکرم سے ہر دور میں لوگوں کی طرف ایک نبی کو بھیجا تاکہ وہ لوگوں کی مادّی اور معنوی ترقی کی طرف ہدایت کرے۔ قرآن مجید میں ہے: لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ اللہ نے مومنین پر یہ لطف و احسان فرمایا کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک پیغمبر کو مبعوث کیا جو اللہ کی آیات ان کو پڑھ کر سناتا ہے اور ان کے نفس کا تزکیہ کرتا ہے۔ ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ لوگ پہلے کھلم کھلا گمراہی میں تھے۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۱۶۴)

دلیل لطف کو اہلسنت بھی پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت کی دلیل کے طور پر قبول کرتے ہیں لیکن امام کے بارے میں اسے تسلیم نہیں کرتے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم کامل ہے اور اس میں کہیں کمی نہیں ہوسکتی اس بنا پر امام کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ رسول خدا ﷺ کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصوب ہو اور پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں لوگوں کو اس کا تعارف کرایا ہو۔ غدیر خم کے میدان میں آیہ تبلیغ اس امر کا ثبوت ہے جیسا کہ اشارہ کیا جاچکا ہے۔

خواجہ نصیر الدین طوسی (۵۹۷ھ - ۶۷۲ھ) اپنی کتاب "تجرید الاعتقاد" میں لکھتے ہیں:

اَلْاِمَامُ لُطْفٌ فَيَجِبُ نَصْبُهٗ عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى تَحْصِيْلًا لِلْغَرَضِ امام اللہ تعالیٰ کا لطف ہے اس لیے امام کا اس کی جانب سے منصوب ہونا ضروری ہے تاکہ مقصد خداوندی حاصل ہو۔

دلیل لطف[۱] کے علاوہ بھی قرآن مجید میں ایسی آیات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ

---

۱۔ شیخ ابو جعفر محمد بن حسن طوسیؒ (۳۸۵ھ۔ ۴۶۰ھ) فرماتے ہیں:

اَللُّطْفُ عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى وَاجِبٌ لِاَنَّهٗ خَلَقَ الْخَلْقَ وَ جَعَلَ فِيْهِمُ الشَّهْوَةَ فَلَوْ لَمْ يَفْعَلِ اللُّطْفَ لَزِمَ الْاِغْرَآءُ وَ ذٰلِكَ قَبِيْحٌ فَاللُّطْفُ هُوَ نَصْبُ الْاَدِلَّةِ وَ اِكْمَالُ الْعَقْلِ وَ اِرْسَالُ الرُّسُلِ فِيْ زَمَانِهِمْ وَ بَعْدَ انْقِطَاعِهِمْ اِبْقَآءُ الْاِمَامِ لِئَلَّا يَنْقَطِعَ خَيْطُ غَرَضِهٖ یعنی لطف اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کیونکہ اس نے اپنے بندوں کو نفسانی خواہشات کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اگر وہ اپنا لطف ان کے شاملِ حال نہ کرے تو اس سے دھوکا دینا لازم آئے گا جو بری بات ہے۔ لطف کا مطلب ہے دلائل کا قائم کرنا، عقل کو کامل کرنا اور ہر زمانے میں رسولوں کو بھیجنا اور رسالت کے منقطع ہونے کے بعد امام کو باقی رکھنا ہے تاکہ غرضِ تخلیق کی ڈور ٹوٹ نہ جائے۔

نیز علامہ سید ہاشم معروف حسنی فرماتے ہیں:

اشاعرہ کہتے ہیں کہ امام کا تقرر اس وقت لطف کہلا سکتا ہے جب وہ صاحبِ اقتدار ہو اور امر و نہی کی طاقت رکھتا ہو لیکن ائمہ اہلبیتؑ تو ہر دور میں اقتدار سے محروم رہے ہیں۔ نیز اگر امام مقرر کرنا خدا پر واجب ہے تو یہ کسی ایک زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہو سکتا۔ امام کا تقرر اگر خدا پر کل تک واجب تھا تو آج بھی واجب ہے جبکہ آج شیعوں کا امام غائب ہے۔ اس کا لوگوں سے اور لوگوں کا اس سے کوئی رابطہ نہیں۔ ایسے روپوش امام کا کیا فائدہ ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ امام غائب کو بھی اللہ نے مقرر کیا ہے تاکہ وہ لوگوں کی رہنمائی کر کے انھیں اطاعت کے قریب لائے اور معصیت سے دور رکھے تب بھی عملی طور پر ایسے امام کا کوئی فائدہ نہیں۔ لہٰذا امام کا وجود اور عدم برابر ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ''امام مقرر کرنا خدا پر واجب نہیں ہے'' بلکہ اللہ پر سرے سے کوئی چیز واجب ہی نہیں اور نہ ہی اس کے کسی فعل کو قبیح کہا جا سکتا ہے۔ یہ امت کے لیے واجب کفائی ہے کہ وہ کسی عادل شخص کو امام منتخب کرے۔ اگر امت کے تمام افراد اس ذمے داری کو چھوڑ دیں تو سب گنہگار ہوں گے اسی لیے صحابہ نے رسول خدا ﷺ کی وفات کے فوراً بعد امام کا تقرر کیا تھا۔ بعد ازاں مسلمان ہر دور میں ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔ مسلمانوں کے مسلسل عمل سے امت کا اجماع ثابت ہوتا ہے اور کتاب اللہ کے بعد اجماع کو شرعی دلائل میں سب سے نمایاں مقام حاصل ہے۔ علمائے امامیہ نے ہر دور میں اس طرح کے سوالات کے جوابات دیئے ہیں اور کہا ہے کہ اللہ ایسے امام کا انتخاب کرتا ہے جس میں امت کی رہنمائی کی پوری صلاحیت ہوتی ہے اور وہ اپنے نبی کی زبان مبارک سے اس کا اعلان کرا دیتا ہے۔ اللہ ایسے شخص کا انتخاب کرتا ہے جو اپنی ذمے داریوں سے پہلو تہی نہیں کرتا۔ اللہ نے تو یہ سب کچھ کر دیا ہے۔ اب امام کے لیے اگر اسباب مہیا ہوں تو وہ رہنمائی کرتا ہے۔ ہماری نظر میں لطف کا بس یہی مفہوم ہے کہ بندوں کے لیے اطاعت کے وسائل اللہ کی طرف سے فراہم کر دیے جائیں اور وہ اللہ نے یقیناً فراہم کر دیے تھے۔ اللہ نے امت کے لیے صاحبِ حکمت سربراہ کا انتخاب کیا اور ان کی رہنمائی کے لیے جس جس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ سب مہیا کر دیں لیکن بندوں نے ہی سوءِ اختیار سے ان کی رہنمائی کو قبول نہیں کیا۔ کچھ لوگوں نے ان سے جنگ کی اور کچھ لوگوں نے ان کی مدد سے منہ موڑ لیا۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں      راہ دکھلائیں کسے؟ رہروِ منزل ہی نہیں

جب امام مہدیؑ کی زندگی چاروں اطراف سے خطرات میں گھر گئی تو وہ غیبت میں چلے گئے۔ جب وہ فضا کو اپنے لیے سازگار پائیں گے تو دوبارہ ظاہر ہو کر اپنی ذمے داری ادا کریں گے۔ یہ سب کچھ امت کا کیا دھرا ہے۔ اس میں امام کا کوئی دوش نہیں۔ اگر امام کو ایسے افراد ملتے جو ان کی بات سنتے اور پیغام رسانی میں ان کی مدد کرتے تو انھیں لوگوں سے پردہ کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ (تصوف اور تشیع کا فرق، مطبوعہ مجمع علمی اسلامی) رضوانی

امامت اور خلافت خدائی منصب اور عنایت ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۳۰)

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ○ جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اترے تو اس نے کہا: میں تمھیں لوگوں کا امام بناؤں گا۔ انھوں نے کہا: پروردگار میری اولاد میں سے بھی امام بنانا؟ اللہ نے فرمایا کہ میرا یہ عہدہ ظالموں کے لیے نہیں ہوا کرتا۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۱۲۴)

ان دونوں آیات میں اللہ تعالیٰ نے صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ خلیفہ اور امام کا تقرر وہ خود کرتا ہے اور امامت کا منصب ظالموں کو نہیں ملا کرتا یعنی امام کا ظالم نہ ہونا خود عصمت امام کی دلیل ہے لہٰذا اگر اہلسنت کے عقیدے کے مطابق امام کا تقرر اور انتخاب شوریٰ اور اجماع کے ذریعے ہی ہوتا ہے تو پھر ان آیات کے کیا معنی ہوں گے؟

صاحب **تفسیر المیزان** علامہ سید محمد حسین طباطبائی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: امامت کے حوالے سے قرآن میں جو آیات آئی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کہیں بھی امامت کا ذکر آیا ہے وہاں آگے چل کر ہدایت کا بھی ذکر آیا ہے۔

قرآن مجید میں ہے کہ

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ○ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا... اور ہم نے ان (ابراہیم) کو اسحاق عطا کئے اور مستزاد برآں یعقوب اور سب کو نیک بنایا۔ اور ہم نے ان کو امام بنایا جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں۔ (سورۂ انبیاء: آیت ۷۲۔۷۳)

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ جب (بنی اسرائیل) نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین رکھا تو ہم نے ان میں ایسے امام مقرر کئے جو ہمارے حکم سے ہدایت کیا کرتے تھے۔ (سورۂ سجدہ: آیت ۲۴)

ان آیات پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ ان میں ذکر امامت کے بعد ہدایت کو بطور تفسیر بیان کیا گیا ہے اور يَهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا کی قید لگا کر بتایا گیا ہے کہ یہ وہ ہادی ہیں جو خدا کے حکم سے ہدایت کرتے ہیں۔ گویا بتایا گیا ہے کہ امامت کا منصب وہ منصب ہے جو ہدایت کرنے والوں کے لیے مخصوص ہے۔

یہ لوگوں پر ولایت کے معنی میں ہے جو کہ باطنی لحاظ سے ہدایت کے ہم معنی ہے۔ نیز یہاں ہدایت سے مراد منزل تک پہنچانا ہے نہ کہ راستا دکھانا جو انبیاء اور عام مومنین کا بھی طریقہ کار ہے کہ وہ وعظ ونصیحت کے ذریعے لوگوں کو اللہ کے راستے کی طرف دعوت دیتے ہیں۔[1]

ایک اور بات جس کی طرف توجہ دینا ضروری ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ''عہدہ امامت عطا کرنے کی دلیل'' یوں بیان کی ہے لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ (یعنی جب انھوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین رکھا)۔ اس بنا پر اس منصب کے عطا کرنے کا سبب راہ خدا میں مطلق صبر وثبات ہے جو ہر طرح کی آزمائش میں کامیابی کے ساتھ ساتھ مقام یقین پر فائز ہونا بھی ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ ہی کے متعلق ارشاد ہوا ہے: وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ اور اس طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت دکھلاتے رہے تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہوجائیں۔ (سورۂ انعام: آیت ۷۵)

لہٰذا امام کے لیے ضروری ہے کہ یقین کے اس مقام پر ہو جہاں عالم ملکوت اس پر منکشف ہوں۔ اسی طرح امامت کے عظیم منصب کا وہی اہل ہوسکتا ہے جو ذاتی طور پر سعادت مند ہو ورنہ اس سے ظلم سرزد ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں وہ اس منصب کی صلاحیت سے محروم اور خود دوسرے کی ہدایت کا محتاج ہوگا اور یہ بات منصب ہدایت کے شایان شان نہیں۔ (اقتباس از ترجمہ تفسیر المیزان ج ۲، ص ۹۳ تا ۹۶)

ممکن ہے کہ کوئی یہ سوال کرے کہ حضرت علی علیہ السلام کے پاس تو صرف عہدہ امامت تھا وہ سابقہ انبیاء جیسے حضرت ابراہیمؑ جو نبی بھی تھے اور امام بھی سے کیونکر افضل ہوسکتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ عہدۂ امامت کے بھی مختلف درجات ہیں۔ جس طرح تمام انبیاء کی نبوت یکساں نہیں تھی اسی طرح امامت کے بھی مختلف درجات ہیں اور حضرت علی علیہ السلام امامت کے کامل ترین درجے پر فائز تھے۔ (تفسیر نمونہ ج ۱، ص ۳۱۴)

---

۱۔ ہدایت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک راستا بتانا اور دوسری منزل مقصود تک پہنچانا۔
اگر کوئی شخص کسی سے راستا پوچھے اور وہ پوچھنے والے کو منزل مقصود تک پہنچنے کا راستا بتا دے تو اسے ہدایت کی پہلی قسم کہیں گے لیکن اگر وہ شخص پوچھنے والے کو ساتھ لے جا کر منزل مقصود تک پہنچائے تو یہ ہدایت کی دوسری قسم ہے۔ انبیاء و رسلؑ کی ہدایت پہلی نوعیت کی تھی اور امام کی ہدایت دوسری قسم کی ہے۔ تاہم یہ ہدایت زبردستی نہیں بلکہ اختیار اور نفوس کی اہلیت پر منحصر ہے بالکل ویسے ہی جیسے بارش سے ہر جگہ سبزہ نہیں اگتا بلکہ اس کے لیے زمین میں سبزہ اگانے کی صلاحیت ہونا ضروری ہے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ امام کے لیے درجہ یقین پر فائز ہونا ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت دکھلائے تا کہ وہ اہل یقین میں سے ہو جائیں لیکن حضرت علی علیہ السلام کا یقین حضرت ابراہیمؑ کے یقین سے بالا تر تھا۔ اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یقین رکھنے کے باوجود خدا سے درخواست کی تھی: رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَىٰ پروردگار مجھے دکھا دے کہ تو کس طرح مردے کو زندہ کرتا ہے؟ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۶۰) لیکن حضرت علیؑ فرماتے ہیں: لَوْ كُشِفَ الْغِطَاءُ مَا ازْدَدْتُ يَقِينًا اگر پردے ہٹا دیئے جائیں تب بھی میرے یقین میں اضافہ نہیں ہوگا۔

بہر حال جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عہدۂ امامت منشائے خداوندی پر موقوف ہے اور لوگ کسی کو اس کے لیے منتخب نہیں کرسکتے چاہے وہ کتنے ہی بابصیرت اور قابل کیوں نہ ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک اولو العزم اور برگزیدہ پیغمبر تھے۔ انھوں نے اپنی پوری قوم میں سے صرف ۷۰ افراد کو منتخب کیا جو ظاہراً مطلوبہ صلاحیت کے حامل تھے۔ بنی اسرائیل کے یہ افراد جو کوہِ طور پر لے جائے گئے ان کی قوت فہم و ادراک بس اتنی سی تھی کہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: أَرِنَا اللَّهَ جَهْرَةً ؟ ہمیں اللہ کا دیدار کرائیے؟ (سورۂ نساء: آیت ۱۵۳) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے انتخاب کردہ لوگوں کا یہ حال ہے تو دوسروں کا انتخاب کیسا ہوگا؟

پھر یہ بات سب مسلمانوں پر عیاں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علوم الہیہ کے ترجمان اور گنجینہ اسرار حق تھے۔ آپ کے بارے میں قرآن کہتا ہے: عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ پیغمبرؐ کو شدید قوت رکھنے والے نے پڑھایا۔ (سورۂ نجم: آیت ۵) اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین صرف وہی ہوسکتا ہے جو صفات و کمالات میں آپ کا مظہر اور وارث ہو کیونکہ وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسند پر جلوہ فگن ہو کر آپ کی امت کی رہبری کرسکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں امام کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ بھی قدسی صفات ہو اور اس میں ایسی مشابہت موجود ہو جس کی بنا پر اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین کہا جاسکے اور یہ وہ شرائط اور خصوصیات ہیں جو حضرت علی علیہ السلام کے سوا کسی اور میں موجود نہیں ہیں۔ ہم مزید وضاحت کے لیے ایک عام مثال پیش کر رہے ہیں۔

فرض کیجیے ایک ڈاکٹر جو امراض قلب کا ماہر ہے اگر ایک عرصے کے لیے ملک سے باہر چلا جائے اور اپنے کلینک میں کسی ایسے شخص کو اپنی جگہ چھوڑ جائے جو اس کی عدم موجودگی میں دل کے مریضوں کا علاج کرسکے تو وہ امراض قلب ہی کے کسی ماہر کو اپنی جگہ پر مقرر کرے گا نہ کہ کسی عام شخص کو

بلکہ وہ ڈاکٹر اپنی جگہ کسی دوسرے شعبے کے ماہر ڈاکٹر مثلاً ماہر امراض چشم کو بھی نہیں مقرر کرے گا۔ اسی طرح ایک لوہار وقتی طور پر ہی سہی اپنی جگہ کسی کو اپنا جانشین بنانا چاہے گا تو اپنے ہی ہم پیشہ شخص کو تلاش کرے گا کسی قصاب کو اپنی جگہ بٹھا کر نہیں جائے گا۔ یہ بات تمام صاحبان عقل پر واضح ہے۔ اسی بنا پر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا تھا: نَحْنُ شَجَرَةُ النُّبُوَّةِ وَمَحَطُّ الرِّسَالَةِ وَمُخْتَلَفُ الْمَلَائِكَةِ وَمَعَادِنُ الْعِلْمِ وَيَنَابِيعُ الْحُكْمِ ہم نبوت کا شجر، رسالت کی منزل، ملائکہ کی آمدورفت کی جگہ، علم کے معدن اور حکمت کے چشمے ہیں۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۰۷)

ایک اور خطبے میں امام نے فرمایا ہے: اَلَا إِنَّ مَثَلَ آلِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ كَمَثَلِ نُجُومِ السَّمَاءِ إِذَا خَوَى نَجْمٌ طَلَعَ نَجْمٌ دیکھو! آل محمدؐ کی مثال آسمان کے ستاروں جیسی ہے کہ جب ایک ستارہ غائب ہو جاتا ہے تو دوسرا نکل آتا ہے (یعنی ایک امام کے بعد دوسرا امام آجاتا ہے)۔

(نہج البلاغہ، خطبہ ۹۸)

حضرت علی علیہ السلام ایک اور خطبے میں ارشاد فرماتے ہیں: أَيْنَ الَّذِينَ زَعَمُوا أَنَّهُمُ الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ دُونَنَا كَذِبًا وَبَغْيًا عَلَيْنَا أَنْ رَفَعَنَا اللّٰهُ وَوَضَعَهُمْ وَأَعْطَانَا وَحَرَمَهُمْ وَأَدْخَلَنَا وَأَخْرَجَهُمْ. بِنَا يُسْتَعْطَى الْهُدَى وَيُسْتَجْلَى الْعَمَى. إِنَّ الْأَئِمَّةَ مِنْ قُرَيْشٍ غُرِسُوا فِي هٰذَا الْبَطْنِ مِنْ هَاشِمٍ، لَا تَصْلُحُ عَلَى سِوَاهُمْ وَلَا تَصْلُحُ الْوُلَاةُ مِنْ غَيْرِهِمْ کہاں ہیں وہ لوگ جن کا خیال ہے کہ ہمارے بجائے وہی راسخون فی العلم ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ جھوٹ اور ہمارے خلاف بغاوت ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بلندی و برتری عطا فرمائی ہے اور انھیں پست رکھا ہے۔ اس نے ہمیں اپنے کمالات عنایت فرمائے اور انھیں ان سے محروم رکھا۔ ہمیں اپنی رحمت میں داخل کرلیا اور انھیں باہر رکھا۔ ہمارے ہی ذریعے سے ہدایت طلب کی جاتی ہے اور اندھیروں میں روشنی حاصل ہوتی ہے۔ یاد رکھو! دین کے تمام امام قریش میں نسل ہاشم سے قرار دیئے گئے ہیں۔ امامت و خلافت ان کے علاوہ نہ تو کسی کو زیب دیتی ہے اور نہ ہی ان سے باہر کوئی اس کا اہل ہوسکتا ہے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۴۲)

امام زین العابدین علیہ السلام ختم قرآن کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ أَنْزَلْتَهُ عَلَى نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ مُجْمَلًا وَ أَلْهَمْتَهُ عِلْمَ عَجَائِبِهِ مُكَمَّلًا، وَ وَرَّثْتَنَا عِلْمَهُ مُفَسَّرًا، وَ فَضَّلْتَنَا عَلَى مَنْ جَهِلَ عِلْمَهُ وَقَوَّيْتَنَا عَلَيْهِ لِتَرْفَعَنَا فَوْقَ مَنْ لَمْ يُطِقْ حَمْلَهُ. اَللّٰهُمَّ فَكَمَا جَعَلْتَ قُلُوبَنَا لَهُ حَمَلَةً وَعَرَّفْتَنَا بِرَحْمَتِكَ شَرَفَهُ وَفَضْلَهُ فَصَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ الْخَطِيبِ بِهِ وَعَلَى آلِهِ الْخُزَّانِ لَهُ.

بار الہا! تو نے قرآن کو اپنے نبی حضرت محمد ﷺ پر اجمالی طور پر نازل فرمایا اور اس کے عجائب و اسرار کا علم آنحضرت ﷺ پر الہام کیا۔ اس کی تفسیر ہمیں میراث میں عطا فرمائی۔ جو قرآن کا علم نہیں رکھتے ان پر تو نے ہمیں فضیلت بخشی۔ ہماری قوت و توانائی میں اس کے ذریعے اضافہ فرمایا، ہمارے مرتبے کو اس پر بلند کر دیا جو اس کے علم کو برداشت کرنے کی تاب نہیں رکھتا۔ بار الہا! جس طرح تو نے ہمارے دلوں کو اس کی حفاظت کے قابل قرار دیا اور اپنے رحم و کرم سے ہمیں اس قرآن کے شرف اور فضل کی معرفت عطا فرمائی۔ درود و سلام بھیج حضرت محمدؐ پر جو اس کو بیان کرنے والے تھے اور آپ کی آلؑ پر جو آپ کے علم کے خزینہ دار ہیں۔ (صحیفہ سجادیہ، دعا ۴۲)

مذکورہ بالا کلام امام سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم کے لیے ایک ایسا مفسر بھی ضروری ہے جسے اللہ تعالیٰ کے الہام سے تائید حاصل ہو۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص اس مقام کا اہل نہیں ہو سکتا اور یہیں سے رسول خدا ﷺ کی رحلت کے موقع پر حضرت عمرؓ کا قول حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ کا بطلان ہوتا ہے کیونکہ مفسر کے بغیر صرف کتاب خدا سے مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا مثال کے طور پر اگر علم طب کی کوئی کتاب لوگوں کے حوالے کی جائے تو وہ کتاب بیماروں کو طبیب سے بے نیاز نہیں کر سکتی بلکہ ایک ماہر طبیب کا وجود ضروری ہے تاکہ وہ خود اس سے استفادہ کرے یا دوسروں کو اس کی تعلیم دے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول خدا ﷺ نے ''حدیث ثقلین'' میں جو شیعہ و سنی دونوں کے نزدیک معتبر اور متواتر حدیث ہے قرآن کے ساتھ ساتھ عترت سے بھی وابستہ رہنے کی تلقین فرمائی اور بتایا ہے وَلَنْ يَّفْتَرِقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ ان دونوں میں ہرگز جدائی نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ میرے پاس حوض کوثر تک پہنچ جائیں۔

(ذخائر العقبیٰ ص ۱۶)

پھر یہ بات تاریخی اور عملی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ خود بھی اپنے دور خلافت میں پیچیدہ مسائل اور مشکلات کا حل کتاب خدا سے تلاش نہ کر سکے اور انھیں حضرت علی علیہ السلام سے مدد مانگنا پڑی اور وہ لَوْلَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ کہتے ہوئے نظر آئے جبکہ حضرت علی علیہ السلام جو الہامات ربانی کے حامل اور قرآن ناطق تھے ہر مشکل میں حضرت عمرؓ کی مشکل کشائی فرماتے رہے۔

متشابہ آیات کی تفسیر، مجملات کی تفصیل، مبہم احکامات کی توضیح، علمی اور عدالتی مسائل وہ امور ہیں جو ایسی شرائط و قابلیت کا تقاضا کرتے ہیں کہ جن کی وجہ سے امام کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے کیونکہ امام کا فتویٰ فقیہ کے فتوے کی طرح استنباط سے نہیں بلکہ علم امامت کے مطابق لدنی اور الہامی علم

کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس لیے ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ جب بھی امام سے کوئی مشکل سوال کیا گیا تو انھوں نے اس کو مشابہ احکامات سے استنباط کرنے کی بجائے فوراً اس کا درست جواب دیا۔ نیز جہاں کہیں بھی قرآن کی کسی آیت کے بارے میں کوئی ابہام نظر آیا تو امام نے اس کی تفسیر بیان کر کے مقصود خداوندی کو آیت کی شان نزول کے مطابق واضح فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ شیعوں کی نظر میں امامت ، نبوت ہی کی طرح ایک خدائی منصب ہے نیز اَهْلُ الْبَيْتِ اَدْرٰى بِمَا فِي الْبَيْتِ (اہلخانہ بہتر جانتے ہیں کہ گھر میں کیا ہے) کے اصول کے مطابق ائمہ اپنے لدنی اور الہامی علم سے خدا و رسولؐ کے مقصود کو پوری طرح جانتے ہیں۔

ان معروضات کی تکمیل کے لیے ہم امام علی رضا علیہ السلام کی اس حدیث کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں جو شیخ کلینیؒ اور شیخ صدوقؒ نے عبد العزیز بن مسلم کے حوالے سے بیان کی ہے۔

عبد العزیز بن مسلم کہتا ہے کہ امام علی رضا علیہ السلام ابھی شہر مرو میں آئے ہی تھے کہ میں امام کی خدمت میں حاضر ہوا اور امامت کے متعلق لوگوں کے درمیان اختلاف کے بارے میں آپ سے گفتگو کی تو آپ نے مسکرا کر فرمایا: اے عبد العزیز! لوگ ناسمجھ ہیں اور اپنے قیاس کے دھوکے میں آگئے ہیں اس لیے کہ خدا نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح پاک کو اس وقت تک قبض نہیں فرمایا جب تک ان کے لیے دین کو کامل نہ کر دیا۔ خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن نازل فرمایا جس میں ہر شے کی تفصیل موجود ہے۔ جس میں حلال و حرام اور جملہ احکامات و مقررات کا ذکر ہے جو نوع بشر کی ضرورت ہیں اور امامت کو اکمال دین کا سبب قرار دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دار فانی سے دار بقا کی طرف اس وقت سفر کیا جب آپ لوگوں تک دین کے تمام احکامات نہ پہنچا چکے تھے ، امت کو سچائی اور حق کا راستا بتا چکے تھے اور حضرت علی علیہ السلام کو امام بنا چکے تھے۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر آخرت اختیار کیا تو اس وقت کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کی امت کو ضرورت ہو اور آپ نے وہ اس کو نہ بتائی ہو۔ پس جو کوئی بھی یہ گمان رکھتا ہے کہ حق تعالیٰ نے دین کو نامکمل چھوڑ دیا ہے وہ قرآن کی تردید کرتا ہے اور جو قرآن کا رد کرے وہ کافر ہے۔

آیا لوگوں کو مقام امامت کی معرفت حاصل ہے کہ وہ امام کا انتخاب کر سکیں۔ امامت تو ایک ایسا جلیل القدر منصب ہے جہاں عام لوگوں کی عقلیں نہیں پہنچ سکتیں اور جب اس عظیم منصب کا شعور ہی ان کے لیے ممکن نہیں تو پھر ان کو اس منصب پر کسی کو فائز کرنے کا حق کیونکر دیا جا سکتا ہے؟ خدا نے نبوت اور خلت عطا کرنے کے بعد تیسرے مرحلے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے امامت کو مخصوص کر کے انھیں بزرگی بخشی اور فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ...

اس آیت میں قیامت تک ظالموں کو عہدۂ امامت کے لیے نااہل قرار دیا گیا ہے اور اسے اللہ نے صرف اپنے برگزیدہ بندوں کے لیے مخصوص فرمایا ہے۔

پھر حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کو یہ شرف بخشا کہ ان کی نسل میں سے ہی طیب و طاہر اور معصوم بندوں کو امامت سے سرفراز فرمایا۔ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ ○ وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ ۖ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ ○ اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق عطا کئے اور مستزاد برآں یعقوب اور سب کو نیک بنایا۔ اور ہم نے ان کو امام بنایا جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں۔ ہم نے ان کی طرف کار خیر کرنے، نماز قائم کرنے اور زکات دینے کی وحی کی اور یہ سب ہمارے عبادت گزار بندے ہیں۔ (سورۂ انبیاء: آیت ۷۲۔۷۳)

اس بنا پر امامت کا سلسلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طیب و طاہر اولاد میں کئی صدیوں تک جاری رہا یہاں تک کہ خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے وارث بنے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا بیشک ابراہیم سے قریب ترین وہ ہیں جنھوں نے ان کی پیروی کی اور پھر یہ نبیؐ اور ان کے ماننے والے اس نسبت کے حقدار ہیں۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۶۸)

گویا امامت بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختص تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ منصب حضرت علی علیہ السلام کے سپرد فرمایا جو بعد میں ان کی اولاد میں یکے بعد دیگرے منتقل ہوتا رہا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَالْإِيمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِلَىٰ يَوْمِ الْبَعْثِ جو اہل علم اور اہل ایمان تھے وہ کہیں گے کہ اللہ کے نوشتے میں تو تم روز حشر تک پڑے رہے سو یہ وہی روز حشر ہے لیکن تم جانتے نہ تھے۔ (سورۂ روم: آیت ۵۶)

یہاں اہل علم سے مراد ائمہ اہلبیتؑ ہیں۔ اس بنا پر قیامت تک عہدۂ امامت اولاد علیؑ کے لیے مخصوص ہے اس لیے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ پھر یہ نادان لوگ کس طرح ائمہ اطہارؑ کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا امام مقرر کر سکتے ہیں؟

امامت درحقیقت مقام انبیاء اور میراثِ اوصیاء ہے۔ خدا و رسولؐ کی خلافت اور امیرالمومنین (علیؑ) کا مقام و مرتبہ، امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کی میراث ہے۔

امامت دین کی باگ ڈور، مسلمانوں کا وقار، ملت کے نظام کی اساس اور دنیا کی اصلاح سے متعلق ہے۔ امامت شجر اسلام کو پروان چڑھاتی ہے اور یہ اس کی بلند شاخ ہے۔ نماز کا مکمل ہونا، روزہ،

زکات، حج اور جہاد کی ادائیگی، مال غنیمت کی فراوانی، صدقات و خیرات اور احکامات و حدود کا نفاذ سب کچھ امامت پر منحصر ہے۔ یہ امام ہی تو ہے جو حرام خدا کو حرام، حلال خدا کو حلال، حدود الٰہی کے نفاذ، خدا کی پسندیدہ و ناپسندیدہ چیزوں کو حکمت و موعظہ کے ذریعے واضح کرنے کا ذمے دار ہوتا ہے اور ان امور پر اللہ کی روشن دلیل بھی امام خود ہے۔

امام کی مثال سورج جیسی ہے جس سے پوری دنیا روشنی حاصل کرتی ہے حالانکہ وہ دور افق پر ہوتا ہے جس تک پہنچنا محال ہے۔ امام ماہِ کامل کی طرح ہے جو ہر طرف اجالا کر دیتا ہے۔ امام اندھیروں میں ہدایت کا جھلملاتا ستارہ ہے جو تاریک راہوں، بیابانوں اور سمندروں میں لوگوں کے لیے نشان راہ ہے۔ امام اس شیرین اور خوش ذائقہ پانی کی مانند ہے جس سے ہر پیاسا اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔ امام ہی اللہ کا امین ہے، وہی روئے زمین پر بندگان خدا کے لیے اللہ کی حجت ہے۔ وہی لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہے اور وہی لوگوں کے حقوق کا دفاع بھی کرتا ہے۔ امام ہر گناہ سے پاک ہوتا ہے اور ہر عیب سے مبرا بھی۔ امام مخصوص علم اور حلم سے آراستہ ہوتا ہے۔ وہ دین کا نظام اور مسلمانوں کی عزت کی علامت ہوتا ہے جبکہ منافقین کے لیے غضب اور کافروں کے لیے ہلاکت کا پیغام ہوتا ہے۔

ہر امام اپنے زمانے کا یگانہ روزگار ہوتا ہے۔ کوئی سخنور، دانشور اور عالم اس کے علم کے مقابلے کی تاب نہیں رکھتا۔ امام کی کوئی مثل اور نظیر نہیں ہوتی۔ وہ بغیر اکتساب کے صاحب فضل و کمال ہوتا ہے کیونکہ یہ عطیہ خدائے وہاب ہے۔ لہٰذا کون ہے جو اس کی عظمت و فضیلت کو پا سکے؟ اس کی شناخت کر سکے؟ کون ہے جس کے لیے یہ ممکن ہو کہ وہ اپنے لیے خود امام کا انتخاب کر سکے؟

افسوس! ان نادانوں پر جو وادی ضلال میں بھٹک رہے ہیں مگر اس امر کے بارے میں سوچ رہے ہیں جس نے داناؤں کو بھی حیران کر رکھا ہے۔ جس نے دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور خطیبوں کو گنگ کر دیا ہے۔ اس صورت میں کون امام کی پوری معرفت حاصل ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ جب کوئی امام کے فضائل و اوصاف بیان نہیں کر سکتا اور امام کے کسی کام کی حکمت کو نہیں سمجھ سکتا تو وہ اس کی جگہ لینے یا اس سے بے نیاز ہونے کا دعویٰ کیونکر کر سکتا ہے؟ امام اس ستارے کی مانند ہے جو ہماری دسترس سے دور ہے۔ کہاں لوگوں کا اختیار؟ اور کہاں امام؟ دونوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

پھر بھی لوگ یہ گمان رکھتے ہیں کہ علیؑ اور اولاد علیؑ کے سوا بھی کوئی امام ہو سکتا ہے۔ خدا کی قسم! ایسا سوچنے والے فریب کھا رہے ہیں اور خام خیالی میں مبتلا ہیں۔

جو لوگ فریب کھا کر امامت کا دعویٰ کرتے ہیں وہ جتنی شدت سے امام ہونے کا دعویٰ کریں گے اتنا ہی خدا ان کو اپنے سے دور کرتا جائے گا یہاں تک کہ گمراہی ان کا مقدر بن جائے گی کیونکہ وہ اپنی مرضی سے بصیرت کے راستے سے دور جا پڑے ہیں اور انھوں نے شیطان کی پیروی کر کے اسے یہ موقع دیا ہے کہ وہ باطل کو ان کے عمل میں ظاہر کرے حالانکہ وہ پہلے اہل بصیرت تھے۔ قرآن مجید فرماتا ہے : وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ○ ان کے اعمال کو شیطان نے ان کے لیے خوشنما بنا دیا اور انھیں راہ راست سے بھٹکا دیا حالانکہ وہ پہلے بصیرت رکھتے تھے۔ (سورۂ عنکبوت : آیت ۳۸)

اور کچھ لوگوں نے بے بصیرتی کا ثبوت دیا۔ انھوں نے خدا و رسولؐ اور عترت رسولؐ سے منہ موڑ کر اپنے بنائے ہوئے پیشواؤں کو اللہ کے انتخاب پر ترجیح دی۔

قرآن مجید فرماتا ہے :

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ تیرا رب پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور وہ خود ہی اپنے کام کے لیے جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔ یہ انتخاب لوگوں کے کرنے کا کام نہیں ہے۔

(سورۂ قصص : آیت ۶۸)

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں۔ (سورۂ احزاب : آیت ۳۶)

مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ○ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ○ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ○ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ○ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ○ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ○ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ تم کیسے حکم لگاتے ہو؟ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں یہ تم پڑھتے ہو کہ تمہارے لیے ضرور وہاں وہی کچھ ہے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو یا پھر کیا تمہارے لیے قیامت تک ہم پر کچھ عہد و پیمان ثابت ہیں کہ تمھیں وہی کچھ ملے گا جس کا تم حکم لگاؤ۔ ان سے پوچھو تم میں کون اس کا ضامن ہے؟ یا پھر ان کے ٹھہرائے ہوئے کچھ شریک ہیں جنھوں نے اس کا ذمہ لیا ہو؟ یہ بات ہے تو لائیں اپنے ان شریکوں کو اگر وہ سچے ہیں۔

(سورۂ قلم : آیت ۳۶ تا ۴۱)

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ○ کیا ان لوگوں نے قرآن پر غور و فکر نہیں کیا یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں؟ (سورۂ محمد: آیت ۲۴)

وَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَفْقَهُوْنَ○ ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہیں تو یہ سمجھتے ہی نہیں۔

(سورۂ توبہ: آیت ۸۷)

قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ○ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ○ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِیْهِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ ان لوگوں کی طرح نہ ہوجاؤ جنھوں نے کہا کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ نہیں سنتے۔ یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے اگر اللہ کو معلوم ہوتا کہ ان میں کچھ بھی بھلائی ہے تو وہ ضرور انھیں سننے کی توفیق دیتا (لیکن بھلائی کے بغیر) اگر وہ ان کو سنواتا تو وہ بے رخی کے ساتھ منہ پھیر جاتے۔

(سورۂ انفال: آیت ۲۱ تا ۲۳)

قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا کہتے ہیں ہم نے سن لیا پھر نافرمانی بھی کرتے ہیں۔

(سورۂ بقرہ: آیت ۹۳)

پس معلوم ہوا کہ امامت انتخاب کے ذریعے ملنے والا عہدہ نہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے

(سورۂ جمعہ: آیت ۴)

پس ان آیات کی موجودگی میں لوگوں کے لیے کیونکر جائز ہے کہ وہ اپنے لیے خود امام منتخب کریں حالانکہ امام وہ عظیم عالم ہے جس کے لیے جہل کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں ایسی طاقت ہوتی ہے کہ اس میں کسی کمزوری کا گزر نہیں ہوسکتا۔

امام درحقیقت تقدس، طہارت، اعمال حسنہ، زہد و تقویٰ اور علم و عبادت کا سرچشمہ ہے۔ اسے صرف رسول ہی امام مقرر کرتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کے بعد امام کا تعلق ان کی اور حضرت فاطمہ زہراؑ کی پاک نسل سے ہے۔ امام کا ہر عیب سے مبرا ہونا ضروری ہے اور اس کے حسب نسب میں نہ کوئی عیب ہوتا ہے اور نہ کوئی پستی۔ امام کے لیے قریشی اور ہاشمی ہونا لازمی ہے کیونکہ یہی رضائے رب ہے۔ امام سراپا علم ہوتا ہے اور اس کا حلم کامل ہوتا ہے۔ وہ سیاست سے مکمل آگہی رکھتا ہے۔ وہ صاحب امر الٰہی ہوتا ہے۔ وہ بندگان خدا کو نصیحت کرنے اور خدا کے دین کا محافظ بھی ہوتا ہے۔

خدا نے انبیاء اور ائمہؑ کو زیور توفیق سے آراستہ کیا ہے اور اپنے علم وحکمت سے اس طرح بھر دیا ہے کہ کوئی ان کی برابری نہیں کرسکتا اسی لیے وہ ہر زمانے کے لوگوں سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔

ارشاد احدیت ہے : اَفَمَنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّهْدٰى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ بھلا جو حق کا راستا دکھائے وہ اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا مگر یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے ؟ آخر تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ تم (الٹے الٹے) فیصلے کرتے ہو؟

(سورۂ یونس : آیت ۳۵)

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا جس کو حکمت ملی اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔

(سورۂ بقرہ : آیت ۲۶۹)

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا قَالُوْۤا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○ ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر کیا ہے (یہ سن کر وہ) بولے ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہوگیا ؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے۔ نبی نے جواب دیا : اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا ہے اور اس کو علمی اور جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے اللہ بڑی کشائش والا ، علم والا ہے۔

(سورہ بقرہ : آیت ۲۴۷)

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (اے رسولؐ !) اللہ نے تم پر کتاب وحکمت نازل فرمائی ہے اور تمھیں وہ کچھ بتایا ہے جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر اللہ کا بہت فضل ہے۔ (سورہ نساء : آیت ۱۱۳)

ائمہ اہلبیتؑ کے بارے میں ارشاد ہوا :

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ فَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ○ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ○ کیا یہ ان لوگوں سے اس لیے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انھیں اپنے فضل سے نواز دیا ؟ اگر یہ بات ہے تو انھیں معلوم ہو کہ ہم نے تو ابراہیم کی اولاد کو کتاب وحکمت عطا کی اور ملک عظیم بخش دیا مگر ان میں سے کوئی

اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا اور منہ موڑنے والے کے لیے تو بس جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے۔ (سورۂ نساء : آیت ۵۴۔۵۵)

جب اللہ اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب کرتا ہے تو اسے شرح صدر کی فضیلت عطا کرتا ہے۔ اس کے دل میں حکمت کے چشمے جاری کر دیتا ہے اور اسے ایسا علم لدنی عطا کرتا ہے کہ وہ کسی سوال کے جواب سے عاجز نہیں ہوتا۔ وہ اس علم کے بعد راہ حق سے منحرف بھی نہیں ہوتا اسی لیے وہ اللہ کی طرف سے معصوم ہوتا ہے۔ اسے تائید ایزدی حاصل ہوتی ہے چنانچہ وہ ہر طرح کی قولی اور فعلی لغزش سے محفوظ رہتا ہے۔ اللہ نے امام کو ایسے اوصاف سے متصف کیا ہے کہ وہ بندگان خدا پر خدا کی حجت قرار پائے اور لوگوں پر اللہ کا گواہ بن سکے۔ یہی اللہ کا فضل عظیم ہے لہٰذا لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ کیا وہ اتنی قدرت رکھتے ہیں کہ ایسے فرد کو پیدا کر سکیں اور اسے اپنا رہبر قرار دیں؟

امام علی رضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

رب کعبہ کی قسم! امام کا از خود انتخاب کرنے والوں نے بڑا ظلم کیا ہے۔ انھوں نے کتاب خدا کو پس پشت ڈال دیا ہے جیسے انھیں علم ہی نہیں کہ یہ خدا کی کتاب ہے اور اس میں ان کی ہدایت و نجات کا سامان موجود ہے۔ ان لوگوں نے کتاب خدا کو چھوڑ کر اپنی خواہش کی پیروی کی ہے اور خدا نے ایسے لوگوں کی مذمت کی ہے اور انھیں اپنا دشمن قرار دیا ہے۔ اس کا فرمان ہے:

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو اللہ کی عطا کردہ ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے؟ اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا۔ (سورۂ قصص : آیت ۵۰)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہے ان کے لیے ہلاکت ہے اور اللہ ان کے اعمال کو برباد کر دے گا۔ (سورۂ محمد : آیت ۸)

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝ یہ رویہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہے۔ اسی طرح اللہ ہر متکبر سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔ (سورۂ مومن : آیت ۳۵)

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا.

(اصول کافی، کتاب الحجت، باب نادر جامع فی فضل الامام وصفاتہ۔ شیخ صدوق، امالی، مجلس ۹۷۔ عیون اخبار الرضا، باب ۲۰)

یہ روایت بتاتی ہے کہ امامت ایک معنوی منصب ہے جس میں اللہ سبحانہٗ کا ارادہ شامل ہے۔
امام اسلامی حکومت میں مسلمانوں کے معاملات کی سرپرستی کرنے اور دنیوی زندگی میں معارف الٰہیہ کے بیان کے ساتھ ساتھ لوگوں کی اخروی زندگی کی طرف بھی ان کی ہدایت کرتا ہے۔ نیز اعمال کے حقائق اس کی رہبری سے ہی تکمیل کے مراحل طے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ عقیدے میں امام کی معرفت ایمان اور تکمیل دین کی بنیادی شرط ہے۔ معرفت امام کے بغیر دین و ایمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔
رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَعْرِفْ إِمَامَهُ (إِمَامَ زَمَانِهِ) مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً جو شخص اپنے زمانے کے امام کی معرفت کے بغیر مرگیا وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔

(کفایۃ الخصام، باب ۳۔ ۴، ح ۶۔ ینابیع المودۃ ص ۴۸۳)

یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض خود غرض اور بے خبر لوگوں اور کچھ مستشرقین کا گمان ہے کہ شیعہ ایک اقلیتی فرقہ ہے جو وفات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد معرض وجود میں آیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ اصل اسلام یعنی اہلسنت سے کٹ کر ایک الگ فرقہ بنا ہے جبکہ ایک گروہ نے تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ لغو بات کہی ہے کہ شیعہ فرقے نے صفوی عہد (۱۵۰۱ء۔ ۱۷۲۲ء) میں جنم لیا ہے حالانکہ اس طرح کے لوگ اگر تحقیق کی تھوڑی سی زحمت اٹھالیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ اصل معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اصل اسلام وہی ہے جس کی اہل تشیع پیروی کرتے ہیں۔ دوسرا گروہ وفات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اصحاب سقیفہ نے ایجاد کیا تھا اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی حیات طیبہ میں متعدد بار علیؑ اور شیعیان علیؑ کی تحسین فرما چکے تھے جیسا کہ کتب اہلسنت میں بھی بیان ہوا ہے۔ مختلف مستندات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ جب إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ [۱] کی آیت اتری تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: يَا عَلِيُّ هُمْ أَنْتَ وَشِيعَتُكَ اے علیؑ تم اور تمہارے شیعہ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ہیں۔ (شواہد التنزیل ج ۲، ص ۳۶۱۔ غایۃ المرام، باب ۹۳)

ایک اور موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: عَلِيٌّ وَشِيعَتُهُ هُمُ الْفَائِزُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ علیؑ اور اس کے شیعہ قیامت کے دن کامیاب ہوں گے۔ (فضائل الخمسہ بحوالہ کنوز الحقائق ص ۹۲)

جیسا کہ گزر چکا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوت ذوالعشیرہ میں اپنے قریبی رشتے داروں کو جب قبول اسلام کی دعوت دی تھی تو اس موقع پر صرف حضرت علی علیہ السلام ہی تھے جنھوں نے اس دعوت حق کو

---

۱۔ جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے وہ یقیناً بہترین لوگ ہیں۔ (سورۂ بینہ: آیت ۷)

قبول کیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی دن حضرت علی علیہ السلام کو اپنا خلیفہ، وارث اور وصی بنایا تھا گویا آپ نے اپنی نبوت کے ساتھ ہی حضرت علی علیہ السلام کی خلافت اور امامت کا بھی اعلان کر دیا تھا۔ پھر حجۃ الوداع کے موقع پر جب آیۂ بلغ اتری تو غدیر خم کے میدان میں باضابطہ طور پر حضرت علی علیہ السلام کی ولایت سے لوگوں کو آگاہ فرما دیا تھا۔

رہ گئے وہ خود غرض اور نادان لوگ جو شیعہ اثنا عشریہ کو صفوی دور حکومت کی پیداوار کہتے ہیں ان کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ صدر اسلام سے آج تک جتنی کتابیں مسئلہ امامت پر لکھی گئی ہیں اتنی کسی دوسرے موضوع پر نہیں لکھی گئیں۔ ان تمام کتب کا ذکر اس کتاب کی طوالت کا باعث بنے گا اس لیے ہم صرف چند کتابوں کے ناموں کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

**الامامة** تالیف خلیل بن احمد بصری متوفی دوسری صدی ہجری۔

**الامامة** تالیف احمد بن الحسین (امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابی)۔

**الامامة** تالیف عبد اللہ بن جعفر الحمیری متوفی تیسری صدی ہجری۔

**الامامة** تالیف فضل بن شاذان متوفی تیسری صدی ہجری۔

**الامامة** تالیف محمد بن ابی عمیر (امام علی رضا علیہ السلام کے صحابی)۔

**الامامة** تالیف یحییٰ بن عیسیٰ (امام محمد تقی علیہ السلام کے صحابی)۔

**الامامة** تالیف یحییٰ بن محدم متوفی پانچویں صدی ہجری۔

وہ کتب جو صفوی دور حکومت میں لکھی گئیں ان کی تالیف میں بھی صفویوں کا کوئی کردار نہیں تھا جیسے احقاق الحق اور عبقات الانوار۔ احقاق الحق کے مصنف قاضی نور اللہ شوشتری[1] تھے جو شیخ بہائی کے ہم عصر تھے اور اکبر آباد ہندوستان میں مقیم تھے اور عبقات الانوار کے مصنف سید حامد حسین لکھنوی تھے۔

---

۱۔ سید نور اللہ شوشتری مرعشی جنھیں شہید ثالث کہا جاتا ہے مغل بادشاہ اکبر اور جہانگیر کے دور میں قاضی تھے۔ آپ کی تصنیفات میں سے مجالس المومنین اور احقاق الحق عالمگیر شہرت کی حامل ہیں۔ احقاق الحق لکھنے پر شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) اور دیگر شدت پسند علماء نے فتویٰ دیا تھا کہ قاضی نور اللہ کو ایک سو کوڑے مارے جائیں، گرم سیسہ پلایا جائے، زبان گدی سے کھینچ لی جائے اور پھر سر قلم کر دیا جائے۔ چنانچہ جب جہانگیر کے دور میں ۱۰۱۹ھ میں آپ کو کوڑے لگائے گئے تو آپ پندرہویں کوڑے پر ہی شہید ہو گئے لہٰذا باقی کوڑے آپ کی لاش پر مارے گئے۔ پھر گدی میں سوراخ کر کے آپ کی زبان کھینچی گئی اور سیسہ گرم کر کے آپ کے سر پر ڈالا گیا جس سے آپ کا سر جل گیا اور مغز باہر نکل گیا۔ پھر آپ کی لاش آگرہ (اکبر آباد) شہر کے باہر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دی گئی۔ (رضوانی)

یہ دونوں افراد ہندوستان میں رہتے تھے جو صفوی حکومت اور اس کی سیاست سے بالکل الگ ملک تھا۔ اگرچہ صفوی حکومت نے بھی مذہب تشیع کی ترویج کے لیے قابل قدر اقدامات کئے (اور شیعت کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا) تاہم اس کا مطلب یہ ہرگزنہیں کہ تشیع ہی صفوی حکومت کی پیداوار ہے۔

اگرچہ زیر نظر کتاب میں اب تک حضرت علی علیہ السلام کی ولایت و امامت کے بارے میں جو دلائل پیش کئے گئے ہیں ان میں سے ہر ایک مقصود و مطلوب کے اثبات کے لیے کافی ہے تاہم اس ضمن میں آیات اور شیعہ وسنی روایات سے بہت زیادہ دلائل ہمارے پاس موجود ہیں اس لیے بعد کے ابواب میں ان میں سے کچھ پیش کئے جائیں گے۔

اس مقام پر ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ اگر امامت خدائی منصب ہے تو پھر حضرت علی علیہ السلام نے اپنے ایک خط میں معاویہ کو یہ کیوں لکھا تھا اِنَّہُ بَایَعَنِی الْقَوْمُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا اَبَابَکْرٍ وَ عُمَرَ وَ عُثْمَانَ عَلٰی مَا بَایَعُوْھُمْ عَلَیْہِ یعنی وہ لوگ جنھوں نے ابوبکر، عمر اور عثمان کی بیعت کی تھی انھوں نے اسی اصول پر میری بھی بیعت کی ہے۔ (نہج البلاغہ، مکتوب ۶)

اس سے تو پتا چلتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام خود اپنی خلافت کا معیار لوگوں کے انتخاب کو سمجھتے تھے؟

اس سوال کے جواب کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کرچکے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام اللہ کے حکم سے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نص سے خلافت الٰہیہ کے عہدے پر فائز تھے لیکن عوام کی اکثریت بھی بطور خلیفہ بیعت کرنے کے لیے آپ کی طرف آئی تھی تو حضرت علی علیہ السلام نے بھی ۲۵ سال کی خاموشی کے بعد ان کی بیعت کو قبول کرلیا لیکن معاویہ کے نام لکھا گیا خط اہل منطق کی زبان میں حریف کے سامنے اس کے غلط مسلمات کو پیش کرکے اس پر حجت قائم کرنا تھا یعنی حضرت علی علیہ السلام معاویہ کو بتا رہے تھے کہ تم خلفائے ثلاثہ کی خلافت کو مانتے ہو جسے لوگوں نے منتخب کیا تھا لہٰذا اگر تمہارے نزدیک خلافت کا معیار لوگوں کا انتخاب ہے تو پھر لوگوں نے ہی مجھے خلیفہ منتخب کیا ہے اس لیے اگر یہی راستا صحیح ہے تو تمھیں میری خلافت کو قبول کرکے میری بیعت کرنی چاہیے۔ امام نے اپنے خط کے ذریعے معاویہ کے لیے ہر بہانے کی راہ مسدود کردی۔ ایسا ہرگز نہیں کہ آپ اپنی خلافت کو صرف لوگوں کے انتخاب کی بنا پر ہی مستند جانتے تھے۔

# (۲) حضرت علی علیہ السلام کے متعلق آیات قرآن

حضرت علی علیہ السلام کی شان میں شیعہ و سنی مورخین و مفسرین کے مطابق قرآن کی تقریباً تین سو سے زائد آیات نازل ہوئی ہیں۔ ان سب کا اس کتاب میں ذکر ممکن نہیں اس لیے ہم یہاں اہلسنت کی چند معتبر کتب سے حضرت علی علیہ السلام کے متعلق نازل شدہ کچھ آیات پیش کر رہے ہیں۔

(۱) آیت تبلیغ : ابو اسحاق ثعلبی نے اپنی تفسیر ثعلبی میں، طبری نے الولایت میں اور ابن صباغ مالکی نے فصول المہمہ میں لکھا ہے کہ یَاَیُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ کی آیت حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر خم کے میدان میں حضرت علی علیہ السلام کو ہاتھوں پہ اٹھا کر فرمایا تھا: مَنۡ کُنۡتُ مَوۡلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوۡلَاہُ... (شواہد التنزیل ج ۱، ص ۱۸۹۔ فصول المہمہ ص ۲۷)

چونکہ اس آیت کی شان نزول اور غدیر خم کی روداد ہم اس کتاب میں بیان کر چکے ہیں اس لیے یہاں اسے بیان نہیں کر رہے۔

(۲) آیت ولایت : فخر الدین رازی، حاکم نیشاپوری اور جار اللہ زمخشری وغیرہ نے ابن عباسؓ اور ابو ذر غفاریؓ سے نقل کیا ہے کہ ایک دن کسی سائل نے مسجد میں لوگوں سے سوال کیا مگر کسی نے اسے کوئی چیز نہ دی۔ حضرت علی علیہ السلام نے جو اس وقت نماز پڑھ رہے تھے حالت رکوع میں سائل کو اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی سے اشارہ کیا تو سائل آپ کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے آپ کی انگلی سے انگوٹھی نکال لی۔ اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی : اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوا الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَهُمۡ رٰکِعُوۡنَ ○ (سورۂ مائدہ : آیت ۵۵) اگرچہ ''مومنین'' جمع کا صیغہ ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ حالت رکوع میں زکات دیتے ہیں تاہم اس کے مصداق صرف حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ دیگر ائمہ بھی چونکہ مقام و عہدۂ ولایت و امامت کے حامل ہیں اور سب اولاد علیؑ میں سے ہیں اس لیے جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔

(کفایۃ الطالب ص ۲۵۰ ۔ مناقب خوارزمی ص ۱۷۸ ۔ تفسیر طبری ج ۶، ص ۱۶۵ ۔ تفسیر رازی ج ۳ ص ۴۳۱)

اکثر علمائے اہلسنت یہ بات مانتے ہیں کہ آیت ولایت حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں اتری ہے تاہم ابن حجر جیسے بعض لوگوں نے اس حوالے سے یہ بات کہی ہے کہ لفظ ولی کے معنی دوست اور مددگار کے ہیں اور اس سے اولیٰ بالتصرف ہونا مراد نہیں ہے۔ حالانکہ کلام الٰہی کے ظاہر سے بھی یہ بات عیاں ہے کہ ولی کے معنی صاحب اختیار اور اولیٰ بالتصرف ہی ہیں کیونکہ آیت کلمۂ حصر اِنَّمَا سے شروع ہوتی ہے یعنی تمہارا ولی صرف اللہ، اس کا رسولؐ اور حالت رکوع میں زکات دینے والے ہیں۔ اگر ولی کے معنی دوست لیے جائیں تو اس معنی کو خدا، رسولؐ اور حالت رکوع میں زکات دینے والے کے لیے مخصوص کرنا پڑے گا جو کہ غیر منطقی بھی اور بے معنی ہے کیونکہ اس صورت میں اہل ایمان کے لیے لازمی ہوجائے گا کہ وہ صرف خدا، اس کے رسولؐ اور حضرت علی علیہ السلام کو ہی دوست رکھیں اور ان کے علاوہ کسی کو دوست نہ بنائیں۔ حالانکہ تمام مومنین ایک دوسرے کے دوست بھی ہیں اور مددگار بھی۔ پھر دوستی کوئی ایسی چیز نہیں کہ اسے خدا اپنے اور اپنے اولیاء کے ساتھ مخصوص کردے۔

حسانؔ بن ثابت نے حضرت علی علیہ السلام کی مدح میں کہا تھا:

فَأَنْتَ الَّذِيْ أَعْطَيْتَ إِذْ كُنْتَ رَاكِعًا ۔ فَدَتْكَ نُفُوْسُ الْقَوْمِ يَا خَيْرَ رَاكِعٍ

فَأَنْزَلَ فِيْكَ اللهُ خَيْرَ وِلَايَةٍ ۔ وَبَيَّنَهَا فِيْ مُحْكَمَاتِ الشَّرَائِعِ

آپ ہی ہیں وہ جس نے حالت رکوع میں زکات دی۔ ہماری جانیں آپ پر قربان ہوجائیں اے سب سے بہترین رکوع کرنے والے۔ اللہ نے بھی آپ کی شان میں آیت ولایت اتاری اور اسے قرآن میں دین کی محکم باتوں کے ساتھ بیان کیا۔ (کشف الغمہ ص ۸۸)

یہ بات بالکل واضح ہے کہ ولایت سے مراد پیشوائی اور رہبری ہے نہ کہ دوستی یا کوئی اور معنی۔

(۳) آیت اطاعت: شیخ سلیمان قندوزی حنفی وغیرہ لکھتے ہیں کہ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَطِيْعُوا اللهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (سورہ نساء: آیت ۵۹) حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اولی الامر سے مراد ائمہ اہلبیتؑ ہیں۔

(ینابیع المودۃ ص ۱۱۴۔ شواہد التنزیل ج ۱، ص ۱۴۹۔ غایۃ المرام باب ۵۸)

اہلسنت ہر مسلمان حاکم کو "اولی الامر" سمجھتے ہیں اور اس آیت کی بنا پر اس کی اطاعت کو واجب جانتے ہیں حالانکہ یہ کسی بھی لحاظ سے درست نہیں۔ اس صورت میں تو معاویہ بن ابی سفیان، یزید بن معاویہ، عبد الملک بن مروان، ولید بن یزید بن عبد الملک، سفاح، منصور، ہارون، مامون اور متوکل جیسے

ظالم و فاسق حکمرانوں کی اطاعت لوگوں پر واجب سمجھی جانی چاہیے جبکہ قرآن نے ایسوں کی اطاعت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ وَلَا تُطِيعُوٓا۟ أَمْرَ ٱلْمُسْرِفِينَ ۝ ٱلَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِى ٱلْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔

(سورۂ شعراء : آیت ۱۵۱ ۔ ۱۵۲)

اس بنا پر صرف ان ''صاحبان امر'' کی اطاعت واجب ہے جو پاک اور معصوم ہیں۔ ان کے احکامات وہی ہوں جو خدا اور اس کے رسولؐ کے اوامر ونواہی ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام اور ان کی اولاد میں ہونے والے امام ایسے ہی صاحبان امر ہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: اَنَا وَعَلِيٌّ وَالْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ وَتِسْعَةٌ مِنْ وُلْدِ الْحُسَيْنِ مُطَهَّرُوْنَ مَعْصُوْمُوْنَ یعنی میں علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ اور نسل حسینؑ سے ہونے والے نو امام پاک اور معصوم ہیں۔ (ینابیع المودۃ ص ۴۴۵)

(۴) آیت مباہلہ : فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ ٱلْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا۟ نَدْعُ أَبْنَآءَنَا وَأَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ ٱللَّهِ عَلَى ٱلْكَٰذِبِينَ ۝ اے رسولؐ! علم آ جانے کے بعد اب جو کوئی اس معاملے میں تم سے جھگڑا کرے تو اس سے کہو کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو لے آئیں اور تم اپنے بیٹوں کو لے آؤ اور ہم اپنی عورتوں کو لے آئیں اور تم اپنی عورتوں کو لے آؤ اور ہم اپنے نفسوں کو لے آئیں اور تم اپنے نفسوں کو لے آؤ اور ہم اللہ سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ (سورۂ آل عمران : آیت ۶۱)

نجران کے نصاریٰ نے جب مدینہ میں آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور دیگر موضوعات پر بحث کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں قائل کر دینے والے جوابات دیئے مگر وہ اپنی ضد پر اڑے رہے تو آیت مباہلہ نازل ہوئی۔ چنانچہ سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل نجران کو مباہلہ کرنے کی دعوت دی۔ دوسرے دن لاٹ پادری نے کہا: اگر محمدؐ اپنے اہلبیت کے ساتھ آئیں تو ان سے مباہلہ نہ کرنا اس لیے کہ اگر وہ حق پر نہ ہوتے تو اپنے اہلبیت کو لعنت میں مبتلا کرنے کے لیے نہ لاتے البتہ اگر وہ اپنے اصحاب کو ساتھ لائیں تو پھر ان سے ضرور مباہلہ کرنا۔

ادھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علی، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام کو لے کر میدان میں آئے۔ پادری نے پوچھا: یہ لوگ کون ہیں؟ اسے بتایا گیا یہ جوان محمدؐ کے ابن عم اور داماد ہیں، یہ خاتون ان کی اکلوتی بیٹی ہیں جن سے وہ بے حد پیار کرتے ہیں اور یہ دونوں بچے ان کے نواسے ہیں۔

پادری نے کہا: خدا کی قسم! میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ خدا سے دعا کریں تو پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ دیں اس لیے بہتر یہی ہے کہ ان سے مباہلہ نہ کرو اور محمدؐ سے مصالحت کرلو۔ چنانچہ نصاریٰ نے آکر عرض کی: یا ابا القاسم: ہم مباہلہ کرنا نہیں چاہتے۔ ہم مصالحت کے لیے تیار ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے بھی ان کی درخواست قبول کرلی۔

ابن ابی الحدید، ابن مغازلی وغیرہ لکھتے ہیں کہ اَبۡنَآءَنَا سے مراد حسنینؑ، نِسَآءَنَا سے مراد حضرت زہراؑ اور اَنۡفُسَنَا سے مراد حضرت علیؑ ہیں۔ (مناقب ابن مغازلی ص ۲۶۳۔ کفایۃ الخصام ص ۳۰۹۔ فصول المہمہ ص ۸)

اس آیت میں خدا نے حضرت علی علیہ السلام کو ''نفس رسول'' قرار دیا ہے۔

(۵) آیت تطہیر: طبری اور فخر رازی کی تفسیروں میں اور برادران اہلسنت کی دیگر کتابوں میں ہے کہ آیت اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَیُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا (سورۂ احزاب: ۳۳) جناب ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں اس وقت اتری تھی جب رسول خدا ﷺ نے جناب فاطمہؑ، امام علیؑ اور امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو اپنی چادر میں جمع کر کے فرمایا تھا: اَللّٰھُمَّ ھٰٓؤُلَاۗءِ اَھۡلُ بَیۡتِیۡ فَاَذۡھِبۡ عَنۡھُمُ الرِّجۡسَ وَطَھِّرۡھُمۡ تَطۡھِیۡرًا بار الہا! یہ میرے اہلبیتؑ ہیں۔ ان سے ہر طرح کی ناپاکی کو دور رکھ اور انھیں ایسا پاک رکھ جو پاک رکھنے کا حق ہے۔

اس موقع پر جناب ام سلمہؓ نے جو پردے کی اوٹ میں تھیں آنحضرت ﷺ سے عرض کیا: کیا میں بھی ان میں سے ہوں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تم خیر پر ہو مگر میرے اہلبیت یہ ہیں۔[1]

(کفایۃ الطالب ص ۳۷۲۔ تفسیر رازی ج ۶، ص ۷۸۳)

بعض علماء مثلاً زمخشری کہتے ہیں کہ یہ آیت ازواج رسولؐ کے متعلق نازل ہوئی ہے کیونکہ اس آیت کا سیاق و سباق ازواج کے بارے میں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ آیت ازواج سے متعلق تھی تو ضمیر کا ''جمع مؤنث'' ہونا ضروری تھا یعنی آیت اس طرح ہوتی لِیُذۡھِبَ عَنۡکُنَّ الرِّجۡسَ وَیُطَھِّرَکُنَّ تَطۡھِیۡرًا کیونکہ جمع مؤنث کے لیے ''جمع مذکر'' کا صیغہ استعمال کرنا عربی قواعد زبان کے خلاف اور بالکل غلط ہے اور یہ کہنا کہ جناب فاطمہ زہراؑ کی موجودگی کے باوجود بھی تو جمع مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اہلبیتؑ میں مردوں کی اکثریت کی بنا پر ہے جبکہ ازواج کو اگر شامل کیا جائے تو اکثریت عورتوں کی بنتی ہے بالکل اسی طرح جیسے سورۂ ہود آیت ۷۳ میں اگرچہ مخاطب (جناب سارہ)

---

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے علامہ سید مرتضیٰ عسکری کی کتاب ''شواہد تحریف''، مطبوعہ مجمع علمی اسلامی

عورت ہے مگر حضرت ابراہیمؑ چونکہ اس خاندان کے سربراہ تھے اس لیے جمع مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہے: قَالُوٓا اَتَعۡجَبِیۡنَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ رَحۡمَتُ اللّٰہِ وَ بَرَکٰتُہٗ عَلَیۡکُمۡ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ کہ اہلبیتؑ سے مقصود صرف علیؑ و فاطمہؑ اور حسنینؑ ہیں اس لیے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف انھیں اہلبیتؑ کہا ہے۔

اہلسنت کی معتبر کتابوں میں انس بن مالک سے منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز فجر پڑھنے کے لیے مسجد تشریف لے جاتے تو مسلسل چھ ماہ تک روزانہ حضرت فاطمہؑ کے دروازے کے سامنے رکتے اور بلند آواز میں فرماتے اَلصَّلٰوۃُ یَا اَہۡلَ الۡبَیۡتِ اور پھر آیت تطہیر کی تلاوت فرماتے۔

(مستدرک علی الصحیحین ج ۳، ص ۱۵۸۔ شواہد التنزیل ج ۲، ص ۱۱)

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ آیت تطہیر صرف پانچ افراد کے بارے میں نازل ہوئی جو میں محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ ہیں۔ (تفسیر ابن جریر طبری ج ۲۲، ص ۵)

**قاموس الصحیفہ** میں صاحب ریاض السالکین کے حوالے سے نقل ہوا ہے کہ علمائے اہلسنت کہتے ہیں کہ ازواج رسولؐ اہلبیت کا جزو ہیں لیکن علامہ سیوطی نے اپنی کتاب الجامع الصغیر میں ابن عساکر کے حوالے سے واثلہ کے طریق سے ایک حدیث نقل کی ہے جس کے مضمون میں یہ صراحت موجود ہے کہ ازواج رسولؐ اہلبیت میں شمار نہیں ہوتیں۔ وہ حدیث یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صاحبزادی جناب فاطمہؑ سے فرمایا: بیٹی! میرے اہلبیت میں سے تم سب سے پہلے مجھ سے ملو گی جبکہ ازواج میں سب سے پہلے زینب میرے پاس آئیں گی۔[1]

(۶) شیعہ اور سنی علماء و مورخین نقل کرتے ہیں کہ جب مشرکین کی عہد شکنی کی مذمت میں سورۂ توبہ کی آیات نازل ہوئیں تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سورہ کی ابتدائی آیات حضرت ابوبکرؓ کو دیں کہ وہ انھیں جا کر موسم حج میں مشرکین کو سنائیں۔ حضرت ابوبکرؓ وہ آیات لے کر مکہ روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ حضرت جبریلؑ نازل ہوئے اور فرمایا: یا رسول اللہؐ! اللہ نے فرمایا ہے: لَا یُؤَدِّیۡہَا عَنۡكَ اِلَّا اَنۡتَ اَوۡ رَجُلٌ مِّنۡكَ آپ خود اس پیغام کو پہنچائیں یا وہ آدمی پہنچائے جو آپ میں سے ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو طلب فرمایا اور کہا: میرے ناقہ پر سوار ہو کر ابوبکر کے

---

۱۔ **قاموس الصحیفہ** ص ۲۵۔ یہ کتاب حجۃ الاسلام حاجی سید ابو الفضل حسینی کی تالیف ہے جو انھوں نے صحیفہ سجادیہ کی لغات کی شرح میں نہایت دلکش انداز میں لکھی ہے۔ اس میں مستند منابع سے استفادہ کیا گیا ہے۔

پیچھے جاؤ اور ان سے آیات لے کر مشرکین مکہ کو سناؤ۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام روانہ ہوئے اور راستے میں آپ نے حضرت ابوبکرؓ سے وہ آیات لے لیں اور خود مکہ تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ بے چینی کے عالم میں واپس آئے اور انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: یا رسول اللہؐ! کیا میرے بارے میں کچھ نازل ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ بلکہ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ آیات میں خود لے کر جاؤں یا وہ جائے جو مجھ سے ہو۔ اس لیے میں نے یہ کام علیؑ کو سونپا ہے۔

(ذخائر العقبیٰ ص ۶۹ ۔ کفایۃ الطالب ص ۲۴۲ ۔ ینابیع المودۃ ص ۸۸ ۔ شیخ مفید، ارشاد ج ۱، باب ۲، فصل ۱۷)

یہاں تین نکات قابل غور ہیں:

(۱) حضرت علیؑ منیت رسولؐ کی منزل پر فائز ہیں اور حضرت ابوبکرؓ کو یہ خصوصیت حاصل نہیں۔

(۲) خدا نے حضرت ابوبکرؓ کو ایک شہر میں چند آیات پہنچانے کے لائق نہ سمجھا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ اس کام کے لیے حضرت علی علیہ السلام کو روانہ فرمائیں۔ اس صورت میں قابل غور بات یہ ہے کہ اہل سقیفہ نے کس طرح ایسے شخص کو جانشین رسولؐ چن لیا کہ وہ تمام احکامات قرآن کے ساتھ مسلمانوں کے خلیفہ کی ذمے داری نبھائے۔

(۳) حضرت ابوبکرؓ کو پہلے بھیجنا اور پھر واپس بلا لینا اور حضرت علی علیہ السلام کو اس کام پر مامور کرنا ان کی فضیلت اور صلاحیت کی نشاندہی کے لیے تھا۔ اس لیے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے ہی حضرت علی علیہ السلام کو بھیجتے تو لوگوں کی نظر میں یہ ایک عام بات ہوتی جس کی کوئی خاص اہمیت نہ ہوتی لیکن جب حضرت ابوبکرؓ چلے گئے اور ان کے بعد حضرت علی علیہ السلام کو اسی کام کے لیے مامور کیا گیا تو یہ امر اس بات کی دلیل بن گیا کہ حضرت علی علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی اور تبلیغی امور کی انجام دہی میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

(۷) آیت مودت: قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (اے رسولؐ! ان لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ میں تبلیغ رسالت کے بدلے تم سے صلہ نہیں مانگتا البتہ اپنے قرابت داروں کی محبت ضرور چاہتا ہوں۔ (سورۂ شوریٰ: آیت ۲۳)

زمخشری تفسیر کشاف میں اور گنجی شافعی کفایۃ الطالب میں لکھتے ہیں:

جب آیت مودت اتری تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا: وَمَنْ قَرَابَتُكَ هٰؤُلَاۤءِ الَّذِيْنَ وَجَبَتْ عَلَيْنَا مَوَدَّتُهُمْ؟ یعنی آپ کے وہ قرابتدار کون ہیں جن کی محبت ہم پر واجب ہے؟

قَالَ: عَلِيٌّ وَفَاطِمَةُ وَابْنَاهُمَا آپ نے فرمایا: علیؑ، فاطمہؑ اور ان کے بیٹے (حسنؑ وحسینؑ)۔

(کفایۃ الطالب ص ۹۱۔ تفسیر کشاف ج ۲، ص ۲۳۹۔ ذخائر العقبیٰ ص ۲۵)

(۸) آیت قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (سورۂ رعد: آیت ۴۳) کی تفسیر میں ثعلبی نے لکھا ہے کہ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ سے مراد حضرت علیؑ ہیں۔ (غایۃ المرام، باب ۱۲۶)

ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا کہ کتاب کا علم کس کے پاس ہے تو آپ نے فرمایا: میرے بھائی علی بن ابی طالب علیہ السلام کے پاس ہے۔ (شواہد التنزیل ج ۱، ص ۳۰۷)

شیخ سلیمان بلخی نے ابن عباسؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ علم کتاب رکھنے والے حضرت علی علیہ السلام ہیں اس لیے آپ قرآن کی تفسیر، تاویل اور ناسخ ومنسوخ ہر چیز کے عالم تھے۔ (ینابیع المودۃ ص ۱۰۴)

(۹) آیت اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ (سورۂ ہود: آیت ۱۷) کے ضمن میں بھی شیعہ وسنی مفسرین اور مورخین نے لکھا ہے کہ جو گواہ خود آنحضرت ﷺ ہی سے ہے اس سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ (تفسیر ابو الفتوح رازی۔ ینابیع المودۃ ص ۹۹)

ابراہیم بن محمد حموینی نے **فرائد السمطین** میں ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی اور کوئی دوسرا اس میں آپ کا شریک نہیں۔ خوارزمی نے بھی مناقب میں لکھا ہے کہ عمرو بن عاص نے معاویہ کے نام اپنے خط میں حضرت علی علیہ السلام کی شان میں اترنے والی جن آیات کا حوالہ دیا تھا ان میں یہ آیت بھی شامل تھی۔ (غایۃ المرام، باب ۱۲۸)

(۱۰) آیت اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۷۴) کی شان نزول کے بارے میں خوارزمی، ثعلبی، مالکی، ابو نعیم وغیرہ نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے پاس چار درہم تھے۔ اس میں سے آپ نے ایک درہم رات کو اور ایک درہم دن کو خیرات کر دیا اور اگلے دن بھی پوشیدہ طور پر ایک درہم اور اگلی رات کو علانیہ طور پر ایک درہم خیرات کر دیا۔ (مناقب ابن مغازلی ص ۲۸۰۔ ذخائر العقبیٰ ص ۸۸)

(۱۱) آیت وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۰۷) کے سلسلے میں ثعلبی نے اپنی تفسیر میں ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ شب ہجرت جب حضرت علی علیہ السلام بستر رسول ﷺ پر سوئے تو یہ آیت اتری۔ (ینابیع المودۃ ص ۹۲۔ کفایۃ الطالب ص ۲۳۹)

(۱۲) آیت اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ (سورۂ بینہ: آیت ۷) کے

سلسلے میں مقاتل بن سلیمان نے ضحاک سے اور اس نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام اور اہلبیتؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ (غایۃ المرام، باب، ۹۴، ح ۹)

(۱۳) آیت وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ ○ (سورۂ صافات : آیت ۲۴) کے ضمن میں ابوسعید خدری نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ جس چیز کا سوال کیا جائے گا وہ علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت ہے۔ (شواہد التنزیل ج ۱، ص ۱۰۷۔ صواعق المحرقہ ص ۸۹)

(۱۴) آیت اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (سورۂ مریم : آیت ۹۶) کے ضمن میں گنجی شافعی نے مناقب خوارزمی سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی حضرت علی علیہ السلام سے ملا اور بولا : یا ابا الحسن خدا کی قسم ! میں خدا کی خاطر آپ کو دوست رکھتا ہوں۔ حضرت علی علیہ السلام نے جب اس بات کا ذکر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : شاید تم نے اس کے ساتھ کوئی نیکی کی ہے ؟ میں نے کہا : یا رسول اللہؐ خدا کی قسم ! میں نے اس کے ساتھ کوئی نیکی نہیں کی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : خدا کا شکر ہے کہ اس نے مومنین کے دلوں میں تمہاری محبت جاگزیں فرمائی ہے۔ اس موقع پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ (کفایۃ الطالب ص ۲۴۹۔ مناقب خوارزمی ص ۱۸۸۔ الغدیر ج ۲، ص ۵۶)

(۱۵) آیت اعتصام : وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (سورۂ آل عمران : آیت ۱۰۳) کے سلسلے میں **مناقب الفاخرة** کے مؤلف لکھتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے کہا : ایک دن ہم بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر تھے کہ ایک بدو نے آکر عرض کی : یا رسول اللہؐ ! میں نے آپ کو وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ کا حکم دیتے سنا ہے۔ یہ اللہ کی رسی کیا ہے جس سے ہمیں وابستہ رہنا چاہیے ؟ آپ نے اپنا ہاتھ علی علیہ السلام کے ہاتھ پر رکھ کر فرمایا : اس سے وابستہ رہو۔ یہی حَبْلُ الْمَتِيْن ہے۔ (کفایۃ الخصام ص ۳۴۳)

(۱۶) آیت اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (سورۂ رعد : آیت ۷) کے بارے میں کتب اہلسنت میں سات احادیث منقول ہیں جن میں بیان ہوا ہے کہ "منذر" سے مراد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور "ہادی" سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ انہی میں سے ایک کو مالکی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : اَنَا الْمُنْذِرُ وَعَلِيٌّ الْهَادِيْ وَبِكَ يَا عَلِيُّ يَهْتَدِي الْمُهْتَدُوْنَ یعنی میں ڈرانے والا ہوں اور علیؑ ہدایت کرنے والے ہیں۔ اے علیؑ ! تمہارے ذریعے ہی ہدایت یافتگان ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ (فصول المہمہ ص ۱۲۲)

(۱۷) آیت وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ○

(سورۂ ابراہیم: آیت ۳۵) کے سلسلے میں ابن مغازلی نے ابن مسعود کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں جو یہ کہا تھا کہ "بار الہا! میری اولاد کو بت پرستی سے دور رکھنا" وہ کلمات دعا مجھ محمدؐ اور علیؑ پر پہنچ کر ختم ہوئے کیونکہ ہم دونوں میں سے کسی نے بھی کبھی بتوں کو سجدہ نہیں کیا اس لیے اللہ نے مجھے نبوت اور علیؑ کو امامت عطا کی۔ (مناقب ابن مغازلی ص ۲۷۶)

(۱۸) فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ (سورۂ تحریم: آیت ۴) کے سلسلے میں اہلسنت کے جید علماء اور مفسرین لکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس آیت میں صالح المومنین سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ (شواہد التنزیل ج ۲، ص ۲۵۵۔ صواعق محرقہ ص ۱۴۴)

(۱۹) لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (سورۂ حشر: آیت ۲۰) کی آیت کے ضمن میں موفق بن احمد نے ایک روایت نقل کی ہے کہ جابر کہتے ہیں: ایک دفعہ ہم بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر تھے کہ حضرت علی علیہ السلام مسجد میں داخل ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے یہ شخص اور اس کے شیعہ قیامت کے دن کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔ (کفایۃ الخصام ص ۴۲۲)

(۲۰) آیت وَتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ (سورۂ حاقہ: آیت ۱۲) کے سلسلے میں طبری اور سیوطی اپنی تفاسیر میں لکھتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا کی: بار الہا! اسے علیؑ کا کان قرار دے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس دن کے بعد میں کوئی بات نہیں بھولا۔ (مناقب ابن مغازلی ص ۲۶۵)

(۲۱) آیت اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوٗنَ (سورۂ سجدہ: آیت ۱۸) کے بارے میں ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں، ابن کثیر اپنی تفسیر میں اور خطیب تاریخ بغداد میں لکھتے ہیں کہ ولید بن عقبہ نے حضرت علی علیہ السلام کے سامنے ڈینگ ماری کہ میں تم سے زیادہ فصیح ہوں، میرا نیزہ بھی زیادہ تیز ہے اور میں تم سے زیادہ شجاع بھی ہوں تو حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اے فاسق! چپ ہو جا۔ اسی موقع پر حضرت علی علیہ السلام کی تصدیق کے لیے یہ آیت اتری۔ (غایۃ المرام، باب ۱۵۲۔ مناقب ابن مغازلی ص ۳۲۴)

(۲۲) اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ (سورۂ ق: آیت ۲۴) کے ضمن میں حاکم حسکانی نے ابوسعید خدری سے نقل کیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب قیامت کا دن آئے گا تو اللہ تعالیٰ مجھے اور علیؑ کو حکم دے گا کہ جو بھی تمہارا دشمن ہے اسے جہنم میں جھونک دو اور جو تمہارا دوست اور محب ہے اسے جنت میں بھیج دو اور یہی اللہ تعالیٰ کے اس حکم کا مفہوم ہے۔ (شواہد التنزیل ج ۲، ص ۱۹۰)

(۲۳) آیت وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (سورۂ بقرہ: آیت ۴۳) کے بارے میں موفق بن احمد اور ابونعیم اصفہانی نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ یہ آیت رسول اکرم ﷺ اور حضرت علی علیہ السلام کی شان میں اتری ہے کیونکہ یہی وہ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے نماز پڑھی اور رکوع کیا۔ (غایۃ المرام، باب ۱۷۶)

(۲۴) آیت ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (سورۂ تکاثر: آیت ۸) کے ضمن میں ابونعیم اصفہانی اور حاکم حسکانی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت نقل کی ہے کہ اس آیت میں نعیم سے مراد ولایت علیؑ ہے۔ قیامت میں اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا؟ (غایۃ المرام، باب ۴۸۔ شواہد التنزیل ج ۲، ص ۳۶۸)

(۲۵) آیت سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ (سورۂ معارج: آیت ۱) کے ضمن میں ثعلبی اور مالکی وغیرہ لکھتے ہیں کہ ۱۸ ؍ ذی الحجہ کو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کرتے ہوئے فرمایا تھا: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ جب حارث بن نعمان فہری نے یہ خبر سنی تو مدینہ میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا: آپ نے ہمیں اللہ کی وحدانیت اور اپنی نبوت کے اقرار کا حکم دیا تو ہم نے قبول کرلیا۔ پھر آپ نے نماز، روزہ، حج، زکات اور جہاد کا حکم دیا تو ہم نے اسے بھی مان لیا مگر آپ نے اس پر بس نہیں کیا اور اب اپنے چچا زاد بھائی کو منصب ولایت پر فائز کردیا ہے۔ کیا اس کا حکم بھی اللہ نے دیا ہے؟ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: اس خدائے یکتا کی قسم! جس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ یہ بھی اسی کا حکم ہے۔ حارث نے اپنے ناقہ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا: خدایا! محمد (ص) جو بات کہہ رہے ہیں اگر یہ درست ہے تو مجھ پر آسمان سے پتھر کا عذاب نازل فرما۔ ابھی وہ اپنی اونٹنی تک نہیں پہنچا تھا کہ آسمان سے ایک پتھر اس کے سر پر گرا اور وہ فوراً ہلاک ہوگیا۔ (فصول المہمہ ص ۲۶۔ کفایۃ الخصام ص ۳۸۸)

حضرت علی علیہ السلام کے فضائل و مناقب سے متعلق جو آیات نازل ہوئی ہیں وہ بہت زیادہ ہیں مگر ہم نے چند آیات کا تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ گنجی شافعی اور ثعلبی ابن عباسؓ کی اس روایت کو نقل کرتے ہیں کہ نَزَلَتْ فِيْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ اَكْثَرُ مِنْ ثَلَاثِمِائَةِ آيَةٍ علی بن ابی طالب علیہ السلام کی شان میں تین سو سے زیادہ آیتیں نازل ہوئیں۔ (کفایۃ الطالب ص ۲۳۱۔ صواعق محرقہ ص ۷۶۔ ینابیع المودۃ ص ۱۲۶)

اب ہم اپنے برادران اہلسنت سے پوچھتے ہیں کہ ان تمام آیات کے باوجود جو آپ کی معتبر کتب میں موجود ہیں کیونکر آپ حضرت علی علیہ السلام کے بجائے دوسروں کی خلافت کو مانتے ہیں؟ کیا اس حوالے سے آپ کی باتوں اور عقیدے میں کھلا تضاد نہیں؟

اس باب کے خاتمے پر یہ یاد دلانا بھی ناگزیر ہے کہ ممکن ہے کچھ افراد کے ذہن میں یہ سوال

ابھرے کہ خدا نے قرآن میں حضرت علی علیہ السلام کے نام کی صراحت کیوں نہیں کی کہ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ کے جانشین ہیں تاکہ مسلمان اختلاف کا شکار نہ ہوں؟

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اول تو "علیؑ کی ولایت" ایک آزمائش ہے اور لوگوں کا اس کے ذریعے امتحان لیا جانا مقصود ہے۔ اس امر کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے کہ الٓمّٓ ○ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ کیا لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ محض یہ کہہ دینے سے کہ وہ ایمان لے آئے انھیں چھوڑ دیا جائے گا اور انھیں آزمایا نہیں جائے گا۔ (سورۂ عنکبوت: آیت ۱ ـ ۲)

شیعہ وسنی علماء ومفسرین کے مطابق یہ "ولایت علیؑ" ہی ہے جس کے ذریعے مسلمانوں کا امتحان لیا جائے گا۔ (شواہد التنزیل ج ۱، ص ۴۳۸ ـ غایۃ المرام، باب ۱۲۵)

دوسری بات یہ ہے کہ بالفرض اگر قرآن میں حضرت علی علیہ السلام کا نام ذکر ہوتا تب بھی لوگوں نے حب دنیا اور حرص وطمع کی بنا پر حضرت علی علیہ السلام کی مخالفت کرنی تھی کیونکہ خود قرآن کی کئی آیات کی کھلم کھلا مخالفت کی جا رہی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کلی احکامات پر مشتمل ہے اور اس کے جزئیات کی وضاحت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ نے بیان کی ہے۔ چنانچہ ولایت وامامت کا اصول بھی قرآن حکیم میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے لیکن رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ نے اپنے کلام اور بیان کے ذریعے اس کی تطبیق حضرت علی علیہ السلام کی ذات اقدس پر فرماتے ہوئے لوگوں کو حقیقت امر سے آگاہ کردیا تھا اور یہ وہ حقیقت ہے جسے علماء ومفسرین اہلسنت بھی مانتے ہیں لیکن عملی طور پر اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

# (۳) حضرت علی علیہ السلام کے متعلق احادیث پیغمبرؐ

اس باب میں ہم برادران اہلسنت کی معتبر کتب سے حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کچھ احادیث بیان کریں گے تاکہ عذر تراش لوگوں کے لیے ہر قسم کے عذر کی راہ مسدود ہو جائے۔

(۱) حدیث غدیر: شیعہ اور سنی علماء سب نے لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع سے واپس ہوتے ہوئے غدیر خم کے مقام پر اپنے صحابہ سے فرمایا: کیا میں تمہاری جانوں پر تم سے زیادہ تصرف کا حق نہیں رکھتا؟ انھوں نے کہا: یا رسول اللہؐ! ہاں۔ تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ** جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ بھی مولا ہے۔

(ذخائر العقبیٰ ص ۶۷۔ مناقب ابن مغازلی ص ۱۶، ۲۶)

(۲) حدیث منزلت: احمد بن حنبل، شیخ سلیمان بلخی، ابن صباغ مالکی وغیرہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: **اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ** تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

(صحیح مسلم ج ۳، رقم ۶۲۱۷ مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور۔ ینابیع المودۃ ص ۵۰۔ فصول المہمہ ص ۱۲۵)

بحرانی نے اہلسنت سے ایک سو اور اہل تشیع سے ستر احادیث اسی حوالے سے نقل کی ہیں۔

(غایۃ المرام، باب ۲۰۔۲۱)

(۳) حدیث انذار: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بعثت کے آغاز میں حکم خدا سے اپنے قریبی رشتے داروں (بنی عبد المطلب) کو جمع کر کے انھیں اپنی ''رسالت'' سے آگاہ فرمایا اور اسلام لانے کی دعوت دی۔ پھر اسی اجتماع میں اعلان فرمایا کہ تم میں سے جو بھی میری دعوت قبول کرنے میں پہل کرے گا وہی میرا جانشین ہوگا۔ اس موقع پر صرف حضرت علی علیہ السلام نے آپ کی دعوت قبول کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **اَنْتَ اَخِيْ وَوَزِيْرِيْ وَوَارِثِيْ وَخَلِيْفَتِيْ مِنْ بَعْدِيْ** تم میرے بعد میرے بھائی، میرے وزیر، میرے

وارث اور میرے جانشین ہو۔ (تاریخ ابی الفداء ج ۱، ص ۲۱۶۔ کفایۃ الطالب ص ۲۰۵۔ تاریخ طبری ج ۲، ص ۲۱۷)

یہ حدیث ان اہم ترین احادیث میں سے ایک ہے جو حضرت علی علیہ السلام کی خلافت سے متعلق ہیں کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کا اعلان اپنی نبوت کے اعلان کے ساتھ ہی کر دیا تھا اور یہ بات اہلسنت کی تاریخ، تفسیر اور حدیث کی بیشتر کتابوں میں مذکور ہے۔ ہم بھی اس کتاب کے شروع میں اس حوالے سے ضروری باتیں لکھ چکے ہیں۔

(۴) حدیث ثقلین: شیعہ اور سنی کی معتبر کتب میں لفظی فرق کے ساتھ یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وقت وصال قریب آیا تو آپ نے فرمایا: اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ وَاِنَّھُمَا لَنْ یَّتَفَرَّقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ میں تمہارے درمیان دو گراں بہا چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت میرے اہل بیت۔ یہ دونوں ہرگز جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر تک پہنچ جائیں گے۔

(مناقب ابن مغازلی ص ۲۳۴۔ مستدرک صحیحین ج ۳، ص ۱۰۹)

حدیث ثقلین متفق علیہ حدیث ہے جسے مختلف حوالوں اور عبارتوں کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ اس حدیث سے درج ذیل نکات اخذ کئے جاسکتے ہیں۔

(۱) جس طرح قرآن قیامت تک لوگوں کے درمیان باقی رہے گا عترت رسولؐ بھی اسی طرح قیامت تک باقی رہے گی یعنی کسی بھی زمانے میں دنیا حقیقی امام سے خالی نہیں ہوگی۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دو گرانقدر امانتوں کے ذریعے مسلمانوں کی تمام تر علمی اور دینی ضروریات کو پورا کر دیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہلبیتؑ کو مسلمانوں کے لیے علم و دانش کا سرچشمہ قرار دے کر ان کی سیرت کے معتبر ہونے کی تصدیق فرما دی ہے۔

(۳) قرآن اور اہلبیتؑ ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں۔ اس لیے کسی بھی مسلمان کو یہ حق نہیں کہ وہ علوم اہلبیتؑ سے روگردانی کرے اور خود کو ان کی ہدایت و رہنمائی سے دور رکھے۔

(۴) مسلمان اگر اہلبیتؑ کی اطاعت کریں اور ان سے وابستہ رہیں تو ہرگز گمراہ نہیں ہوں گے اور ہمیشہ حق ان کے ساتھ رہے گا۔

(۵) لوگوں کے لیے تمام ضروری علوم اور ان کی دینی مشکلات کا حل اہلبیتؑ کے پاس ہے اور جو بھی ان کی پیروی کرے گا وہ گمراہی کے اندھیروں میں نہیں بھٹکے گا حقیقی سعادت اس کا مقدر بنے گی

یعنی اہلبیتؑ غلطی اور اشتباہ سے معصوم ہیں اور اسی قرینے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہلبیتؑ اور عترت سے مراد آنحضرت ﷺ کے تمام رشتے دار اور اولاد نہیں بلکہ معین افراد ہیں جو علوم دین میں بھی کامل ہیں اور ہر طرح کی غلطی اور گناہ سے معصوم ہیں تاکہ وہ لوگوں کی رہبری کی صلاحیت کے حامل ہوں۔ اور وہ حضرت علی علیہ السلام اور آپ کے گیارہ فرزند ہیں جن میں سے ہر ایک یکے بعد دیگرے منصب امامت پر فائز ہوتا رہا۔

(علامہ طباطبائی، پاسدران اسلام، مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامیؑ)

(۵) حدیث سفینہ: جناب ابن عباسؓ اور دیگر مفسرین نے لکھا ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا:
مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِيْ مَثَلُ سَفِيْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجَا وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ میرے اہلبیت کی مثال کشتی نوحؑ جیسی ہے جو اس میں سوار ہو گیا وہ پار لگ گیا اور جس نے اسے چھوڑ دیا وہ ہلاک ہو گیا۔

(حلیۃ الاولیاء ج ۴، ص ۳۰۶ ۔ ذخائر العقبیٰ ص ۲۰)

محمد بن ادریس شافعی اپنے اشعار میں اس حدیث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وَلَمَّا رَأَيْتُ النَّاسَ قَدْ ذَهَبَتْ بِهِمْ ۔۔۔ مَذَاهِبُهُمْ فِيْ اَبْحُرِ الْغَيِّ وَالْجَهْلِ
رَكِبْتُ عَلَى اسْمِ اللّٰهِ فِيْ سُفُنِ النَّجَا ۔۔۔ وَهُمْ اَهْلُ بَيْتِ الْمُصْطَفٰى خَاتَمِ الرُّسُلِ
وَاَمْسَكْتُ حَبْلَ اللّٰهِ وَهُوَ وِلَاءُهُمْ ۔۔۔ كَمَا قَدْ اُمِرْنَا بِالتَّمَسُّكِ بِالْحَبْلِ

جب میں نے لوگوں کو گمراہی کے سمندر میں ڈوبتے دیکھا تو اللہ کا نام لے کر کشتیٔ نجات میں سوار ہو گیا جو کہ خاتم الانبیاءؑ کے اہلبیتؑ ہیں۔ میں نے اللہ کی رسی کا سہارا لیا ہے اور یہ رسی بھی اہلبیتؑ کی ولایت ہے کیونکہ خود خدا نے کہا ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو۔ (شب ہائے پشاور ص ۲۲۷)

(۶) حدیث حق: علمائے اہل سنت اور اہل تشیع نے مختلف اسناد سے نقل کیا ہے کہ نبیؐ کریم ﷺ نے فرمایا: عَلِيٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِيٍّ علیؑ ہمیشہ حق کے ساتھ اور حق ہمیشہ علیؑ کے ساتھ ہے۔

بحرانی نے اس ضمن میں فریقین کے علماء سے پندرہ حدیثیں نقل کی ہیں۔ (غایۃ المرام، باب ۳۶۰)

(۷) الحدیث: اِنَّ عَلِيًّا مِنِّيْ وَاَنَا مِنْهُ وَهُوَ وَلِيُّ كُلِّ مُؤْمِنٍ بَعْدِيْ علیؑ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں اور وہ میرے بعد ہر مومن کے ولی ہیں۔ (کنوز الحقائق ص ۲۰۳ ۔ ذخائر العقبیٰ ص ۶۸)

(۸) الحدیث: لِكُلِّ نَبِيٍّ وَصِيٌّ وَوَارِثٌ وَاِنَّ عَلِيًّا وَصِيِّيْ وَوَارِثِيْ ہر نبی کا ایک وصی اور جانشین ہوتا ہے اور میرا وصی اور جانشین علیؑ ہے۔ (الریاض النضرۃ ج ۲، ص ۱۷۸ از فضائل الخمسہ)

(۹) الحدیث : مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰہَ. وَمَنْ اَطَاعَ عَلِیًّا فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ عَصٰی عَلِیًّا فَقَدْ عَصَانِیْ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جس نے علیؑ کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے علیؑ کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔ (مستدرک صحیحین ج ۳، ص ۱۲۶)

(۱۰) الحدیث : اَنَا وَعَلِیٌّ حُجَّۃُ اللّٰہِ عَلٰی عِبَادِہٖ میں اور علیؑ بندگان خدا پر اللہ کی حجت ہیں۔

(کنوز الحقائق ص ۴۳)

(۱۱) الحدیث : عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ مَعَ عَلِیٍّ لَا یَفْتَرِقَانِ حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ علیؑ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علیؑ کے ساتھ۔ ان دونوں میں ہرگز جدائی نہ ہوگی یہاں تک کہ دونوں میرے پاس حوض کوثر تک پہنچیں گے۔ (ابن حجر، صواعق محرقہ ص ۷۴)

(۱۲) جب حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ اور دیگر صحابہ کے گھروں کے دروازے جو مسجد نبویؐ میں کھلتے تھے بند کردیئے گئے اور صرف حضرت علی علیہ السلام کے گھر کا دروازہ کھلا رکھا گیا تو اس موقع پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَا اَنَا سَدَدْتُ اَبْوَابَکُمْ وَفَتَحْتُ بَابَ عَلِیٍّ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ فَتَحَ بَابَ عَلِیٍّ وَسَدَّ اَبْوَابَکُمْ میں نے نہ تو تمہارے گھروں کا دروازہ بند کیا اور نہ ہی علیؑ کے گھر کا دروازہ کھلا رہنے دیا یہ خود خدا ہے جس نے تمہارے گھروں کے دروازے بند کردیئے اور علیؑ کے گھر کا دروازہ کھلا رکھا۔ (کنز العمال ج ۶، ص ۴۰۸)

(۱۳) الحدیث : اِنَّ اللّٰہَ جَعَلَ ذُرِّیَّۃَ کُلِّ نَبِیٍّ فِیْ صُلْبِہٖ وَجَعَلَ ذُرِّیَّتِیْ فِیْ صُلْبِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ اللہ نے ہر نبی کی ذریت اس کی صلب میں رکھی مگر میری ذریت کو علی بن ابی طالبؑ کی صلب میں رکھا۔

(فیض القدیر ج ۲، ص ۲۲۳۔ مناقب ابن مغازلی ص ۴۹)

(۱۴) الحدیث : یَا عَلِیُّ اَنْتَ اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا وَاَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ اِسْلَامًا وَاَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی یا علیؑ! تم ہی مومن اول اور مسلم اول ہو۔ تمھیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی۔ (ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۳، ص ۲۵۸)

(۱۵) جب نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں دو دو صحابیوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا تو حضرت علی علیہ السلام اشکبار ہوگئے اور کہنے لگے: یا رسول اللہؐ! آپ نے اصحاب کے درمیان تو رشتۂ اخوت قائم کیا لیکن مجھے کسی کا بھائی نہیں بنایا۔ اس موقع پر نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَنْتَ اَخِیْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ تم دنیا اور

آخرت دونوں میں میرے بھائی ہو۔ (مناقب ابن مغازلی ص ۳۷۔ کفایۃ الطالب ص ۱۹۴)

(۱۶) الحدیث: اَنَا سَیِّدُ النَّبِیِّیْنَ وَ عَلِیٌّ سَیِّدُ الْوَصِیِّیْنَ وَاِنَّ اَوْصِیَائِیْ بَعْدِیْ اِثْنٰی عَشَرَ اَوَّلُهُمْ عَلِیٌّ وَآخِرُهُمُ الْقَائِمُ الْمَهْدِیُّ عَلَیْهِ السَّلَامُ میں نبیوں کا سردار اور علیؑ وصیوں کا سردار ہے۔ میرے بارہ وصی ہوں گے جن میں سے پہلے علیؑ اور آخری قائم مہدیؑ ہیں۔ (ینابیع المودۃ ص ۴۴۵)

اس حدیث میں حضرت علی علیہ السلام کی خلافت و امامت کے علاوہ دیگر ائمہؑ کی امامت کا بھی تذکرہ موجود ہے۔

(۱۷) الحدیث: مَنْ اَحَبَّ عَلِیًّا فَقَدْ اَحَبَّنِیْ وَمَنْ اَبْغَضَ عَلِیًّا فَقَدْ اَبْغَضَنِیْ وَمَنْ اٰذٰی عَلِیًّا فَقَدْ اٰذَانِیْ وَمَنْ اٰذَانِیْ فَقَدْ اٰذَی اللّٰهَ جس نے علیؑ کو دوست رکھا اس نے مجھے دوست رکھا اور جس نے علیؑ سے دشمنی رکھی اس نے مجھ سے دشمنی رکھی۔ جس نے علیؑ کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے اذیت دی اس نے اللہ کو اذیت دی۔ (ریاض النضرۃ ج ۲، ص ۱۶۶)

(۱۸) الحدیث: حُبُّ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ یَاْکُلُ السَّیِّئَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ علی بن ابیطالبؑ کی محبت برائیوں کو کھا جاتی ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ (تاریخ بغداد ج ۴، ص ۱۹۴)

(۱۹) الحدیث: اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا فَمَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْیَاْتِ الْبَابَ میں شہر علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔ جو علم حاصل کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ دروازے سے داخل ہو۔

(مناقب ابن مغازلی ص ۸۳۔ علامہ سیوطی، جامع الصغیر ج ۱، ص ۳۷۴)

(۲۰) الحدیث: یَا عَلِیُّ خُلِقْتُ اَنَا وَاَنْتَ مِنْ شَجَرَةٍ، فَاَنَا اَصْلُهَا وَاَنْتَ فَرْعُهَا وَالْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ اَغْصَانُهَا فَمَنْ تَعَلَّقَ بِغُصْنٍ مِنْهَا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ یا علیؑ! ہم دونوں ایک ہی شجر سے خلق ہوئے ہیں۔ میں اس شجر کی اصل (جڑ) ہوں اور تم اس کا تنا ہو۔ حسنؑ اور حسینؑ اس کی شاخیں ہیں۔ پس جو کوئی ان میں سے کسی بھی شاخ سے تعلق جوڑے اللہ اسے بہشت میں داخل فرمائے گا۔ (کفایۃ الطالب ص ۳۱۸)

(۲۱) جناب ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو دیکھ کر فرمایا: اَنْتَ سَیِّدٌ فِی الدُّنْیَا وَ سَیِّدٌ فِی الْاٰخِرَةِ، مَنْ اَحَبَّکَ فَقَدْ اَحَبَّنِیْ وَ حَبِیْبِیْ حَبِیْبُ اللّٰهِ وَ عَدُوُّکَ عَدُوِّیْ وَ عَدُوِّیْ عَدُوُّ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ، وَیْلٌ لِمَنْ اَبْغَضَکَ مِنْ بَعْدِیْ تم دنیا اور آخرت کے سردار ہو۔ جس نے تم سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی۔ میرے محب سے اللہ محبت کرتا ہے۔ جس نے تمھیں دشمن رکھا وہ میرا دشمن ہے۔ میرا دشمن اللہ عزوجل کا دشمن ہے۔ وائے ہو اس پر جو میرے بعد تم سے دشمنی کرے۔ (مناقب ابن مغازلی ص ۱۰۳)

(۲۲) مجاہد نے جناب ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: عَلِيٌّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى الْحَوْضِ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ جَاءَ بِجَوَازٍ مِنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ قیامت کے دن علیؑ حوض کوثر کے کنارے کھڑے ہوں گے کوئی بھی شخص جنت میں داخل نہیں ہوسکے گا مگر یہ کہ اس کے پاس علی بن ابیطالبؑ کا لکھا ہوا پروانہ ہو۔ (مناقب ابن مغازلی ص ۱۱۹)

(۲۳) جناب قیس بن حازمؓ سے نقل ہوا ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ کا حضرت علی علیہ السلام سے آمنا سامنا ہوا تو حضرت ابوبکرؓ مسکرائے۔ حضرت علی علیہ السلام نے مسکرانے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا: میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: لَا يَجُوزُ أَحَدٌ الصِّرَاطَ إِلَّا مَنْ كَتَبَ لَهُ عَلِيٌّ الْجَوَازَ کوئی شخص پل صراط عبور نہیں کرسکتا مگر یہ کہ علیؑ نے اسے پروانہ لکھ کر دیا ہو۔ (ریاض النضرۃ ج ۲، ص ۱۷۷)

(۲۴) جناب ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: حُبُّكَ إِيمَانٌ وَبُغْضُكَ نِفَاقٌ وَأَوَّلُ مَنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مُحِبُّكَ وَأَوَّلُ مَنْ يَدْخُلُ النَّارَ مُبْغِضُكَ تمہاری محبت ایمان اور تم سے دشمنی نفاق ہے۔ سب سے پہلے جنت میں جانے والا تمہارا محب ہوگا اور سب سے پہلے جہنم میں جانے والا تمہارا دشمن ہوگا۔ (فصول المہمہ ص ۱۲۷)

(۲۵) الحدیث: سَتَكُونُ بَعْدِي فِتْنَةٌ فَإِذَا كَانَ ذَالِكَ فَالْزِمُوا عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ فَإِنَّهُ أَوَّلُ مَنْ آمَنَ بِي وَأَوَّلُ مَنْ يُصَافِحُنِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَهُوَ الصِّدِّيقُ الْأَكْبَرُ وَهُوَ فَارُوقُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ يُفَرِّقُ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ وَهُوَ يَعْسُوبُ الدِّيْنِ میرے بعد بہت جلد ایک فتنہ برپا ہوگا۔ پس جب ایسا ہو تو تم لوگ علی بن ابی طالبؑ کا دامن تھام لینا اس لیے کہ مجھ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے وہی ہیں اور قیامت کے دن سب سے پہلے مجھ سے مصافحہ بھی وہی کریں گے۔ وہ صدیق اکبر بھی ہیں اور اس امت کے فاروق اعظم بھی۔ وہی حق و باطل میں جدائی کرنے والے ہیں۔ علیؑ ہی دین کے پیشوائے اعظم ہیں۔

(اسد الغابہ ج ۵، ص ۲۷۸۔ ینابیع المودۃ ص ۸۲)

(۲۶) الحدیث: يَا عَلِيُّ أَنْتَ قَسِيمُ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اے علیؑ! تم قیامت کے دن جنت اور جہنم تقسیم کرنے والے ہو۔ (ابن حجر، صواعق محرقہ ص ۷۵۔ ینابیع المودۃ ص ۸۶)

شافعی کہتے ہیں:

عَلِيٌّ حُبُّهُ جُنَّةٌ قَسِيمُ النَّارِ وَالْجَنَّةِ
وَصِيُّ الْمُصْطَفٰى حَقًّا إِمَامُ الْإِنْسِ وَالْجِنَّةِ

علیؑ کی محبت آتش جہنم کے لیے سپر ہے۔ علیؑ جنت و جہنم کو تقسیم کرنے والے ہیں۔ بے شک وہ محمد مصطفیٰؐ کے وصی اور جن وانس کے امام ہیں۔

اس حدیث کے بارے میں جب احمد بن حنبل سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا:

تم کس لیے اس کا انکار کرتے ہو؟ کیا تم نے نبی اکرم ﷺ کی یہ حدیث نہیں سنی کہ اے علیؑ! تمھیں مومن کے سوا کوئی دوست نہیں رکھتا اور منافق کے سوا کوئی تمھیں دشمن نہیں رکھتا۔ سائل نے کہا: ہاں! ہم نے یہ حدیث سنی ہے۔

احمد بن حنبل نے کہا: مومن کہاں جائے گا؟ اس نے کہا: جنت میں۔

احمد بن حنبل نے پوچھا: منافق کہاں جائے گا؟ اس نے کہا: جہنم میں۔

قَالَ اَحْمَدُ فَعَلِیٌّ قَسِیْمُ النَّارِ وَالْجَنَّةِ احمد بن حنبل نے کہا: پس علیؑ جنت و جہنم کے قسیم ہوگئے

(الامام الصادق والمذاھب الاربعة ج ۱، ص ۳۲۷)

(۲۷) الحدیث: اِنَّ اللهَ حَرَّمَ الْجَنَّةَ عَلٰی مَنْ ظَلَمَ اَهْلَ بَیْتِیْ اَوْ قَاتَلَهُمْ اَوْ اَغَارَ عَلَیْهِمْ اَوْ سَبَّهُمْ اللہ نے جنت حرام کردی ہے ان لوگوں پر جنھوں نے اہلبیتؑ پر ظلم کیا، ان کو قتل کیا، ان پر حملہ کیا اور ان پر سب وشتم کیا۔ (ذخائر العقبیٰ ص ۲۰)

(۲۸) جناب عمارؓ، جناب معاذؓ اور بی بی عائشہؓ نے رسول خدا ﷺ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ اَلنَّظْرُ اِلٰی وَجْهِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ عِبَادَةٌ وَ ذِکْرُهٗ عِبَادَةٌ وَلَا یُقْبَلُ اِیْمَانٌ اِلَّا بِوِلَایَتِهٖ وَالْبَرَائَةِ مِنْ اَعْدَائِهٖ علی ابن ابی طالبؑ کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔ نیز ان کا ذکر عبادت ہے۔ اس شخص کا ایمان قبول نہیں کیا جائے گا جو ولایت علیؑ کا اقرار اور آپ کے دشمنوں سے برائت کا اظہار نہ کرے۔

(مناقب ابن شہر آشوب ج ۲، ص ۵)

(۲۹) الحدیث: عُنْوَانُ صَحِیْفَةِ الْمُؤْمِنِ حُبُّ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ مومن کے نامۂ عمل کا عنوان علی بن ابی طالبؑ کی محبت ہے۔ (جامع الصغیر ج ۲، ص ۱۴۵۔ مناقب ابن مغازلی ص ۲۴۳)

(۳۰) جناب زید بن ارقم کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھے جب آپ نے فرمایا: اَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی مَنْ اِذَا اسْتَرْشَدْتُمُوْهُ لَنْ تَضِلُّوْا وَلَنْ تَهْلِکُوْا؟ کیا میں تمھیں اس شخص کے بارے میں بتاؤں کہ اگر تم اس سے ہدایت طلب کرو تو گمراہ نہیں ہوگے اور ہلاکت میں بھی نہیں پڑو گے۔

قَالُوْا بَلٰی یَارَسُوْلَ اللهِ، قَالَ هُوَ ذَا وَاَشَارَ اِلٰی عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ عَلَیْهِ السَّلَامُ ثُمَّ قَالَ وَاَخُوْهُ

وَوَازِرُوْهُ وَاَصْدِقُوْهُ وَانْصَحُوْهُ فَاِنَّ جِبْرِيْلَ اَخْبَرَنِيْ بِمَا قُلْتُ لَكُمْ سب نے کہا: جی ہاں۔ یا رسول اللہؐ! آپ نے حضرت علی بن ابی طالبؑ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: اس کے ساتھی بنو اور اس کا بوجھ بٹاؤ۔ اس کے دوست اور خیر خواہ بنو اس لیے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کی خبر مجھے جبریلؑ نے دی ہے۔

(مناقب ابن مغازلی ص ۲۴۵)

(۳۱) حموینی نے جناب ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بی بی ام سلمہؓ سے فرمایا: هٰذَا عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ لَحْمُهُ لَحْمِيْ وَدَمُهُ دَمِيْ وَهُوَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى اِلَّا اَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ يَا اُمَّ سَلَمَةَ هٰذَا عَلِيٌّ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَسَيِّدُ الْمُسْلِمِيْنَ وَوَصِيِّيْ وَعَيْبَةُ عِلْمِيْ وَبَابِيَ الَّذِيْ اُوْتِيَ مِنْهُ وَمَعِيَ فِي السَّنَامِ الْاَعْلٰى يَقْتُلُ الْقَاسِطِيْنَ وَالنَّاكِثِيْنَ وَالْمَارِقِيْنَ یہ علی بن ابی طالبؑ ہیں۔ ان کا گوشت میرا گوشت اور ان کا خون میرا خون ہے۔ ان کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اے ام سلمہ! یہ علیؑ مومنین کے امیر، مسلمانوں کے سردار، میرے وصی، میرے علم کا خزانہ اور دروازہ ہیں۔ اس دروازے سے گزرے بغیر کوئی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بہشت میں میرے ساتھ اعلیٰ مقام پر ہوں گے۔ یہ قاسطین (اصحاب صفین)، ناکثین (اصحاب جمل) اور مارقین (خوارج) سے جنگ کریں گے۔ (غایۃ المرام، باب ۸، ح ۶، ۳۸)

(۳۲) جابر بن سمرہ کہتے ہیں پوچھا گیا کہ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ صَاحِبُ لِوَائِكَ فِي الْاٰخِرَةِ ؟ قَالَ: صَاحِبُ لِوَائِيْ فِي الدُّنْيَا عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ یا رسول اللہؐ! آخرت میں آپ کا علمدار کون ہوگا؟ فرمایا: دنیا و آخرت میں میرا علمدار علی بن ابی طالبؑ ہے۔ (مناقب ابن مغازلی ص ۲۰۰۔ مناقب خوارزمی ص ۲۵۰)

(۳۳) الحدیث: حَقُّ عَلِيٍّ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ كَحَقِّ الْوَالِدِ عَلٰى وَلَدِهٖ مسلمانوں پر علیؑ کا وہی حق ہے جو ایک بیٹے پر باپ کا ہوتا ہے۔ (لسان المیزان ج ۴، ص ۳۹۹۔ مناقب ابن مغازلی ص ۴۸)

(۳۴) الحدیث: عَنْ اَبِيْ اَيُّوْبَ اَنْصَارِيٍّ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ لِفَاطِمَةَ: اَمَا عَلِمْتِ اَنَّ اللّٰهَ اطَّلَعَ اِلٰى اَهْلِ الْاَرْضِ فَاخْتَارَ مِنْهُمْ اَبَاكِ فَبَعَثَهُ نَبِيًّا ، ثُمَّ اطَّلَعَ الثَّانِيَةَ فَاخْتَارَ بَعْلَكِ فَاَوْحٰى اِلَيَّ فَاَنْكَحْتُهُ وَاتَّخَذْتُهُ وَصِيًّا جناب ابو ایوب انصاریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہؑ سے فرمایا: کیا تم جانتی ہو کہ خدا نے اہل زمین پر نظر ڈالی اور ان میں سے تمہارے باپ کو منتخب فرمایا اور نبی بنایا۔ پھر دوبارہ نظر ڈالی اور تمہارے شوہر کو منتخب فرما کر مجھ پر وحی کی کہ میں اس سے تمہاری شادی کردوں اور اسے اپنا جانشین بناؤں۔ (کفایۃ الطالب ص ۲۹۶)

(۳۵) شیخ سلیمان بلخی اپنی کتاب ینابیع المودۃ میں فرائد السمطین کے حوالے سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک یہودی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور آپ سے آپ کے اوصیاء کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: اِنَّ وَصِيِّي عَلِيُّ بْنُ اَبِي طَالِبٍ وَ بَعْدَهُ سِبْطَايَ الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ تَتْلُوْهُ تِسْعَةُ اَئِمَّةٍ مِنْ صُلْبِ الْحُسَيْنِ میرے وصی علی بن ابی طالبؑ ہیں۔ اس کے بعد میرے دونوں نواسے حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔ پھر ان کے بعد صلب حسینؑ سے نو امام ہوں گے۔

قَالَ يَا مُحَمَّدُ (ص) فَسَمِّهِمْ لِي. قَالَ اِذَا مَضَى الْحُسَيْنُ فَابْنُهُ عَلِيٌّ. فَاِذَا مَضَى عَلِيٌّ فَابْنُهُ مُحَمَّدٌ. فَاِذَا مَضَى مُحَمَّدٌ فَابْنُهُ جَعْفَرٌ فَاِذَا مَضَى جَعْفَرٌ فَابْنُهُ مُوْسَى. فَاِذَا مَضَى مُوْسَى فَابْنُهُ عَلِيٌّ. فَاِذَا مَضَى عَلِيٌّ فَابْنُهُ مُحَمَّدٌ فَاِذَا مَضَى مُحَمَّدٌ فَابْنُهُ عَلِيٌّ. فَاِذَا مَضَى عَلِيٌّ فَابْنُهُ الْحَسَنُ. فَاِذَا مَضَى الْحَسَنُ فَابْنُهُ الْحُجَّةُ مُحَمَّدٌ الْمَهْدِيُّ فَهٰؤُلَاءِ اِثْنَا عَشَرَ یہودی نے کہا: یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے ان کے نام بتایئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: حسینؑ کے بعد ان کا بیٹا علیؑ۔ علیؑ کے بعد ان کا بیٹا محمدؑ، محمدؑ کے بعد ان کا بیٹا جعفرؑ۔ جعفرؑ کے بعد ان کا بیٹا موسیٰؑ، موسیٰؑ کے بعد ان کا بیٹا علیؑ، علیؑ کے بعد ان کا بیٹا محمدؑ، محمدؑ کے بعد ان کا بیٹا علیؑ، علیؑ کے بعد ان کا بیٹا حسنؑ اور حسنؑ کے بعد ان کا بیٹا حجت ہوگا۔ اس کا نام محمد اور لقب مہدیؑ ہوگا۔ یہ ہیں میرے بارہ اوصیاء۔ (ینابیع المودۃ ص ۴۴۱)

بہر حال حضرت علی علیہ السلام کی امامت و خلافت کے بارے میں بہت زیادہ احادیث موجود ہیں جن کے بیان کے لیے سینکڑوں صفحات بھی کم پڑ جائیں۔ اس لیے ہم نے کچھ احادیث بیان کرنے پر اکتفاء کیا ہے جو کہ اہلسنت کی معتبر کتابوں سے لی گئی ہیں حالانکہ شیعہ کتب حدیث و تاریخ اس طرح کی احادیث سے بھری ہوئی ہیں مگر ہم نے ان میں سے کوئی پیش نہیں کی۔[1]

---

۱۔ شیعہ وسنی احادیث کے لیے دیکھئے ''مولا علیؑ کی شان میں ایک ہزار احادیث''، مطبوعہ مجمع علمی اسلامی

# (۴) حضرت علی علیہ السلام کے متعلق اہل علم کے تاثرات

اس باب میں ہم حضرت علی علیہ السلام کے متعلق اہلسنت کے بعض اکابر علماء کی آراء پیش کر رہے ہیں تاکہ آپ جان سکیں کہ حضرت علی علیہ السلام کی عظیم شخصیت کے بارے میں وہ کیا کہتے ہیں۔

ابن ابی الحدید معتزلی اپنی کتاب شرح نہج البلاغہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

میں اُس ہستی کی عظمت کیا بیان کروں جس کی عظمت کا اس کے دشمنوں نے بھی اقرار کیا ہے۔ جس کے فضائل دشمن بھی نہ چھپا سکے اگرچہ انھوں نے اس کو چھپانے کے لیے اپنا پورا زور صرف کیا۔ جب دشمن ان کے فضائل چھپا نہ سکے تو انھوں نے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کئے۔ انھوں نے منبروں سے اس پر سب وشتم کیا، اس کے محبوں کو دھمکایا، زندانوں میں قید کیا اور ان کو پھانسیاں لگائیں۔ اس کے فضائل پر مبنی حدیثوں کو بیان کرنے پر پابندی لگا دی لیکن دشمن نے جتنی کوششیں کیں اس ہستی کی عظمت میں اتنا ہی اضافہ ہوتا گیا بالکل ویسے ہی جیسے مشک و عنبر کو جتنا چھپایا جائے اس کی خوشبو اتنی ہی پھیلتی ہے۔ سورج کو ہتھیلی سے چھپایا نہیں جاسکتا۔ روز روشن کو اگرچہ نابینا نہیں دیکھ سکتا مگر بینا تو دیکھ سکتا ہے۔ میں کیا کہوں اس ''مردحق'' کے بارے میں جو فضیلت کا سرچشمہ ہے۔ وہ سید الفضائل اور منبع کمالات ہے۔ تمام کمالات اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ کوئی کتنا ہی اکتساب علم کیوں نہ کرچکا ہو وہ اسی کے خرمن علم کا خوشہ چین نظر آتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ سب سے بہترین علم، ''معارف الٰہی کا علم'' ہے۔ اس لیے کہ علم کا شرف ''معلوم'' کے شرف سے ہے اور اس عظیم ہستی کے پرحکمت کلام سے معارف الٰہی کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ معارف الٰہی کی ابتدا اور انتہا اسی ذات اقدس پر ہے۔

اور یہ کہ معتزلہ کے بزرگ واصل بن عطا (متوفی ۱۳۱ھ) ابو ہاشم (متوفی ۹۸ھ) کے شاگرد تھے اور ابو ہاشم اپنے والد محمد بن حنفیہ (متوفی ۸۱ھ) کے شاگرد تھے۔ محمد بن حنفیہ نے اپنے والد حضرت علی علیہ السلام سے اکتساب فیض کیا تھا۔

نیز اشعری فرقہ ابو الحسن علی بن اسماعیل اشعری (متوفی ۳۲۴ھ) سے منسوب ہے۔ اشعری، ابوعلی جبائی معتزلی (متوفی ۳۰۳ھ) کا شاگرد تھا۔ گویا دونوں فرقوں نے حضرت علی علیہ السلام سے کسب فیض کیا تھا جبکہ امامیہ اور زیدیہ کا حضرت علی علیہ السلام سے انتساب ظاہر و باہر ہے۔

اور یہ کہ جملہ علوم میں سے ایک علم، فقہ ہے اور ہر فقیہ حضرت علی علیہ السلام کے خرمن کا خوشہ چین ہے۔ حنفی فقہاء میں سے ابو یوسف اور محمد بن حسن نے ابوحنیفہ سے فقہ سیکھی تھی۔ امام شافعی جو بڑے پائے کے فقیہ ہیں انھوں نے فقہ کی تعلیم محمد بن حسن سے حاصل کی اور محمد بن حسن کی فقہ ابوحنیفہ سے جا کر ملتی ہے۔ احمد بن حنبل نے فقہ امام شافعی سے سیکھی لہٰذا ان کی فقہ بھی ابوحنیفہ سے جا کر ملتی ہے جبکہ ابوحنیفہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگرد رہے تھے اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی فقہ ان کے آباء و اجداد کے ذریعے حضرت علی علیہ السلام پر منتہی ہوتی ہے۔ رہ گئے مالک بن انس تو انھوں نے ربیعہ الرای سے، انھوں نے عکرمہ سے اور عکرمہ نے حبر الامت ابن عباسؓ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی تھی جو حضرت علی علیہ السلام کے شاگرد تھے۔ جب ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ آپ کے علم کو حضرت علی علیہ السلام کے علم سے کیا نسبت ہے تو انھوں نے کہا: كَنِسْبَةِ قَطْرَةٍ مِنَ الْمَطَرِ اِلَى الْبَحْرِ الْمُحِيْطِ یعنی جو بارش کے ایک قطرے کو بحر بیکراں سے ہوتی ہے۔[1]

ابن ابی الحدید مزید لکھتے ہیں:

میں اس مرد حق کے بارے میں کیا کہوں جو سب سے پہلے ایمان لایا اور اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی حالانکہ تمام روئے زمین پر لوگ پتھروں کو پوجتے تھے اور اپنے خالق حقیقی کے منکر تھے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ کسی نے توحید پر ایمان میں سبقت نہیں کی۔ اکثر اہل حدیث بھی معتقد ہیں کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سب سے پہلے پیروی کرنے اور ان پر ایمان لانے والے علیؑ ہی تھے۔ صرف ایک چھوٹے گروہ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ خود حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے:

اَنَا الصِّدِّيْقُ الْاَكْبَرُ وَاَنَا الْفَارُوْقُ الْاَوَّلُ اَسْلَمْتُ قَبْلَ اِسْلَامِ النَّاسِ وَصَلَّيْتُ قَبْلَ صَلٰوتِهِمْ

میں ہی صدیق اکبر اور فاروق اول ہوں۔ سب سے پہلے میں نے اسلام قبول کیا اور سب سے پہلے میں نے ہی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ) نماز پڑھی۔ (بحار الانوار ج ۴۱ نقل از شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۷، ۱۴)

---

۱۔ ابن ابی الحدید نے صاحبان علم کے علوم کو بالواسطہ حضرت علی علیہ السلام کے علم سے نسبت دے کر غالباً یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ معتزلی اشعری، حنفی اور دیگر مذاہب بھی برحق ہیں۔ البتہ اس ضمن میں یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ فرقے حصول علم کے بعد منحرف ہو گئے اور فرقہ حقہ امامیہ سے خارج ہو گئے۔

ابن ابی الحدید اس کے بعد کہتے ہیں :

فَلَا رَیْبَ عِنْدَنَا اَنَّ عَلِیًّا عَلَیْهِ السَّلَامُ کَانَ وَصِیَّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَاِنْ خَالَفَ فِیْ ذَالِكَ مَنْ هُوَ مَنْسُوْبٌ عِنْدَنَا اِلَی الْعِنَادِ بے شک ہمارے نزدیک حضرت علی علیہ السلام رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ کے جانشین ہیں۔ جس نے اس بات کی مخالفت کی ہے تو وہ ہمارے نزدیک اہل عناد میں سے ہے۔

(ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۲۶)

ابن ابی الحدید نے حضرت علی علیہ السلام کی مدح میں سات طویل اور پُر معنی قصیدے کہے ہیں جو القصائد السبع العلویات کے نام سے مشہور ہیں۔ اپنے پہلے قصیدے میں وہ کہتے ہیں :

وَمَا اَنْسَ لَا اَنْسَ اللَّذَیْنِ تَقَدَّمَا ۔۔۔ وَ فَرَّهُمَا وَالْفَرُّ قَدْ عَلِمَا حُوْبٌ

وَلِلرَّایَةِ الْعُظْمٰی وَقَدْ ذَهَبَا بِهَا ۔۔۔ مَلَابِسُ ذُلٍّ فَوْقَهَا وَ جَلَابِیْبُ

یَشُلُّهُمَا مِنْ آلِ مُوْسٰی شَمَرْدَلٌ ۔۔۔ طَوِیْلُ نِجَادِ السَّیْفِ اَجْیَدُ یَعْبُوْبُ

یَمُجُّ مَنُوْنًا سَیْفُهُ وَ سِنَانُهُ ۔۔۔ وَ یَلْهَبُ نَارًا غِمْدُهُ وَالْاَنَابِیْبُ

عَذَرْتُکُمَا اِنَّ الْحِمَامَ لَمُبْغَضٌ ۔۔۔ وَاِنَّ بَقَاءَ النَّفْسِ لِلنَّفْسِ مَحْبُوْبٌ

لَیَکْرَهُ طَعْمَ الْمَوْتِ وَالْمَوْتُ طَالِبٌ ۔۔۔ فَکَیْفَ یَلَذُّ الْمَوْتُ وَالْمَوْتُ مَطْلُوْبٌ

دَعَا قَصَبَ الْعَلْیَا یَمْلِکُهَا امْرُؤٌ ۔۔۔ بِغَیْرِ اَفَاعِیْلِ الدَّنَائَةِ مَقْضُوْبٌ

یَرٰی اَنَّ طُوْلَ الْحَرْبِ وَالْبُؤْسِ رَاحَةٌ ۔۔۔ وَاَنَّ دَوَامَ السِّلْمِ وَالْخَفْضِ تَعْذِیْبٌ

فَلِلّٰهِ عَیْنَا مَنْ رَاٰهُ مُبَارِزًا ۔۔۔ وَ لِلْحَرْبِ کَاْسٌ بِالْمَنِیَّةِ مَقْطُوْبٌ

جَوَادٌ عَلَا ظَهْرَ الْجَوَادِ وَ اَخْشَبٌ ۔۔۔ تَزَلْزَلَ مِنْهُ فِی النِّزَالِ الْاَخَاشِیْبُ

وَاَصْلَتَ فِیْهَا مَرْحَبُ الْقَوْمِ مِقْضَبًا ۔۔۔ جُرَازًا بِهٖ حَبْلُ الْاَمَانِیْ مَقْضُوْبٌ

فَاَشْرَبَهُ کَاْسَ الْمَنِیَّةِ اَحْوَسٌ ۔۔۔ مِنَ الدَّمِ طَعِیْمٌ وَلِلدَّمِ شِرِّیْبٌ

میں سب کچھ بھول سکتا ہوں مگر ان دونوں کے فرار کو نہیں بھول سکتا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جنگ سے بھاگنا گناہ ہے۔ پیغمبرؐ کے عظیم پرچم کو اٹھا کر وہ میدان میں گئے مگر فرار کے ذریعے انھوں نے اسے بے آبرو کردیا۔ آل موسیٰؑ کے پہلوان مرحب نے ان دونوں کو مار بھگایا اس حالت میں کہ تیز دھار لمبی تلوار اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ چاق و چوبند گھوڑے پر سوار تھا۔ مرحب کی تلوار اور اس کا نیزہ موت کا پیغام تھا۔ اس کی تلوار آگ برساتی تھی۔ میں تم دونوں کے عذر کو (جو تم نے مرحب کے مقابلے سے

بچنے کے لیے بنایا تھا) قبول کرتا ہوں کیونکہ ہر آدمی موت سے ڈرتا اور زندگی سے پیار کرتا ہے۔ جب موت خود چل کر تمہارے پاس آتی ہے تو تم کو ناگوار ہوتی ہے پھر کیونکر ممکن ہے کہ تم خود موت کی تلاش میں نکلو اور اس سے کھیلو۔ تم مرد میدان نہیں ہو اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم دونوں اسلام کا پرچم رکھ دو اور اسے مردِ حق کے حوالے کر دو تا کہ یہ اس کے ہاتھ میں رہے کیونکہ وہ جنگ آزماؤں کو ذلیل نہیں ہونے دے گا۔ وہ ایسا انسان ہے کہ طویل جنگوں کی سختیوں کو اپنے لیے راحت اور مسلسل صلح جوئی اور گوشہ نشینی کو رنج و تکلیف جانتا ہے۔ خوش نصیب ہے وہ آنکھ جس نے علیؑ کو میدان میں برسرِ پیکار دیکھا حالانکہ جنگ میں موت کا جام لبریز ہوتا ہے۔ سرپٹ دوڑنے والے گھوڑے پر سوار یہ وہ شیر دل سخی ہے کہ جنگ کے موقع پر پہاڑ بھی اس کے خوف سے دہل جاتے ہیں۔ اس جنگ میں مرحب اپنی تیز دھار تلوار کو لہرا رہا تھا اور آرزوؤں کی رسی کو کاٹ ڈالتا تھا مگر علیؑ وہ بہادر ہے جس نے مرحب کو موت کا جام پلایا اور وہ جنگوں میں احیاءِ حق کے لیے بڑے بڑے سورماؤں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔

(القصائد السبع العلویات، قصیدہ اول)

ابن ابی الحدید اپنے پانچویں قصیدے میں حضرت علی علیہ السلام کی مدح یوں بیان کرتے ہیں۔

هُوَ النَّبَأُ الْمَكْنُوْنُ وَالْجَوْهَرُ الَّذِيْ — تَجَسَّدَ مِنْ نُوْرٍ مِنَ الْقُدْسِ زَاهِرٖ

وَ وَارِثُ عِلْمِ الْمُصْطَفٰى وَشَقِيْقُهٗ — اَخًا وَ نَظِيْرًا فِي الْعُلٰى وَالْاَوَاصِرِ

اَلَا اِنَّمَا الْاِسْلَامُ لَوْلَا حُسَامُهٗ — كَعَفْطَةِ عَنْزٍ اَوْ قُلَامَةِ حَافِرٖ

اَلَا اِنَّمَا التَّوْحِيْدُ لَوْ لَا عُلُوْمُهٗ — كَعُرْضَةِ ضِلِّيْلٍ وَ نُهْبَةِ كَافِرٖ

هُوَ الْاٰيَةُ الْعُظْمٰى وَمُسْتَنْبِطُ الْهُدٰى — وَ حيرَةُ اَرْبَابِ النُّهٰى وَ الْبَصَائِرِ

تَعَالَيْتَ عَنْ مَدْحٍ فَاَبْلَغُ خَاطِبٍ — بِمَدْحِكَ بَيْنَ النَّاسِ اَقْصَرُ قَاصِرٖ

اِذَا طَافَ قَوْمٌ فِي الْمَشَاعِرِ وَالصَّفَا — فَقَبْرُكَ رُكْنِيْ طَائِفًا وَ مَشَاعِرِيْ

وَاِنْ ذَخِرَ الْاَقْوَامُ فِي الْمَشَاعِرِ وَالصَّفَا — فَحُبُّكَ اَوْفٰى عُدَّتِيْ وَ ذَخَائِرِيْ

وَاِنْ صَامَ نَاسٌ فِي الْهَوَاجِرِ حِسْبَةً — فَمَدْحُكَ اَسْنٰى مِنْ صِيَامِ الْهَوَاجِرِ

نَصَرْتُكَ فِي الدُّنْيَا بِمَا اسْتَطِيْعُهٗ — فَكُنْ شَافِعِيْ يَوْمَ الْمَعَادِ وَنَاصِرِيْ

علیؑ ایک راز ہے جسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ وہ عالم قدس کے تابندہ نور ہیں جو اس دنیا میں لباس وجود پہن کر آئے۔ وہ رسولؐ کے علم کے وارث اور ان کے بھائی ہیں۔ وہ عالی مرتبہ اور اخلاق حسنہ

میں رسولؐ کی نظیر ہیں۔ یاد رکھو! اگر علیؑ کی ذوالفقار نہ ہوتی تو بکری کی رینٹ کے برابر بھی اسلام کی وقعت نہ ہوتی۔ اگر اس کا علم نہ ہوتا تو توحید گمراہوں اور کافروں کے نرغے میں ہوتی۔ وہ خدا کی بڑی آیت اور ہدایت کا سرچشمہ ہیں۔ صاحبان عقل و بصیرت ان کے مرتبے سے حیران ہیں۔ اے علیؑ! آپ مدح و ستائش سے بالاتر ہیں۔ بہترین خطیب بھی آپ کی تعریف سے قاصر ہے۔ جب حج کے موقع پر لوگ مشعر الحرام اور صفا میں مشغول طواف ہوتے ہیں تو آپ کی قبر مطہر بھی میرا رکن اور ''مشاعر'' ہوتی ہے جس کا میں طواف کرتا ہوں۔ اگر لوگ اپنی آخرت کے لیے عبادت ذخیرہ کرتے ہیں تو میرے لیے بہترین زاد راہ آپ کی محبت ہے۔ اگر لوگ سخت گرمی میں خدا کی خوشنودی کے لیے روزہ رکھتے ہیں تو آپ کی مدح ان گرم دنوں کے روزوں سے بھی زیادہ افضل ہے۔ جہاں تک میری بساط تھی میں نے آپ کی مدح کر کے دنیا میں آپ کی مدد کی ہے۔ آپ بھی قیامت کے دن میری شفاعت اور مدد کیجیے گا۔

(القصائد السبع العلویات، قصیدہ خامسہ)

فتح مکہ کے عنوان سے موسوم قصیدہ میں ابن ابی الحدید کہتے ہیں:

طَلَعْتَ عَلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ بِعَارِضٍ ... يَمُجُّ نَجِيعًا مِنْ ظُبَيِ الْهِنْدِ أَحْمَرَا

وَ أَظْهَرْتَ نُورَ اللهِ بَيْنَ قَبَائِلَ ... مِنَ النَّاسِ لَمْ يَبْرَحْ بِهَا الشِّرْكُ نَيِّرَا

رَقِيْتَ بِأَسْمَى غَارِبٍ أَحْدَقَتْ بِهِ ... مَلَائِكُ يَتْلُونَ الْكِتَابَ الْمُسَطَّرَا

بِغَارِبِ خَيْرِ الْمُرْسَلِينَ وَ أَشْرَفِ ... الْأَنَامِ وَ أَزْكَى نَاعِلٍ وَطَأَ الثَّرَى

فَسَبَّحَ جِبْرِيْلُ وَ قَدَّسَ هَيْبَةً ... وَ هَلَّلَ إِسْرَافِيلُ رُعْبًا وَ كَبَّرَا

فَتًى لَمْ يُعَرِّقْ فِيهِ تَيْمُ ابْنُ مُرَّةٍ ... وَلَا عَبَدَ اللَّاتَ الْخَبِيثَةَ أَعْصُرَا

وَلَا كَانَ مَعْزُولًا غَدَاةَ بَرَائَةٍ ... وَلَا عَنْ صَلَوٰةٍ أَمَّ فِيهَا مُؤَخَّرَا

وَلَا كَانَ يَوْمَ الْغَارِ يَهْفُو جَنَانُهُ ... حِذَارًا وَلَا يَوْمَ الْعَرِيْشِ تَسَتَّرَا

حَلَفْتُ بِمَثْوَاهُ الشَّرِيفِ وَ تُرْبَةٍ ... أَحَالَ ثَرَاهَا طِيبُ رَيَّاهُ عَنْبَرَا

لَأَسْتَنْفِدَنَّ الْعُمْرَ فِي مِدَحِيْ لَهُ ... وَإِنْ لَامَنِي فِيهِ الْعَذُولُ فَأَكْثَرَا

آپ لشکر کے ساتھ سرزمین کعبہ کی طرف یوں بڑھتے چلے آ رہے تھے جیسے بادل تیزی سے چل رہا ہو یا جیسے سرخ ہرنوں کا غول بے تکان چوکڑیاں بھر رہا ہو۔ آپ نے وہاں مشرک قبائل پر اللہ کا نور آشکار فرمایا اور دوش رسولؐ پر چڑھے اس حال میں کہ فرشتے قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے اس منظر کو دیکھ

رہے تھے۔ آپ افضل الرسل کے دوش مبارک پر سوار ہوئے جو زمین پر چلنے والوں میں سب سے پاکیزہ نعلین پہننے والے ہیں۔ جبریلؑ آپ کی ہیبت پر تسبیح کرتے رہے جبکہ اسرافیلؑ بھی تہلیل وتکبیر کہتے رہے۔ یہ وہ جواں مرد ہے جس کے نسب میں تیم بن مرۃ (حضرت ابوبکرؓ کے قبیلے) کا کوئی دخل نہیں۔ جس نے کبھی خبیث لات کی پوجا نہیں کی اور اسے نہ تو سورۂ برأت لے کر جانے سے معزول کیا گیا اور نہ نماز جماعت کی امامت کا ارادہ کرنے پر ہٹایا گیا۔ وہ ایسا ہرگز نہیں کہ رسولؐ کا یار غار تھا مگر پھر بھی اس کا دل مشرکین کے ڈر سے کانپ رہا تھا یا پھر بدر کے میدان میں جنگ سے ڈر کر سائبان بدر میں چھپ گیا تھا۔ میں آپ کے مقدس مدفن کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کی خاک کی خوشبو مشک وعنبر کی مانند ہے کہ میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ آپ کی مدح میں گزار دوں گا اگرچہ ملامت کرنے والے مجھے ملامت کرتے رہیں۔ (القصائد السبع العلویات، قصیدہ دوم)

امام شافعی نے بھی حضرت علی علیہ السلام کی شان میں یہ اشعار کہے ہیں:

قِيْلَ لِيْ قُلْ فِيْ عَلِيٍّ مَدْحًا ذِكْرُهُ يُخْمِدُ نَارًا مُوْصَدَهْ

قُلْتُ لَا اَقْدِرُ فِيْ مَدْحِ امْرِءٍ ضَلَّ ذُو اللُّبِّ اِلٰى اَنْ عَبَدَهْ

وَالنَّبِيُّ الْمُصْطَفٰى قَالَ لَنَا لَيْلَةَ الْمِعْرَاجِ لَمَّا صَعِدَهْ

وَ ضَعَ اللّٰهُ بِكَتْفِيْ يَدَهُ فَاَحَسَّ الْقَلْبُ اَنْ قَدْ بَرَدَهْ

وَ عَلِيٌّ وَاضِعٌ اَقْدَامَهُ فِيْ مَحَلٍّ وَضَعَ اللّٰهُ يَدَهْ

مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ علیؑ کی مدح میں کچھ کہوں کہ جس کا ذکر جہنم کے بھڑکتے شعلوں کو سرد کردیتا ہے۔ میں نے کہا میں اس کی مدح کرنے کی تاب نہیں رکھتا جس کے متعلق عقل مند آدمی گمراہی میں پڑ گیا یہاں تک کہ اسی کی پرستش کرنے لگا۔ نبی مصطفیٰؐ نے فرمایا تھا کہ جب میں شب معراج آسمان کی بلندیوں کی طرف گیا تو اللہ نے اپنا ''ہاتھ'' میرے کندھے پر رکھا جس سے میرے دل کو سکون کا احساس ہوا اور علیؑ وہ ہے جس نے اپنا پاؤں اس جگہ رکھا جہاں اللہ نے اپنا ''ہاتھ'' رکھا تھا۔

(حضرت علی علیہ السلام نے دوش رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چڑھ کر ہبل کو توڑا تھا اسی کی طرف اشارہ ہے)۔

امام شافعی نے ایک اور جگہ کہا ہے:

اُحِبُّ عَلِيًّا لَا اُبَالِيْ وَاِنْ فَشَا وَذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَشَاءُ

اَنَا عَبْدٌ لِفَتًى اُنْزِلَ فِيْهِ هَلْ اَتٰى اِلٰى مَتٰى اَكْتُمُهُ اِلٰى مَتٰى

میں علیؑ کو دوست رکھتا ہوں اور ان کے دشمنوں سے مجھے کوئی ڈر نہیں اگرچہ میری دوستی سب پر ظاہر ہو جائے کیونکہ یہ دوستی اللہ کا فضل ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ میں اس جوان کا غلام ہوں جس کی شان میں هل اتی نازل ہوئی۔ میں کب تک یہ بات چھپائے رکھوں؟

امام شافعی نے ایک اور جگہ کہا ہے:

إِذَا فِيْ مَجْلِسٍ ذَكَرُوْا عَلِيًّا ۔۔۔ وَ شِبْلَيْهِ وَ فَاطِمَةَ الزَّكِيَّةَ

يُقَالُ تَجَاوَزُوْا يَا قَوْمُ هٰذَا ۔۔۔ فَهٰذَا مِنْ حَدِيْثِ الرَّافِضِيَّةِ

هَرَبْتُ إِلَى الْمُهَيْمِنِ مِنْ أُنَاسٍ ۔۔۔ يَرَوْنَ الرَّفْضَ حُبَّ الْفَاطِمِيَّةِ

عَلٰى آلِ الرَّسُوْلِ صَلٰوةُ رَبِّيْ ۔۔۔ وَ لَعْنَتُهُ لِتِلْكَ الْجَاهِلِيَّةِ

جب کسی مجلس میں علیؑ، ان کے فرزندوں اور فاطمہ زہراؑ کا ذکر ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ لوگو! ان باتوں پر کان نہ دھرو۔ یہ رافضیوں کی باتیں ہیں۔ میں خدائے مہیمن کی پناہ مانگتا ہوں ایسے لوگوں سے جو اولاد فاطمہؑ کی محبت کو رفض سمجھتے ہیں۔ اللہ کا سلام ہو آل رسولؐ پر اور اللہ کی لعنت ہو ایسی جاہلیت پر

عمرو بن عاص نے بھی حضرت علی علیہ السلام کی شان میں ایک قصیدہ کہا تھا جو **قصیدۂ جلجلیہ** کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں عمرو نے یوم غدیر کے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کا اعتراف کیا تھا۔ اس قصیدے کا پس منظر یہ ہے کہ معاویہ نے عمرو بن عاص کو مصر کی حکومت سونپنے کے بعد عمرو سے مصر کے خراج کا مطالبہ کیا تو عمرو نے اسے نظر انداز کر دیا۔ معاویہ کی طرف سے دو تین بار یہ مطالبہ دہرایا گیا تو عمرو نے معاویہ کو یہ قصیدہ لکھ کر بھجوایا۔ علامہ امینی نے **الغدیر** کی جلد دوم میں مکمل قصیدہ نقل کیا ہے جو کافی طویل ہے اس لیے ہم اسے نقل کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔

ایک دن معاویہ نے حضرت علی علیہ السلام کے بڑے بھائی جناب عقیل سے حضرت علی علیہ السلام کے متعلق کچھ باتیں پوچھیں تو جناب عقیل نے معاویہ کو "لوہا گرم کرنے والے" واقعہ کی تفصیل بتائی جسے سن کر معاویہ نے کہا: رَحِمَ اللّٰهُ اَبَا الْحَسَنِ فَلَقَدْ سَبَقَ مَنْ كَانَ قَبْلَهٗ وَاَعْجَزَ مَنْ يَّاْتِيْ بَعْدَهٗ خدا رحمت کرے ابو الحسن پر! بے شک وہ اپنے سے پہلے والوں پر سبقت لے گئے اور بعد میں آنے والے ان کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہیں گے۔ (بحار الانوار ج ۴۲ نقل از شرح ابن ابی الحدید)

اہلسنت کے جید عالم دین و مفسر جار اللہ زمخشری ایک متعصب شخص تھے مگر وہ کہتے ہیں کہ حدیث قدسی میں خدا نے فرمایا ہے: لَاُدْخِلُ الْجَنَّةَ مَنْ اَطَاعَ عَلِيًّا وَاِنْ عَصَانِيْ، وَاُدْخِلُ النَّارَ مَنْ عَصَاهُ

وَاِنْ اَطَاعَنِیْ میں علیؑ کی اطاعت کرنے والے کو ضرور جنت میں داخل کروں گا اگرچہ اس نے میری نافرمانی کی ہو اور علیؑ کی نافرمانی کرنے والے کو جہنم میں جھونک دوں گا چاہے اس نے میری اطاعت کی ہو۔

زمخشری مزید کہتے ہیں:

حقیقت یہی ہے۔ کیونکہ علیؑ کی دوستی اور محبت ہی "ایمان کامل" ہے۔ ایمان کامل کے ہوتے ہوئے برے اعمال ایمان کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اس لیے خدا کا یہ فرمانا کہ میں علیؑ کی پیروی کرنے والے کو بخش دوں گا چاہے وہ میری نافرمانی ہی کیوں نہ کرنے والا ہو درحقیقت علیؑ کے مقام کا اظہار ہے اسی طرح خدا کا یہ فرمان کہ علیؑ کی نافرمانی کرنے والے کو جہنم میں ڈال دوں گا چاہے وہ میرا اطاعت گزار ہی کیوں نہ ہو بھی حقیقت پر مبنی ہے کیونکہ جو علیؑ کا دوست اور محب نہیں اس کا کوئی ایمان ہی نہیں۔ لہٰذا اس کی اطاعت دکھاوا ہے یہ حقیقی اطاعت بالکل نہیں۔ اس لیے کہ تمام اعمال اس وقت حقیقی اطاعت کے زمرے میں آتے ہیں جب ان میں علیؑ کی محبت و دوستی شامل ہو جائے۔ پس جو کوئی بھی علیؑ کو دوست رکھے گا درحقیقت وہی اطاعت گزار ہے اور جو اللہ کا مطیع و فرمانبردار ہوگا وہی نجات پائے گا۔ اس بنا پر حب علیؑ کی بنیاد ایمان اور بغض علیؑ کی بنیاد کفر ہے اور قیامت کے دن سوائے محبت اور دشمنی کے کچھ بھی نہ ہوگا یعنی لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہوں گے اس سے ہٹ کر کچھ بھی نہ ہوگا یا تو وہ علیؑ کے محب ہوں گے یا پھر علیؑ کے دشمن۔ علیؑ کے محب کے لیے عذاب اور حساب نہیں اور جس شخص کے لیے حساب کتاب نہیں بہشت اسی کی منزل ہوگی جبکہ علیؑ کے دشمن کا کوئی ایمان ہی نہیں اور جس کا کوئی ایمان نہ ہو خدا اس پر نگاہ رحمت نہیں کرتا۔ اس کی اطاعت بھی گناہ ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ پس علیؑ کے دشمن کے لیے رستگاری نہیں اور اس کے برعکس علیؑ کے محب کے لیے عرصۂ محشر میں پریشانی نہیں۔

فَطُوْبٰی لِاَوْلِیَائِہٖ وَسُحْقًا لِاَعْدَائِہٖ خوش قسمت ہیں علیؑ کے محب اور بدبخت ہیں ان کے دشمن۔

(ناسخ التواریخ، امام محمد باقر علیہ السلام ج ۷، ص ۱۲۷)

امام احمد بن حنبل کہتے ہیں: مَا جَاءَ لِاَحَدٍ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ مِنَ الْفَضَائِلِ مَا جَاءَ لِعَلِیٍّ یعنی جتنے فضائل حضرت علی علیہ السلام کے بیان ہوئے ہیں اتنے اصحاب رسولؐ میں سے کسی کے نہیں ہوئے۔

(کشف الغمہ ص ۴۸)

سبط ابن جوزی اپنی کتاب تذکرہ میں لکھتے ہیں:

حضرت علی علیہ السلام کے فضائل سورج سے زیادہ روشن اور سنگریزوں سے بھی زیادہ ہیں۔ یہ فضائل

دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کا استنباط قرآن سے کیا گیا ہے اور دوسرے وہ جنھیں رسول اکرم ﷺ کی سنت سے سمجھا گیا ہے۔ (ناسخ التواریخ، امام محمد باقرؑ ج ۷، ص ۱۳۴)

بہت سے مستشرقین نے بھی حضرت علیؑ کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔

انگریز دانشور جان ڈیون پورٹ نے دعوت ذوالعشیرہ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی گفتگو کے آخر میں صراحت کے ساتھ فرمایا تھا کہ تم میں سے کون ہے جو میرا مددگار بنے اور تبلیغ دین میں میرا بوجھ بٹائے؟ کون ہے جو میرا اس طرح وزیر اور خلیفہ بنے جیسے ہارونؑ، موسیٰؑ کے خلیفہ اور وزیر تھے۔

حاضرین مجلس پر مکمل سکوت اور گہری خاموشی طاری تھی۔ کسی نے بھی اس قیمتی عطیے کو قبول کرنے کی جرأت نہ کی یہاں تک کہ پیغمبر ﷺ کا نوجوان چچا زاد بھائی علیؑ اٹھا اور کہا: یا رسول اللہؐ! میں یہ دعوت قبول کرتا ہوں۔ آپ کی وزارت کا بوجھ اٹھانے کے لیے میں تیار ہوں۔ محمدؐ نے علیؑ کی بات سننے کے بعد انھیں اپنے سینے سے لگایا اور حاضرین سے کہا: دیکھ لو یہی میرا بھائی اور وزیر ہے۔[۱]

انگریز مؤرخ تھامس کارلائل نے اپنی کتاب ہیروز اینڈ ہیروورشپ میں لکھا ہے:

... جہاں تک اس جوان علیؑ کا تعلق ہے تو کوئی شخص انھیں چاہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ ایک شریف النفس اور عالی ظرف انسان تھے جیسا کہ انھوں نے اپنی زندگی میں ہمیشہ ثابت کر دکھایا۔ ان کا دل جذبۂ ہمدردی سے سرشار تھا۔ وہ ایک نڈر انسان تھے۔ جانبازی ان کا خاصہ تھا۔ وہ شیر کی طرح بہادر تھے اور ساتھ ہی متانت، سچائی اور شفقت جیسی صفات کے حامل تھے جو سرداری کے لائق بناتی ہیں۔ وہ عراق کی ایک مسجد میں قتل کر دیئے گئے۔ ان کی موت کی وجہ حد سے زیادہ عدل و انصاف تھا۔

---

۱۔ JOHN DAVENPORT کی کتاب AN APOLOGY FOR MOHAMMED AND THE KORAN ص ۲۱، مطبوعہ J. Davy & Sons 137, Long Acre, London 1869 کی اصل عبارت یہ ہے:

"Who among you will aid me to bear this burden ? Who will be my lieutenant and vizier, as Aaron was to Moses?"

The assembly remained mute with astonishment, not one venturing to accept the proffered perilous office, until the young and impetuous Ali, Mohammed's cousin, started up, exclaiming, "O prophet ! I will; though I am, indeed, the youngest of these present, the most rheumy of them as to eyes, the biggest of them as to belly, and the slenderest of them as to legs. I, O Prophet ! wil be thy Vizier over them !"

On which, throwing his arms around the generous youth, and pressing him to his bosom, Mohammed exclaimed, "Behold, my brother, my Vizier !". *(Rizwani)*

وہ دوسروں کے لیے انصاف طلب کرنے پر یقین رکھتے تھے۔[۱]

مصر کا ایک مادہ پرست مصنف شبلی شُمَیّل لکھتا ہے :

علیؑ ایک قابل احترام بزرگ اور یگانہ روزگار شخص تھے جن کی نظیر مشرق و مغرب اور ماضی و مستقبل میں نہیں ملتی۔

فرانسیسی دانشور براؤن کارا دیو کہتا ہے :

علیؑ حوادث زمانہ کی پیداوار نہ تھے بلکہ حوادث روزگار ان سے جنم لیتے تھے۔ ان کا کردار ان کے فکر کی بلندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ ایسے سورما تھے جو دلیری کے ساتھ دردمند دل بھی رکھتے تھے۔ وہ نہایت بردبار انسان بھی تھے۔ وہ ایسے جنگجو تھے جو جنگ کے موقع پر بھی زہد سے دور نہ ہوتے۔ انھوں نے مال دنیا اور حشم و خدم کی کبھی پروا نہیں کی اور راہ حق میں اپنی جان لٹا دی۔ ان کی روح ایسی مظبوط و عمیق تھی کہ اس پر ہر وقت خوف الٰہی طاری رہتا تھا۔

بہرحال جناب امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی عظمت و حقانیت دنیا کے تمام محققین اور علماء پر روشن ہے چاہے وہ اہل سنت سے ہوں یا کسی دوسرے فرقے سے۔

---

۱۔ تھامس کارلائل کی کتاب HEROES AND HERO WORSHIP ص ۷۹ ، مطبوعہ Wiley & Halsted, New York ۱۸۵۹ء کی اصل عبارت یہ ہے :

"As for this young Ali, one cannot but like him. A noble-minded creature, as he shows himself, now and always afterwards; full of affection, of fiery daring. Something chivalrous in him; brave as a lion; yet with a grace, a truth and affection worthy of Christian Knighthood. He died by assassination in the Mosque at Bagdad; a death occassioned by his own generous fairness, confidence in the fairness of others". *(Rizwani)*

# (۵) حضرت علی علیہ السلام کا غیر امام نہیں ہو سکتا

اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ امامت درحقیقت اللہ کا عطا کردہ منصب ہے جو ظالموں کو ہرگز نہیں ملتا کیونکہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سے پوچھا تھا کہ کیا یہ عہدہ میری اولاد میں بھی برقرار رہے گا تو اللہ نے فرمایا تھا: لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ یعنی میرا عہدہ امامت ظالموں تک نہیں پہنچتا۔ اس آیت میں ظلم سے مراد صرف دوسرے پر ستم کرنا نہیں ہے۔ یہاں ظلم "عدل" کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے جو وسیع معانی رکھتا ہے۔ چونکہ عدل کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ ہر چیز کو اس کے اصل مقام پر برقرار رکھنا عدل ہے چنانچہ ہر چیز کو اس کی اصل جگہ سے ہٹانا ظلم کہلائے گا۔ بدترین ظلم "شرک" ہے۔ قرآن میں ہے کہ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ (سورۂ لقمان: آیت ۱۳) نیز یہ کہ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ کفار ہی ظالم ہیں۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۵۴) خلفائے ثلاثہ اسلام قبول کرنے سے پہلے کافر اور بت پرست تھے اس لیے ان کا شمار ظالموں میں ہوتا ہے اور وہ قرآن کی رو سے امامت کے اہل نہیں ہیں جبکہ حضرت علی علیہ السلام کا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ ایمان آپ کی فطرت میں رچا بسا تھا۔ آپ نے ایک لمحے کے لیے بھی بت پرستی نہیں کی۔

شیخ سلیمان بلخی ابن سعد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے کمسنی میں بھی کسی بت کی پرستش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے نام کے ساتھ کَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ کہا جاتا ہے۔ (ینابیع المودۃ ص ۲۸۰)

ابن مغازلی شافعی نے جناب ابن مسعودؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ یعنی بار الہا! مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے دور رکھنا میں علیؑ اور میں (محمدؐ) شامل ہیں۔ ہم دونوں میں سے کسی نے کبھی بتوں کو سجدہ نہیں کیا اسی لیے اللہ نے مجھے نبی اور علیؑ کو وصی قرار دیا۔ (مناقب ابن مغازلی ص ۲۷۶)

ممکن ہے کوئی یہ اعتراض کرے کہ خلفائے ثلاثہ اسلام لانے کے بعد دائرہ کفر و شرک سے

نکل کر موحد بن چکے تھے اس لیے ان کا شمار ظالموں میں نہیں کیا جاسکتا ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ آیت لَا یَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِیْنَ میں لَا یَنَالُ ''فعل مضارع منفی'' کا صیغہ ہے جس کا اطلاق ماضی ، حال اور مستقبل تینوں پر ہوتا ہے اس لیے اگر اس معاملے میں کوئی استثناء ہوتا تو آیت میں اس ''مستثنیٰ منہ'' کا ذکر کرنا ضروری تھا تا کہ خلفائے ثلاثہ کے سابقہ کفر و شرک کو نظر انداز کیا جاسکتا۔ اس صورت میں یہ آیت یوں ہوتی کہ لَا یَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِیْنَ اِلَّا بَعْدَ تَرْكِ الظُّلْمِ لیکن اس آیت میں نہ تو حرف استثناء آیا ہے اور نہ ہی مستثنیٰ منہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو بھی ایک لمحے کے لیے کافر و ظالم رہا ہو وہ عہدۂ امامت کا اہل نہیں ہوسکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ خلفائے ثلاثہ اسلام لانے کے بعد بھی ظلم کے مرتکب ہوتے رہے۔ اس لیے کہ سورۂ مائدہ میں ارشاد اقدس الٰہی ہے : وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ اور اس آیت سے قبل کی آیت میں ارشاد ہوا ہے : وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ پھر اسی سورہ میں آگے چل کر آیا ہے وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ جو کچھ اللہ نے نازل فرمایا اس کے مطابق حکم نہ دینے والا ظالم ، کافر اور فاسق ہے۔ ( آیات ۴۵ ، ۴۴ ، ۴۷ )

اگرچہ یہ آیات یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں مگر حکم میں کوئی قید نہیں ہے۔ حکم مطلق ہے۔ اس لیے ان آیات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جو بھی آئین الٰہی کے خلاف حکم دے وہ ظالم ، کافر اور فاسق ہے۔ لہٰذا لَا یَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِیْنَ کے حکم کے مطابق وہ عہدۂ امامت کی اہلیت نہیں رکھتے اس لیے کہ ایسے لوگ معصوم نہیں۔ بعض علمائے اہلسنت جیسے بیضاوی اور زمخشری کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ عہدۂ امامت کسی مشرک اور فاسق کو نہیں مل سکتا۔

خلفائے ثلاثہ نے اپنے دور خلافت میں کئی مواقع پر کھلم کھلا قرآن کے خلاف فیصلے کئے اور اپنی رائے کو خدا و رسولؐ کے فرمان پر مقدم جانا۔ دوسرے الفاظ میں انھوں نے نص کے ہوتے ہوئے اجتہاد کیا جسے بدعت کہتے ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں جو اہلسنت کی معتبر ترین کتب حدیث ہیں ان میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت فاطمہ زہراؑ نے حضرت ابوبکرؓ کے پاس جاکر بھرے دربار میں اپنے والد گرامی کی میراث کا مطالبہ کیا تو انھوں نے کہا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے : نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِیَاءِ لَا نُوَرِّثُ مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ یعنی ہم گروہ انبیاء کوئی میراث نہیں چھوڑتے۔ ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔

اس حدیث کے بارے میں تحقیق و تجزیہ بتاتا ہے کہ یہ خود حضرت ابوبکرؓ کا قول تھا کیونکہ یہ حکم

قرآن کے خلاف ہے اور اسی سے موصوف کا جانشینیٔ رسولؐ کے لیے نا اہل ہونا بالکل واضح ہوتا ہے کیونکہ

(۱) قرآن کریم میں ہے کہ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ سلیمان نے اپنے والد داؤد سے میراث پائی۔ (سورۂ نمل: آیت ۱۶) اور فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ○ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ زکریا نے دعا کی بارالہا! مجھے فرزند عطا فرما جو میری اور آل یعقوب کی میراث کا وارث ہو۔ (سورۂ مریم: آیت ۵۔۶)

اگر حضرت ابوبکرؓ کے قول کے مطابق انبیاءؑ میراث نہیں چھوڑتے، ان کا کوئی وارث نہیں ہوتا تو پھر قرآن کی ان آیات کا کیا جواب ہوگا؟

ہم بتاتے چلیں کہ یہ بات تین حالتوں سے خالی نہیں۔

(۱) حضرت ابوبکرؓ کی یہ حدیث من گھڑت ہے اور عملی طور پر انھوں نے قرآن کی مخالفت کی ہے۔ اس صورت میں سورۂ مائدہ کی آیت کے مطابق وہ ظالم شمار ہوں گے اور امامت کے حقدار نہیں رہیں گے۔

(۲) حضرت ابوبکرؓ نے حدیث نہیں گھڑی تھی بلکہ وہ اپنے قول میں سچے تھے۔ اس کا مطلب نعوذ باللہ یہ ہوگا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قرآن کے منافی بات کہی جو آپ پر وحی کے ذریعے نازل ہوا تھا۔ یہ امر محال ہے جبکہ

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ ہم کہیں حضرت ابوبکرؓ نے حدیث تو خود گھڑی تھی لیکن انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ یہ حدیث قرآن کے منافی ہے یعنی انھوں نے جان بوجھ کر قرآن کی مخالفت نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب بھی یہ ہوگا کہ حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تہمت لگائی اور جھوٹی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب کی۔ یہ حرکت ان کی جانشینیٔ رسولؐ کے لیے اہل نہ ہونے کا ثبوت ہے کیونکہ جو شخص قرآن سے اس قدر بے خبر ہو اور اسے انبیائے الٰہی سے متعلق آیات کا علم ہی نہ ہو وہ کس طرح مسند رسولؐ پر بیٹھ کر شریعت کے تمام احکامات کے بارے میں حکم صادر کرسکتا ہے؟

(۲) جب حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ تم کیوں میرے بابا پر تہمت لگاتے ہو تو اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے ان سے ان کے دعوے کے ثبوت کے لیے گواہ طلب کئے اور یہ بات بھی موصوف کی مخالفت قرآن کی ایک اور دلیل ہے کیونکہ گواہ اس سے طلب کیا جاتا ہے جس کے قول کی صحت پر اعتماد نہ ہو حالانکہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا آیۂ تطہیر کے مطابق معصومہ ہیں اور معصومہ کے دعوے کو رد کرنا قول خدا کی تکذیب اور آیت تطہیر کا انکار کرنا ہے۔

(۳) حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے گواہوں میں ایک گواہ حضرت علی علیہ السلام تھے لیکن آپ کی گواہی کو یہ کہہ کر قبول نہیں کیا گیا کہ آپ ان کے شوہر ہیں اور یہ بات بھی آیت تطہیر کے انکار کے علاوہ سورۂ رعد کی آیت ۴۳ اور سورۂ ہود کی آیت ۱۷ کو بھی رد کرنے کے برابر ہے اس لیے کہ ہم اس کتاب کے صفحہ ۲۷۲ پر بتا چکے ہیں کہ خدا نے یہ آیات حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل فرمائی ہیں جن کے مطابق حضرت علی علیہ السلام رسالت عظمیٰ کے گواہ ہیں۔ اس ضمن میں ہم نے ان آیات سے مربوط اہلسنت کے منابع کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اب حضرت ابوبکرؓ نے کیونکر خدا کے مقرر کردہ گواہ کو رد کردیا؟ اسے خدا اور قرآن کی مخالفت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

قرآن کی ایک اور مخالفت حضرت ابوبکرؓ نے زکات کے مصرف سے اَلْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ کو حذف کرکے کی۔ آیت یہ ہے: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ یہ صدقات و زکات تو مفلسوں، محتاجوں اور کارکنان صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور قرض داروں کے قرض ادا کرنے میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کی مدد میں بھی یہ مال خرچ کرنا چاہیے۔ یہ حقوق خدا کی طرف سے مقرر کردیئے گئے ہیں۔ (سورۂ توبہ: آیت ۶۰)

فقہ حنفی کی کتاب الجوهرة النيرة میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے مشورے پر اَلْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ کو چھوڑ دیا تھا۔ اہلسنت اسے حکم اسقاط کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی زکات کو تالیف قلوب کے لیے استعمال کرے تو اس پر زکات کی ادائیگی ساقط نہیں ہوگی حالانکہ یہ حکم قرآن کے صریح خلاف ہے۔

اللہ نے متعہ کو جائز اور حلال قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے: فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً جن عورتوں سے تم متعہ کرو ان کا مہر جو مقرر کیا ہو ادا کردو۔ (سورۂ نساء: آیت ۲۴) لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں متعة النساء اور متعة الحج کو حرام کردیا تھا حالانکہ عہد رسولؐ میں یہ دونوں متعہ کئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے متعہ کرنے والے کے لیے سخت سزا کا اعلان کیا تھا۔ یہ بات کتب اہلسنت میں معمولی لفظی اختلاف کے ساتھ مذکور ہے۔

صحیح مسلم میں جناب جابر بن عبد اللہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے برسر منبر کہا تھا مُتْعَتَانِ كَانَتَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ مُحَلَّلَتَانِ فَاَنَا اَنْهٰى عَنْهُمَا وَاُعَاقِبُ عَلَيْهِمَا مُتْعَةُ الْحَجِّ وَمُتْعَةُ النِّسَآءِ یعنی عہد رسولؐ میں دو طرح کے متعہ حلال تھے مگر میں ان دونوں سے منع کرتا ہوں اور ان پر

عمل کرنے والے کو سزا دوں گا۔ وہ مُتعَةُ الحَجّ اور مُتعَةُ النِّسَآءِ ہیں۔[۱]

---

۱۔ بدایۃ المجتھد، ابن رشد ج ۲، ص ۱۴۱۔ زاد المعاد، ابن قیم ج ۲، ص ۲۰۵۔ المغنی، ابن قدامہ ج ۷، ص ۵۲۷ اور المحلی، ابن حزم ج ۷، ص ۱۰۷ میں بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا تھا: زمانہ رسولؐ میں متعۃ الحج اور متعۃ النساء ہوتے تھے مگر میں ان سے منع کرتا ہوں اور ان کو حرام قرار دیتا ہوں۔ جو بھی ان پر عمل کرے گا میں اس کو سزا دوں گا۔ نیز مسند احمد بن حنبل ج ۷، ص ۴۳۶۔ تفسیر طبری ج ۵، ص ۹۔ احکام القرآن، جصاص ج ۲ ص ۱۷۳۔ تفسیر قرطبی ج ۵، ص ۳۵۔ تفسیر کبیر، رازی ج ۳، ص ۲۰۰۔ شرح صحیح مسلم، نووی ج ۹، ص ۱۸۱۔ تفسیر بیضاوی ج ۱، ص ۲۵۹ وغیرہ میں بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں متعہ جائز تھا۔

۲۹ ستمبر ۲۰۰۹ء کو ایکسپریس نیوز کے ٹاک شو POINT BLANK WITH LUCMAN میں مولانا حافظ طاہر محمود اشرفی صاحب اور مولانا جلیل نقوی صاحب نے متعہ کے موضوع پر اظہار خیال فرمایا تھا۔ اس پروگرام میں حافظ اشرفی صاحب نے یہ تسلیم کیا کہ آیت متعہ نازل ہوئی تھی اور عہد رسولؐ میں متعہ ہوتا تھا مگر پھر یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ حافظ اشرفی صاحب! قرآن تو کہتا ہے کہ مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا تو کیا آپ آیت متعہ کی ناسخ آیت بتا سکتے ہیں؟ اور اگر آپ کہتے ہیں کہ یہ حکم قول رسول ﷺ سے منسوخ ہوا ہے تو اس کی روایت خبر واحد ہے اور خبر واحد سے نسخ آیت ثابت نہیں ہوتا۔ نیز یہ روایت ان روایات سے متصادم ہے جو متعہ کی حلت کے بارے میں تواتر کے ساتھ اہلبیت رسولؐ سے آئی ہیں۔ اور خود اہلسنت میں اس بات پر بھی اختلاف ہے کہ متعہ کا حکم کب منسوخ ہوا تھا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ فتح مکہ کے دن جبکہ سنن ابن ماجہ اور سنن ابی داؤد میں ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر یہ حکم منسوخ ہوا تھا۔

مولانا حافظ طاہر محمود اشرفی صاحب نے کہا کہ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت میں اکابر صحابہ کو بلا کر متعہ کی تمام روایتوں کو جمع کیا اور پھر اصلاح معاشرہ کے لیے اسے حرام قرار دے دیا اس لیے اہلسنت والجماعت کے نزدیک متعہ قطعاً حرام ہے۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت میں بلکہ خلافت کے آخری زمانے میں متعہ کو حرام کیا تھا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ عہد فاروقی میں بھی متعہ ہوتا تھا۔ نیز یہ کہ حضرت عمرؓ نے یہ نہیں کہا تھا کہ متعہ کا حکم منسوخ ہو چکا ہے بلکہ یہ کہا تھا کہ عہد رسولؐ میں متعہ ہوتا تھا اور میں اس کو حرام کرتا ہوں۔ کیا حضرت عمرؓ یا کسی اور کے پاس قرآن کے ثابت شدہ حکم کو بدلنے کا اختیار ہے؟؟

یہاں ہمارا مقصد متعہ کے جواز کو ثابت کرنا نہیں بلکہ یہ عرض کرنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو احکامات قرآن کے بیان کر گئے ہیں ان کے کسی حلال یا حرام کو کوئی گروہ (پارلیمنٹ) یا کوئی فرد واحد بدل نہیں سکتا۔

اسلام میں احکام وضع کرنا صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے جو رب الارباب ہے۔ اللہ اپنے احکام رسول پاکؐ پر نازل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں احکامات کو جو ہر زمان و مکان کے لیے ہیں مجمل بیان کرتا ہے اور ان کی تفصیل کو رسول پاک ﷺ پر چھوڑ دیتا ہے وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ... (سورہ نحل: آیت ۴۴) جس طرح اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو احکامات پہنچانے کا مکلف قرار دیا ہے اسی طرح امت پر یہ لازم کیا ہے کہ وہ کلام رسولؐ اور کلام خدا میں کوئی فرق نہ کریں کیونکہ رسول اللہ ﷺ اپنی مرضی سے کوئی بات نہیں کہتے۔ وہ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ کی منزل پر فائز ہیں چنانچہ امت کو حکم دیا گیا ہے کہ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا پس امت کو کس کی پیروی کرنی چاہیے؟ رسول اللہ ﷺ کی یا حضرت عمرؓ کی؟

یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ اس پروگرام میں مولانا جلیل نقوی صاحب سے یہ غلطی ہوئی کہ انھوں نے متعہ کی عدت دس دن بتائی جبکہ متعہ کی عدت دو طہر ہوتی ہے۔ (رضوانی)

سنن بیہقی میں مسلم بن ابی نضرہ سے روایت ہے کہ میں نے جابر سے کہا: ابن زبیر تو متعہ سے منع کرتے ہیں اور ابن عباسؓ اس کا حکم دیتے ہیں۔ جابر نے کہا: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں متعہ کیا اور یہ حضرت ابوبکرؓ کے دور تک ہوتا رہا لیکن جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو انھوں نے کہا: پیغمبرؐ بھی وہی ہیں اور قرآن بھی وہی ہے مگر میں دونوں متعہ سے جو عہد رسولؐ میں جائز تھے منع کرتا ہوں اور ان پر عمل کرنے والے کو سزا دوں گا۔

صحیح ترمذی میں ہے کہ کسی نے ابن عمرؓ سے متعہ حج کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ حلال ہے۔ سائل نے کہا مگر تمہارے والد تو اس سے منع کرتے ہیں۔ ابن عمرؓ نے کہا: اگر میرے والد ایک کام سے منع کریں اور رسول خدا ﷺ نے وہ کام کیا ہو تو تم کس کی پیروی کرو گے۔ سائل نے کہا: رسول خدا ﷺ کی۔ ابن عمرؓ نے کہا: رسول خدا ﷺ نے متعہ حج کیا تھا۔ (تفسیر میزان ج ۲)

ہم یہاں اکابرین اہلسنت سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا اسلام کی مقدس شریعت اور اس کے احکام قیامت تک باقی ہیں یا نہیں؟ کیا رسول خدا ﷺ کے حلال وحرام قیامت تک حلال وحرام ہیں یا نہیں؟ کیا آسمانی ادیان میں قانون سازی خود خدائے بزرگ و برتر کرتا ہے یا نہیں؟

اہل تشیع گو امام کو معصوم اور خدا کا نمائندہ سمجھتے ہیں لیکن وہ اس بات کے قائل ہیں کہ امام احکام شریعت میں کوئی تبدیلی، ترمیم یا تنسیخ نہیں کر سکتے اور کوئی قانون نہیں بنا سکتے۔ شیعوں کے نزدیک امام صرف قرآن اور دینی احکام کے مفسر اور ترجمان ہوتے ہیں لیکن اہلسنت جو خلیفہ کو معصوم نہیں مانتے اور جنھوں نے اجماع کے نتیجے میں خلیفہ منتخب کیا ہے وہ کس طرح خلیفہ کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ شرعی احکام میں تصرف کرے اور خدا اور رسولؐ کے حکم کی مخالفت کرے؟!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ ھٰذَآ اَوْ بَدِّلْہُ قُلْ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَہٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ○ جب انھیں ہماری صاف صاف آیتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اس کو بدل دو۔ (اے رسولؐ!) کہہ دیجئے کہ مجھ کو اختیار نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اسے بدل دوں۔ میں تو بس اس وحی پر چلتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے ہولناک دن کے عذاب سے خوف آتا ہے۔ (سورۂ یونس: آیت ۱۵)

پس جب خود رسول اللہ ﷺ وحی الٰہی میں تبدیلی نہیں کر سکتے اور آپ روز قیامت کے عذاب سے ڈرتے ہیں وہاں ''جناب خلیفہ''[۱] کس طرح اس کام کے مجاز ہو سکتے ہیں؟

## قرآن حکیم کی ایک اور مخالفت کی مثال حضرت عمرؓ کی طرف سے ایک نشست میں تین طلاقیں

---

۱۔ یہاں ہم یہ بتا دیں کہ الفاظ کے حقیقی معنی بھی ہوتے ہیں اور مجازی معنی بھی۔ لغوی معنی بھی ہوتے ہیں اور اصطلاحی معنی بھی اور یہ کہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ الفاظ کے معنی بدل بھی جاتے ہیں حتیٰ کہ بعض الفاظ کے معنی بالکل متضاد ہو جاتے ہیں۔ بعض الفاظ مطلق بولے جائیں تو عام معنی دیتے ہیں اور اضافت کے ساتھ بولے جائیں تو ان کے معنی خاص ہو جاتے ہیں مثلاً جب نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو تبلیغ کے لیے یمن بھیجا تھا تو انھوں نے کہا تھا: اَنَا رَسُوْلُ رَسُوْلِ اللّٰہِ یعنی میں اللہ کے پیغمبر کا پیغام بر ہوں۔ یہاں پہلا لفظ رسول، عام اور دوسرا خاص ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کے اس فرمان میں بھی لفظ رسول اللہ بالکل عام معنی میں آیا ہے اِنَّ الْمِسْکِیْنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ فَمَنْ مَنَعَہٗ فَقَدْ مَنَعَ اللّٰہَ وَمَنْ اَعْطَاہُ فَقَدْ اَعْطَی اللّٰہَ فقیر درحقیقت اللہ کا بھیجا ہوا ہوتا ہے لہٰذا جس نے اسے منع کیا گویا اس نے اللہ کو منع کر دیا اور جس نے اسے کچھ دیا گویا اس نے اللہ کو دیا۔ اسی طرح عربی زبان میں لفظ صلاۃ کے لغوی معنی دعا کرنے کے ہیں مگر مصطلحات اسلامی میں اس کا مطلب وہ خاص عمل ہے جسے نماز کہتے ہیں۔ مصطلحات اسلامی کو مصطلحات شرعی بھی کہا جاتا ہے یعنی ایسی اصطلاحات یا ایسے نام جو شریعت اور صاحب شریعت کی طرف سے وضع ہوئے ہوں۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس کچھ ایسے نام بھی ہیں جنھیں مسلمانوں یا علمائے اسلام نے ایک مخصوص مفہوم کے لیے وضع کیا ہے۔ ایسے ناموں کو مصطلحات متشرعہ یا مصطلحات مسلمین کہا جاتا ہے۔

عربی زبان میں ہر پیشوا کو چاہے مذکر ہو یا مونث، فرد ہو یا کتاب، ہدایت کرنے والا ہو یا گمراہ کرنے والا امام کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے: وَجَعَلْنٰھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا ہم نے ان کو پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں۔ اور وَجَعَلْنٰھُمْ اَئِمَّۃً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ ہم نے ان کو پیشوا بنایا وہ لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے ہیں۔ اور وَمِنْ قَبْلِہٖ کِتٰبُ مُوْسٰٓی اِمَامًا وَّرَحْمَۃً اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب جو پیشوا اور رحمت ہے۔

نیز عادل، ظالم، فاسق، فاجر اور کافر حاکم کو بھی امام کہا جاتا ہے۔ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّۃَ الْکُفْرِ کفر کے پیشواؤں سے جنگ کرو۔ حدیث ہے کہ اَفْضَلُ الْجِھَادِ کَلِمَۃُ عَدْلٍ عِنْدَ اِمَامٍ جَائِرٍ سب سے بڑا جہاد ظالم حاکم کے سامنے سچی بات کہنا ہے۔

نیز مذہبی پیشواؤں کے لیے بھی لفظ امام استعمال ہوتا ہے جیسے امام ابوحنیفہ، امام غزالی، امام راغب، امام بخاری وغیرہ جو اسلامی علوم میں اپنے اپنے زمانے میں پیش پیش تھے۔ اسی طرح یہ لفظ سیاسی و سماجی پیشواؤں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے امام حسن البنا، امام خمینی، امام موسیٰ صدر وغیرہ۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: فَاِنَّ اَعْظَمَ الْخِیَانَۃِ خِیَانَۃُ الْاُمَّۃِ وَاَفْظَعَ الْغِشِّ غِشُّ الْاَئِمَّۃِ یعنی قوم سے غداری کرنا سب سے بڑی خیانت ہے اور رہنماؤں سے دغا کرنا بدترین دغا بازی ہے۔

لفظ خلیفہ حکمران کے معنوں میں مسلمانوں کا وضع کردہ ہے۔ پہلے یہ لفظ خلیفۃ الرسولؐ تھا پھر مختصر ہو کر صرف خلیفہ رہ گیا۔ قرآن و حدیث یا اسلامی اصطلاحات کی رو سے جانشین رسولؐ کے معنوں میں امام علی علیہ السلام کی خلافت اور آپ کی حکومت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ہاں! مصطلحات متشرعہ کے اعتبار سے حضرت ابوبکرؓ پہلے، حضرت عمرؓ دوسرے، حضرت عثمانؓ تیسرے اور حضرت علیؑ چوتھے خلیفہ تھے مگر حکمران کے لیے خلیفہ کا لفظ شرعی اصطلاح نہیں ہے۔ شرعی اصطلاح کے مطابق حضرت علیؑ اس وقت بھی رسول اللہ ﷺ کے بلافصل خلیفہ تھے جب آپ حکمران نہیں تھے کیونکہ شرعی معنوں میں خلافت، پیغمبرؐ کے وصی سے الگ یا سلب ہونے والی چیز نہیں۔ (رضوانی)

دینا ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک اجتماع میں کہا: لوگوں کو جلدی ہوتی ہے اس لیے بہتر ہے کہ تین طلاقوں میں کوئی فاصلہ نہ ہو یعنی اگر کوئی شوہر اپنی بیوی سے کہے طَلَّقْتُكِ ثَلَاثًا (میں نے تم کو تین طلاقیں دیں) تو تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی حالانکہ شریعت اسلام میں اگر کوئی شوہر ایسا کہے تب بھی یہ ایک طلاق شمار ہوتی ہے۔ تفسیر در منثور میں ہے کہ ایک شخص جس نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی تھی بہت اداس تھا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے پوچھا: تم نے کس طرح طلاق دی؟ اس نے کہا: یا رسول اللہؐ! میں نے ایک نشست میں تین طلاقیں دیں۔ آپ نے فرمایا: یہ صرف ایک طلاق ہے۔ اگر تم چاہو تو بیوی سے رجوع کر سکتے ہو۔

آیت اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ طلاق دو بار ہے (یعنی جب دو دفعہ طلاق دیدی جائے تو) پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلائی سے اس کو چھوڑ دیا جائے (سورۂ بقرہ: آیت ۲۲۹) اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ تین طلاقوں کے درمیان فاصلہ ضروری ہے۔

حضرت عمرؓ نے آیت وضو کے برخلاف حکم دیا کہ پاؤں کا مسح کرنے کی بجائے انھیں دھویا جائے۔

قانون خدا اور سنت رسولؐ کی مخالفتوں کے معاملے میں حضرت عثمانؓ کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ وہ اس معاملے میں اتنا آگے بڑھ گئے تھے کہ خود مسلمانوں نے ان کے گھر پر حملہ کر کے انھیں قتل کر ڈالا۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے: مولانا مودودی، خلافت و ملوکیت)

خلفائے ثلاثہ نے احکام قرآن کی جو مخالفتیں کیں وہ شیعہ اور سنی کتابوں میں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اسی لیے ہم نے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا ہے۔ تفصیلات جاننے کے خواہاں علامہ سید شرف الدین کی کتاب **النص والاجتهاد** کا مطالعہ فرمائیں۔ اس کتاب میں نص کے مقابل خلفاء کے اجتہاد کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔

(نیز دیکھئے: علامہ سید مرتضی عسکری کی کتاب، احیائے دین میں ائمہ اہلبیتؑ کا کردار، مطبوعہ مجمع علمی اسلامی)

بعض علمائے اہلسنت جیسے ابن حجر مکی وغیرہ کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ اصحاب رسولؐ جن میں خلفاء بھی شامل ہیں مجتہد تھے اس لیے انھوں نے معاشرتی حالات کے مطابق اسلامی احکام میں رد و بدل کیا ہے، بالفرض اگر ان کا یہ اجتہاد شریعت کے خلاف ہو تب بھی ان کی یہ غلطی چونکہ عمداً نہیں اس لیے وہ معذور شمار ہوں گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو کوئی ایسی دلیل موجود نہیں کہ تمام اصحاب مجتہد تھے اور اگر بفرض محال

اس بات کو مان لیا جائے تب بھی وہی صحابی قابل احترام ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا تابع ہو ورنہ منافقین بھی اصحاب ہی میں شمار ہوتے تھے اور ان کی مذمت میں پورا سورہ نازل ہوا ہے۔

دوسری بات یہ کہ مجتہد کی شرائط میں سے ایک شرط اس کا عادل ہونا ہے جبکہ خلفاء سے سرزد ہونے والے مظالم ان کے عادل ہونے کی نفی کرتے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ اجتہاد صرف وہاں ہوتا ہے جہاں نص موجود نہ ہو یا پھر نص اجمالی یا اطلاقی ہو اور اس کے متعلق مسلمہ قواعد کے مطابق اظہار رائے ممکن ہو۔ اس طرح کا اجتہاد بھی اس صورت میں درست ہوتا ہے جب وہ کتاب خدا اور سنت رسولؐ کے مطابق ہو اور ''نص صریح'' کے خلاف نہ ہو۔ فقہ کی اصطلاح میں نص سے مراد قرآن و سنت ہے۔ اس بنا پر نص کی موجودگی میں اجتہاد خدا اور رسولؐ کے فرمان پر اپنی ذاتی رائے کو مقدم قرار دینا ہے۔ یہ بدعت ہے جو شرعی اور عقلی طور پر جائز نہیں ہے۔ ایسا مجتہد سورۂ مائدہ کی آیات ۴۴ تا ۴۷ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مصداق ہے۔

اس بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ خلفائے ثلاثہ زمانہ جاہلیت میں بت پرست ہونے کی بنا پر اور اسلام قبول کرنے کے بعد نص کی مخالفت کرنے کی بنا پر آیت لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ کے مطابق امامت کے اہل نہیں ہیں۔ یہ منصب الٰہی منصب ہے جس کے لیے معصوم ہونا لازمی ہے۔ خلفائے ثلاثہ کی خلافت عام انسانی اور ظاہری حکومتوں کی مانند تھی۔ اس طرح کی خلافت کا امامت اور خلافت الٰہیہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ امامت صرف بارہ اماموں کے لیے مخصوص ہے۔

# (۶) اہل سنت کے دلائل کا رد

گزشتہ صفحات میں حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بلافصل کے اثبات کے لیے دیئے گئے دلائل میں سے ہر ایک اپنی جگہ مکمل ثبوت ہے تاہم اتمام حجت اور سابقہ گفتگو کی تکمیل کے لیے اس باب میں بھی دلائل اہلسنت کا رد بیان کیا جا رہا ہے۔ ان کے دلائل مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔ ان کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ متلاشیان حق پر حقیقت واضح ہوجائے۔

**پہلی دلیل:** چونکہ حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے قربانی دی، ہجرت کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شریک سفر رہے، غار میں بھی آپ کے ساتھ تھے اور یہ فضیلت ان کے خلیفہ بننے کے لیے اہل ہونے کی دلیل ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ

(۱) جیسا کہ ہم پہلے ثابت کرچکے ہیں کہ امامت اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی منشائے الٰہی پر موقوف ہے یعنی لازمی ہے کہ امام اللہ ہی کی طرف سے معین کیا جائے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا اعلان فرمائیں جیسا کہ آیت تبلیغ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر خم میں امام کا تقرر اور اعلان فرمایا۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کا سفر پہلے سے طے شدہ نہیں تھا بلکہ ان کا اچانک آمنا سامنا ہوا تھا چنانچہ طبری اپنی تاریخ کے جزو سوم میں لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روانگی کی کوئی اطلاع نہ تھی۔

(۳) محض مصاحبت فضیلت کی دلیل نہیں اس لیے کہ حضرت یوسف علیہ السلام بھی عزیز مصر کے قید خانے میں ''کئی خداوں'' کے قائل دو افراد کے مصاحب تھے۔ قرآن مجید میں ہے: **یٰصَاحِبَیِ السِّجۡنِ ءَاَرۡبَابٌ مُّتَفَرِّقُوۡنَ خَیۡرٌ اَمِ اللّٰہُ الۡوَاحِدُ الۡقَہَّارُ** ○ اے میرے قید خانے کے ساتھیو! کیا الگ الگ خدا بہتر ہیں یا خدائے واحد جو سب پر غالب ہے؟ (سورۂ یوسف آیت ۳۹) لہٰذا ممکن ہے کہ دو افراد ایک دوسرے کے

ساتھی ہوں مگر ان کا عقیدہ الگ الگ ہو۔

(۴) یہ کہنا کہ قرآن میں حضرت ابوبکرؓ کا تذکرہ آیا ہے ان کی فضیلت کی دلیل نہیں ہوسکتی اس لیے کہ آیۂ مبارکہ میں ارشاد ہوا ہے: اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا اگر تم پیغمبرؐ کی مدد نہ کرو گے تو اللہ ان کا مددگار ہے۔ جب کافروں نے ان کو گھر سے نکال دیا تھا اس وقت دو (ہی شخص تھے جن) میں (ایک ابوبکر تھے) دوسرے (خود رسول اللہؐ) جب وہ دونوں غار میں تھے اس وقت پیغمبرؐ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ (سورۂ توبہ: آیت ۴۰)

اس آیت کا انداز بیان بتا رہا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اس اتفاقی مصاحبت پر پشیمان تھے اور اسی لیے خوفزدہ بھی تھے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دکھ ہو رہا تھا اور آپ نے انھیں تسلی دی۔ اس ضمن میں قابل توجہ سوال یہ ہے کہ کیا حضرت ابوبکرؓ کا یہ غم اللہ کے لیے تھا کہ اسے نیک عمل شمار کیا جائے؟ یا اس کے برعکس وہ اپنی جان کے خوف سے پریشان تھے؟

اگر ان کا غم خدا کے لیے تھا تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں اس کار خیر سے منع کیوں فرمایا؟ اور اگر ایسا جان کے خوف سے تھا تو اس صورت میں یہ آیت نہ صرف یہ کہ ان کی فضیلت پر دلیل نہیں بن سکتی بلکہ ان کے ڈرپوک ہونے کی نشاندہی کرتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ناراحت ہونے کا باعث بنی اور اللہ کو اپنے رسولؐ کی زبانی انھیں بیقرار ہونے سے روکا گیا۔ اللہ نے حضرت ابوبکرؓ کی مصاحبت کو کوئی وقعت نہ دی اس لیے کہ اسی آیت میں آگے ارشاد ہوا ہے فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا پس اللہ نے اپنے رسولؐ کو سکون بخشا اور ایسے لشکر سے ان کی مدد کی جسے کسی نے نہیں دیکھا۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے حضرت ابوبکرؓ کی ڈھارس بندھانے کے لیے یہ آیت اتاری تھی کیونکہ رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو تسکین کی ضرورت ہی نہ تھی ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ آیت کے بعد والے حصے میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ نے غیبی لشکر کے ذریعے سے مدد فرمائی اور جس کی مدد فرمائی تھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے اس لیے اللہ نے ان ہی کو دلاسا دیا تھا۔ اس امر کی مزید تائید اسی آیت کے شروع سے ملتی ہے فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے نکالے گئے تھے اس وقت بھی اللہ نے آپ کی مدد فرمائی تھی نہ کہ حضرت ابوبکرؓ کی۔

رہی یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس وقت تسکین کی ضرورت ہی نہ تھی تو یہ بات اس لیے بھی

غلط ہے کہ اسی سورہ میں جنگ حنین کے موقع پر آنحضرت ﷺ کے لیے نزول سکینہ کا ذکر آیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ثُمَّ اَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَتَهٗ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ وَعَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اس وقت اللہ نے اپنے رسولؐ اور مومنین کے دلوں کو اطمینان بخشا۔ (سورۂ توبہ: آیت ۲۶ اور سورۂ فتح: آیت ۲۶)[1]

لہٰذا جس طرح اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ مومنین پر بھی نزول سکینہ کا ذکر ہے وہاں بھی اگر حضرت ابوبکرؓ شامل ہوتے تو آیت میں یا ان کا نام ہوتا یا پھر آیت اس طرح ہوتی فَاَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَتَهٗ عَلَيۡهِ وَعَلٰى صَاحِبِهٖ (یعنی اللہ نے اپنے رسولؐ کو اور ان کے ساتھی کو سکون بخشا) یا یوں ہوتی فَاَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَتَهٗ عَلَيۡهِمَا وَاَيَّدَهُمَا (پس اللہ نے ان دونوں کو سکون بخشا اور ان دونوں کی مدد کی) لیکن آیت میں تثنیہ کی ضمیر نہیں آئی ہے۔

اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ تسکین اور غیبی لشکر کے ذریعے سے مدد پہنچانا صرف رسول خدا ﷺ کے لیے ہے اور حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں یہی کہا گیا ہے کہ وہ غار میں پریشان تھے۔

ہم برادران اہلسنت سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ یہ کیسی فضیلت ہے جو آپ نے حضرت ابوبکرؓ کے لیے تراشی ہے؟ اگر آپ فضیلت ہی کو خلافت کا معیار جانتے ہیں تب بھی واقعۂ ہجرت میں حضرت علیؑ ہی کو "ہیرو" کی حیثیت حاصل ہے جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس رات بستر رسولؐ پر اس طرح سوئے کہ ابن ابی الحدید وغیرہ کے مطابق وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ کی آیت امام کی فضیلت و بزرگی کی سند بن کر نازل ہوئی۔

**دوسری دلیل:** کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ کے آخری ایام میں جب آپ بی بی عائشہؓ کے گھر میں بستر علالت پر تھے تو آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو مسجد میں نماز کی امامت کے لیے بھیجا تھا۔ رسول خدا ﷺ کا یہ اقدام مسلمانوں پر موصوف کی خلافت کے لیے اہلیت کی دلیل ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کو نماز باجماعت پڑھانا ہی خلافت کی دلیل ہے تو پھر اس بات کو بھی قبول کرنا پڑے گا کہ حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ عتاب بن اُسید خلافت کے اہل تھے جنھوں نے فتح مکہ کے موقع پر فجر، مغرب اور عشاء کی نمازوں کی امامت کی تھی۔ لہٰذا جو رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں مقدس ترین شہر مکہ میں مسلمانوں کو باجماعت نماز پڑھا سکتا ہے وہ حضرت ابوبکرؓ سے کہیں زیادہ خلافت کا اہل ہے کیونکہ حضرت ابوبکرؓ نے تو رسول خدا ﷺ کی بیماری کی وجہ سے مجبوراً مسجد میں جا کر

---

۱۔ سورۂ فتح ہی میں ہے: هُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ السَّكِيۡنَةَ فِىۡ قُلُوۡبِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لِيَزۡدَادُوۡۤا اِيۡمَانًا مَّعَ اِيۡمَانِهِمۡ (آیت ۴) رضوانی

نماز پڑھائی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو رسول خدا ﷺ نے نہیں بھیجا تھا بلکہ جب حضرت بلالؓ نے اذان کہی اس وقت آنحضرت ﷺ بے ہوش تھے چنانچہ بی بی عائشہؓ نے موذن سے کہا تھا کہ میرے بابا سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھا دیں۔ رسول اکرم ﷺ کو جب ہوش آیا تو آپ نے پوچھا: نماز پڑھانے کون گیا ہے؟ بی بی نے کہا: آپ غش میں تھے چنانچہ میں نے موذن سے کہا کہ وہ میرے بابا کو باجماعت نماز پڑھانے کے لیے کہیں۔

آنحضرت ﷺ اسی حالت میں حضرت علی علیہ السلام اور فضل بن عباس کے کاندھوں کا سہارا لے کر مسجد میں تشریف لائے کہ کہیں اس نماز پڑھانے کو حضرت ابوبکرؓ سند خلافت نہ بنائیں۔ اس وقت ابھی نماز کی پہلی تکبیر کہی گئی تھی کہ آنحضرت ﷺ نے محراب میں پہنچ کر حضرت ابوبکرؓ کو ہٹایا اور خود امامت فرمائی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف خود علمائے اہلسنت نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ ابن ابی الحدید معتزلی اپنے قصائد سبعہ میں کہتے ہیں:

وَلَا كَانَ مَعْزُولًا غَدَاةَ بَرَاۗئَةٍ      وَلَا عَنْ صَلٰوةٍ اَمَّ فِيهَا مُؤَخَّرَا

یعنی علیؑ، ابوبکر کی مانند نہیں، آپ کو نہ تو سورۂ برأت لے کر جانے سے معزول کیا گیا اور نہ ہی نماز باجماعت کی امامت کا قصد کرنے پر ہٹایا گیا۔ (القصائد السبع العلویات، قصیدہ دوم)

خلاصہ یہ کہ باجماعت نماز پڑھانے کے لیے بی بی عائشہؓ نے اپنے بابا کو مسجد میں بھیجا تھا نہ کہ رسول اللہ ﷺ نے کیونکہ اگر آنحضرت ﷺ نے انھیں یہ ذمے داری سونپی ہوتی تو پھر آپ بیماری اور نقاہت کے باوجود نہ تو مسجد میں تشریف لے جاتے اور نہ ہی انھیں ہٹا کر خود امامت فرماتے۔

**تیسری دلیل:** کہا جاتا ہے کہ رسول خدا ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: اِقْتَدُوْا بِالَّذَيْنِ مِنْ بَعْدِىْ اَبِىْ بَكْرٍ وَّ عُمَرَ یعنی میرے بعد ابوبکرؓ اور عمرؓ کی پیروی کرو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ "اگر" یہ حدیث صحیح ہے تو پھر حضرت علی علیہ السلام کی ولایت سے متعلق وہ تمام احادیث جن کا اہلسنت نے بھی ذکر کیا ہے ان کا کیا ہوگا؟ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک وقت میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علی علیہ السلام دونوں ہی رسول اللہ ﷺ کے جانشین ہوں؟ اگر آپ نے ان دونوں کو امت کا امام مقرر کیا تھا تو پھر سقیفہ کا اجتماع کیوں منعقد ہوا تھا؟ وہاں کیوں کہا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے خود خلیفہ مقرر نہیں فرمایا اس لیے مسلمانوں کے اجماع سے خلیفہ منتخب کیا جانا ضروری ہے؟

اس سلسلے میں اہلسنت اِنَّ اَصْحَابِي كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمِ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ والی حدیث بھی نقل کرتے ہیں۔ اس سے معاملہ مزید پیچیدہ ہوجاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے علاوہ تمام اصحاب کو بھی امت کا امام اور خلیفہ بنایا جاسکتا ہے۔ ''اگر'' یہ حدیث صحیح ہے تو پھر حضرت ابوبکرؓ ہی کی بیعت کیوں ضروری تھی حالانکہ تمام صحابہ قابل اقتداء اور رسول خدا ﷺ کے جانشین تھے۔

خدانخواستہ اگر ایسا ہوتا تو نہ جانے مسلمانوں کی کیا حالت ہوتی کیونکہ اصحاب کی رائے ایک دوسرے کے برخلاف تھی۔ سعد بن عبادہ، ابوبکر اور عمر کی ایک رائے تھی، طلحہ و زبیر کی رائے الگ تھی اور حضرت علی علیہ السلام کی رائے ان سب سے الگ تھی۔ حضرت علی علیہ السلام تن تنہا مذکورہ اصحاب کے مخالف تھے۔ لہٰذا ایسی صورت میں اس زمانے کے مسلمانوں کی کیا ذمے داری ہوتی ؟ اس حدیث کا وضعی ہونا اس قدر عیاں ہے کہ بعض علمائے اہلسنت نے بھی اس کے جعلی ہونے کو تسلیم کیا ہے اور اس کے دو راویوں کو مجہول اور جھوٹا قرار دیا ہے۔ (دیکھیے: صالح الوردانی کی کتاب فریب، مطبوعہ مجمع علمی اسلامی)

خلفائے ثلاثہ کے بارے میں اسی طرح کی اور دلیلیں بھی دی گئی ہیں مگر ان سب کا ذکر قارئین کو تھکا دینے کے علاوہ کتاب کی طوالت کا سبب بنے گا لہٰذا ہم یہاں حضرت علی علیہ السلام کی خلافت و ولایت کے بارے میں مامون رشید کا علمائے کلام اور فقہائے اہلسنت کے ساتھ مناظرے کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جس میں اہلسنت کے تمام تر بے بنیاد دلائل کا جواب موجود ہے تاکہ حقیقت واضح ہوجائے۔

## مامون رشید کا علمائے اہلسنت کے ساتھ مناظرہ

شیخ صدوق نے اپنی کتاب **عیون اخبار الرضا** میں ایک مناظرہ نقل کیا ہے جسے ہم اختصار کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسحاق بن حماد بن زید بیان کرتا ہے کہ یحییٰ بن اکثم نے ہمیں ایک مجلس میں بلایا اور کہا کہ مامون نے مجھے حکم دیا ہے کہ اہل حدیث اور کلام و معارف کے چند جید علماء کو ایک مناظرے کی دعوت دوں چنانچہ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور تقریباً ۴۰ علماء کو اپنے ساتھ لے کر محل کے دروازے تک پہنچا جہاں میں نے ان لوگوں کو رکنے کے لیے کہا اور خود مامون کو اطلاع دینے کے لیے اس کے سامنے پیش ہوا۔

مامون نے ان تمام علماء کو اپنے حضور پیش کرنے کے لیے دربان کو اشارہ کیا۔ وہ سب مامون کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے مامون کو سلام کیا۔ جس کے بعد مامون کچھ دیر تک ان سے

باتیں کرتا رہا اور آخرکار اس نے کہا:

اے علمائے اسلام! میرا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت علی علیہ السلام آپ کی جانشینی کے لیے افضل ترین فرد تھے۔ اگر میرا عقیدہ غلط ہے تو آپ اسے دلیل سے رد کریں اور اگر ٹھیک ہے تو آپ بھی اس کا اقرار کریں۔ یاد رہے کہ میرا حشم و خدم آپ کو حرف حق کہنے سے باز نہ رکھے۔ آپ تقویٰ کو اپنا شعار بنائیں اور صرف حق بات کہیں۔

اگر آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہیں تو بلا جھجک پوچھ سکتے ہیں ورنہ مجھے اجازت دے دیجئے کہ میں آپ سے سوال پوچھوں؟ سب نے کہا: ہم آپ سے سوال پوچھیں گے۔ مامون نے کہا: آپ کسی ایک صاحب کو چن لیں جو مجھ سے بات کرے اور جہاں کہیں وہ غلطی کرے وہاں آپ اس کی غلطی کی تصحیح کر دیں تاہم مجھ سے آپ کی نمائندگی کرتے ہوئے ایک ہی عالم بات کرے۔

— چنانچہ ایک محدث نے کہا: ہمارا عقیدہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت ابوبکرؓ سب سے افضل تھے اس لیے کہ تمام صحابہ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: میرے بعد ابوبکرؓ و عمرؓ کی پیروی کی جائے لہٰذا ضروری ہے کہ یہ دونوں بہترین خلائق ہوں تا کہ لوگ ان کی پیروی کریں۔

— مامون: روایات تو بہت زیادہ ہیں لیکن یہ سب تین حالتوں سے خالی نہیں ہیں:

یا تمام روایات صحیح ہیں

یا تمام وضعی اور باطل ہیں

یا ان میں سے بعض صحیح اور بعض وضعی ہیں۔

اگر تمام احادیث اور روایات صحیح ہیں تو پھر یہ اختلافات کہاں سے آئے؟ کیوں بعض روایات دوسری روایات کو غلط ثابت کرتی ہیں؟ اگر ہم کہیں کہ تمام روایات وضعی اور باطل ہیں تو اس طرح دین کا باطل ہونا اور شریعت کا خاتمہ لازم آئے گا۔ اس لیے لامحالہ یہی کہنا پڑے گا کہ کچھ احادیث اور روایات صحیح ہیں اور کچھ وضعی ہیں۔ میں جب آپ کی دلیل پر نظر ڈالتا ہوں تو اس حدیث کا مضمون مجھے مکمل طور پر غلط نظر آتا ہے اس لیے کہ یہ قول رسول اکرم ﷺ سے منسوب کیا گیا ہے جو دانا ترین ذات ہیں۔ وہ امر محال کا حکم دے ہی نہیں سکتے کیونکہ حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ دو صورتوں سے خالی نہیں

یا تو دونوں ہر لحاظ سے یکساں ہوں گے

یا ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے

پہلی صورت کو مانیں تو دونوں کا جسم اور فکر میں یکساں ہونا لازم آتا ہے جو کہ عقلاً محال ہے۔ دوسری صورت میں اگر ایک کی پیروی کی جائے تو دوسرے کی پیروی نہیں ہوگی۔ اس طرح یہ دونوں کیسے برحق ہوسکتے ہیں جبکہ دونوں کی رائے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

مثلاً حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا تھا: خالد بن ولید کو مالک بن نویرہ کے قتل کے جرم میں معزول کردو اور قصاص میں اس کی گردن اڑا دو مگر حضرت ابوبکرؓ نے اس بات کو قبول نہیں کیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں **متعة الحج** اور **متعة النساء** کو حرام قرار دیا تھا لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانے میں ایسا نہیں کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بعد حضرت عمرؓ کو خلیفہ مقرر کیا لیکن حضرت عمرؓ نے خلافت کو شوریٰ پر چھوڑ دیا وغیرہ۔

— محدث: رسول خدا ﷺ نے فرمایا تھا: **لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا لَا تَّخَذْتُ اَبَابَكْرٍ خَلِيْلًا** اگر میں کسی کو دوست بناتا تو ابوبکرؓ کو دوست بناتا۔

— مامون: یہ روایت اس قابل نہیں کہ اسے رسول اکرم ﷺ سے منسوب مانا جائے کیونکہ فریقین میں مشہور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مؤاخات کے وقت حضرت علی علیہ السلام کو اپنا بھائی بنایا تھا۔ اب آپ بتائیں کہ ان دونوں میں سے کون سی روایت صحیح ہے؟

— محدث: حضرت علی علیہ السلام نے خود برسر منبر کہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد امت کے بہترین افراد ابوبکرؓ اور عمرؓ ہیں۔

— مامون: یہ ناممکن ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے ایسی بات کہی ہو کیونکہ اگر یہ دونوں بہترین افراد تھے تو پھر رسول خدا ﷺ نے عمرو بن عاص کو ان کا امیر کیوں بنایا تھا؟ نیز اسامہ بن زید کو ان دونوں پر سالار کیوں مقرر کیا تھا؟ اگر یہ درست ہے تو پھر حضرت علی علیہ السلام رسولؐ کے بعد یہ کیوں فرماتے رہے کہ میں ہی رسول خدا ﷺ کی جانشینی کا حقدار ہوں اور اگر مجھے خدشہ نہ ہوتا کہ لوگوں کی اکثریت دین سے منحرف ہوجائے گی تو میں ان دونوں سے اپنا حق لے کر دکھاتا۔ نیز انھوں نے فرمایا تھا: میں خلافت کا زیادہ حقدار ہوں کیونکہ میں ابتدا سے ہی اللہ کی عبادت کرنے والا ہوں جبکہ یہ دونوں ایک عرصے تک بت پرست رہے ہیں۔

— محدث: ہم تک آنحضرت ﷺ کی یہ روایت پہنچی ہے کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ جنت میں بوڑھوں کے سردار ہوں گے۔

— مامون : یہ حدیث ہی نہیں ہے اس لیے کہ جنت میں کوئی بوڑھا نہیں ہوگا۔ خود آنحضرت ﷺ نے **شجعیہ** نامی بوڑھی خاتون سے فرمایا تھا کہ کوئی بڑھیا جنت میں داخل نہیں ہوگی مگر یہ کہ وہ جوان ہوجائے گی۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی تھی **اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ○ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ○ عُرُبًا اَتْرَابًا ○** ہم ان کو خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انھیں کنواریاں بنا دیں گے۔ (سورۂ واقعہ : آیت ۳۵ تا ۳۷)

اس بنا پر وہی حدیث صحیح ہے جس پر فریقین متفق ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا : **اَلْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ سَيِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ** حسنؑ اور حسینؑ جوانان جنت کے سردار ہیں۔ (فصول المہمہ ص ۱۵۹)

— محدث : رسول خدا ﷺ کی حدیث ہے کہ اگر میں مبعوث نہ ہوتا تو عمرؓ نبی ہوتے۔

— مامون : یہ حدیث بالکل وضعی ہے۔ ناممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا ہو اس لیے کہ ارشاد الٰہی ہے : **وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ** (اے نبی ! یاد رکھو) اس عہد کو جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا ہے۔ آپ سے بھی اور نوح ، ابراہیم ، موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے بھی سب سے ہم پختہ عہد لے چکے ہیں۔ (سورۂ احزاب : آیت ۷) لہٰذا یہ کیونکر درست ہوسکتا ہے کہ جس سے نبوت کے بارے میں عہد لیا جاچکا ہو اسے مبعوث نہ کیا جائے اور دوسرے کو بغیر عہد کے مبعوث کردیا جائے۔

— محدث : حدیث رسولؐ ہے کہ اگر اللہ کا عذاب نازل ہوجائے تو عمر بن خطابؓ کے سوا کوئی نجات نہیں پائے گا۔

— مامون : یہ حدیث قرآن کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اللہ نے اپنے حبیبؐ سے فرمایا ہے : **وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ** اس وقت تو اللہ ان پر عذاب نازل کرنے والا نہ تھا جب آپؐ ان کے درمیان موجود تھے۔ (سورۂ انفال : آیت ۳۳) اس آیت میں اللہ نے واضح طور پر رسول پاک ﷺ کے وجود مبارک کو نزول عذاب سے روکنے کا واحد سبب بتایا ہے لیکن تم لوگ حضرت عمرؓ کو رسول اللہ ﷺ کی مانند قرار دے رہے ہو؟ حالانکہ حقیقت میں اگر عذاب نازل ہوتا تو صرف رسول اللہ ﷺ نجات پانے والے ہوں گے جبکہ باقی سب (جن میں حضرت عمرؓ بھی شامل ہیں) عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

— محدث : رسول اکرم ﷺ نے گواہی دی ہے کہ حضرت عمرؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔

— مامون : اگر یہ حدیث صحیح ہے تو پھر حضرت عمرؓ نے (صاحب سرّ رسولؐ) جناب حذیفہؓ کو قسم دیکر

کیوں پوچھا تھا کہ کیا میرا نام بھی منافقین میں شامل ہے؟ اگر آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کو جنت کی بشارت دی تھی تو یہ سوال بتاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو رسول اللہ ﷺ کے قول پر یقین نہیں تھا اور رسول اللہؐ کی بات میں شک کرنا کفر کی دلیل ہے اور کفر و جنت دونوں یکجا نہیں ہو سکتے۔

— محدث : حدیث رسولؐ ہے کہ مجھے میری امت کے مقابلے میں ترازو پر تولا گیا تو میرا پلڑا بھاری رہا۔ پھر ابوبکرؓ کو تولا گیا تو ان کا بھی پلڑا بھاری رہا۔ پھر عمرؓ کو تولا گیا اور ان کا پلڑا بھی بھاری رہا یعنی انھیں بھی وہی افتخار حاصل ہے جو رسول ﷺ کا خاصہ ہے۔

— مامون : یا تو جسموں کے لحاظ سے تولا گیا ہوگا یا اعمال کے لحاظ سے۔ جسمانی وزن کیا گیا ہے تو یہ حدیث غلط ہے اور اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو اس میں فضیلت کی کوئی بات نہیں۔ اگر اعمال کے لحاظ سے تولا گیا تو کیا ان دونوں کے اعمال کو تمام امت کے اعمال پر برتری حاصل تھی؟ اگر ایسا کہا گیا تو یہ پہلی بات سے بھی زیادہ غلط بات ہے کیونکہ اسلام میں اچھے کام اور تقویٰ برتری کا معیار ہیں اور تمام علماء و مؤرخین نے گواہی دی ہے کہ زہد، تقویٰ، عبادت اور اخلاص میں کوئی بھی حضرت علی علیہ السلام کی برابری نہیں کرسکتا۔ اس بنا پر رسول اللہ ﷺ کے بعد ابوبکرؓ اور عمرؓ نہیں بلکہ حضرت علی علیہ السلام افضل ترین ہستی قرار پائیں گے۔

علمائے اہلسنت نے اپنے سر جھکا لیے، کسی میں تاب سخن نہ تھی۔ مامون نے جب ان کی یہ حالت دیکھی تو کہا: آپ لوگ چپ کیوں ہیں؟ سب نے جواب دیا: جب تک ہمارے پاس دلائل موجود تھے ہم نے آپ سے بات کی۔ مامون نے ان علماء کی خاموشی دیکھ کر چند مزید باتیں مختصر سوال و جواب کے ذریعے بیان کر کے اپنے دعوے کو ثابت کیا۔

مامون : بعثت رسولؐ کے بعد سب سے بہترین عمل کیا ہے؟

محدثین : ایمان میں سبقت۔

مامون : کیا حضرت علی علیہ السلام سے بھی پہلے کوئی ایمان لایا تھا؟

محدثین : جی ہاں! حضرت ابوبکرؓ۔ جب حضرت علی علیہ السلام ایمان لائے اس وقت آپ نابالغ تھے لیکن حضرت ابوبکرؓ چالیس سال کی عمر میں ایمان لائے تھے اس لحاظ سے ان کے ایمان کو حضرت علی علیہ السلام کے ایمان پر برتری حاصل ہے۔

مامون : حضرت علی علیہ السلام رسول خدا ﷺ کی دعوت پر ایمان لائے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی

دعوت اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی (سورۂ نجم : آیت ۴) کے مطابق وحی الٰہی تھی۔ اگر اللہ نے حضرت علی علیہ السلام کو اس دعوت کے قبول کرنے کا مکلف نہ جانا ہوتا تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے انھیں دعوت نہ دیتا۔ گویا حضرت علی علیہ السلام کا کمسنی میں ایمان لانا الہام الٰہی کی وجہ سے تھا یا دعائے پیغمبرؐ کا نتیجہ تھا۔ یہ بات حضرت علی علیہ السلام کی افضلیت پر دلالت کرتی ہے کہ آپ بچپن ہی میں الہام الٰہی کو قبول کرنے کے اہل تھے اور اگر حضرت علی علیہ السلام کا ایمان لانا دعائے پیغمبرؐ کا نتیجہ تھا تو اس صورت میں بھی مذکورہ آیت کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ایمان علیؑ کو قبول کرنا وحی کے عین مطابق تھا۔ گویا نبیؐ اور علیؑ دونوں اللہ کے برگزیدہ ہیں اور اللہ کے نبیؐ حضرت علی علیہ السلام پر مکمل بھروسا رکھتے تھے اور آپ نے ان کے ایمان کو یہ جانتے ہوئے قبول فرمایا تھا کہ حضرت علی علیہ السلام کو تائید ایزدی حاصل ہے۔

مامون نے دوسرا سوال کیا: ایمان کے بعد کون سا عمل افضل ہے؟

محدثین : راہ خدا میں جہاد۔

مامون : کیا پوری امت میں کوئی ایسا فرد ہے جس نے میدان جنگ میں حضرت علی علیہ السلام سے زیادہ جاں نثاری کا مظاہرہ کیا ہو؟ کیا یہ حضرت علی علیہ السلام ہی نہیں تھے جنھوں نے بدر میں اکثر دشمنوں کو مار بھگایا تھا؟

محدثین : جنگ بدر میں اگر حضرت علی علیہ السلام نے بہادری کے جوہر دکھائے تو دوسری طرف حضرت ابوبکرؓ بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں بیٹھ کر جنگ کی تدابیر بتا رہے تھے۔

مامون : کیا حضرت ابوبکرؓ اکیلے تھے یا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے ساتھ شریک تھے؟ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت ابوبکرؓ کے مشورے کی ضرورت تھی؟

محدثین: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں ان تینوں میں سے کسی ایک بات کو بھی قبول کرلوں۔[1]

مامون : میدان چھوڑ کر حضرت ابوبکرؓ کا سائبان کے نیچے جا کر بیٹھ جانا کون سی فضیلت رکھتا ہے اگر جنگ سے کنارہ کشی کر کے ایک طرف بیٹھ جانا سبب افتخار ہے تو پھر اللہ نے مجاہدین کی تعریف کرتے ہوئے کیوں فرمایا ہے: وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ○ اللہ نے لڑنے والوں کو بیٹھ

---

۱۔ ابن ابی الحدید نے بدر کے دن حضرت ابوبکرؓ کے سائبان میں بیٹھے رہنے کے حوالے سے کہا ہے:

وَلَا كَانَ يَوْمَ الْغَارِ يَهْفُو جَنَانُهُ حِذَارًا وَلَا يَوْمَ الْعَرِيْشِ تَسَتَّرَا

یعنی علیؑ ابوبکرؓ کی طرح نہیں تھے کہ غار ثور میں رسول اللہؐ کے ہوتے ہوئے مشرکین کے ڈر سے ان کا دل تھر تھر کانپ رہا ہو یا پھر بدر کے میدان میں جنگ سے ڈر کر سائبان کے نیچے پناہ لیے ہوئے ہوں۔

رہنے والوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ (سورۂ نساء: آیت ۹۵)

اس کے بعد مامون نے اسحاق بن حماد سے کہا: اسحاق! سورۂ ہل اتیٰ کی تلاوت کرو۔

اسحاق سورۂ کی تلاوت کرتے ہوئے جب وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا تک پہنچا تو مامون نے کہا: اسحاق! یہ آیات کس کے بارے میں نازل ہوئیں؟

اسحاق: حضرت علی علیہ السلام کے حق میں۔

مامون: کیا حضرت علی علیہ السلام نے مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے وقت یہ الفاظ نہیں کہے تھے إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝

اسحاق: ہم تک کوئی ایسی بات نہیں پہنچی۔

مامون: گویا اللہ حضرت علی علیہ السلام کی نیت جانتا تھا اور اس نے لوگوں کو اس سے آگاہ کرنے کے لیے یہ آیت نازل فرمائی تاکہ لوگ اس باطنی فضیلت کو جان لیں۔

مامون: اے اسحاق! حدیث طیر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک بھنا ہوا پرندہ پیش کیا گیا تو آپ نے دعا فرمائی: بار الہا! میرے ساتھ یہ گوشت کھانے کے لیے اپنے محبوب ترین بندے کو بھیج اس وقت حضرت علی علیہ السلام تشریف لائے تھے صحیح ہے یا غلط؟

اسحاق: صحیح ہے۔

مامون: یہ معاملہ چار احتمالات میں کسی ایک سے خالی نہیں۔

(۱) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا مستجاب ہوئی اور حضرت علی علیہ السلام اللہ کے محبوب ترین بندے ہیں۔

(۲) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا مستجاب نہیں ہوئی اور حضرت علی علیہ السلام اچانک آگئے۔

(۳) اللہ کے نزدیک محبوب بندے اور بھی تھے مگر اللہ نے حضرت علی علیہ السلام ہی کو بھیج دیا۔

(۴) اللہ کے نزدیک کوئی افضل اور مفضول نہیں۔ اس نے ویسے ہی حضرت علی علیہ السلام کو بھیج دیا۔

اے اسحاق! اگر تم پہلے احتمال کو قبول کرو تو وہی میرا مقصود ہے لیکن اگر تم باقی تین احتمالات میں سے کسی بھی ایک کو تسلیم کرو تو یہ تمہارے کفر اور گمراہی کی دلیل ہوگی۔[۱]

اسحاق کافی دیر تک سر جھکائے خاموش رہا۔ پھر اس نے یہ آیت پڑھی ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا (سورۂ توبہ: آیت ۴۰) اور کہا کہ اس آیت میں خدا نے حضرت ابوبکرؓ کو رسولؐ کا ساتھی قرار دیا ہے۔

---

۱۔ حدیث طیر، مناقب ابن مغازلی ص ۱۵۶ اور ینابیع المودۃ ص ۵۶ پر نقل کی گئی ہے۔

مامون حیرت سے بولا : سبحان اللہ ! تمہاری سوچ کس قدر چھوٹی ہے ؟ کیا ضروری ہے کہ صرف یکساں نظریات اور شخصیت رکھنے والے لوگ ہی ایک دوسرے کے ساتھی کہلائیں ؟ کیا قرآن میں ایک کافر آدمی کو ایک مومن آدمی کا ساتھی نہیں کہا گیا : قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ۝ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝ اس کے ساتھی نے گفتگو کرتے ہوئے اس سے کہا کیا تو کفر کرتا ہے اور اس ذات سے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور تجھے پورا آدمی بنا کھڑا کیا مگر میں تو یہ کہتا ہوں کہ اللہ ہی میرا پروردگار ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ (سورۂ کہف : آیت ۳۷ ـ ۳۸)

پھر مامون نے کہا : اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا کا جملہ حضرت ابوبکرؓ کی دلجوئی کے لیے کہا گیا ہے کیونکہ وہ بہت پریشان تھے۔ لہٰذا تم مجھے بتاؤ کیا حضرت ابوبکرؓ کا حزیں ہونا اچھی بات تھی ؟ وہ اطاعت تھی یا معصیت ؟ اگر اطاعت تھی تو رسول خدا ﷺ نے انھیں اس سے منع کیوں فرمایا ؟ اور اگر معصیت تھی تو اس سے ان کی کون سی فضیلت ثابت ہوتی ہے ؟

مامون : اچھا یہ بتاؤ کہ اللہ نے غار میں سکون کسے بخشا تھا ؟

اسحاق : حضرت ابوبکرؓ کو کیونکہ رسول خدا ﷺ کو اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔

مامون : اگر ایسا ہے تو اللہ نے کیوں فرمایا تھا وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَعَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ (سورۂ توبہ : آیت ۲۵ ـ ۲۶)

اے اسحاق ! کیا تم بتا سکتے ہو کہ موت کے خوف سے میدان چھوڑ کر کون بھاگے اور کون میدان میں ثابت قدم رہے ؟ اور جن مومنین کے دلوں کو اللہ نے سکون بخشا تھا وہ کون تھے ؟

کیا یہ حقیقت نہیں کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھاگنے والوں میں شامل تھے اور حضرت علی علیہ السلام حضرت عباسؓ اور دوسرے پانچ صحابہ ثابت قدم رہے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام اکیلے تلوار چلا رہے تھے، حضرت عباسؓ رسول خدا ﷺ کے ناقہ کی مہار تھامے ہوئے تھے اور باقی پانچ صحابہ پروانہ وار آنحضرتؐ کے گرد حلقہ بنائے ہوئے ان کی حفاظت کر رہے تھے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اللہ نے رسول خدا ﷺ اور ان کے مومن ساتھیوں کے دلوں کو سکون بخشا تھا ؟ اور اگر یہ درست ہے تو یہاں تو خدا نے اپنے رسولؐ پر تسکین نازل کی تھی پھر کیونکر ہوسکتا ہے کہ غار میں وہ تسکین کے سزاوار نہ ہوں۔ پھر میں تم سے یہ بھی پوچھنا چاہوں گا کہ جو یکہ وتنہا اتنے بڑے لشکر سے نبرد آزما رہا اور اللہ کا سکون اس کے شامل حال رہا کیا

اسے افضل مانا جائے یا اسے جو غار میں آنحضرت ﷺ کے ہوتے ہوئے تسکین الٰہی سے محروم رہا؟ اے اسحاق! بتاؤ کیا وہ افضل ہے جو غار میں رسول خدا ﷺ کا ساتھی تھا یا وہ جو لیلۃ المبیت بستر رسولؐ پر سو کر اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار تھا؟ اسے رسول خدا ﷺ کی سلامتی اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔

پھر مامون نے کہا: کیا تم حدیث ولایت مَنۡ کُنۡتُ مَوۡلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوۡلَاہُ کو مانتے ہو؟

اسحاق: جی مانتا ہوں۔ میں نے خود اس روایت کو نقل کیا ہے۔

مامون: کیا اس سے حضرت علی علیہ السلام کی افضلیت ثابت نہیں ہوتی؟

اسحاق: لوگوں کا کہنا ہے کہ رسول خدا ﷺ نے یہ بات زید بن حارثہؓ کے لیے فرمائی تھی۔

(یعنی جس پر میری ولایت ہے اس پر میرے بعد علیؑ کی ولایت ہوگی اور زیدؓ رسول خدا ﷺ کے مولا یعنی غلام تھے چنانچہ آپ نے اپنے بعد حضرت علی علیہ السلام کو اس کا آقا بنایا تھا)۔

مامون: رسول خدا ﷺ نے یہ حدیث کب اور کہاں ارشاد فرمائی تھی؟

اسحاق: حجۃ الوداع کے موقع پر۔

مامون: زید بن حارثہ کب اور کہاں قتل ہوئے؟

اسحاق: ۸ سنہ ہجری جنگ موتہ میں۔

مامون: جنگ موتہ حجۃ الوداع سے پہلے نہیں ہوئی تھی؟

اسحاق: بالکل۔ پہلے ہوئی تھی۔

مامون: پھر کس طرح ممکن ہے کہ یہ جملہ زید بن حارثہ کے لیے کہا گیا ہو؟ اچھا یہ بتاؤ کہ تم حدیث منزلت اَنۡتَ مِنِّیۡ بِمَنۡزِلَۃِ ہَارُوۡنَ مِنۡ مُوۡسٰی کو صحیح مانتے ہو؟

اسحاق: جی۔ میں اسے صحیح مانتا ہوں۔

مامون: کیا حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سگے بھائی نہیں تھے؟

اسحاق: کیوں نہیں؟

مامون: کیا حضرت علی علیہ السلام بھی رسول خدا ﷺ کے سگے بھائی تھے؟

اسحاق: نہیں۔ حضرت علی علیہ السلام کے والد حضرت ابو طالبؑ اور ماں جناب فاطمہ بنت اسدؓ تھیں جبکہ رسول خدا ﷺ کے والدین حضرت عبداللہؓ اور بی بی آمنہؓ تھے۔

مامون: کیا حضرت علی علیہ السلام بھی حضرت ہارون علیہ السلام کی طرح نبی تھے؟

اسحاق: نہیں۔

مامون : پھر کس خصوصیت کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کو مثیل ہارون علیہ السلام کہا تھا ؟

اسحاق : حضرت موسیٰ علیہ السلام جب "میقات" کی طرف جا رہے تھے تو انھوں نے اپنے پیروکاروں کے لیے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا جبکہ حضرت علی علیہ السلام کو صرف جنگ تبوک کے موقع پر مدینہ میں موجود ناتواں مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے رسول خدا ﷺ نے اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔

مامون : جب حضرت موسیٰ علیہ السلام میقات کی طرف جا رہے تھے تو کیا وہ اپنے ساتھ کچھ لوگوں کو لے کر گئے تھے یا نہیں ؟

اسحاق : جی ہاں۔

مامون : کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے تمام پیروکاوں کے لیے جن میں ان کے ساتھ جانے والے بھی شامل تھے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا تھا ؟

اسحاق : جی کیا تھا۔

مامون : پھر حضرت علی علیہ السلام کے لیے بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ وہ بھی تمام مسلمانوں کے لیے رسول خدا ﷺ کے جانشین تھے چاہے وہ مدینہ میں رہ جانے والے لوگ ہوں یا رسول خدا ﷺ کے ساتھ جانے والے ہوں۔ اسحاق لاجواب ہوگیا۔

اس طرح مامون نے تمام محدثین کو مختلف دلائل سے خاموش کر دیا اور اس کے بعد علمائے کلام کی طرف متوجہ ہوا اور بولا : اے گروہ علماء ! میں آپ سے سوال کروں یا آپ مجھ سے سوال پوچھیں گے ؟ ہم آپ سے سوال پوچھیں گے۔ مامون نے کہا : پوچھیں۔ آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں ؟

متکلم : کیا حضرت علی علیہ السلام کی خلافت دیگر واجبات کی طرح نہیں جو ہم تک پہنچے ہیں ؟

مامون : بالکل اسی طرح ہے۔

متکلم : پھر کیا وجہ ہے کہ دیگر واجبات کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں لیکن حضرت علی علیہ السلام کی خلافت میں اختلاف پایا جاتا ہے ؟

مامون : اس لیے کہ دیگر واجبات میں حسد اور رقابت کا مسئلہ نہیں لیکن خلافت، حکومت ہے۔ ہر شخص میں حکومت کی خواہش موجود ہوتی ہے۔ نمازی بننے اور ایک قوم کا حاکم بننے میں بہت فرق ہے۔

متکلم : رسول خدا ﷺ کی حدیث ہے کہ مسلمان اجماع کے ذریعے جسے نیک جانیں وہ عنداللہ نیک ہے اور جسے برا جانیں وہ عنداللہ برا ہے۔

مامون : یہاں دو احتمال پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اجماع سے مراد تمام مسلمانوں کا اجماع

ہے جو کہ محال ہے اس لیے کہ لوگ اپنی ذات اور فکر میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد بعض مسلمانوں کا گروہی عقیدہ ہے۔ اس صورت میں بھی مختلف گروہوں کے درمیان اختلافات موجود ہیں جیسے شیعہ حضرت علی علیہ السلام کو اپنا پیشوا مانتے ہیں اور آپ دوسروں کو۔

متکلم : کیا یہ سوچا جاسکتا ہے کہ سب اصحاب رسولؐ نے غلطی کی تھی ؟

مامون : یہ اس سوچ کا محل نہیں کہ انھوں نے غلطی کی تھی کیونکہ آپ لوگ یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ امامت ایک الٰہی عہدہ ہے اور نہ ہی یہ مانتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے سونپی گئی ذمے داری ہے۔ اس صورت میں خلافت و امامت نہ تو واجب ہے اور نہ ہی سنت اور جو چیز نہ واجب ہو نہ سنت اسے بدعت کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا اور یہ بدعت غلطی اور خطا سے بھی بدتر ہے اس لیے کہ خطا میں درگزر کی گنجائش ہوتی ہے مگر بدعت میں تو معافی بھی نہیں۔

متکلم : اگر آپ امامت علیؑ کو دوسروں کے مقابلے میں درست جانتے ہیں تو اپنی دلیل پیش کریں کیونکہ مدعی کے لیے گواہ پیش کرنا لازمی ہے۔

مامون : میں مدعی نہیں ہوں۔ میں حضرت علی علیہ السلام کی امامت کا اقرار کرنے والا ہوں۔ مدعی تو وہ لوگ ہیں جو خود کو اس بات کا مجاز سمجھتے ہیں کہ وہ خلیفہ مقرر کریں اور اسے معزول بھی کریں۔ اس لیے ان لوگوں پر لازم ہے کہ وہ گواہ پیش کریں اور یہی آپ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ آپ سب صاحب اختیار ہیں گویا آپ سب مدعی ہیں۔ علاوہ ازیں گواہ مدعی کے علاوہ کسی دوسرے کا ہونا بھی ضروری ہے اس لیے امت رسولؐ کے باہر سے گواہ پیش کیا جانا چاہیے لیکن افسوس کہ ایسا کام عملی طور پر ناممکن ہے۔

مذکورہ گفتگو کے علاوہ بھی مامون نے علمائے کلام کے ساتھ بہت سی باتیں کی تھیں اور ان سب کو لاجواب کردیا تھا۔[۱] (عیون اخبار الرضا ، باب ۴۴)

---

۱۔ یہ مامون جس کی علمیت آپ نے ملاحظہ کی اس نے حکومت کی خاطر امام علی رضا علیہ السلام کو قتل کرادیا تھا جیسے منصور نے امام جعفر صادق علیہ السلام کو اور اس کے باپ ہارون نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو قتل کرادیا تھا۔ حکمران حکومت کی خاطر قتل جیسا گھناؤنا جرم کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ مامون نے تخت و تاج کے لیے اپنے بھائی امین کو بھی قتل کردیا تھا۔

ایک دن جب مامون نے اپنے باپ ہارون سے پوچھا تھا کہ آپ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا احترام تو بہت کرتے ہیں مگر ان کا حق ان کو نہیں دیتے تو ہارون نے کہا تھا: تو میری اولاد ہے لیکن اگر میرے تخت و تاج کو تجھ سے بھی خطرہ ہو تو میں تجھے بھی قتل کردوں گا۔ یاد رکھ! اقتدار کی کوئی اولاد نہیں ہوتی اَلْمُلْكُ عَقِيْمٌ. (بحار الانوار ج ۱۱، ص ۲۷۲)

ہوس ملک گیری اور حب دنیا انسان کے ایمان کو برباد کردیتی ہے اور وہ خدا کو بھول جاتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم سے ملنے کی توقع نہیں۔ وہ دنیاوی زندگی سے خوش اور اس پر قانع ہیں اور ہماری نشانیوں کو بھولے ہوئے ہیں۔ (سورۂ یونس : آیت ۷) رضوانی

معتزلی عالم ابی عثمان عمرو بن بحر الجاحظ کا شمار اہلسنت کے علماء و محققین میں ہوتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے بعض مقامات پر ابن ابی الحدید کی طرح "حضرات شیخین" کی حمایت بھی کی ہے تاہم انھوں نے ایک علیحدہ رسالے میں حضرت علی علیہ السلام کے جانشین رسولؐ ہونے سے متعلق دلائل بیان کئے ہیں جسے علی بن عیسیٰ اربلی نے اپنی کتاب **کشف الغمہ** میں نقل کیا ہے۔ ہم یہاں تکمیل بحث کے لیے ان دلائل کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں۔

جاحظ کہتے ہیں: جانشینی رسولؐ کے مسئلے پر شیعہ اور سنی فرقوں میں اختلاف ہے۔

سنی فرقہ کہتا ہے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے جانشین کا تقرر کیے بغیر وفات پائی اور آپ امت کو یہ اختیار دیکر گئے کہ وہ جسے چاہیں جانشین بنالیں۔ چنانچہ امت نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ چنا۔

شیعہ فرقہ کہتا ہے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا وصی اور جانشین مقرر فرمایا تھا۔

دونوں فرقے اپنی اپنی حقانیت کے دعویدار ہیں۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ فریقین سے بحث کر کے حق و باطل کو واضح کریں۔ اس لیے ہم نے ان سے پوچھا: کیا امت، دین کی حفاظت کرنے، ظالم سے مظلوم کو اس کا حق دلانے، اپنے معاملات فیصل کرانے، اسلامی قوانین پر عمل کرانے، مستحقین میں اموال کی تقسیم کرنے اور زکات جمع کرنے سے متعلق معاملات کو چلانے کے لیے ایک رہبر و حاکم کی محتاج نہیں ہے؟ سب کا جواب تھا جی ہاں! ہم ایک حاکم کے محتاج ہیں۔

ہم نے پوچھا: کیا لوگ اس بات کے مجاز ہیں کہ وہ کتاب وسنت کو پیش نظر رکھے بغیر کسی کو اپنا حاکم مقرر کر سکیں؟

فریقین نے کہا: ہرگز نہیں۔ انھیں اس کی اجازت نہیں۔

ہم نے پوچھا: وہ اسلام جسے قبول کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے وہ کیا ہے؟

فریقین نے کہا: کلمۂ شہادتین کا اقرار کرنا، اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے جو کچھ بیان ہوا ہے اس پر ایمان لانا، نماز، روزہ، حج بجالانا، قرآن پر عمل کرنا اور اس کے حرام وحلال کو ماننا۔

ہم نے پوچھا: کیا کچھ ایسے نیک بندے ہیں جنھیں اللہ نے اپنی مخلوق میں سے منتخب فرمایا ہے؟

فریقین نے کہا: جی ہاں۔

ہم نے پوچھا: کس دلیل کی بنیاد پر ان کا انتخاب ہوا؟

فریقین نے کہا: قرآن میں ہے: وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ اور تیرا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ خود ہی اپنے کام کے لیے جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔ یہ انتخاب لوگوں کے کرنے کا کام نہیں ہے۔ (سورۂ قصص: آیت ۶۸)

ہم نے پوچھا: نیک لوگ کون ہیں؟

فریقین نے کہا: متقی لوگ۔

ہم نے پوچھا: اس امر کی دلیل کیا ہے؟

فریقین نے کہا: ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (سورۂ حجرات: آیت ۱۳)

ہم نے پوچھا: متقین میں سے کن لوگوں کو اللہ نے برگزیدہ قرار دیا ہے؟

فریقین نے کہا: مال و جان سے راہ خدا میں جہاد کرنے والے کو جس کی دلیل اللہ کا یہ ارشاد ہے وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (سورۂ نساء: آیت ۹۵)

ہم نے پوچھا: کیا اللہ کے نزدیک مجاہدین میں بھی بعض کو بعض پر برتری حاصل ہے؟

فریقین نے کہا: ہاں۔ جہاد میں سبقت حاصل کرنے والے مجاہدین کو دوسروں پر برتری حاصل ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے: وہ لوگ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنھوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے۔ ان کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے۔ (سورۂ حدید: ۱۰)

ہم ان تمام باتوں کو تسلیم کرتے ہیں کیونکہ دونوں فرقے ان باتوں پر ایک ہی رائے رکھتے ہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جہاد میں سبقت حاصل کرنے والے ہی بہترین افراد ہیں۔ پھر ہم نے مزید سوالات کیے۔ ہم نے پوچھا: کیا جہاد میں سبقت کرنے والوں میں بھی کچھ اللہ کے نزدیک زیادہ فضیلت اور درجہ رکھتے ہیں؟

فریقین نے کہا: جی ہاں۔ جنھوں نے جہاد میں زیادہ تکالیف برداشت کیں اور میدان جنگ میں زیادہ دشمنوں کو قتل کیا ان کا درجہ مقدم ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ جو بھی ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے اس کی جزا ملے گی۔ (سورۂ زلزال: آیت ۷)

ہم نے تسلیم کیا جہاد میں زیادہ تکالیف اٹھانے والا افضل ہے۔

ہم نے پوچھا: حضرت علی علیہ السلام اور حضرت ابوبکرؓ میں سے کس نے میدان جنگ میں زیادہ تکالیف برداشت کی تھیں؟ کس کی قربانیاں راہ خدا میں زیادہ تھیں؟

فریقین نے کہا: حضرت علی علیہ السلام نے سب سے زیادہ جنگوں میں دشمنوں کو قتل کیا اور سب سے

زیادہ تکلیفیں برداشت کیں۔ آپ ہمیشہ دین خدا اور رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دفاع میں پیش پیش رہے۔

اس بنا پر دونوں فرقوں کے نزدیک کتاب وسنت کی روشنی میں حضرت علی علیہ السلام افضل ہیں۔

ہم نے پوچھا: متقین میں افضل کون ہے؟

فریقین نے کہا: زیادہ خوف خدا رکھنے والا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَذِكْرًا لِّلْمُتَّقِينَ ○ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ (سورۂ انبیاء: آیت ۴۸ ـ ۴۹)

ہم نے پوچھا: اللہ سے ڈرنے والے کون ہیں؟ فریقین نے کہا: علماء۔ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ اللہ کے بندوں میں صرف اہل علم ہی اللہ سے ڈرتے ہیں۔ (سورۂ فاطر: آیت ۲۸)

ہم نے پوچھا: لوگوں میں سب سے زیادہ عالم کون ہے؟

فریقین نے کہا: جو عدل کرنے میں سب سے بڑھ کر ہو، ہدایت کرنے میں کامل ترین ہو اور راہ حق کا رہنما ہو وہ اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے نہ کہ اسے تابع بنایا جائے۔

ارشاد الٰہی ہے: يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ... تم میں سے عادل لوگ اس کا فیصلہ دیں گے۔ (سورۂ مائدہ: آیت ۹۵) گویا اللہ نے حکومت کا حق صاحبان عدل کو دیا ہے۔

ہم نے ان کی اس بات کو بھی قبول کرلیا اور پوچھا: سب سے بڑھ کر عادل کون ہے؟

فریقین نے کہا: جو سب سے زیادہ عدل پر ثابت قدم رہے۔

ہم نے پوچھا: لوگوں میں سب سے زیادہ عدل پر قائم رہ کر حق کی ہدایت کرنے والا کون ہے؟

فریقین نے کہا: وہ جو حق کی طرف لوگوں کی ہدایت کرنے میں پیش پیش ہو وہ رہنما بنے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: أَفَمَن يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَن يُتَّبَعَ أَمَّن لَّا يَهِدِّي إِلَّا أَن يُهْدَىٰ کیا حق کی طرف ہدایت کرنے والا قابل اتباع ہے یا وہ جو ہدایت میں دوسروں کا محتاج ہے۔ (سورۂ یونس: آیت ۳۵)

اس بنا پر کتاب خدا، سنت رسولؐ اور دونوں فرقوں کا اجماع اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کی امت میں افضل ترین فرد حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام ہیں اس لیے کہ آپ کا جہاد سب سے زیادہ، آپ کا تقویٰ سب سے زیادہ، آپ کا خوف خدا سب سے زیادہ آپ کا علم سب سے زیادہ اور آپ کا انصاف سب سے زیادہ تھا بلکہ آپ سراپا انصاف تھے اس لیے امت کی رہنمائی کا سب سے زیادہ حق آپ ہی کا تھا۔ آپ محکوم نہیں بلکہ واجب الاتباع حاکم تھے۔

(کشف الغمہ ص ۱۲ ـ ۱۳)

# (۷) دو عقلی اور اصولی دلیلیں

گزشتہ گفتگو میں حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے ذیل میں پیش کی جانے والی آیات و احادیث سے صرف نظر کرتے ہوئے اب ہم عقلی اور استدلالی بحث کی طرف آتے ہیں اور فیصلہ آپ کی عقل سلیم پر چھوڑتے ہیں۔

## پہلی دلیل

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاحب وحی بھی تھے اور کائنات کے جملہ اسرار و رموز سے واقف بھی۔ نیز آپ صاحب خلق عظیم بھی تھے اور اس بارے میں ہم مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں۔

اس لیے ہمارا کہنا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کا جانشین ایسا فرد ہونا لازمی ہے جو کم از کم ایمان دار تو ہو۔ ہم برادران اہلسنت کے فائدے میں امامت کے لیے تمام ضروری شرائط کو نظر انداز کر کے صرف ایمان دار یعنی صحیح کام کرنے والے کو معیار قرار دے رہے ہیں اس لیے کہ اگر کوئی ایمان دار ہی نہیں تو پھر اسے لوگوں کے امور میں عمل دخل کا کوئی حق نہیں چہ جائیکہ اسے مسند رسولؐ پر بیٹھنے کا حق ہو۔ ہماری اس بات کو روئے زمین کے سب لوگ قبول کریں گے اس لیے کہ اصل بات یہی ہے کہ سب لوگ ایمان دار ہوں۔ اگر عام آدمی میں ایمان داری کی صفت مفقود ہو تو کوئی اہم بات نہیں لیکن خلیفۃ المسلمین جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین ہونے کا دعویدار ہو اور مسند رسولؐ پر بیٹھا ہو اس کے لیے ہر حال میں لازمی ہے کہ وہ ''امین'' اور ''ایمان دار'' ہو۔ اور صرف خلیفہ بلا فصل کے لیے شرط نہیں ہے بلکہ خلافت کی مستقل اور بنیادی شرط ہے۔ گویا تمام خلفائے رسولؐ کے لیے ضروری ہے کہ وہ سچے بھی ہوں اور امین بھی ہوں۔ سچے اور ایمان دار شخص کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ اپنے حق پر قناعت کرتا ہے اور دوسروں کا حق نہیں مارتا۔ دوسری طرف اگر کہیں دو افراد کسی چیز، مقام اور عہدے پر اپنی ملکیت کا

دعویٰ کریں تو اجتماع ضدین کے محال ہونے کی بنا پر دونوں افراد کے دعوے کو صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا۔

مثال کے طور پر ایک ہی وقت میں دو افراد ایک ہی گھر یا کارخانے کی ملکیت کا دعویٰ کریں تو ان دونوں کا دعویٰ صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ گھر یا کارخانے کا مالک ان دونوں میں سے کوئی ایک ہی ہوگا۔[1]

اس تمہید کے بعد اب ہم اصل بات کی طرف آتے ہیں۔

رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد امت میں مسئلہ خلافت کے بارے میں اختلاف پیدا ہوا۔ شیعہ حضرت علی علیہ السلام کو جبکہ اہل سنت حضرت ابوبکرؓ کو پہلا خلیفہ مانتے ہیں یعنی حضرت علی علیہ السلام اس بات کے مدعی تھے کہ خلافت و امامت عہدہ الٰہی ہے اور رسول خدا ﷺ نے حکم خدا سے آپ کو اپنا خلیفہ بنایا تھا جبکہ حضرت ابوبکرؓ خود ان کے اپنے عقیدے کے مطابق سقیفہ میں اجماع کے ذریعے خلیفہ بنے تھے اور ہم تمہیدی گفتگو میں عرض کرچکے ہیں کہ اجتماع ضدین محال ہونے کی بنا پر یہ ممکن نہیں کہ بیک وقت دونوں افراد کا دعویٰ درست ہو۔ اس لحاظ سے ان دونوں میں سے ایک خلافت کا حقدار ہوگا اور دوسرا نہیں ہوگا۔

یہ مسئلہ بھی ریاضی کے ایک ایسے سوال کی طرح ہے جس کے دو مختلف جواب نکلتے ہیں یعنی شیعوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام بلافصل خلیفہ تھے اور حضرت ابوبکرؓ کا دعویٰ غلط ہے جبکہ سنیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اجماع کی رو سے خلیفہ اول ہیں۔

ریاضیات کی ابتدائی معلومات رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ ریاضی میں درست جواب کے بارے میں اطمینان کرنے کے لیے حاصل جواب کو سوال کے مفروضات سے تطبیق دیتے ہیں۔ اگر وہی جواب آئے تو حل درست ہے وگرنہ غلط ہے۔

ذیل میں ہم اس بات کو مزید واضح کرنے کے لیے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

سوال: ایک دکان دار نے 50 میٹر کپڑا خریدا جو 40 روپے میٹر تھا۔ اسے فروخت کرتے وقت اس نے 20 میٹر کپڑا 45 روپے فی میٹر کے حساب سے فروخت کیا۔ 340 روپے منافع حاصل کرنے کے لیے دکان دار کو باقی کپڑا (30 میٹر) کتنے روپے فی میٹر کے حساب سے فروخت کرنا ہوگا؟

اس سوال کو دو طالب علموں کے سامنے رکھا گیا۔ ایک طالب علم کا جواب تھا 48 روپے فی میٹر

---

۱۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں افراد کا دعویٰ غلط ہو یعنی دونوں مدعی اس گھر یا کارخانے کے مالک نہ ہوں اور کوئی تیسرا شخص ان کا مالک ہو۔ بہرحال ان دونوں افراد کے دعوے کا صحیح ہونا محال ہے اور یہ وہی ضدین ہیں جن کا اجتماع علم منطق کے مطابق محال ہے لیکن ''ارتفاع'' (دونوں کا نہ ہونا) ممکن ہے۔

اور دوسرے کا جواب تھا 60 روپے فی میٹر۔

ظاہر ہے کہ دونوں جوابات صحیح نہیں ہو سکتے۔ ان میں سے ایک طالب علم کا جواب صحیح اور دوسرے کا غلط ہوگا یا پھر دونوں جواب غلط ہوں گے اور اس کا صحیح جواب کچھ اور ہوگا۔

ہم جواب کی درستی یا غلطی جاننے کے لیے دونوں جوابات کو سوال کے مفروضات کے ساتھ ملا کر دیکھیں گے۔ جو مفروضات کے مطابق ہو وہ صحیح ہے اور جو مطابقت نہیں رکھتا وہ غلط ہے۔

اگر ہم پہلے جواب 48 روپے فی میٹر کی تحقیق کریں تو یوں ہوگا۔

قیمت خرید 40 روپے فی میٹر۔

کل کپڑے کی قیمت خرید (2000 = 50 x 40)

منافع کی رقم 340 روپے۔

لہٰذا تمام کپڑے کی قیمت فروخت 2000 + 340 = 2340 روپے بنتی ہے۔

اب چونکہ 20 میٹر کپڑا 45 روپے فی میٹر کے حساب سے فروخت ہوا اس لیے

حاصل شدہ رقم 20 x 45 = 900 روپے ہوگی۔

منافع اور قیمت خرید پوری کرنے کے لیے درکار رقم 2340 - 900 = 1440 روپے بنتی ہے۔

اس لیے باقی 30 میٹر کپڑا اگر 48 روپے کے حساب سے فروخت کیا جائے تو درکار رقم 1440 روپے مل جائیں گے۔ یہ جواب بالکل صحیح ہے۔

اب دوسرے جواب کی پڑتال 60 روپے سے کرتے ہیں۔

باقی کپڑے کی قیمت فروخت 60 x 30 = 1800 روپے ہوگی۔

اور پہلے 20 میٹر کی قیمت فروخت 900 + 1800 = 2700 روپے ہوگی۔

اس طرح دکان دار کا منافع 2700 - 2000 = 700 روپے بنے گا جو کہ غلط ہے کیونکہ منافع کی رقم 340 روپے ہونی چاہیے 700 روپے نہیں۔

آیئے اہل تشیع اور اہل سنت کے خلافت بلا فصل سے متعلق جواب کو مسئلے کے مفروضات (جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے) کے مطابق جانچ کر دیکھیں کہ ان میں سے کون سا جواب صحیح ہے؟

اگر ہم شیعہ عقیدے کو مان لیں تو

وہ مسئلے کے مفروضات کے عین مطابق ہے اس لیے کہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ خلافت کے مدعی

دونوں افراد یعنی حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکرؓ میں سے حضرت علی علیہ السلام سچے ہیں۔ خلافت ان کا حق ہے اور حضرت ابوبکرؓ ناحق خلیفہ بنے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام بلا فصل خلیفہ تھے اور حضرت ابوبکرؓ نے ان کا حق چھینا تھا۔ چونکہ وہ ایمان دار آدمی نہیں تھے اس لیے وہ خلافت رسولؐ کے اہل نہیں تھے۔

اگر ہم سنی عقیدے کو مان لیں تو وہ مسئلے کے مفروضات سے میل نہیں کھاتا اس لیے کہ اگر حضرت ابوبکرؓ اپنے دعوے میں سچے تھے تو ان کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ حضرت علی علیہ السلام کا دعویٰ جھوٹا ہے اور علیؑ ان کا حق چھینا چاہتے ہیں۔ اس طرح حضرت علی علیہ السلام ایمان دار اور امین نہ ہونے کی بنا پر رسول اللہؐ کے خلیفہ بننے کے حقدار نہیں۔

ہم برادران اہلسنت سے پوچھتے ہیں کہ اگر حضرت علی علیہ السلام ایمان دار اور امین نہیں تھے اور وہ حضرت ابوبکرؓ کا حق چھینا چاہتے تھے تو پھر خلفائے ثلاثہ کے بعد لوگوں نے اصرار کر کے حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ کیوں بنایا؟

تمہید میں ہم بتا چکے ہیں کہ جانشین رسولؐ کے لیے ایمان دار ہونا لازمی ہے چاہے وہ پہلا خلیفہ بنے یا چوتھا لہٰذا اہلسنت کا جواب مسئلہ جانشینی کے مفروضات کے مطابق نہیں جبکہ دوسری طرف اہلسنت کی طرف سے چوتھے مرحلے پر حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ بنانا ان کے ایمان دار ہونے کی دلیل ہے جو کہ شیعوں کے عقیدے کے مطابق ہے۔ اس طرح حضرت ابوبکرؓ خلافت کے لیے نااہل قرار پاتے ہیں۔

بعض اہلسنت نے اس الجھن سے جان چھڑانے کے لیے کہا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے خود حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے ان کی بیعت کر لی تھی۔ یہ بات درج ذیل اسباب کی بنا پر غلط ہے۔

(۱) اہلسنت کی متعدد روایات سے پتا چلتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کو کئی بار زبردستی حضرت ابوبکرؓ کے پاس لے جایا گیا نیز جب تک حضرت فاطمہ زہراؑ بقید حیات رہیں حضرت علی علیہ السلام نے بیعت نہیں کی تھی۔

(۲) زبردستی بیعت لینا رضامندی کی دلیل نہیں ہوتی اور حضرت علی علیہ السلام کے کلام سے یہ بات واضح ہے کہ یہ بیعت جبری تھی۔ آپ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا جیسا کہ آپ نے خطبہ شقشقیہ اور دیگر خطبات میں فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: **اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَعْدِیْکَ عَلٰی قُرَیْشٍ فَاِنَّھُمْ قَدْ قَطَعُوْا رَحِمِیْ وَ اَکْفَؤُا اِنَائِیْ وَ اَجْمَعُوْا عَلٰی مُنَازَعَتِیْ حَقًّا کُنْتُ اَوْلٰی بِہٖ مِنْ غَیْرِیْ** خدایا! میں قریش سے انتقام لینے پر تجھ سے مدد کا خواستگار ہوں کیونکہ انھوں نے میری قرابت اور عزیز داری کے بندھن توڑ دیے اور

میرے ظرف (عزت و حرمت) کو اوندھا کر دیا اور اس حق میں کہ جس کا میں سب سے زیادہ اہل ہوں جھگڑا کرنے کے لیے ایکا کر لیا۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۲۱۵)

اپنی بیعت لینے کے بعد حضرت علی علیہ السلام منبر پر گئے اور فرمایا: لَا يُقَاسُ بِآلِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ أَحَدٌ وَلَا يُسَوَّىٰ بِهِمْ مَنْ جَرَتْ نِعْمَتُهُمْ عَلَيْهِ أَبَدًا. هُمْ أَسَاسُ الدِّيْنِ وَعِمَادُ الْيَقِيْنِ. إِلَيْهِمْ يَفِيْءُ الْغَالِيْ وَبِهِمْ يَلْحَقُ التَّالِيْ. وَلَهُمْ خَصَائِصُ حَقِّ الْوِلَايَةِ وَفِيْهِمُ الْوَصِيَّةُ وَالْوِرَاثَةُ. اَلْآنَ إِذْ رَجَعَ الْحَقُّ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَنُقِلَ إِلَىٰ مُنْتَقَلِهِ اس امت میں کسی کو آل محمدؐ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا جن لوگوں پر ان کے احسانات ہمیشہ جاری رہے ہوں وہ ان کے برابر نہیں ہوسکتے۔ وہ دین کی بنیاد اور یقین کے ستون ہیں۔ آگے بڑھ جانے والے کو ان کی طرف پلٹ کر آنا ہے اور پیچھے رہ جانے والے کو ان سے آکر ملنا ہے۔ حق ولایت کی خصوصیات انہی کے لیے ہیں اور ان ہی کے بارے میں پیغمبرؐ کی وصیت اور ان ہی کے لیے نبیؐ کی وراثت ہے۔ اب یہ وقت وہ ہے کہ حق اپنے اہل کی طرف پلٹ آیا اور اپنی صحیح جگہ پر منتقل ہوگیا۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۲)

## دوسری دلیل

(۱) فرض کیجئے کہ امامت عہدۂ خداوندی نہیں جیسا کہ اہلسنت کہتے ہیں اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کے لیے کوئی جانشین مقرر نہیں فرمایا اسی لیے سقیفہ میں مسلمانوں کے اجماع سے خلیفہ مقرر کیا گیا۔ اس صورت میں بھی جانشین رسولؐ کا انتخاب چونکہ پوری امت کا معاملہ تھا اس لیے تمام مسلمانوں کی شوریٰ میں شرکت ضروری تھی تاکہ اکثریت کا نظریہ معلوم کیا جاسکتا لیکن وہاں صورت حال اس کے برعکس تھی۔ علاوہ ازیں اصحاب کے ایک گروہ نے بھی حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی جیسا کہ تاریخ یعقوبی میں تحریر ہے قَدْ تَخَلَّفَ عَنْ بَيْعَةِ أَبِيْ بَكْرٍ قَوْمٌ مِّنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ وَمَالُوْا مَعَ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ مہاجرین اور انصار میں سے بعض افراد نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی اور وہ سب کے سب حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی طرف مائل تھے۔[۱]

خود حضرت علی علیہ السلام نے اسی ضمن میں حضرت ابوبکرؓ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

---

۱۔ بعض مہاجرین و انصار جو حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ تھے انھوں نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سے انکار کر دیا تھا۔ یعقوبی نے سلمان فارسی، زبیر، عمار، ابوذر، مقداد، عباس بن عبدالمطلب وغیرہ کے نام بھی تحریر کیے ہیں۔

فَإِنْ كُنْتَ بِالشُّورٰى مَلَكْتَ أُمُوْرَهُمْ      فَكَيْفَ بِهٰذَا وَالْمُشِيْرُوْنَ غُيَّبٌ

اگر تم سقیفہ کی شوریٰ میں لوگوں کے معاملات چلانے کے لیے حاکم مقرر ہوئے ہو تو بتاؤ یہ کیسی شوریٰ تھی کہ اس میں جن سے مشورہ ضروری تھا وہ موجود ہی نہ تھے؟

سقیفہ میں جو کچھ ہوا وہ ایک سازش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کی جانے والی منصوبہ بندی ہے کیونکہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور ابو عبیدہ بن جراح پہلے ہی منصوبہ بنا چکے تھے کہ خلافت کو بنی ہاشم سے چھین کر ایک خاص ترتیب سے آگے بڑھایا جائے گا یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے جب چھ رکنی شوریٰ بنائی تو کہا تھا کہ اگر ابو عبیدہ زندہ ہوتا تو وہی خلیفہ بنتا۔ یہ بات صرف شیعہ محققین ہی نے نقل نہیں کی بلکہ معتزلی علماء خصوصاً ابن ابی الحدید نے بھی لکھی ہے یہاں تک کہ بلجیم کے مشہور مستشرق Henri Lammens (ہنری لامانس ۱۸۶۲ء - ۱۹۳۷ء) نے کافی تحقیق کے بعد اس طرح کے منصوبے کی موجودگی کو مانا ہے لہٰذا اس اجماع کو جسے اہلسنت خلافت کی سب سے بڑی دلیل قرار دیتے ہیں شوریٰ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس اجماع میں چند افراد بغیر اطلاع جمع ہوئے تھے اور انھوں نے لڑ جھگڑ کر اپنے میں سے ہی ایک کو خلیفہ بنا دیا تھا۔ اگر وہ عوامی رائے سے کسی کو منتخب کرنا چاہتے تو ضروری تھا کہ شوریٰ کی تشکیل سے پہلے سب مسلمانوں کو اس کی اطلاع دیتے۔ اگرچہ قرآن و سنت کی رو سے امام اور خلیفہ کا انتخاب ایک حقیقی عوامی شوریٰ کے دائرہ اختیار سے بھی باہر ہے۔

(۲)    بالفرض اگر یہ ایک حقیقی شوریٰ تھا اور خلیفہ چننے کے لیے ہی تشکیل دیا گیا تھا تب بھی سوال یہ ہے کہ جس فرد کو خلیفہ چنا جانا تھا کیا اس کے لیے ضروری نہ تھا کہ وہ عام مسلمانوں کی نسبت روحانی اور اخلاقی صفات نیز دیگر عمدہ خصوصیات میں امتیازی حیثیت رکھتا ہو۔

ہم بصد ادب برادران اہلسنت سے پوچھتے ہیں کہ بتایئے امت اسلامیہ میں کون افضل ہے؟ کیا شجاعت، سخاوت، قضاوت، حکمت، علم، عدل، تقویٰ اور دیگر صفات میں کوئی ہے جو حضرت علی علیہ السلام سے افضل ہو؟

کیا مؤرخین و محدثین اہلسنت نے یہ نقل نہیں کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: أَعْلَمُكُمْ عَلِيٌّ، أَفْضَلُكُمْ عَلِيٌّ، أَعْدَلُكُمْ عَلِيٌّ، أَقْضَاكُمْ عَلِيٌّ، أَتْقٰكُمْ عَلِيٌّ وَهٰكَذَا... علیؑ تم میں اعلم ہیں، علیؑ تم میں افضل ہیں، علیؑ تم میں سب سے عادل ہیں، علیؑ تم میں سب سے بہترین قاضی ہیں، علیؑ تم میں سب سے زیادہ متقی ہیں لہٰذا حضرت علی علیہ السلام میں یہ تمام صفات ہونے کے باوجود دوسرے کو کیوں چنا گیا؟

کیا غزالی، ابن ابی الحدید وغیرہ کی روایت کے مطابق خود حضرت ابوبکرؓ نے منبر پر جا کر نہیں کہا تھا اَقِیْلُوْنِیْ وَلَسْتُ بِخَیْرِکُمْ وَعَلِیٌّ فِیْکُمْ یعنی مجھے معاف رکھو کیونکہ میں تم لوگوں سے بہتر نہیں ہوں اور علیؑ تمہارے درمیان موجود ہیں۔

فرض کیجیے کہ حضرت علی علیہ السلام کی خلافت سے متعلق کوئی نص (قرآن اور حدیث) موجود نہ تھی تب بھی آپ کی افضلیت کا تقاضا تھا کہ چاہے شوریٰ کے ذریعے ہی سہی حضرت علی علیہ السلام کو خلافت کے لیے منتخب کیا جائے۔ ابن ابی الحدید کہتے ہیں: کَانَ اَوْلٰی بِالْاَمْرِ وَاَحَقُّ لَا عَلٰی وَجْهِ النَّصِّ بَلْ عَلٰی وَجْهِ الْاَفْضَلِیَّةِ فَاِنَّهٗ اَفْضَلُ الْبَشَرِ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَاَحَقُّ بِالْخِلَافَةِ مِنْ جَمِیْعِ الْمُسْلِمِیْنَ حضرت علی علیہ السلام ہی خلافت کے سب سے زیادہ حقدار تھے لیکن نص کی بنا پر نہیں بلکہ افضلیت کی بنا پر کیونکہ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد افضل البشر ہیں اور تمام مسلمانوں سے بڑھ کر مستحق خلافت ہیں۔ (شرح نہج البلاغہ ج ۱)

اب اہل دانش بتائیں کہ عقل سلیم کیا کہتی ہے؟ کیا اس کو منتخب کیا جانا چاہیے جو یہ کہے کہ اگر میں کوئی غلطی کروں تو میری رہنمائی کرنا یا اس علیؑ کو جو یہ فرماتے ہیں کہ میں تمہارے درمیان قرآن سے، مسیحیوں کے لیے انجیل سے اور یہودیوں کے لیے توریت سے فیصلے کروں گا۔ وہ بھی اس طرح کہ اگر اللہ ان کتابوں کو نطق بخش دے تو وہ سب میرے فتوے اور حکم کی تصدیق کریں گی۔ (ینابیع المودۃ ص ۷۴)

ان شرائط کے بعد کیا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو خلیفہ منتخب کیا جا سکتا تھا جو ابن ابی الحدید اور دیگر علماء کے مطابق احد، خیبر اور حنین کی جنگوں سے بھاگنے والوں میں شامل تھے یا حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ ہونا چاہیے تھا جو دشمنوں کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند تھے اور جنھوں نے بڑے بڑے سورماؤں کو قتل کر دیا تھا۔ جنھوں نے اپنی ذوالفقار شرربار سے اسلام کا ہمیشہ دفاع کیا اور ابن ابی الحدید کے بقول اگر حضرت علی علیہ السلام نہ ہوتے تو اسلام شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا۔

جنگ خندق میں حضرت عمرؓ کا اصرار تھا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشرکین مکہ سے صلح کر لیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ عمرو بن عبدود بہت ہی دلیر آدمی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی لڑنے کی جرأت نہیں رکھتا یعنی وہ مسلمانوں کو دشمن سے بچنے کی تدبیر کرنے کی بجائے عمرو بن عبدود کی تعریف کر کے مسلمانوں کے حوصلے پست کر رہے تھے لیکن حضرت علی علیہ السلام نے تن تنہا مشرکین کے اس دیو کو قتل کر کے اپنے اخلاص کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

خندق کے دن علیؑ کی ایک ضربت جن و انس کی عبادت سے افضل ہے۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ خود حضرت عمرؓ حضرت علی علیہ السلام کی بہادری کا اعتراف کرتے تھے۔ انھوں نے کچھ لوگوں کے سامنے سعید بن عاص سے۔ جس کے باپ کو بدر میں حضرت علی علیہ السلام نے قتل کیا تھا۔ کہا کہ اس دن میں تیرے باپ کو قتل کرنا چاہتا تھا مگر جب میں نے دیکھا کہ وہ بپھرے ہوئے بیل کی طرح مخالفین پر جھپٹنے کے لیے تلوار لہرا رہا ہے اور اس کے منہ سے غصے کے مارے جھاگ نکل رہا ہے تو میں اس کے سامنے سے بھاگ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا: اے خطاب کے بیٹے! کدھر بھاگ رہے ہو؟ اسی لمحے علیؑ نے حملہ کردیا اور خدا کی قسم! ابھی میں اپنی جگہ سے ہلا بھی نہ تھا کہ علیؑ نے تیرے باپ کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ (ارشاد مفید ج ۱، باب ۲، فصل ۲۰، ح ۴)

ہم برادران اہلسنت سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ جانشینیٔ رسولؐ کا اہل ہوسکتا ہے جو یہ کہے کہ تم لوگ مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہوحتیٰ کہ پردہ نشین خواتین بھی مجھ سے زیادہ علم رکھتی ہیں یا پھر وہ اہل ہوسکتا ہے جو یہ کہتا نظر آئے سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ یعنی مجھ سے پوچھ لو اس سے قبل کہ تم مجھے نہ پاؤ۔ اور اپنے سینے کی طرف اشارہ کرکے کہا ہو اِنَّ هٰهُنَا لَعِلْمًا جَمًّا علم کا مخزن یہ سینہ ہے۔[1]

یہی حال دیگر تمام صفات اور لازمی شرائط کا ہے جس میں کوئی بھی حضرت علی علیہ السلام کی برابری کا تصور تک نہیں کرسکتا اور یہ امر بجائے خود آپ کی خلافت و ولایت کے حقدار ہونے کی واضح دلیل ہے۔ چنانچہ خلیل بن احمد بصری کہتا ہے: اِحْتِيَاجُ الْكُلِّ اِلَيْهِ وَاسْتِغْنَاؤُهُ عَنِ الْكُلِّ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّهُ اِمَامُ الْكُلِّ سب کا علیؑ کی طرف محتاج ہونا اور علیؑ کا تمام لوگوں سے بے نیاز ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ وہی لوگوں کے امام اور پیشوا ہیں۔

یہاں پہنچ کر برادران اہلسنت کے لیے راہ فرار مسدود ہوجاتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ جوان تھے اور غزوات میں چونکہ انھوں نے بہت سے لوگوں کو قتل کیا تھا اس لیے زیادہ تر لوگ ان کے خلاف تھے لیکن حضرت ابوبکرؓ ایک کہن سال شخص تھے اور لوگ بھی ان سے راضی تھے۔ اس لیے انھیں

---

۱۔ زمخشری اور سیوطی نے لکھا ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ نے کہا: جو کوئی بھی عورتوں کو چار سو درہم سے زائد مہر دے گا تو میں زائد رقم واپس لے کر بیت المال میں جمع کردوں گا۔ ایک عورت نے پردے کے پیچھے سے کہا: آپ کا یہ فیصلہ قول خدا کے خلاف ہے۔ خدا کا فرمان ہے: وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا اگر تم ایک بیوی کو چھوڑ کر دوسری بیوی کرنا چاہو اور پہلی بیوی کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی مت لو۔ (سورۂ نساء: آیت ۲۰) حضرت عمرؓ نے حیران ہوکر کہا:

كُلُّكُمْ اَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ حَتَّى الْمُخَدَّرَاتُ فِي الْحِجَالِ تم سب مجھ سے زیادہ دین کا علم رکھتے ہوحتیٰ کہ پردہ نشین خواتین بھی۔

خلیفہ منتخب کیا گیا حالانکہ یہ بات نہایت ہی مضحکہ خیز ہے اس لیے کہ

(۱) کہن سال ہونا فضیلت کی دلیل نہیں۔

(۲) اگر کہن سال ہونا ہی معیار خلافت ہے تو پھر ایسے بہت افراد تھے جو حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ بوڑھے تھے جیسے خود حضرت ابوبکرؓ کے والد ابو قحافہ جو اس وقت بقید حیات تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب ابو قحافہ کو ان کے بیٹے کے خلیفہ بننے پر تہنیت پیش کی گئی تو انھوں نے پوچھا کہ میرے بیٹے کو کیوں منتخب کیا گیا؟ جواب ملا: کیونکہ وہ تمام صحابہ سے زیادہ بزرگ ہیں۔ ابو قحافہ نے برملا کہا تھا: اس لحاظ سے تو مجھے خلیفہ ہونا چاہیے کیونکہ میں تو اس کا بھی باپ ہوں۔

کچھ مؤرخین لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے والد کو جو مکہ گئے ہوئے تھے ایک خط میں لکھا تھا خلیفہ رسولؐ ابوبکر کی طرف سے — اس کے باپ ابو قحافہ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ لوگوں نے مجھے بزرگ ہونے کی بنا پر خلافت کے لیے منتخب کرلیا ہے۔ ابو قحافہ نے اپنے بیٹے کو لکھا کہ بیٹا! تم نے اپنے خط کی ایک سطر میں ہی تین غلطیاں کی ہیں۔ پہلی یہ کہ تم نے خود کو خلیفہ رسولؐ لکھا ہے حالانکہ رسول خدا ﷺ نے تم کو خلیفہ نہیں بنایا۔ دوسری یہ کہ لوگوں نے تم کو خلیفہ چنا ہے۔ یہ بات تمہاری پہلی بات کے برعکس ہے۔ تیسری یہ کہ تم کو بزرگ ہونے کی بنا پر خلیفہ چنا گیا ہے۔ اس صورت میں تمہارا باپ ہونے کے ناطے میں اس منصب کا زیادہ سزاوار ہوں۔ (پیغمبر شناختہ شدہ ج ۱، ص ۱۱۰ خلاصہ)

(۳) جوان آدمی اس بنا پر خلافت کے لائق نہیں ہوتا کہ وہ اپنی کم عمری اور ناتجربہ کاری کی بنا پر ڈرتا ہے۔ اس کا ذہن خام ہوتا ہے۔ وہ مال کا حریص ہوتا ہے۔ زمانے کے اتار چڑھاؤ سے ناآشنا ہوتا ہے اس لیے کہ اس کے پاس بزرگوں جیسا تجربہ اور فہم نہیں ہوتا۔ اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو اس کا کیا کیا جائے کہ خود اہلسنت کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام سب سے زیادہ عالم، سب سے زیادہ دلیر، سب سے زیادہ سخی اور سب سے زیادہ متقی تھے۔ گویا وہ بے عیب تھے۔ جب ایسا ہے تو پھر حضرت علی علیہ السلام کا جوان ہونا نہ صرف یہ کہ ان کے لیے ایک خامی تصور نہیں کی جاسکتی بلکہ اسے خلافت کے حوالے سے اولیت دی جانی چاہیے تھی۔ جوان ہونے کی وجہ سے آپ کی قوت و توانائی زیادہ تھی، آپ دوسروں کی نسبت زیادہ مستعدی سے امور خلافت انجام دے سکتے تھے یعنی وہ جملہ صفات جو حضرت علی علیہ السلام کا خاصہ ہیں بفرض محال اگر حضرت ابوبکرؓ میں ہوتیں تب بھی حضرت علی علیہ السلام کو ان پر مقدم کرنا ضروری تھا کیونکہ آپ جوان ہونے کی بنا پر زیادہ سرگرم رہتے اور زیادہ بہتر طور پر امت کی رہبری کرسکتے تھے۔

(۴) یہ کہنا کہ حضرت علی علیہ السلام نے غزوات میں بہت سارے کفار و مشرکین کو قتل کیا تھا اس لیے ان کے رشتے دار مسلمان حضرت علی علیہ السلام سے کینہ رکھتے تھے نہایت غیر منطقی بات ہے کیونکہ حضرت علی علیہ السلام نے کسی بھی شخص کو ذاتی دشمنی کی وجہ سے قتل نہیں کیا تھا بلکہ خدا کے دشمن کو خدا کے دین کی نصرت اور کلمہ توحید کی سر بلندی کے لیے قتل کیا تھا۔

(۵) سقیفہ میں مہاجرین نے انصار کے سامنے حضرت ابوبکرؓ کو چننے کے لیے یہ استدلال پیش کیا تھا کہ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرابت رکھتے ہیں اور ان کے نزدیکی صحابی ہیں لہٰذا اگر خلافت کا معیار قرابت اور صحابیت ہی تھا تو یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اس لحاظ سے تو حضرت علی علیہ السلام ہی کو منتخب کیا جانا چاہیے تھا کیونکہ وہ صحابی بھی ہیں اور ان کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سببی اور نسبی دونوں لحاظ سے قرابت حاصل ہے اور وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ کے حکم کے مطابق سب سے پہلے دعوت اسلام کو قبول کرنے والے بھی آپ ہی ہیں۔ خود حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: سُبْحَانَ اللّٰهِ اَتَكُوْنُ الْخِلَافَةُ بِالصَّحَابَةِ وَلَا تَكُوْنُ بِالصَّحَابَةِ وَالْقَرَابَةِ سجان اللہ! خلافت کو اصحاب میں ہونا چاہیے لیکن کیا اس کے لیے نہیں جو صحابی بھی ہو اور قرابت دار بھی۔ اس کے بعد آپ نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا تھا:

وَاِنْ كُنْتَ فِي الْقُرْبٰى حَجَجْتَ خَصِيْمَهُمْ فَغَيْرُكَ اَوْلٰى بِالنَّبِيِّ وَ اَقْرَبُ

اگر تم نبی کی قرابت کو دلیل خلافت جانتے ہو تو میں تم سے زیادہ نبی سے قرابت رکھتا ہوں۔

# (۸) اہل سنت سے چند باتیں

ہم برادران اہلسنت سے بڑے ادب سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے ذہنوں سے ہر طرح کے تعصب کو جھٹک کر ہمارے پیش کردہ دلائل پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کریں اور خود فیصلہ کریں کہ خلافت کا اصلی حقدار کون ہے؟ ارشاد اقدس الٰہی ہے: میرے ان بندوں کو بشارت سنا دو جو باتوں کو سنتے ہیں اور ان میں سے اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی اور یہی عقل والے ہیں۔ (سورۂ زمر: آیت ۱۷ - ۱۸)

اگر ہماری باتیں ان کے دلوں میں اتر رہی ہیں اور ان کے ذہنوں کو اپنی طرف منعطف کر رہی ہیں تو انھیں ان کو بغیر تعصب کے قبول کرنا چاہیے۔ ہم پورا یقین رکھتے ہیں کہ اگر ہمارے اہلسنت بھائی تعصب سے اوپر اٹھ کر ہماری بیان کردہ باتوں پر غور کریں گے تو وہ سب اس کتاب کے مندرجات سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے افکار و عقائد پر نظر ثانی کریں گے۔

ان مطالب کو قلمبند کرنے کا مقصد سنی شیعہ اختلاف کو ہوا دینا یا مسلمانوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنا نہیں بلکہ اس کا اصل مقصد حقیقت کو واضح کر کے راہ حق کی طرف اپنے پیارے بھائیوں کی رہنمائی کرنا ہے کیونکہ بہر حال مسلمانوں کے دونوں فرقوں پر لازم ہے کہ وہ غیر مسلم اقوام کے مقابلے میں اپنے اتحاد کو باقی رکھیں اور اسے مضبوط سے مضبوط تر بنائیں اس لیے کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کی ایک اہم وصیت کلمۃ التوحید و توحید الکلمۃ ہے یعنی مصر سے کاشغر تک سب مسلمان ایک تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ہی لڑی میں پرو جائیں۔

برادران عزیز!

اس میں شک نہیں کہ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے عقائد کا احترام کرے لیکن ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ بعض اوقات کچھ عقائد ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی کوئی عملی اور منطقی دلیل اور بنیاد نہیں

ہوتی اور بچپن سے ہی تربیت اور معاشرتی ماحول کی بنا پر اس کے دماغ میں یہ عقائد راسخ ہوجاتے ہیں۔ اس طرح کے افکار کا تبدیل کیا جانا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ کہیں ان کا تسلسل انسان کی فطرت ثانیہ نہ بن جائے۔ ایسے عقائد کو تبدیل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ اس کے لیے مختلف عقائد کی تہہ تک پہنچنے اور حقیقت تک رسائی کے لیے مسلسل جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان ہر قسم کے تعصب سے دور رہے کیونکہ تعصب انسان کو اصل حقائق تک پہنچنے نہیں دیتے۔[۱]

زیر نظر کتاب میں خلافت و امامت کے حوالے سے اتنی بحث و تحقیق کی گئی ہے کہ اس کے مطالعے سے اکتاہٹ نہ ہو۔ تمام مطالب کے حوالے اہلسنت کی معتبر کتب سے پیش کئے گئے ہیں اور مذہب تشیع کے منابع و ماخذ سے کچھ بھی نقل نہیں کیا گیا۔ اب ہم آپ سے بغض و محبت سے ہٹ کر یہ پوچھتے ہیں کہ اگر آپ کے عقیدے کے مطابق خلافت کا معاملہ شوریٰ اور اجماع پر ہی موقوف تھا تو پھر حضرت عمرؓ کو مسلمانوں کے اجماع سے کیوں خلیفہ نہیں بنایا گیا؟ کیوں ان کو محض حضرت ابوبکرؓ کی وصیت پر خلیفہ بنا دیا گیا؟

آپ خود کہتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے کسی کو خلیفہ نہیں بنایا تھا اور حضرت ابوبکرؓ کو مسلمانوں کے اجماع کے ذریعے خلیفہ چنا گیا تھا لہٰذا کیا یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ حضرت ابوبکرؓ نے رسول خدا ﷺ کی پیروی کیوں نہیں کی اور کیوں خلافت کو مسلمانوں کے انتخاب پر نہیں چھوڑ دیا؟

حضرت عمرؓ کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے طریقہ کار نے ایک نئی شکل اختیار کرلی اور خلافت کو شوریٰ میں ہی محدود کردیا گیا اور اس کی مخالفت کرنے والوں کو قتل کردینے کا حکم جاری کیا گیا حالانکہ اگر خلافت کا معاملہ اجماع اور شوریٰ ہی کے ذریعے حل کرنا ضروری تھا تو پھر تمام مسلمانوں کی اجماع میں شرکت کی بجائے چھ رکنی کمیٹی کی تشکیل کا مطلب کیا تھا؟ علاوہ ازیں ہر شوریٰ میں اکثریت کی آراء کو معتبر جانا جاتا ہے اور اقلیت کو بھی اختلاف کا حق ہوتا ہے لیکن یہاں اقلیت اور مخالفین کو قتل کردینے کا حکم کس لیے تھا؟

---

۱۔ جن اہل سنت علماء نے حال میں تحقیق کے بعد شیعہ مذہب قبول کیا ہے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

(۱) ڈاکٹر محمد ساوی تیجانی (تیونس) — (۲) جناب ادریس الحسینی (مراکش)
(۳) جناب صالح الوردانی (مصر) — (۴) جناب محمد عبدالحفیظ (مصر)
(۵) ڈاکٹر احمد حسین یعقوب (اردن) — (۶) جناب یاسین معیوف البدری (شام)
(۷) جناب شیخ عبداللہ ناصر (کینیا) — (۸) جناب سید عبدالمنعم محمد حسن (سوڈان)
(۹) جناب شیخ معتصم سید احمد (سوڈان) — (۱۰) جناب عصام العماد

گزشتہ بحث میں یہ ثابت کیا جاچکا ہے کہ امامت ایک خدائی عہدہ ہے اور امام کو اجماع اور شوریٰ کے ذریعے نہیں چنا جاسکتا۔ بالفرض اگر اس معاملے کو اجماع پر ہی چھوڑ دیا جائے تب بھی حقیقی اجماع کا اطلاق حضرت علی علیہ السلام کی خلافت پر صادق آتا ہے جہاں عوام اپنی مرضی سے حضرت علی علیہ السلام کے گھر پر جمع ہوکر اصرار کرتے ہیں کہ وہ صرف ان کی بیعت کریں گے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا تھا: اس وقت مجھے لوگوں کے ہجوم نے دہشت زدہ کردیا جو میری جانب بجو کے ایال کی طرح ہر طرف سے لگاتار بڑھ رہا تھا یہاں تک کہ عالم یہ ہوا کہ حسنؑ و حسینؑ کچلے جا رہے تھے اور میری ردا کے دونوں کنارے پھٹ گئے تھے اور وہ سب میرے گرد بکریوں کے گلے کی طرح گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی رحلت سے قبل قلم اور کاغذ طلب فرمایا تھا تاکہ ایک تحریر لکھ دیں لیکن اس وقت حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ ہمیں کسی تحریر کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔

اس ضمن میں ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر وصیت ضروری نہ تھی اور صرف کتاب خدا کافی تھی تو پھر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے کتاب خدا کے ہوتے ہوئے اپنے اپنے انتقال کے وقت وصیت کیوں کی تھی؟ قرآن کے معنی اور اس کا علم حضرت علی علیہ السلام سے زیادہ جاننے والا کوئی اور نہ تھا اس لیے کہ خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: اَنَامَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا فَمَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْیَاْتِ الْبَابَ میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔ جسے علم سیکھنا ہو وہ دروازے پر آئے۔

(سیوطی، جامع الصغیر ج ۱، ص ۳۷۴۔ مناقب ابن مغازلی ص ۸۳۔ فصول المہمہ)

ہم اہلسنت بھائیوں سے یہ بھی پوچھنا چاہیں گے کہ اگر آپ امامت و خلافت کو من جانب اللہ نہیں مانتے اور جانشین رسولؐ کا معصوم ہونا بھی ضروری نہیں سمجھتے تو پھر اصحاب ثلاثہ کو دیگر صحابہ پر فوقیت کیوں دیتے ہیں؟ اور آج تک آپ اسی بات کے دفاع میں کوشاں ہیں حالانکہ بعض علمائے اہلسنت کو علم اور دیگر معلومات عامہ کے حوالے سے خلفاء پر فوقیت دی جاسکتی ہے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ فخر الدین رازی، زمخشری، ابن ابی الحدید اور ایسے ہی دیگر علماء و مفسرین کو حضرت عثمانؓ اور دیگر خلفاء کے مقابلے میں دینی امور کی زیادہ معلومات تھیں جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ امام اور جانشین رسولؐ کو تین لحاظ یعنی حکومت، اسلامی معارف کے بیان اور معنوی حیات کی تربیت کے لحاظ سے ذمے داری نبھانا ہوتی ہے اور اگر کسی کو خدا کی تائید حاصل نہ ہو اور وہ معصوم نہ ہو تو وہ اس طرح کی ذمے داری کو ہرگز نہیں نبھا سکتا بلکہ معارف و احکام کے بیان اور روحانی تربیت کو اگر نظرانداز بھی

کر دیا جائے تب بھی وہ محض ظاہری حکومت سے متعلق امور کو نمٹانے کی صلاحیت سے بھی قاصر رہے گا بالکل ویسے ہی جیسے خلفائے ثلاثہ اس وقت تک مکمل طور پر امور مملکت کو انجام نہ دے سکے جب تک وہ حلال مشکلات حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے دامن سے متمسک نہ ہوئے یعنی جب کبھی کوئی مشکل معاملہ درپیش ہوا تو حضرت علی علیہ السلام کی صحیح رائے سے ہی ان کو استفادہ کرنا پڑا اور علماء و مورخین اہلسنت کے مطابق حضرت عمرؓ نے کئی بار کہا تھا لَوْ لَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ (یعنی اگر مشکل کو حل کرنے کے لیے علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا) اسی طرح ایران اور روم کے خلاف لڑی جانے والی لڑائیوں کے حوالے سے بھی جب انھیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تو حضرت علی علیہ السلام کے ذریعے ہی انھیں صحیح اور منطقی حل میسر ہوئے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ بھلا جو حق کا راستا دکھائے وہ اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ کہ جب تک کوئی اسے راستا نہ بتائے راستا پائے۔ تو تم کو کیا ہوا ہے؟ تم کیسا انصاف کرتے ہو؟ (سورۂ یونس: آیت ۳۵)

حیرت کی بات یہ ہے کہ ابن ابی الحدید اپنی تمام تر تحقیق کے باوجود شرح نہج البلاغہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ قَدَّمَ الْمَفْضُوْلَ عَلَى الْاَفْضَلِ حمد ہے اس اللہ کی جس نے مفضول کو افضل پر فوقیت دی حالانکہ مذکورہ بالا آیت خود اس بات کا جواب ہے کہ اللہ ہدایت کرنے والے رہنما یعنی افضل کو برتری دیتا ہے نہ کہ مفضول کو اور ابن ابی الحدید کی یہ بات خود ذات احدیت کی بارگاہ میں جسارت کے مترادف ہے اس لیے کہ اللہ فاضل پر مفضول کو فوقیت نہیں دیتا چہ جائیکہ افضل پر مفضول کو فوقیت دی جائے اور یہ حکمت الٰہی کے منافی ہے۔ یہ بات تو عام لوگوں کے نزدیک بھی قرین عقل نہیں۔ یہ صرف اہل سقیفہ تھے جنھوں نے اس طرح کا فیصلہ کیا اور مفضول کو افضل پر فوقیت دی۔

برادران اہلسنت محسوس کر رہے ہوں گے کہ ہمارے تمام دلائل عقل و منطق کی بنیادوں پر استوار ہیں۔ نیز ہم نے اس کتاب میں جن کتابوں کے حوالے دیے ہیں وہ بھی علمائے اہلسنت کی معتبر کتابیں ہیں حالانکہ کتب امامیہ اس حوالے سے نہایت مستحکم دلائل سے بھری ہوئی ہیں لیکن ہم نے ہر قسم کے بہانے کو ختم کرنے کے لیے ان کو نقل کرنے سے گریز کیا ہے البتہ اصل حقیقت سے تمام محققین بخوبی واقف ہیں۔ وہ یہ کہ آج بھی اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کا تحفظ ہر مسلمان کی اولین ترجیح ہونی چاہیے اسی لیے حضرت علی علیہ السلام خلفائے ثلاثہ کے ساتھ اسلام کے مفاد میں تعاون کرتے رہے۔

اگر چند افراد کے سقیفہ میں اکٹھا ہونے سے خلافت کا معاملہ طے ہوا ہے تو یہ جاننا بھی ضروری

ہے کہ حقیقی خلافت الٰہیہ، ولایت خداوندی ہے جسے خود خدا نے حضرت علی علیہ السلام کے لیے مخصوص فرمایا تھا۔ آپ تمام مسلمانوں کے نزدیک سب سے زیادہ شجاع، عادل، سخی اور عالم تھے اور اصحاب میں سب سے زیادہ متقی تھے۔ بقول شاعر

هُوَ فِي الْكُلِّ اِمَامُ الْكُلِّ      مَنْ اَبُوبَكْرٍ ، وَمَنْ كَانَ عُمَرُ ؟

علیؑ تو مولائے کائنات ہیں۔ ابوبکر کون ہیں اور عمر کون ہیں؟

پس تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ قرآن وعترت سے متعلق رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت اِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِي...[1] (مستدرک صحیحین ج ۳، ص ۱۰۹۔ مناقب ابن مغازلی ص ۲۳۴) کو عملی جامہ پہنائیں اور تفرقہ سے بچیں۔ اور یاد رکھیں کہ صراط مستقیم یعنی شاہراہ ولایت پر گامزن ہو کر ہی سعادت دارین حاصل کی جاسکتی ہے۔ ارشاد پروردگار ہے وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ اور یہی میرا سیدھا راستا ہے۔ تو تم اسی پر چلنا اور جدا جدا راستوں پر نہ چلنا ورنہ خدا کے راستے سے الگ ہو جاؤ گے۔ ان باتوں کا خدا تمھیں حکم دیتا ہے تاکہ تم پرہیزگار بنو۔ (سورۂ انعام : آیت ۱۵۳)

راقم اپنے اہلسنت بھائیوں سے یہی کہہ سکتا ہے کہ میں نے تبلیغ کی جو شرط تھی اسے نبھایا ہے چاہے آپ اس سے نصیحت حاصل کریں یا یہ بات آپ کو ناگوار گزرے۔

---

۱۔ صحیح ترمذی ج ۵، ص ۳۲۸، حدیث ۳۸۷۴، مطبوعہ دار الفکر بیروت۔
صحیح مسلم ج ۳، ص ۶۳۵، حدیث ۶۲۲۵، مطبوعہ مکتب رحمانیہ، لاہور۔
ارجح المطالب، شیخ عبید اللہ امرتسری حنفی ص ۳۳۶، مطبوعہ لاہور۔ (رضوانی)

# حضرت علی علیہ السلام کی اولاد اور ان کے اصحاب

## (۱) حضرت علی علیہ السلام کی اولاد

حضرت علی علیہ السلام کی اولاد کی تعداد کے بارے میں مؤرخین کا اختلاف ہے۔ ان کے بیٹوں کی تعداد ۱۸ اور بیٹیوں کی تعداد بھی ۱۸ بیان ہوئی ہے۔ شیخ مفید اور علامہ طبرسی نے ان کی تعداد ۲۷ لکھی ہے۔ ہم ذیل میں ان کا اجمالی تذکرہ کر رہے ہیں:

(۱) امام حسن علیہ السلام: آپ حضرت علی علیہ السلام کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ آپ ۱۵ رمضان ۳ھ میں مدینہ میں متولد ہوئے اور ۲۸ صفر ۵۰ھ میں مدینہ میں شہید ہوئے۔

(۲) امام حسین علیہ السلام: آپ حضرت علی علیہ السلام کے دوسرے فرزند تھے۔ آپ ۴ شعبان ۴ھ میں مدینہ میں متولد ہوئے اور ۱۰ محرم ۶۰ھ میں کربلا میں شہید ہوئے۔

(۳) جناب زینب کبریٰ؏: آپ کی ولادت باسعادت ۸ھ میں ہوئی اور آپ اپنے ابن عم عبد اللہ بن جعفر طیار سے بیاہی گئیں۔

(۴) جناب زینب صغریٰ؏: آپ کی کنیت ام کلثوم تھی۔

ان چاروں کی والدہ حضرت فاطمہ زہرا؏ تھیں۔ جناب فاطمہ زہرا؏ حضرت علیؑ کی پہلی زوجہ تھیں۔ جب تک وہ بقید حیات رہیں حضرت نے دوسری شادی نہیں کی۔

(۵) محمد بن حنفیہ: آپ کی کنیت ابو القاسم تھی۔ آپ خولہ بنت جعفر بن قیس حنفیہ کے فرزند تھے۔

(۶و۷) عمر اور رقیہ: یہ جڑواں بھائی بہن تھے۔ ان کی والدہ اُمّ حبیب بنت ربیعہ تھیں۔

(۸ تا ۱۱) ابو الفضل العباسؑ، جعفرؓ، عثمانؓ اور عبد اللہؓ۔

یہ چاروں بھائی کربلا میں شہید ہوئے۔ ان کی والدہ ماجدہ جناب اُمّ البنین بنت حزام بن خالد کلابی تھیں۔ واقعہ کربلا کے بعد جناب امّ البنین نے اپنے فرزندوں کا مرثیہ اس طرح پڑھا تھا:

یَا مَنْ رَاٰی الْعَبَّاسَ کَرَّ عَلٰی جَمَاهِیرِ النَّقَدِ وَ وَرَاهُ مِنْ اَبْنَاءِ حَیْدَرَ کُلُّ لَیْثٍ ذِیْ لَبَدٍ
اُنْبِئْتُ اَنَّ ابْنِیْ اُصِیْبَ بِرَاْسِهٖ مَقْطُوْعُ یَدٍ وَیْلِیْ عَلٰی شِبْلِیْ اَمَالَ بِرَاْسِهٖ ضَرْبُ الْعَمَدِ
لَوْ کَانَ سَیْفُكَ فِیْ یَدَیْكَ لَمَادَنٰی مِنْهُ اَحَدٌ

اے چشم ناظر جو کربلا کے مناظر کو دیکھ رہی تھی اُس وقت کا حال تو بتا جب میرے عباس دلاورؑ نے اور اُس سے پہلے میرے (تین) شیر دل بیٹوں نے کم ظرف لشکر پر حملہ کیا تھا۔ کیا لوگوں کی یہ بات درست ہے کہ جب میرے بیٹے کے ہاتھ سلامت نہیں رہے تو ایک جفا کار نے اُس کے سر پر آہنی گرز مارا تھا۔ اے میرے لال عباسؑ! میں جانتی ہوں کہ اگر تیرے ہاتھ سلامت ہوتے تو نابکار دشمن تیرے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ ناپاک دشمن کو یہ مجال اس لیے ہوئی کہ تیرے ہاتھ کٹ گئے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے بھائی عقیل کے مشورے سے جناب امّ البنین سے شادی کی تھی کیونکہ جناب عقیل انساب عرب سے اچھی طرح واقف تھے۔ حضرت علی علیہ السلام نے ان سے فرمایا تھا: میں ایک ایسی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں جس سے میرا ایک بہادر بیٹا پیدا ہو۔ حضرت علی علیہ السلام کی مراد اس بیٹے سے حضرت عباس علیہ السلام تھے جنھوں نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کربلا میں امام حسین علیہ السلام کے ساتھ جام شہادت نوش فرمایا۔

(۱۲) یحییٰ: آپ کی والدہ جناب اسماء بنت عمیس تھیں۔ یحییٰ حضرت علی علیہ السلام کی شہادت سے پہلے ہی فوت ہوگئے تھے۔ اسماء حضرت جعفر طیارؓ کی زوجہ تھیں۔ جنگ موتہ میں حضرت جعفرؓ کی شہادت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے ان سے شادی کی تھی۔ ان کے بطن سے جناب محمد بن ابی بکرؓ پیدا ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد جناب اسماء حضرت علی علیہ السلام کے حبالۂ نکاح میں آئی تھیں۔

(۱۳ و ۱۴) ام الحسن اور رملہ: ان کی والدہ امّ سعید بنت عروہ بن مسعود ثقفی تھیں۔

(۱۵ و ۱۶) محمد اصغر (جن کی کنیت ابوبکر تھی) اور عبد اللہ: ان دونوں کی والدہ لیلیٰ بنت مسعود دارمیہ تھیں۔ یہ دونوں بھائی کربلا میں شہید ہوئے تھے۔

(۱۷ تا ۲۷) حضرت علی علیہ السلام کی دیگر بیٹیوں کے نام یہ تھے۔ نفیسہ، زینب صغریٰ، رقیہ صغریٰ، اُمّ ہانی، امّ کرام، امّ سلمہ، میمونہ، جمانہ، امامہ، خدیجہ اور فاطمہ۔

حضرت علی علیہ السلام کی نسل جن بیٹوں سے چلی ان کے نام یہ ہیں:

(۱) امام حسن علیہ السلام (۲) امام حسین علیہ السلام (۳) محمد بن حنفیہؓ (۴) حضرت عباس علیہ السلام (۵) عمر علیہ السلام

(ارشاد مفید ج ۱، باب ۴۔ اعلام الوریٰ)

# (۲) حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب

حضرت علی علیہ السلام کے کچھ اصحاب آپ کے بڑے قریب تھے۔ وہ آپ کے فرماں بردار اور جاں نثار تھے۔ وہ آپ کی محبت اور اطاعت میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ خود امام عالی مقام بھی ان پر خاص لطف فرماتے تھے۔ ذیل میں ہم ان میں سے بعض اصحاب کا اجمالی تذکرہ کر رہے ہیں۔

(۱) مالک اشتر نخعی : اس جلیل القدر صحابی کی تعریف و توصیف چند سطروں میں نہیں کی جاسکتی اس لیے ہم خود حضرت علی علیہ السلام کی زبان مبارک سے بیان کی گئی ان کی تعریف پر اکتفاء کرتے ہیں۔ آپ نے اہل مصر کے نام اپنے مکتوب میں لکھا تھا :

میں نے تمہاری طرف بندگان خدا میں سے ایک بندہ بھیجا ہے جو خطرے کے دنوں میں سوتا نہیں اور خوف کی گھڑیوں میں دشمن سے ہراساں نہیں ہوتا اور فاسق و فاجر لوگوں کے لیے جلائے جانے والی آگ ہے اور وہ مالک بن حارث ہے جس کا تعلق قبیلہ مذحج سے ہے۔ پس ان کی بات کو سنو اور ان کے ہر اس حکم کو جو حق کے مطابق ہو مانو کیونکہ وہ سَیْفُ اللّٰہِ الْمَسْلُوْل یعنی اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں جو نہ کبھی کند ہوتی ہے اور نہ اس کا وار کبھی خالی جاتا ہے۔ (نہج البلاغہ، مکتوب ۳۸)

جی ہاں ! مالک اشتر وہ سَیْفُ اللّٰہِ الْمَسْلُوْل تھے کہ ان کی شمشیر شرربار منافقین کے خرمن کو جلا کر راکھ کر ڈالتی تھی۔ حضرت علی علیہ السلام کی نگاہ میں ان کا مقام کتنا بلند تھا اس کا اندازہ اس جملے سے لگایا جاسکتا ہے کہ لَقَدْ کَانَ لِیْ کَمَا کُنْتُ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ یعنی مالک میرے لیے ویسے ہی تھا جیسے میں رسول اللہؐ کے لیے تھا۔ اگر حضرت علی علیہ السلام کے اس جملے پر توجہ دی جائے تو مالک اشتر کا مقام واضح ہوسکتا ہے۔

ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں لکھتے ہیں :

''اگر کوئی خدا کی قسم کھا کر کہے کہ خدا نے عرب و عجم میں مالک اشتر جیسا کوئی دوسرا خلق نہیں

کیا سوائے حضرت علیؑ کے جو مالک کے استاد تھے تو میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایسی قسم کھانے والے نے کوئی گناہ کیا۔ مالک اشتر وہ بطل جلیل تھے جن کی زندگی اہل شام کے لیے موت اور جن کی موت اہل عراق کے لیے پریشانی کا سبب بنی۔''

جنگ صفین میں مالک اشترؒ نے بہادری کے وہ جوہر دکھائے جو ناقابل فراموش ہیں۔ خود معاویہ انھیں حضرت علی علیہ السلام کے دست راست کے نام سے پکارتا تھا۔

جنگ صفین سے واپسی کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر کو مصر کا گورنر بنا کر بھیجا تھا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ جب انھیں قلزم کے مقام پر زہر دے کر شہید کر دیا گیا تو ان کی شہادت کی خبر سن کر حضرت علی علیہ السلام اتنے زیادہ محزون ہوئے کہ آپ نے گریہ کرتے ہوئے فرمایا: اللہ مالک پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ اگر وہ پہاڑ تھا تو بھی ایک عظیم پہاڑ اور اگر وہ پتھر تھا تو بھی نہایت سخت۔ وہ اپنی موت سے اہل شام کو خوش اور اہل عراق کو پریشان کر گیا۔ افسوس! مالک کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ پُر نہیں ہو سکتا۔

(۲) اویس قرنی: آپ بے حد عابد و عارف انسان تھے۔ آپ آٹھ مشہور زہاد میں سے ایک تھے۔ آپ یمن میں اونٹ چرا کر اپنی والدہ کے اخراجات پورے کرتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے اپنی والدہ سے مدینہ جا کر زیارت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شرف حاصل کرنے کی اجازت طلب کی تو ان کی والدہ نے کہا: چلے جاؤ مگر وہاں آدھے دن سے زیادہ مت ٹھہرنا۔

اویس قرنی مدینہ پہنچ کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں موجود نہیں تھے۔ چند گھنٹے رکنے کے بعد اویس قرنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کئے بغیر واپس یمن چلے گئے۔ جب سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور بیت الشرف میں داخل ہوئے تو آپ نے فرمایا: یہ کیسا نور ہے جو میں یہاں دیکھ رہا ہوں؟ بتایا گیا کہ یمن سے اویس نام کا اونٹ چرانے والا ایک شخص آیا تھا۔ وہ چند گھنٹے تک آپ کا انتظار کرنے کے بعد واپس چلا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اور اس نور کو ہمارے گھر میں ہدیہ چھوڑ گیا۔ (ناسخ التواریخ، کتاب صفین ص ۱۹۵)

شہید ثالثؒ مجالس المومنین میں لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اویس قرنی کو ''نفس الرحمٰن'' نام دیا اور فرمایا: مجھے یمن کی طرف سے اللہ کی خوشبو آتی محسوس ہو رہی ہے۔ سلمان فارسیؓ نے پوچھا: یا رسول اللہؐ! یہ شخص کون ہے؟ آپ نے فرمایا

إِنَّ بِالْيَمَنِ شَخْصًا يُقَالُ لَهُ أُوَيْسُ الْقَرَنِيُّ يُحْشَرُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاحِدًا يَدْخُلُ فِي شَفَاعَتِهِ مِثْلُ رَبِيعَةَ وَمُضَرٍ، أَلَا مَنْ رَآهُ مِنْكُمْ يُقْرِءُهُ مِنِّي السَّلَامَ یمن میں ایک شخص ہے جس کا نام اویس قرنی ہے۔ یہ شخص قیامت کے دن قبیلہ ربیعہ اور مضر کے افراد کے برابر لوگوں کی شفاعت کرے گا۔ تم میں سے جو بھی اس سے ملاقات کرے اسے میرا اسلام پہنچائے۔ (منتخب التواریخ ص ۱۵۴)

اویس قرنی جنگ صفین میں حضرت علی ؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت کرنے کے بعد آپ کی رکاب میں لڑے اور اسی جنگ میں شہید ہوئے۔[1]

(۳) محمد بن ابی بکر: حضرت علی ؑ کے خاص صحابی بلکہ آپ کے لیے بیٹوں جیسے تھے۔ ان کے متعلق حضرت علی ؑ نے فرمایا تھا: وہ میرا بیٹا تھا مگر ابوبکرؓ کی صلب سے۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں حضرت علی ؑ کے ہمرکاب رہے۔ جنگ صفین کے بعد حضرت علی ؑ کی طرف سے مصر کے گورنر مقرر کئے گئے تھے۔ معاویہ کے حکم پر عمرو بن عاص نے مکر و فریب کے ذریعے اہل مصر کو ان کے خلاف اکسایا اور انھیں قتل کرنے کے بعد ان کے جسم کو مردہ گدھے کی کھال میں رکھ کر جلایا گیا۔ حضرت علی ؑ کو جب ان کی شہادت کی خبر ملی تو آپ بہت غمگین ہوئے۔ یہی حال ان کی والدہ اسماء بنت عمیس کا تھا جو اس وقت حضرت علی ؑ کی زوجہ تھیں۔ محمد بن ابی بکر شہادت کے وقت ۲۸ سال کے تھے۔ آپ کے پسماندگان میں آپ کا ایک سات سالہ لڑکا بھی تھا۔

محمد بن ابی بکر نے حضرت علی ؑ کی مدح میں اشعار کہے ہیں:

يَا أَبَانَا قَدْ وَجَدْنَا مَا صَلَحَ — خَابَ مَنْ أَنْتَ أَبُوهُ وَ افْتَضَحَ

إِنَّمَا أَخْرَجَنِيْ مِنْكَ الَّذِيْ — أَخْرَجَ الدُّرَّ مِنَ الْمَاءِ الْمِلْحِ

أَنَسِيْتَ الْعَهْدَ فِيْ خُمٍّ وَمَا — قَالَهُ الْمَبْعُوْثُ فِيْهِ وَ شَرَحَ

فِيْكَ وَصَّى أَحْمَدُ فِيْ يَوْمِهَا — أَمْ لِمَنْ أَبْوَابَ خَيْبَرَ قَدْ فَتَحَ

---

۱۔ علامہ سید ہاشم معروف حسنی لبنانی نے اپنی کتاب تصوف اور تشیع کا فرق، مطبوعہ مجمع علمی اسلامی کے صفحہ ۲۱۴ پر لکھا ہے: جب ائمہ اہلبیتؑ نے صوفیا کی زبردست مخالفت کی اور ان کے نظریات کا ابطال کیا تو صوفی مشائخ نے افترا بازی کا سہارا لیا اور رسولؐ و اہلبیت رسولؐ سے ایسی روایات منسوب کردیں جن میں مقامات و احوال و طریقت کی باتیں کہی گئی تھیں۔ ان لوگوں نے صوفیا کی فہرست میں ایسے لوگوں کے نام بھی شامل کیے جن کا تاریخ میں کوئی وجود ہی نہ تھا۔ ان ناموں میں سے ایک نام اویس قرنی کا ہے۔ (رضوانی)

مَا تَرٰى عُذْرَكَ فِي الْحَشْرِ غَدًا　　يَا لَكَ الْوَيْلُ اِذَا الْحَقُّ اتَّضَحَ
وَ عَلَيْكَ الْخِزْیُ مِنْ رَبِّ السَّمَآءِ　　كُلَّمَا نَاحَ حَمَامٌ اَوْ صَدَحَ
يَا بَنِي الزَّهْرَاءِ اَنْتُمْ عُدَّتِيْ　　وَبِكُمْ فِي الْحَشْرِ مِيْزَانِيْ رَجَحَ

اے میرے بابا! جس راہ میں بھلائی تھی میں نے اسے پالیا ہے۔ زیاں کار اور رسوا ہے وہ آدمی جس کا آپ جیسا باپ ہو۔ مجھے بھی اس خدا نے آپ کی صلب سے پیدا کیا جو کھارے پانی سے موتی نکالتا ہے۔ کیا آپ اتنی جلدی غدیر خم میں کئے گئے اعلان رسولؐ کو بھول گئے۔ غدیر کے دن جناب احمد مختارؐ نے آپ کے لیے وصیت کی تھی یا اس کے لیے جو در خیبر کو اکھاڑنے والا ہے۔ کل حشر کے دن آپ کیا عذر پیش کریں گے کہ آپ نے خلافت کیوں غصب کی تھی؟ جبکہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حق آپ پر واضح ہو چکا تھا۔ آپ پر آسمانوں کے پروردگار کی طرف سے رسوائی ہو۔ جب تک پرندوں کی چہچہاہٹ باقی رہے۔ اے اولاد فاطمہؑ! آپ ہی میری پناہ گاہ ہیں اور روز حشر آپ کی ولایت کے وسیلے سے میرے نیک اعمال کا پلڑا بھاری ہوگا۔ (تحفہ ناصری)

(۴) میثم تمار: آپ بھی حضرت علی علیہ السلام کے خاص اصحاب میں سے تھے۔ آپ نے حضرت علی علیہ السلام سے اپنی محبت میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا یہاں تک کہ آپ کی محبت کے جرم میں عبید اللہ بن زیاد نے آپ کو نہایت سفاکانہ طریقے سے شہید کیا۔

حضرت علی علیہ السلام جناب میثم تمار کو ابن زیاد کے ہاتھوں شہید ہونے کی خبر دے چکے تھے بلکہ آپ نے ان کو کھجور کا وہ درخت بھی دکھایا تھا جو عمرو بن حریث کے گھر کے کنارے پر تھا اور جس پر میثم کو سولی پر لٹکایا جانا تھا۔ میثم جب بھی اس درخت کے قریب سے گزرتے تو اس کو پانی دیتے اور اس کے نیچے نماز پڑھتے اور عمرو بن حریث سے کہتے کہ میں بھی تمہارا ہمسایہ بنوں گا لہٰذا حق ہمسایہ بہترین انداز میں ادا کرنا۔ عمرو آپ کی باتوں سے یہی خیال کرتا رہا کہ شاید میثم بھی اس کے گھر کے نزدیک مکان خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن جب میثم کو اس درخت پر سولی دی گئی اس وقت عمرو کی سمجھ میں آیا کہ آپ کی باتوں کا مقصد کیا تھا۔ (ارشاد مفید)

(۵) کمیل ابن زیاد: آپ حضرت علی علیہ السلام کے ممتاز صحابی اور تابعی تھے۔ عارفین نے انھیں ''صاحب سرّ امیر المومنین'' کا نام دیا ہے۔ خود انھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے عرض کی تھی: اَلَسْتُ صَاحِبَ سِرِّكَ؟ کیا میں آپ کا راز دار نہیں ہوں؟

مشہور دعائے کمیل حضرت علی علیہ السلام نے آپ ہی کو تعلیم دی تھی۔
جب حجاج بن یوسف کوفہ کا والی بنا تو اس نے جناب کمیل کو بلایا۔ آپ کو معلوم تھا کہ وہ آپ کو قتل کرے گا اس لیے آپ روپوش ہوگئے۔ اس وجہ سے حجاج نے کمیل کے قبیلے والوں کا وظیفہ بند کردیا۔ جب کمیل کو یہ خبر ملی تو وہ کہنے لگے کہ میں تو بوڑھا ہوچکا ہوں چنانچہ مجھے اپنے قبیلے کی روزی کی بندش کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ یہ سوچ کر آپ حجاج کے سامنے حاضر ہوگئے۔ حجاج نے کہا: میں تمہاری تلاش میں تھا تاکہ تمھیں کیفر کردار تک پہنچاؤں۔ جناب کمیل نے کہا: جو تیرا جی چاہے کر کیونکہ میری موت کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ عنقریب تیری اور میری بازگشت خدا کی طرف ہوگی۔ میرے مولا حضرت علی علیہ السلام مجھے خبر دے چکے ہیں کہ تو میرا قاتل ہے۔ حجاج کہنے لگا: تمہارا شمار قاتلان عثمان میں ہوتا ہے اس لیے تمھیں موت کی سزا دی جاتی ہے۔ پھر اس کے حکم پر جناب کمیل کا سر قلم کردیا گیا۔ شہادت کے وقت آپ کی عمر ۹۰ برس تھی۔

(۶) عبد اللہ ابن عباس: آپ ابن عباس کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ حضرت علی علیہ السلام کے چچا زاد اور خاص صحابی تھے۔ ابن عباس کو علم انساب، علم فقہ اور علم تفسیر میں مہارت حاصل تھی اور آپ کو یہ افتخار حضرت علی علیہ السلام کی شاگردی کے نتیجے میں حاصل ہوا تھا۔ ابن عباس نہایت موقع شناس، بابصیرت اور ممتاز اکابرین میں سے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حکمین کے انتخاب کے لیے صفین میں حضرت علی علیہ السلام نے آپ ہی کو حکم مقرر فرمایا تھا لیکن اہل لشکر نے اسے قبول نہ کیا۔ ابن عباس حضرت علی علیہ السلام کے سچے محب اور حقیقی شیعہ تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کا ابن عباس کو شدید صدمہ ہوا اور اس سانحہ پر رونے کی وجہ سے آپ نابینا ہوگئے اور اسی حالت میں دنیا سے رحلت فرمائی۔

(۷) قنبر: آپ حضرت علی علیہ السلام کے غلام تھے۔ حجاج نے جب انھیں گرفتار کرکے کہا کہ کیا تم علیؑ کے بندے ہو تو قنبر نے کہا: میں خدا کا بندہ ہوں مگر علیؑ میرے ولی نعمت تھے۔ حجاج نے کہا: علیؑ کے دین سے بیزاری کا اعلان کرو۔ قنبر نے کہا: تم پہلے مجھے ایسا دین بتاؤ جو علیؑ کے دین سے بہتر ہو۔ حجاج کہنے لگا: اگر تم "دین علیؑ" سے بیزاری کا اظہار نہیں کرتے تو پھر خود ہی بتاؤ کہ تمھیں کس طرح قتل کروں؟ قنبر نے کہا: اس وقت اختیار تیرے ہاتھ میں ہے جس طرح چاہے قتل کر۔ میں بھی کل (بروز قیامت) تجھے اسی طرح قتل کروں گا۔ آخر کار حجاج نے قنبر کو قتل کر ڈالا۔
امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ جناب قنبر کو حضرت علی علیہ السلام سے شدید محبت تھی۔

جب حضرت علی علیہ السلام گھر سے باہر نکلتے تو قنبر بھی تلوار لیے آپ کے پیچھے چلتے۔ ایک رات حضرت علی علیہ السلام نے پوچھا: قنبر! تم میرے پیچھے کیوں آئے ہو؟ قنبر نے عرض کی: مولا! اس لیے کہ کہیں آپ کو کوئی گزند نہ پہنچائے۔ حضرت نے فرمایا: قنبر! تم مجھے اہل آسمان سے بچانا چاہتے ہو یا اہل زمین سے؟ قنبر نے کہا: اہل زمین کے شر سے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جب تک خدا کا حکم نہ ہو اہل زمین مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ سن کر قنبر واپس ہوگئے۔ (بحار الانوار ج ۴۲، ص ۱۳۲)

(۸) رُشید ہجری: آپ بھی حضرت علی علیہ السلام کے خاص صحابی تھے۔ ایک دن حضرت علی علیہ السلام نے ان سے فرمایا: اے رشید! اس وقت تمہارا صبر کیسا ہوگا جب بنو امیہ کا ایک حرام زادہ تمہارے دونوں ہاتھ، پاؤں اور زبان کاٹنا چاہے گا؟ رشید نے عرض کی: مولا! کیا اس کا انجام بہشت ہوگا؟ فرمایا: ہاں! تو دنیا وآخرت دونوں میں میرے ساتھ ہوگا۔

روایت ہے کہ ایک دن حضرت علی علیہ السلام اپنے اصحاب کے ہمراہ نخلستان میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنے اصحاب کے ساتھ اس درخت سے کچھ کھجوریں تناول فرمائیں رشید نے عرض کی: مولا! یہ کھجوریں کتنی عمدہ ہیں؟ حضرت نے فرمایا: اے رشید! تمھیں اسی درخت پر سولی دی جائے گی۔ اس دن کے بعد رشید ہمیشہ اس درخت کے پاس آتے اور اسے پانی دیتے۔ پھر ایک دن جب اس درخت کے پاس آئے تو دیکھا کہ اس کی شاخیں تراشی گئی ہیں۔ کہنے لگے اب میری موت قریب آچکی ہے یہاں تک کہ ابن زیاد کا غلام ان کے پاس آیا اور کہنے لگا: رشید! حاکم نے تمھیں بلایا ہے۔ رشید اس ظالم کے پاس گئے۔ وہ کہنے لگا: اپنے آقا کی کچھ جھوٹی باتیں ہمیں بھی سناؤ۔ رشید نے کہا: نہ میں جھوٹ بولتا ہوں اور نہ میرے آقا جھوٹی باتیں بتلاتے ہیں۔ میرے آقا نے مجھے بتایا تھا کہ تو میرے ہاتھ، پاؤں اور زبان کاٹے گا۔

ابن زیاد نے کہا: واللہ! میں اس کو جھٹلاؤں گا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ رشید کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے جائیں مگر زبان کو نہ کاٹا جائے۔ چنانچہ ان کو اسی حالت میں بازار لایا گیا تو انھوں نے لوگوں کو امیر المومنین علیہ السلام کے فضائل سنانا شروع کر دیئے۔ جب ابن زیاد کو اس کی خبر ملی تو اس نے حکم دیا کہ ان کی زبان بھی کاٹ دی جائے۔ اس کے بعد آپ کو اسی درخت پر سولی دیدی گئی۔ (منتخب التواریخ ص ۱۶۰)

(۹) سَہل بن حُنیف: آپ حضرت علی علیہ السلام کے نہایت مخلص صحابی تھے۔ جنگ صفین میں آپ نے بھرپور جہاد کیا اور صفین سے واپسی کے بعد کوفہ میں انتقال فرمایا۔ سہل نے زمانہ رسولؐ کے غزوات میں

بھی حصہ لیا تھا۔ آپ ان چند صحابہ میں سے تھے جنھوں نے جنگ احد میں رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی تھی۔ آپ نہایت قابل اعتماد شخص تھے اسی لیے حضرت علی علیہ السلام جنگ جمل کے لیے جاتے ہوئے انھیں مدینہ میں اپنا قائم مقام بنا کر گئے تھے۔

(۱۰۔۱۱) صعصعہ بن صوحان اور زید بن صوحان : یہ دونوں بھائی حضرت علی علیہ السلام کے خاص اصحاب میں سے تھے۔ زید جنگ جمل میں شہید ہوئے تھے۔ جب معاویہ کوفہ آیا تو صعصعہ نے اس سے کہا: میرا دل نہیں چاہتا کہ میں تجھے بطور خلیفہ دیکھوں۔ معاویہ نے کہا: اچھا! اب جبکہ تم مجھے خلیفہ سمجھنے لگے ہو تو منبر پر جا کر علیؑ پر سب کرو۔ صعصعہ منبر پر گئے اور بولے : لوگو! معاویہ نے مجھے حضرت علی علیہ السلام پر سب کرنے کو کہا ہے لیکن میں لعنت کرتا ہوں معاویہ اور ہر اس شخص پر جو علیؑ پر سب کرے۔ حاضرین مسجد نے کہا: آمین (ہم بھی صعصعہ کے ساتھ آمین کہتے ہیں)۔

(۱۲) عمار یاسرؓ: آپ حضرت عمرؓ کے زمانے میں کوفہ کے حاکم تھے۔ آپ کوفہ میں حضرت علی علیہ السلام کے فضائل بیان کرتے تھے۔ جب حضرت عمرؓ کو یہ خبر ملی تو انھوں نے عمارؓ کو معزول کر دیا۔ عمارؓ واپس مدینہ آگئے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا: کیا تمھیں معزول ہونے کا غم ہے؟ انھوں نے کہا: تمہاری طرف سے حاکم مقرر ہونے پر اگر مسرور ہوا ہوتا تو آج تمہاری طرف سے معزول ہونے پر غمگین ہوتا۔

جناب عمارؓ صفین میں سخت جنگ لڑنے کے بعد درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۹۰ برس سے زیادہ تھی۔ حضرت علی علیہ السلام کو آپ کی شہادت پر بڑا دکھ ہوا۔

حضرت علی علیہ السلام کے اور بھی بہت سے اصحاب تھے جن میں حجر بن عدی، قیس بن سعد اور عدی بن حاتم وغیرہ کے نام مشہور ہیں۔ یہ سب حضرت علی علیہ السلام کے نہایت قابل اعتماد اصحاب تھے۔

# حضرت علی علیہ السلام کے زریں اقوال

## (۱) از نہج البلاغہ

(۱) اَلتَّوْحِيْدُ اَنْ لَا تَتَوَهَّمَهُ وَالْعَدْلُ اَنْ لَا تَتَّهِمَهُ۔

توحید یہ ہے کہ خدا کی خیالی تصویر نہ بنائی جائے اور عدالت یہ ہے کہ اسے الزام نہ دیا جائے۔

(۲) اِنَّ لِلّٰہِ تَعَالٰی فِیْ کُلِّ نِعْمَةٍ حَقًّا فَمَنْ اَدَّاہُ زَادَہُ مِنْھَا وَمَنْ قَصَّرَ عَنْہُ خَاطَرَ بِزَوَالِ نِعْمَتِہٖ۔

یقیناً اللہ تعالیٰ کا ہر نعمت میں ایک حق ہے (جس کے بدلے اس کا شکر ادا کرنا ضروری ہے) پس جو اسے ادا کرے گا اللہ اس کی نعمت کو بڑھا دے گا اور جو شکر میں کوتاہی کرے گا وہ موجودہ نعمت کو بھی خطرے میں ڈال دے گا۔

(۳) اِذَا قَدَرْتَ عَلٰی عَدُوِّكَ فَاجْعَلِ الْعَفْوَ عَنْہُ شُکْرًا لِلْقُدْرَةِ عَلَيْهِ۔

جب دشمن پر غلبہ پالو تو اسے معاف کر کے اس غلبہ کا شکر ادا کرو۔

(۴) مِنْ كَفَّارَاتِ الذُّنُوْبِ الْعِظَامِ اِغَاثَةُ الْمَلْھُوْفِ وَالتَّنْفِيْسُ عَنِ الْمَكْرُوْبِ۔

بڑے بڑے گناہوں کا کفارہ یہ ہے کہ فریاد کرنے والے مظلوم کی مدد کی جائے اور پریشان حال کی پریشانی دور کی جائے۔

(۵) يَا ابْنَ اٰدَمَ اِذَا رَاَيْتَ رَبَّكَ سُبْحَانَہٗ يُتَابِعُ عَلَيْكَ نِعَمَہٗ وَاَنْتَ تَعْصِيْهِ فَاحْذَرْہُ۔

اے فرزند آدم! جب گناہوں کے باوجود پروردگار کی نعمتیں تجھے مسلسل ملتی رہیں تو ہوشیار ہوجا (کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے اتمام حجت ہو رہی ہے اور نافرمانی کے باوجود رحمت کا جاری رہنا درحقیقت ایک ڈھیل ہے جس کا انجام دردناک عذاب ہے لہٰذا اس سے ڈر)۔

(۶) اِذَا كُنْتَ فِیْ اِدْبَارٍ وَالْمَوْتُ فِیْ اِقْبَالٍ فَمَا اَسْرَعَ الْمُلْتَقٰی۔

جب تمہاری زندگی جا رہی ہے اور موت تمہاری طرف آ رہی ہے تو تمہاری ملاقات موت سے

بہت جلد ہو سکتی ہے۔

(۷) اَفْضَلُ الزُّهْدِ اِخْفَاءُ الزُّهْدِ۔

بہترین زہد، زہد کا مخفی رکھنا ہے (کیونکہ ریاکاری زہد نہیں، نفاق ہے)۔

(۸) اَشْرَفُ الْغِنٰی تَرْكُ الْمُنٰی۔

بہترین بے نیازی یہ ہے کہ انسان امید ہی نہ باندھے۔

(۹) اِيَّاكَ وَ مُصَادَقَةَ الْاَحْمَقِ فَاِنَّهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّنْفَعَكَ فَيَضُرُّكَ، وَاِيَّاكَ وَ مُصَادَقَةَ الْبَخِيْلِ فَاِنَّهُ يَقْعُدُ عَنْكَ اَحْوَجَ مَا تَكُوْنُ اِلَيْهِ، وَاِيَّاكَ وَ مُصَادَقَةَ الْفَاجِرِ فَاِنَّهُ يَبِيْعُكَ بِالتَّافِهِ، وَاِيَّاكَ وَ مُصَادَقَةَ الْكَذَّابِ فَاِنَّهُ كَالسَّرَابِ يُقَرِّبُ عَلَيْكَ الْبَعِيْدَ وَيُبَعِّدُ عَلَيْكَ الْقَرِيْبَ۔

خبردار! کسی احمق سے دوستی نہ کرنا کیونکہ وہ تمھیں فائدہ بھی پہنچانا چاہے گا تو (اپنی بے عقلی کی وجہ سے) نقصان پہنچا دے گا اور کسی بخیل اور خسیس سے دوستی نہ کرنا (کیونکہ جب تم اس سے کوئی چیز مانگو گے) تو وہ تم سے دور بھاگے گا حالانکہ تمھیں اس کی شدید ضرورت ہوگی اور دیکھو! کسی فاجر سے بھی دوستی نہ کرنا کیونکہ وہ تمھیں حقیر چیز کے عوض بیچ ڈالے گا۔ کسی جھوٹے کی صحبت بھی اختیار نہ کرنا کیونکہ وہ سراب کی طرح ہے جو دور والے کو قریب اور قریب والے کو دور کر دیتا ہے۔

(۱۰) لِسَانُ الْعَاقِلِ وَرَاءَ قَلْبِهٖ وَقَلْبُ الْاَحْمَقِ وَرَاءَ لِسَانِهٖ۔

عقل مند کی زبان اس کے دل کے پیچھے اور احمق کا دل اس کی زبان کے پیچھے ہوتا ہے (یعنی عقل مند پہلے سوچتا ہے پھر بولتا ہے لیکن احمق پہلے بولتا ہے پھر سوچتا ہے)۔

(۱۱) سَيِّئَةٌ تَسُوْءُكَ خَيْرٌ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ حَسَنَةٍ تُعْجِبُكَ۔

وہ گناہ جو تمھیں ملول کر دے اللہ کے نزدیک اس نیکی سے بہتر ہے جو تمھیں مغرور بنا دے۔

(۱۲) اَلظَّفَرُ بِالْحَزْمِ، وَالْحَزْمُ بِاِجَالَةِ الرَّاْيِ، وَالرَّاْيُ بِتَحْصِيْنِ الْاَسْرَارِ۔

کامیابی تدبیر اور احتیاط میں پوشیدہ ہے اور تدبیر و احتیاط تفکر میں پوشیدہ ہے اور تدبر رازوں کی حفاظت سے حاصل ہوتا ہے۔

(۱۳) اِحْذَرُوْا صَوْلَةَ الْكَرِيْمِ اِذَا جَاعَ وَاللَّئِيْمِ اِذَا شَبِعَ۔

بھوکے شریف اور پیٹ بھرے کمینے (کے شر) سے بچو۔

(۱۴) اَوْلَى النَّاسِ بِالْعَفْوِ اَقْدَرُهُمْ عَلَى الْعُقُوبَةِ۔

سب سے زیادہ معاف کرنے کا حق اسے ہے جو سب سے زیادہ سزا دینے پر قادر ہو۔

(۱۵) لَا غِنٰى كَالْعَقْلِ وَلَا فَقْرَ كَالْجَهْلِ وَلَا مِيْرَاثَ كَالْاَدَبِ وَلَا ظَهِيْرَ كَالْمُشَاوَرَةِ۔

عقل جیسی کوئی دولت نہیں ہے اور جہالت جیسی کوئی فلاکت نہیں۔ نہ تو ادب جیسی کوئی میراث ہے اور نہ ہی مشورہ جیسا کوئی مددگار ہے۔

(۱۶) اَهْلُ الدُّنْيَا كَرَكْبٍ يُسَارُبِهِمْ وَهُمْ نِيَامٌ۔

اہل دنیا ان سواروں کی مانند ہیں جو سو رہے ہیں اور ان کا سفر جاری ہے (جب موت آئے گی تب جاگیں گے)۔

(۱۷) اَلْعَفَافُ زِيْنَةُ الْفَقْرِ وَالشُّكْرُ زِيْنَةُ الْغِنٰى۔

پاک دامنی ناداری کی زینت ہے اور شکر گزاری امیری کی زینت ہے۔

(۱۸) اِذَا تَمَّ الْعَقْلُ نَقَصَ الْكَلَامُ۔

جب آدمی کی عقل پختہ ہوتی ہے تو اس کی باتیں کم ہو جاتی ہیں (کیونکہ عقل مند ہر بات تول کر بولتا ہے)۔

(۱۹) نَفَسُ الْمَرْءِ خُطَاهُ اِلٰى اَجَلِهٖ۔

انسان کی ایک ایک سانس موت کی طرف ایک ایک قدم ہے۔

(۲۰) مَنْ اَصْلَحَ مَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللّٰهِ اَصْلَحَ اللّٰهُ مَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ النَّاسِ، وَمَنْ اَصْلَحَ اَمْرَ اٰخِرَتِهٖ اَصْلَحَ اللّٰهُ لَهٗ اَمْرَ دُنْيَاهُ، وَمَنْ كَانَ لَهٗ مِنْ نَفْسِهٖ وَاعِظٌ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ اللّٰهِ حَافِظٌ۔

جس نے اپنے اور اللہ کے مابین معاملات ٹھیک کر لیے تو اللہ اس کے اور لوگوں کے مابین معاملات کو ٹھیک کر دے گا اور جو آخرت کے امور درست کر لے گا اللہ اس کے دنیاوی کاموں کو درست کر دے گا اور جو کوئی خود کو نصیحت کرے گا اللہ اس کی حفاظت کا انتظام کر دے گا۔

(۲۱) لَا تَفْرَحْ بِالْغِنٰى وَالرَّخَاءِ وَلَا تَغْتَمَّ بِالْفَقْرِ وَالْبَلَاءِ فَاِنَّ الذَّهَبَ يُجَرَّبُ بِالنَّارِ وَالْمُؤْمِنُ يُجَرَّبُ بِالْبَلَاءِ۔

دولت اور آسائشوں پر خوشی نہ مناؤ، تنگدستی اور مصیبت پر غم نہ کھاؤ کیونکہ سونا (کندن بنانے کے لیے) آگ میں ہی تپایا جاتا ہے۔ اسی طرح مومن کو بھی مصیبتوں سے آزمایا جاتا ہے۔

(۲۲) شَتَّانَ مَا بَيْنَ عَمَلَيْنِ: عَمَلٌ تَذْهَبُ لَذَّتُهُ وَتَبْقٰى تَبِعَتُهُ وَعَمَلٌ تَذْهَبُ مَؤُونَتُهُ وَيَبْقٰى اَجْرُهُ
ان دونوں قسم کے کاموں میں کتنا فرق ہے۔ ایک وہ جس کی لذت ختم ہوجائے مگر اس کا وبال باقی رہے اور دوسرا وہ جس کی سختی ختم ہوجائے مگر اس کا ثواب باقی رہے۔

(۲۳) عِظَمُ الْخَالِقِ عِنْدَكَ يُصَغِّرُ الْمَخْلُوقَ فِيْ عَيْنِكَ۔
خالق کی بڑائی کا احساس پیدا ہونے سے انسان کی نگاہوں میں مخلوق چھوٹی ہوجاتی ہے۔

(۲۴) اِنَّ لِلّٰهِ مَلَكًا يُنَادِيْ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ: لِدُوْا لِلْمَوْتِ وَاجْمَعُوْا لِلْفَنَاءِ وَابْنُوْا لِلْخَرَابِ۔
اللہ کی طرف سے ہر روز ایک منادی ندا دیتا ہے: موت کے لیے اولاد پیدا کرو، برباد ہونے کے لیے مال جمع کرو اور تباہ ہونے کے لیے عمارتیں بناؤ (یعنی آخری انجام کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھو)۔

(۲۵) لَا يَكُوْنُ الصَّدِيْقُ صَدِيْقًا حَتّٰى يَحْفَظَ اَخَاهُ فِيْ ثَلَاثٍ: فِيْ نَكْبَتِهٖ وَغَيْبَتِهٖ وَوَفَاتِهٖ۔
دوست اس وقت تک دوست نہیں ہوسکتا جب تک تین مواقع پر دوست کے کام نہ آئے۔ مصیبت کے وقت اس کی غیر موجودگی میں اور موت کے بعد۔

(۲۶) مَنْ اُعْطِيَ اَرْبَعًا لَمْ يُحْرَمْ اَرْبَعًا: مَنْ اُعْطِيَ الدُّعَاءَ لَمْ يُحْرَمِ الْاِجَابَةَ، وَمَنْ اُعْطِيَ التَّوْبَةَ لَمْ يُحْرَمِ الْقَبُوْلَ، وَمَنْ اُعْطِيَ الْاِسْتِغْفَارَ لَمْ يُحْرَمِ الْمَغْفِرَةَ، وَمَنْ اُعْطِيَ الشُّكْرَ لَمْ يُحْرَمِ الزِّيَادَةَ۔
جس شخص کو چار چیزیں عطا ہوئی ہیں وہ چار چیزوں سے محروم نہیں رہ سکتا۔ جسے دعا کی توفیق مل گئی وہ قبول دعا سے محروم نہیں رہے گا۔ جسے توبہ نصیب ہوگئی وہ قبولیت سے محروم نہیں رہے گا۔ جسے استغفار کی فرصت مل گئی وہ مغفرت سے محروم نہیں رہے گا اور جو شکر کرے وہ اضافے سے محروم نہیں رہے گا۔

(۲۷) اِسْتَنْزِلُوا الرِّزْقَ بِالصَّدَقَةِ وَمَنْ اَيْقَنَ بِالْخَلَفِ جَادَ بِالْعَطِيَّةِ۔
صدقے کے ذریعے روزی طلب کرو اور (یاد رکھو) جسے معاوضہ ملنے کا یقین ہوتا ہے وہ عطا میں دریا دلی دکھاتا ہے۔

(۲۸) يَنْزِلُ الصَّبْرُ عَلٰى قَدْرِ الْمُصِيْبَةِ، وَمَنْ ضَرَبَ عَلٰى فَخِذِهٖ عِنْدَ مُصِيْبَتِهٖ حَبِطَ اَجْرُهُ۔
مصیبت کے مطابق صبر حاصل ہوتا ہے۔ پس جس نے مصیبت میں ران پر ہاتھ مارا اس کا عمل ضائع ہوجاتا ہے۔

(۲۹) اَلْمَرْءُ مَخْبُوْءٌ تَحْتَ لِسَانِہٖ۔
انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے (یعنی جب تک انسان لب کشائی نہیں کرتا اس کا عیب اور ہنر چھپا رہتا ہے)۔

(۳۰) هَلَكَ امْرُؤٌ لَمْ يَعْرِفْ قَدْرَهٗ۔
جو اپنی قدر نہیں پہچانتا وہ برباد ہوجاتا ہے۔

(۳۱) لَا يَعْدَمُ الصَّبُوْرُ الظَّفَرَ وَاِنْ طَالَ بِهِ الزَّمَانُ۔
صبر کرنے والا کامیابی سے محروم نہیں رہتا، چاہے کتنا ہی زمانہ کیوں نہ لگ جائے۔

(۳۲) اَلرَّاضِیْ بِفِعْلِ قَوْمٍ كَالدَّاخِلِ فِيْهِ مَعَهُمْ. وَعَلٰى كُلِّ دَاخِلٍ فِیْ بَاطِلٍ اِثْمَانِ: اِثْمُ الْعَمَلِ بِهٖ، وَ اِثْمُ الرِّضَا بِهٖ۔
جو کوئی کسی قوم کے عمل سے راضی ہوجائے وہ اسی قوم میں شمار کیا جائے گا۔ نیز جو کسی باطل میں داخل ہوجائے اس پر دوہرا گناہ ہوگا۔ عمل کا گناہ بھی اور اس پر راضی ہونے کا گناہ بھی۔

(۳۳) اَيُّهَا النَّاسُ! اِتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ اِنْ قُلْتُمْ سَمِعَ وَاِنْ اَضْمَرْتُمْ عَلِمَ، وَبَادِرُوا الْمَوْتَ الَّذِیْ اِنْ هَرَبْتُمْ مِنْهُ اَدْرَكَكُمْ وَاِنْ اَقَمْتُمْ اَخَذَكُمْ وَاِنْ نَسِيْتُمُوْهُ ذَكَرَكُمْ۔
اے لوگو! اس خدا سے ڈرو جو تمہاری ہر بات کو سنتا اور ہر راز کو جانتا ہے۔ اُس موت کی طرف بڑھو جس سے بھاگنا بھی چاہو تو وہ تمھیں پالے گی۔ اگر ٹھہر جاؤ گے تو گرفت میں لے لے گی اور اگر تم اسے بھول بھی جاؤ، تو وہ تمھیں یاد رکھے گی۔

(۳۴) مَنْ وَضَعَ نَفْسَهٗ مَوَاضِعَ التُّهْمَةِ فَلَا يَلُوْمَنَّ مَنْ اَسَاءَ بِهِ الظَّنَّ۔
جو بدنام جگہوں پر جائے تو وہ اسے برا نہ کہے جو اس سے بدظن ہو۔

(۳۵) مَنِ اسْتَبَدَّ بِرَاْيِهٖ هَلَكَ وَمَنْ شَاوَرَ الرِّجَالَ شَارَكَهَا فِیْ عُقُوْلِهَا۔
جو کوئی اپنی ہی رائے سے کام لے گا وہ برباد ہوجائے گا اور جو لوگوں کے مشوروں سے کام کرے گا وہ ان کی عقلوں میں شریک ہوجائے گا۔

(۳۶) تَرْكُ الذَّنْبِ اَهْوَنُ مِنْ طَلَبِ الْمَعُوْنَةِ۔
گناہ کو چھوڑ دینا بعد میں مدد مانگنے سے آسان ہے۔

(۳۷) كُلُّ وِعَاءٍ يَضِيْقُ بِمَا جُعِلَ فِيْهِ اِلَّا وِعَاءَ الْعِلْمِ فَاِنَّهٗ يَتَّسِعُ بِهٖ۔
ہر ظرف اپنے مظروف کے لیے تنگ ہوسکتا ہے مگر علم کا ظرف وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔

(۳۸) مَنْ حَاسَبَ نَفْسَهُ رَبِحَ وَمَنْ غَفَلَ عَنْهَا خَسِرَ وَمَنْ خَافَ اٰمِنَ وَمَنِ اعْتَبَرَ اَبْصَرَ وَمَنْ اَبْصَرَ فَهِمَ وَمَنْ فَهِمَ عَلِمَ۔

جو اپنا محاسبہ کرتا ہے وہ فائدے میں رہتا ہے اور جو غفلت کرتا ہے وہ خسارے میں رہتا ہے۔ جو خوف خدا رکھتا ہے وہ عذاب سے بچا رہتا ہے اور جو عبرت پکڑتا ہے وہ صاحب بصیرت ہوتا ہے۔ جو صاحب بصیرت ہوتا ہے وہ فہیم ہوتا ہے اور جو فہیم ہوتا ہے اسے علم حاصل ہوتا ہے۔

(۳۹) فِیْ تَقَلُّبِ الْاَحْوَالِ عِلْمُ جَوَاهِرِ الرِّجَالِ۔

جب حالات پلٹا کھاتے ہیں تب ہی لوگوں کے جوہر کھلتے ہیں۔

(۴۰) بِئْسَ الزَّادُ اِلَی الْمَعَادِ الْعُدْوَانُ عَلَی الْعِبَادِ۔

لوگوں پر ظلم کرنا قیامت کے لیے بدترین زاد راہ ہے۔

(۴۱) مِنْ اَشْرَفِ اَعْمَالِ الْکَرِیْمِ غَفْلَتُهٗ عَمَّا یَعْلَمُ۔

شریف آدمی کا بہترین عمل یہ ہے کہ وہ لوگوں کی ان باتوں سے چشم پوشی کرے جنھیں وہ جانتا ہے

(۴۲) اَلْاِیْمَانُ مَعْرِفَةٌ بِالْقَلْبِ وَاِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَعَمَلٌ بِالْاَرْکَانِ۔

ایمان دل سے ماننے، زبان سے اقرار کرنے اور اعضاء و جوارح سے عمل کرنے کا نام ہے۔

(۴۳) اِنَّ قَوْمًا عَبَدُوا اللّٰهَ رَغْبَةً فَتِلْکَ عِبَادَةُ التُّجَّارِ وَاِنَّ قَوْمًا عَبَدُوا اللّٰهَ رَهْبَةً فَتِلْکَ عِبَادَةُ الْعَبِیْدِ وَاِنَّ قَوْمًا عَبَدُوا اللّٰهَ شُکْرًا فَتِلْکَ عِبَادَةُ الْاَحْرَارِ۔

ایک جماعت ثواب کے لالچ میں خدا کی عبادت کرتی ہے یہ تاجروں کی عبادت ہے۔ ایک جماعت عذاب کے خوف سے خدا کی عبادت کرتی ہے یہ غلاموں کی عبادت ہے۔ ایک جماعت شکرانے کے طور پر خدا کی عبادت کرتی ہے یہ آزاد لوگوں کی عبادت ہے۔

(۴۴) یَوْمُ الْمَظْلُوْمِ عَلَی الظَّالِمِ اَشَدُّ مِنْ یَوْمِ الظَّالِمِ عَلَی الْمَظْلُوْمِ۔

مظلوم کے ظالم پر قابو پانے کا دن اس سے کہیں زیادہ سخت ہوگا جس دن ظالم مظلوم کے خلاف اپنی طاقت دکھاتا ہے۔

(۴۵) اِتَّقِ اللّٰهَ بَعْضَ التُّقٰی وَاِنْ قَلَّ وَاجْعَلْ بَیْنَکَ وَبَیْنَ اللّٰهِ سِتْرًا وَاِنْ رَقَّ۔

اللہ سے کچھ تو ڈرو، چاہے وہ کم ہی ہو، اپنے اور اس کے درمیان کچھ تو پردہ رکھو چاہے وہ بے حد باریک ہی کیوں نہ ہو۔

(۴۶) اِنَّ لِلّٰهِ تَعَالٰی فِیْ کُلِّ نِعْمَةٍ حَقًّا فَمَنْ اَدَّاهُ زَادَهُ مِنْهَا وَمَنْ قَصَّرَ عَنْهُ خَاطَرَ بِزَوَالِ نِعْمَتِهٖ۔

بیشک اللہ تعالیٰ کے لیے ہر نعمت میں ایک حق ہے۔ جو اسے ادا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی نعمت بڑھا دے گا اور جو کوتاہی کرے گا وہ موجودہ نعمت کو بھی خطرے میں ڈال دے گا۔

(۴۷) یَاابْنَ اٰدَمَ لَا تَحْمِلْ هَمَّ یَوْمِكَ الَّذِیْ لَمْ یَأْتِكَ عَلٰی یَوْمِكَ الَّذِیْ قَدْ اَتَاكَ فَاِنَّهٗ اِنْ یَكُ مِنْ عُمُرِكَ یَأْتِ اللّٰهُ فِیْهِ بِرِزْقِكَ۔

اے فرزند آدم! اس دن کا غم جو ابھی آیا نہیں اس دن پر مت ڈال جو آچکا ہے اس لیے کہ اگر تیری عمر کا ایک دن بھی باقی ہوگا تو اللہ تیرا رزق تجھ تک پہنچائے گا۔

(۴۸) مَنْ ظَنَّ بِكَ خَیْرًا فَصَدِّقْ ظَنَّهٗ۔

جو تمہارے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہو اس کی رائے کو سچ کر دکھاؤ۔

(۴۹) عَرَفْتُ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ وَحَلِّ الْعُقُوْدِ وَنَقْضِ الْهِمَمِ۔

میں نے اللہ سبحانہٗ کو ارادوں کے ٹوٹ جانے، عقدوں کے حل ہوجانے اور ہمتوں کے پست ہوجانے سے پہچانا ہے۔

(۵۰) مَرَارَةُ الدُّنْیَا حَلَاوَةُ الْاٰخِرَةِ وَحَلَاوَةُ الدُّنْیَا مَرَارَةُ الْاٰخِرَةِ۔

دنیا کی تلخی آخرت کی شیرینی اور دنیا کی شیرینی آخرت کی تلخی ہے۔

(۵۱) یَاابْنَ اٰدَمَ كُنْ وَصِیَّ نَفْسِكَ وَاعْمَلْ فِیْ مَالِكَ مَا تُؤْثِرُ اَنْ یُعْمَلَ فِیْهِ مِنْ بَعْدِكَ۔

اے انسان! اپنے مال میں اپنا وصی خود بن اور آپ وہ کام کر جس کے بارے تو چاہتا ہے کہ لوگ تیرے بعد تیری طرف سے وہ کام کریں۔

(۵۲) اِذَا اَمْلَقْتُمْ فَتَاجِرُوا اللّٰهَ بِالصَّدَقَةِ۔

جب تم تنگدستی کا شکار ہوجاؤ تو صدقے کے ذریعے اللہ سے معاملہ کرو۔

(۵۳) مَنْ تَذَكَّرَ بُعْدَ السَّفَرِ اسْتَعَدَّ۔

جو (آخرت کے) سفر کی دوری کو یاد رکھتا ہے وہ تیاری میں لگا رہتا ہے۔

(۵۴) لَوْ لَمْ یَتَوَعَّدِ اللّٰهُ عَلٰی مَعْصِیَتِهٖ لَكَانَ یَجِبُ اَنْ لَا یُعْصٰی شُكْرًا لِنِعَمِهٖ۔

اگر اللہ نے اپنی نافرمانی پر عذاب سے نہ ڈرایا ہوتا تب بھی اس کی نعمتوں پر شکر کا تقاضا یہ تھا کہ اس کی نافرمانی نہ کی جائے۔

(۵۵) مَا اَكْثَرَ الْعِبَرَ وَاَقَلَّ الْاِعْتِبَارَ۔
عبرتیں کتنی زیادہ اور عبرت پکڑنے والے کتنے کم ہیں۔

(۵۶) اَلنَّاسُ اَبْنَاءُ الدُّنْيَا وَلَا يُلَامُ الرَّجُلُ عَلٰى حُبِّ اُمِّهٖ۔
لوگ دنیا کے بیٹے ہیں اور ماں کی محبت پر بیٹے کو سرزنش نہیں کی جاسکتی (لیکن دنیا سے اتنی بھی محبت اچھی نہیں کہ وہ اس کی محبت میں گناہ کرے)۔

(۵۷) اِنَّ الْمِسْكِيْنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَمَنْ مَنَعَهٗ فَقَدْ مَنَعَ اللّٰهَ وَمَنْ اَعْطَاهُ فَقَدْ اَعْطَى اللّٰهَ۔
فقیر درحقیقت اللہ کا بھیجا ہوا ہوتا ہے لہٰذا جس نے اسے منع کیا گویا اس نے اللہ کو منع کردیا اور جس نے اسے کچھ دیا گویا اس نے اللہ کو دیا۔

(۵۸) لَا يَصْدُقُ اِيْمَانُ عَبْدٍ حَتّٰى يَكُوْنَ بِمَا فِيْ يَدِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ اَوْثَقَ مِنْهُ بِمَا فِيْ يَدِهٖ۔
کسی بندے کا ایمان اس وقت تک سچا نہیں ہوسکتا جب تک اسے خدا کے خزانے پر اپنی دولت سے زیادہ اعتبار نہ ہو۔

(۵۹) اِتَّقُوْا مَعَاصِيَ اللّٰهِ فِي الْخَلَوَاتِ فَاِنَّ الشَّاهِدَ هُوَ الْحَاكِمُ۔
تنہائی میں اللہ کی نافرمانی سے ڈرو کیونکہ جو گواہ ہے وہی فیصلہ کرنے والا ہے۔

(۶۰) اَقَلُّ مَا يَلْزَمُكُمْ لِلّٰهِ اَنْ لَّا تَسْتَعِيْنُوْا بِنِعَمِهٖ عَلٰى مَعَاصِيْهِ۔
اللہ کا تمہارے اوپر کم سے کم حق یہ ہے کہ اس کی نعمتوں کی مدد سے گناہ نہ کرو۔

(۶۱) اَلْغِنَى الْاَكْبَرُ اَلْيَاْسُ عَمَّا فِيْ اَيْدِي النَّاسِ۔
لوگوں کی دولت سے آس نہ رکھنا سب سے بڑی تونگری ہے۔

(۶۲) لَوْ رَاَى الْعَبْدُ الْاَجَلَ وَمَصِيْرَهٗ لَاَبْغَضَ الْاَمَلَ وَغُرُوْرَهٗ۔
اگر انسان اپنی موت اور اپنے انجام کو دیکھ لے تو جھوٹی امیدوں سے منہ موڑ لے۔

(۶۳) لِكُلِّ امْرِئٍ فِيْ مَالِهٖ شَرِيْكَانِ: اَلْوَارِثُ وَالْحَوَادِثُ۔
ہر شخص کے مال میں اس کے دو شریک ہوتے ہیں۔ ایک وارث اور ایک حوادث۔

(۶۴) اَشَدُّ الذُّنُوْبِ مَا اسْتَهَانَ بِهٖ صَاحِبُهٗ۔
سب سے سخت گناہ وہ ہے جسے گنہگار ہلکا سمجھے۔

(۶۵) اَكْبَرُ الْعَيْبِ اَنْ تَعِيْبَ مَا فِيْكَ مِثْلُهٗ۔
بدترین عیب یہ ہے کہ تم اس عیب کو برا کہو جو خود تمہارے اندر ہو۔

(۶۶) اَلْبُخْلُ جَامِعٌ لِمَسَاوِی الْعُیُوْبِ وَھُوَ زِمَامٌ یُقَادُ بِہٖ اِلٰی کُلِّ سُوْءٍ۔

خساست اور بخل ایک بڑی برائی ہے جو تمام برائیوں کے برابر ہے۔ یہ ایسی مہار ہے جس سے ہر برائی کی طرف کھینچ کر لے جایا جاسکتا ہے۔

(۶۷) مَا خَیْرٌ بِخَیْرٍ بَعْدَہُ النَّارُ وَمَا شَرٌّ بِشَرٍّ بَعْدَہُ الْجَنَّۃُ وَکُلُّ نَعِیْمٍ دُوْنَ الْجَنَّۃِ مَحْقُوْرٌ وَکُلُّ بَلَاءٍ دُوْنَ النَّارِ عَافِیَۃٌ۔

وہ بھلائی بھلائی نہیں جس کا انجام جہنم ہو اور وہ برائی برائی نہیں جس سے جنت ملے۔ جنت کے سامنے ہر نعمت ہیچ ہے اور جہنم سے بچ جانے کے بعد ہر مصیبت راحت ہے۔

(۶۸) مَا اَحْسَنَ تَوَاضُعَ الْاَغْنِیَاءِ لِلْفُقَرَاءِ طَلَبًا لِمَا عِنْدَ اللہِ! وَاَحْسَنُ مِنْہُ تِیْہُ الْفُقَرَاءِ عَلَی الْاَغْنِیَاءِ اِتِّکَالًا عَلَی اللہِ۔

کتنی اچھی بات ہے کہ امیر اللہ سے صلہ پانے کے لیے غریب کے ساتھ تواضع سے پیش آئے مگر اس سے بھی اچھی بات یہ ہے کہ غریب اللہ پر بھروسا کر کے امیروں سے بے نیازی برتے۔

(۶۹) مَنْ اَصْلَحَ سَرِیْرَتَہٗ اَصْلَحَ اللہُ عَلَانِیَتَہٗ وَمَنْ عَمِلَ لِدِیْنِہٖ کَفَاہُ اللہُ اَمْرَ دُنْیَاہُ۔

جو اپنے باطن کی اصلاح کرے گا اللہ اس کا ظاہر درست کردے گا اور جو اپنے دین کے لیے عمل کرے گا اللہ اس کی دنیا کے کام بنا دے گا۔

(۷۰) کَفَاکَ مِنْ عَقْلِکَ مَا اَوْضَحَ لَکَ سُبُلَ غَیِّکَ مِنْ رُشْدِکَ۔

تمہارے لیے اتنی عقل کافی ہے جو تمہیں گمراہی کا راستا ہدایت کے راستے سے الگ کر کے دکھا دے۔

(۷۱) اَلْحِلْمُ غِطَاءٌ سَاتِرٌ وَالْعَقْلُ حُسَامٌ قَاطِعٌ فَاسْتُرْ خَلَلَ خُلُقِکَ بِحِلْمِکَ وَقَاتِلْ ھَوَاکَ بِعَقْلِکَ

بردباری چھپا دینے والا پردہ اور عقل کاٹنے والی تلوار ہے چنانچہ اپنی اخلاقی کمزوریوں کو بردباری سے چھپاؤ اور اپنی خواہشات کا عقل کی تلوار سے مقابلہ کرو۔

(۷۲) لَا یَنْبَغِیْ لِلْعَبْدِ اَنْ یَثِقَ بِخَصْلَتَیْنِ: اَلْعَافِیَۃِ وَالْغِنٰی، بَیْنَا تَرَاہُ مُعَافًی اِذْ سَقِمَ وَبَیْنَا تَرَاہُ غَنِیًّا اِذِ افْتَقَرَ۔

کسی بندے کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ دو چیزوں پر بھروسا کرے۔ ایک صحت اور دوسری دولت کیونکہ صحت اچانک بیماری میں اور امارت اچانک غربت میں بدل جاتی ہے۔

(۷۳) اِنَّ اَعْظَمَ الْحَسَرَاتِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ حَسْرَۃُ رَجُلٍ کَسَبَ مَالًا فِیْ غَیْرِ طَاعَۃِ اللہِ فَوَرِثَہٗ رَجُلٌ

فَأَنْفَقَهُ فِي طَاعَةِ اللهِ سُبْحَانَهُ فَدَخَلَ بِهِ الْجَنَّةَ وَدَخَلَ الْأَوَّلُ بِهِ النَّارَ۔

قیامت کے دن سب سے زیادہ افسوس اس شخص کو ہوگا جو خدا کی نافرمانی کر کے مال جمع کرتا رہا اور اس کا وارث اسے خدا کی راہ میں خرچ کردے کیونکہ یہ شخص اسی مال کی وجہ سے جنت میں اور پہلا شخص جہنم میں جائے گا۔

(۷۴) اُذْكُرُوا انْقِطَاعَ اللَّذَّاتِ وَبَقَاءَ التَّبِعَاتِ۔

یاد رکھو! لذتیں ختم ہونے والی ہیں اور ان کا حساب باقی رہنے والا ہے۔

(۷۵) مَنْ عَظَّمَ صِغَارَ الْمَصَائِبِ ابْتَلَاهُ اللهُ بِكِبَارِهَا۔

جو چھوٹی سی مصیبت کو بڑی جانتا ہے اللہ اسے بڑی مصیبت میں ڈال دیتا ہے۔

(۷۶) مَنْ كَرُمَتْ عَلَيْهِ نَفْسُهُ هَانَتْ عَلَيْهِ شَهَوَاتُهُ۔

جو اپنی وقعت کو جانتا ہے وہ اپنی خواہشوں کو بے وقعت سمجھے گا۔

(۷۷) مَنْهُومَانِ لَا يَشْبَعَانِ: طَالِبُ عِلْمٍ وَطَالِبُ دُنْيَا۔

دو بھوکے ایسے ہیں جو کبھی سیر نہیں ہوتے: ایک طالب علم اور دوسرا طالب دنیا۔[۱]

(۷۸) لَا تَرَى الْجَاهِلَ إِلَّا مُفْرِطًا أَوْ مُفَرِّطًا۔

جاہل کو نہ پاؤ گے مگر یا حد سے آگے بڑھا ہوا یا اس سے بہت پیچھے۔

(۷۹) مَا أَخَذَ اللهُ عَلَى أَهْلِ الْجَهْلِ أَنْ يَتَعَلَّمُوا حَتَّى أَخَذَ عَلَى أَهْلِ الْعِلْمِ أَنْ يُعَلِّمُوا۔

اللہ نے جاہلوں کو اس وقت تک علم حاصل کرنے کا مکلف نہیں ٹھہرایا جب تک اس نے عالموں سے یہ وعدہ نہیں لے لیا کہ وہ ان کو تعلیم دیں گے۔

(۸۰) ضَعْ فَخْرَكَ وَاحْطُطْ كِبْرَكَ وَاذْكُرْ قَبْرَكَ۔

تم فخر جتانا چھوڑ دو، غرور کو مٹا دو اور اپنی قبر کو یاد رکھو۔

---

۱۔ لذت دنیا سے سب آشنا ہیں اس لیے کوئی بھی اس سے سیر چشم نہیں ہوتا مگر لذت علم سے بہت کم لوگ آشنا ہیں اس لیے لوگ حصول علم کے لیے بے چین نظر نہیں آتے۔ اور جو لوگ علم حاصل کر رہے ہیں ان کا مقصد بھی حصول دنیا ہی ہے۔ اگر لوگوں کو علم کی لذت معلوم ہوجائے تو وہ اس کی خاطر جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کریں۔ (رضوانی)

# (۲) از غرر الحکم

(۱) اَلْوَلَهُ بِالدُّنْيَا اَعْظَمُ فِتْنَةٍ۔

دنیا کی محبت سب سے بڑی آزمائش ہے۔

(۲) اَلْعِلْمُ كَنْزٌ عَظِيْمٌ لَا يَفْنٰى۔

علم وہ عظیم خزانہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

(۳) اَلدِّيْنُ شَجَرَةٌ اَصْلُهَا التَّسْلِيْمُ وَالرِّضَا۔

دین وہ درخت ہے جس کی جڑ (خدا کے حکم کو) تسلیم کرنا اور (اس کی قضا پر) راضی رہنا ہے۔

(۴) اَلْجِهَادُ عِمَادُ الدِّيْنِ وَمِنْهَاجُ السُّعَدَاءِ۔

جہاد دین کا ستون اور نیکوکاروں کا راستا ہے۔

(۵) اَلرِّضَاءُ بِقَضَاءِ اللّٰهِ يُهَوِّنُ عَظِيْمَ الرَّزَايَا۔

اللہ کی قضا پر راضی رہنا بڑی بڑی مصیبتوں کو آسان بنا دیتا ہے۔

(۶) اَلْاَمَلُ يُقَرِّبُ الْمَنِيَّةَ وَيُبَاعِدُ الْاُمْنِيَّةَ۔

(طویل) آرزوئیں انسان کو موت سے قریب اور نصب العین سے ہٹا دیتی ہیں۔

(۷) اَلْعَاقِلُ لَا يَتَكَلَّمُ اِلَّا لِحَاجَتِهٖ اَوْ لِحُجَّتِهٖ لَا يَشْتَغِلُ اِلَّا بِصَلَاحِ اٰخِرَتِهٖ۔

عقل مند اپنی ضرورت یا اپنی حجت اور ثبات دلیل کے سوا بات نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ اپنی آخرت کی اصلاح میں لگا رہتا ہے۔

(۸) اَلْخَشْيَةُ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ شِيْمَةُ الْمُتَّقِيْنَ۔

اللہ کے عذاب سے ڈرنا متقین کی خصلت ہے۔

(۹) اَلْمُؤْمِنُ حَذِرٌ مِنْ ذُنُوْبِهٖ يَخَافُ الْبَلَاءَ وَيَرْجُوْ رَحْمَةَ رَبِّهٖ۔

مومن اپنے گناہوں پر رنجیدہ، مشکلات سے ترسیدہ اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہوتا ہے۔

(۱۰) اَلْبُکَاءُ مِنْ خِیْفَۃِ اللّٰہِ لِلْبُعْدِ عَنِ اللّٰہِ عِبَادَۃُ الْعَارِفِیْنَ۔

بارگاہ خداوندی سے دوری کے خوف سے رونا عارفین کی عبادت ہے۔

(۱۱) اَلْجُبْنُ وَالْحِرْصُ وَالْبُخْلُ غَرَائِزُ سُوْءٍ یَجْمَعُھَا سُوْءُ الظَّنِّ بِاللّٰہِ۔

بزدلی ، لالچ اور کنجوسی بری خصلتیں ہیں۔ اللہ سے بدگمانی انھیں اکٹھا کردیتی ہے۔

(۱۲) اَلْعَاقِلُ اِذَا سَکَتَ فَکَّرَ وَاِذَا نَطَقَ ذَکَرَ وَاِذَا نَظَرَ اِعْتَبَرَ۔

عقل مند جب خاموش ہوتا ہے تو غور وفکر کرتا ہے اور جب بولتا ہے تو اللہ کا ذکر کرتا ہے اور جب دیکھتا ہے تو عبرت پکڑتا ہے۔

(۱۳) اَلسَّعِیْدُ مَنْ خَافَ الْعِقَابَ فَاٰمِنَ وَرَجَا الثَّوَابَ فَاَحْسَنَ۔

خوش نصیب ہے وہ شخص جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے اس لیے گناہوں سے بچتا ہے اور ثواب کی امید رکھتا ہے اس لیے نیک کام کرتا ہے۔

(۱۴) اَلزُّھْدُ تَقْصِیْرُ الْاٰمَالِ وَاِخْلَاصُ الْاَعْمَالِ۔

زہد کا مطلب آرزوؤں کو کم کرنا اور عمل میں اخلاص پیدا کرنا ہے۔

(۱۵) اَلْعِلْمُ خَیْرٌ مِنَ الْمَالِ، اَلْعِلْمُ یَحْرُسُكَ وَاَنْتَ تَحْرُسُ الْمَالَ۔

علم مال سے بہتر ہے کیونکہ علم تمہاری حفاظت کرتا ہے جبکہ مال کی تم حفاظت کرتے ہو۔

(۱۶) اَلصَّبْرُ عَنِ الشَّھْوَۃِ عِفَّۃٌ وَعَنِ الْغَضَبِ نَجْدَۃٌ وَعَنِ الْمَعْصِیَۃِ وَرَعٌ۔

خواہشات پر صبر کرنا پاکدامنی ہے، غصے پر صبر کرنا بزرگی ہے جبکہ گناہ پر صبر کرنا پارسائی ہے۔

(۱۷) اَلْمُتَّقُوْنَ اَعْمَالُھُمْ زَاکِیَۃٌ وَاَعْیُنُھُمْ بَاکِیَۃٌ وَقُلُوْبُھُمْ وَجِلَۃٌ۔

متقی وہ ہیں جن کے اعمال پاک، آنکھیں اشکبار اور دل خوف خدا سے لرزاں ہوتے ہیں۔

(۱۸) اَلطُّمَاْنِیْنَۃُ اِلٰی کُلِّ اَحَدٍ قَبْلَ الْاِخْتِبَارِ مِنْ قُصُوْرِ الْعَقْلِ۔

آزمانے سے پہلے ہر کسی پر اعتماد کرلینا کم عقلی ہے۔

(۱۹) اَلصَّبْرُ صَبْرَانِ، صَبْرٌ فِی الْبَلَاءِ حَسَنٌ جَمِیْلٌ وَاَحْسَنُ مِنْہُ الصَّبْرُ فِی الْمَحَارِمِ۔

صبر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مصیبت پر صبر کرنا اور یہ صبر بھی اچھا ہے مگر اس سے بہتر صبر حرام چیزوں سے بچنا ہے۔

(۲۰) اَلْبُکَاءُ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ یُنِیْرُ الْقَلْبَ وَیَعْصِمُ عَنْ مُعَاوَدَۃِ الذَّنْبِ۔

خوف خدا میں رونا دل کو نورانی بناتا ہے اور گناہ پر اصرار سے بچاتا ہے۔

(۲۱) اَلْكَلَامُ فِي وِثَاقِكَ مَا لَمْ تَتَكَلَّمْ بِهِ فَإِذَا تَكَلَّمْتَ بِهِ صِرْتَ فِي وِثَاقِهِ۔

بولنے سے پہلے بات تمہارے قابو میں ہے لیکن بولنے کے بعد تم اس کے قابو میں ہو۔

(۲۲) اَلتَّوْبَةُ نَدَمٌ بِالْقَلْبِ وَاسْتِغْفَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَرْكٌ بِالْجَوَارِحِ وَاِضْمَارٌ اَنْ لَا يَعُوْدَ۔

توبہ یہ ہے کہ انسان دل سے شرمندہ ہو، زبان سے استغفار کرے، اعضاء و جوارح سے برے کام نہ کرے اور دوبارہ گناہ نہ کرنے کا عزم کرے۔

(۲۳) اَلْاُنْسُ فِي ثَلَاثَةٍ: اَلزَّوْجَةِ الْمُوَافِقَةِ، وَالْوَلَدِ الْبَارِّ، وَالْاَخِ الْمُوَافِقِ۔

تین چیزوں میں راحت ہے۔ اچھی بیوی، نیک فرزند اور مخلص دوست۔

(۲۴) اَلْعَدْلُ اَنَّكَ اِذَا ظَلَمْتَ اَنْصَفْتَ وَالْفَضْلُ اَنَّكَ اِذَا قَدَرْتَ عَفَوْتَ۔

عدل یہ ہے کہ جب ظلم کرے تو اپنے آپ سے ہی انصاف چاہے اور فضل یہ ہے کہ انتقام کی قدرت ہونے کے باوجود معاف کر دے۔

(۲۵) اَلْخَوْفُ مِنَ اللهِ فِي الدُّنْيَا يُؤْمِنُ الْخَوْفَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْهُ۔

دنیا میں اللہ کا خوف آخرت کے خوف سے محفوظ رکھتا ہے۔

(۲۶) اَحْسِنْ اِلٰى مَنْ اَسَاءَ اِلَيْكَ وَاعْفُ عَمَّنْ جَنٰى عَلَيْكَ۔

جو تمہارے ساتھ بدی کرے تم اس سے نیکی کرو اور جو تم پر ظلم کرے تم اس سے درگزر کرو۔

(۲۷) اَلْزِمِ الصِّدْقَ وَالْاَمَانَةَ فَاِنَّهَا سَجِيَّةُ الْاَخْيَارِ۔

سچائی اور امانت کو اپناؤ کیونکہ یہی نیکوکاروں کی روش ہے۔

(۲۸) اَدِّ الْاَمَانَةَ اِلٰى مَنِ ائْتَمَنَكَ وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ۔

جو تمہارے پاس امانت رکھے اسے اس کی امانت لوٹاؤ اور خائن کے ساتھ بھی خیانت مت کرو۔

(۲۹) اَكْرِمْ ضَيْفَكَ وَاِنْ كَانَ حَقِيْرًا وَقُمْ عَنْ مَجْلِسِكَ لِاَبِيْكَ وَمُعَلِّمِكَ وَلَوْ كُنْتَ اَمِيْرًا۔

مہمان کا احترام کرو چاہے وہ چھوٹا آدمی ہی ہو اور اپنے باپ اور استاد کے احترام میں اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہو چاہے تم امیر ہی کیوں نہ ہو۔

(۳۰) اُنْظُرْ اِلَى الدُّنْيَا نَظَرَ الزَّاهِدِ الْمُفَارِقِ وَلَا تَنْظُرْ اِلَيْهَا نَظَرَ الْعَاشِقِ الْوَامِقِ۔[۱]

دنیا کو دل نہ لگانے والے زاہد کی نظر سے دیکھو۔ اسے دل لگانے والے عاشق کی نظر سے نہ دیکھو۔

---

۱۔ جس طرح مجنوں یعنی قیس عامر عرب کی مشہور معشوقہ لیلیٰ کا عاشق تھا اسی طرح وامق عرب کے مشہور عاشق کا نام بھی ہے جس کی معشوقہ عذرا تھی۔ (رضوانی)

(۳۱) اِجْعَلْ نَفْسَكَ مِيزَانًا بَيْنَكَ وَبَيْنَ غَيْرِكَ وَاَحْبِبْ لَهُ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَاَكْرِهْ مَا تَكْرَهُ لَهَا وَ اَحْسِنْ كَمَا تُحِبُّ اَنْ يُحْسَنَ اِلَيْكَ وَلَا تُظْلِمْ كَمَا تُحِبُّ اَنْ لَا تُظْلَمَ۔

اپنے اور دوسروں کے درمیان خود کو میزان قرار دو اور جو چیز خود پسند کرو وہی دوسروں کے لیے پسند کرو۔ جو چیز تمھیں ناپسند ہو اسے دوسروں کے لیے بھی ناپسند سمجھو۔ جیسی نیکی دوسروں سے چاہتے ہو ویسی نیکی دوسروں کے ساتھ بھی کرو۔ جس طرح تم نہیں چاہتے کہ کوئی تم پر ظلم کرے اسی طرح تم بھی دوسروں پر ظلم مت کرو۔

(۳۲) اِجْعَلْ مِنْ نَفْسِكَ عَلٰى نَفْسِكَ رَقِيبًا وَاجْعَلْ لِاٰخِرَتِكَ مِنْ دُنْيَاكَ نَصِيبًا۔

خودنگر بنو اور اپنی دنیا سے آخرت کے لیے فائدہ اٹھاؤ۔

(۳۳) اِتَّعِظُوا بِمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ قَبْلَ اَنْ يَتَّعِظَ بِكُمْ مَنْ بَعْدَكُمْ۔

جانے والوں سے عبرت پکڑو اس سے پہلے کہ تمہارے بعد والے تم سے عبرت پکڑیں۔

(۳۴) اَخْرِجُوا الدُّنْيَا مِنْ قُلُوبِكُمْ قَبْلَ اَنْ تَخْرُجَ مِنْهَا اَجْسَادُكُمْ. فَفِيهَا اُخْتُبِرْتُمْ وَلِغَيْرِهَا خُلِقْتُمْ۔

دنیا کی محبت اپنے دل سے نکال دو اس سے پہلے کہ تمھیں دنیا سے نکال باہر کیا جائے۔ یہ دنیا امتحان گاہ ہے کیونکہ تمھیں دوسری دنیا کے لیے خلق کیا گیا ہے۔

(۳۵) اِسْتَدِيمُوا الذِّكْرَ فَاِنَّهُ يُنِيرُ الْقَلْبَ وَهُوَ اَفْضَلُ الْعِبَادَةِ۔

ہمیشہ اللہ کو یاد رکھو کیونکہ اللہ کی یاد دل کو روشن رکھتی ہے اور یہی سب سے بڑی عبادت ہے۔

(۳۶) اِعْمَلُوا لِيَوْمٍ تُذْخَرُ لَهُ الذَّخَائِرُ وَتُبْلٰى فِيهِ السَّرَائِرُ۔

عمل ذخیرہ کرو اس دن کے لیے جس دن کے لیے ذخیرہ کرنا چاہیے کیونکہ اس دن عمل کے چھپے ذخیرے ظاہر کردیئے جائیں گے۔

(۳۷) اِحْذَرْ كُلَّ عَمَلٍ اِذَا سُئِلَ عَنْهُ صَاحِبُهُ اِسْتَحْيٰى مِنْهُ وَاَنْكَرَهُ۔

ہر اس کام سے ڈرو جس کے بارے میں تم سے پوچھا جائے تو شرمندہ ہونا اور انکار کرنا پڑے۔

(۳۸) اِحْذَرْ كُلَّ اَمْرٍ يُفْسِدُ الْاٰجِلَةَ وَيُصْلِحُ الْعَاجِلَةَ۔

ہر اس کام سے ڈرو جو آخرت کو برباد اور دنیا کو آباد کرتا ہے۔

(۳۹) اِحْذَرْ مُصَاحَبَةَ الْفُسَّاقِ وَالْفُجَّارِ وَالْمُجَاهِدِينَ مَعَاصِي اللهِ۔

فاسقوں اور فاجروں نیز اللہ کی نافرمانی کی کوشش کرنے والوں سے دور رہو۔

(۴۰) اِحْذَرِ الدُّنْيَا فَاِنَّهَا شَبَكَةُ الشَّيْطَانِ وَمَفْسَدَةُ الْاِيْمَانِ۔
دنیا (کی چاہت) سے خبردار رہو کیونکہ یہ شیطانی جال اور ایمان کو خراب کرنے والی ہے۔

(۴۱) اِيَّاكَ وَفِعْلَ الْقَبِيْحِ فَاِنَّهُ يُقَبِّحُ ذِكْرَكَ وَيُكْثِرُ وِزْرَكَ۔
برے کام سے دور رہو کیونکہ یہ تمھیں بدنام کردے گا اور اس سے تمہارے گناہ میں اضافہ ہوگا۔

(۴۲) اِيَّاكَ وَالنَّمِيْمَةَ فَاِنَّهَا تَزْرَعُ الضَّغِيْنَةَ وَتُبْعِدُ عَنِ اللّٰهِ وَعَنِ النَّاسِ۔
چغل خوری سے بچو کیونکہ یہ کینہ پیدا کرکے آدمی کو خدا اور خلق خدا سے دور کردیتی ہے۔

(۴۳) اِيَّاكَ وَالظُّلْمَ فَاِنَّهُ اَكْبَرُ الْمَعَاصِيْ وَاِنَّ الظَّالِمَ لَمُعَاقَبٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِظُلْمِهٖ۔
ظلم سے بچو کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے اور قیامت میں ظالم سے اس کے ظلم کا ضرور مواخذہ ہوگا۔

(۴۴) اِيَّاكَ وَحُبَّ الدُّنْيَا فَاِنَّهَا رَاْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ وَمَعْدِنُ كُلِّ بَلِيَّةٍ۔
خبردار! دنیا کی محبت میں گرفتار نہ ہونا کیونکہ یہ تمام گناہوں کی جڑ اور تمام بلاؤں کی کان ہے۔

(۴۵) اَلَا وَاِنِّيْ لَمْ اَرَ كَالْجَنَّةِ نَامَ طَالِبُهَا وَلَا كَالنَّارِ نَامَ هَارِبُهَا۔
جان لو! میں نے نہ تو جنت جیسی کوئی چیز دیکھی ہے جس کا طلبگار سو رہا ہو اور نہ دوزخ جیسی کوئی چیز دیکھی ہے جس سے بھاگنے والا سو رہا ہو۔

(۴۶) اَلَا اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَيْكُمْ اِتِّبَاعُ الْهَوٰى وَطُوْلُ الْاَمَلِ۔
جان لو! مجھے تم لوگوں کے متعلق سب سے زیادہ دو چیزوں کا ڈر ہے، ایک خواہشات نفس کی پیروی اور دوسری طویل امیدیں۔

(۴۷) اَلَا وَاِنَّكُمْ فِيْ اَيَّامِ اَمَلٍ مِنْ وَرَائِهٖ اَجَلٌ فَمَنْ عَمِلَ فِيْ اَيَّامِ اَمَلِهٖ قَبْلَ حُضُوْرِ اَجَلِهٖ نَفَعَهٗ عَمَلُهٗ وَلَمْ يَضُرَّهٗ اَجَلُهٗ۔
جان لو کہ تم جس امید میں زندگی گزار رہے ہو، موت اس کے پیچھے ہے۔ پس جو کوئی امید کے دنوں میں موت آنے سے پہلے نیک عمل کرے گا اس کا عمل اسے فائدہ دے گا اورس کی موت اسے نقصان نہیں پہنچائے گی۔

(۴۸) اَفْضَلُ النَّاسِ اَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ۔
سب سے اچھا آدمی وہ ہے جو دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔

(۴۹) اَفْضَلُ الْعِبَادَةِ عِفَّةُ الْبَطْنِ وَالْفَرْجِ۔
سب سے اچھی عبادت شکم اور شرمگاہ کو حرام سے بچانا ہے۔

(۵۰) اَقْوَی النَّاسِ مَنْ قَوِیَ عَلٰی نَفْسِہٖ۔

سب سے طاقتور انسان وہ ہے جو اپنے نفس پر قابو رکھتا ہو۔

(۵۱) اَکْثَرُ النَّاسِ اَمَلًا اَقَلُّھُمْ لِلْمَوْتِ ذِکْرًا۔

جو لوگ موت کو بہت کم یاد رکھتے ہیں ان کی امیدیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔

(۵۲) اَحْمَقُ النَّاسِ مَنْ ظَنَّ اَنَّہٗ اَعْقَلُ النَّاسِ۔

لوگوں میں سب سے بڑا بیوقوف وہ ہے جو خود کو سب لوگوں سے زیادہ عقل مند سمجھتا ہے۔

(۵۳) اَفْضَلُ الْحِکْمَۃِ مَعْرِفَۃُ الْاِنْسَانِ نَفْسَہٗ وَوُقُوْفُہٗ عَنْ قَدْرِہٖ۔

سب سے بڑی دانائی اپنے آپ کو اور اپنی قدر و منزلت کو پہچاننا ہے۔

(۵۴) اَقْوَی النَّاسِ اِیْمَانًا اَقْوَاھُمْ تَوَکُّلًا عَلَی اللّٰہِ سُبْحَانَہٗ۔

ایمان میں وہ آدمی مضبوط ترین ہے جس کا خداوند سبحان پر توکل مضبوط ہے۔

(۵۵) اَشْقَی النَّاسِ مَنْ بَاعَ دِیْنَہٗ بِدُنْیَا غَیْرِہٖ۔

سب سے برا ہے وہ آدمی جو اپنے دین کو دوسرے کی دنیا سنوارنے کے لیے بیچ ڈالے۔

(۵۶) اَحَقُّ النَّاسِ بِالرَّحْمَۃِ عَالِمٌ یَجْرِیْ عَلَیْہِ حُکْمُ جَاھِلٍ وَکَرِیْمٌ یَسْتَوْلِیْ عَلَیْہِ لَئِیْمٌ وَبَرٌّ یُسَلَّطُ عَلَیْہِ فَاجِرٌ۔

سب سے زیادہ رحم کے قابل تین آدمی ہیں: ایک وہ عالم جس پر جاہل حکم چلاتا ہو۔ دوسرا وہ شریف جس پر کمینہ مسلط ہوجائے اور تیسرا وہ بھلا مانس جس پر بدکار غلبہ پالے۔

(۵۷) اَغْنَی الْاَغْنِیَاءِ مَنْ لَمْ یَکُنْ لِلْحِرْصِ اَسِیْرًا۔

سب سے بڑا دولت مند وہ ہے جو لالچ کا بندہ نہ ہو۔

(۵۸) اَعْقَلُ النَّاسِ مَنْ کَانَ بِعَیْبِہٖ بَصِیْرًا وَعَنْ عَیْبِ غَیْرِہٖ ضَرِیْرًا۔

سب سے بڑا عقل مند وہ ہے جو اپنے عیب دیکھتا ہے اور دوسروں کے عیب نہیں دیکھتا۔

(۵۹) اَسْعَدُ النَّاسِ بِالدُّنْیَا اَلتَّارِکُ لَھَا وَاَسْعَدُھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ الْعَامِلُ لَھَا۔

دنیا کے لوگوں میں سب سے خوش نصیب وہ ہے جو دنیا کو ترک کردے اور آخرت میں سب سے خوش نصیب وہ ہوگا جو دنیا میں آخرت کے لیے عمل کرتا رہا۔

(۶۰) اِنَّ اَنْفَاسَکَ اَجْزَاءُ عُمْرِکَ فَلَا تُفْنِھَا اِلَّا فِیْ طَاعَۃٍ تُزْلِفُکَ۔

تمہارا ایک ایک سانس تمہاری زندگی کا حصہ ہے۔ انھیں ضائع نہ کرو بلکہ ایسے کاموں میں خرچ

کرو جو تمھیں اللہ کی اطاعت سے نزدیک کر دے۔

(۶۱) اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ وَالْفَحْشَاءِ فَمَنِ ائْتَمَنَھَا خَانَتْہُ وَمَنِ اسْتَاْمَنَ اِلَیْھَا اَھْلَکَتْہُ وَمَنْ رَضِیَ عَنْھَا اَوْرَدَتْہُ شَرَّ الْمَوَارِدِ۔

بے شک انسان کا نفس اسے برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ پس جو اسے امین سمجھے گا وہ اس سے خیانت کرے گا اور جو اس کی پناہ میں رہے گا وہ اسے ہلاک کر ڈالے گا اور جو اس سے خوش ہوگا وہ اسے بدترین مقام تک لے جائے گا۔

(۶۲) اِنَّ دَعْوَۃَ الْمَظْلُوْمِ مُجَابَۃٌ عِنْدَ اللہِ سُبْحَانَہٗ لِاَنَّہٗ یَطْلُبُ حَقَّہٗ وَاللہُ تَعَالٰی اَعْدَلُ مِنْ اَنْ یَّمْنَعَ ذَا حَقٍّ حَقَّہٗ۔

بلا شبہ خداوند سبحان مظلوم کی دعا قبول کرتا ہے کیونکہ وہ اپنا حق مانگ رہا ہوتا ہے یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو سب سے بڑھ کر انصاف کرنے والا ہے کسی مستحق کو اس کا حق نہ دے۔

(۶۳) اِنَّ اللہَ سُبْحَانَہٗ یُعْطِی الدُّنْیَا مَنْ یُّحِبُّ وَمَنْ لَّا یُحِبُّ وَلَا یُعْطِی الدِّیْنَ اِلَّا مَنْ یُّحِبُّ۔

بلا شبہ خداوند سبحان دنیا چاہنے والے اور نہ چاہنے والے دونوں کو عطا فرماتا ہے لیکن دین اس کو عطا فرماتا ہے جو دین کو چاہے۔

(۶۴) اِنَّ الْعَاقِلَ مَنْ نَّظَرَ فِیْ یَوْمِہٖ لِغَدِہٖ وَسَعٰی فِیْ فِکَاکِ نَفْسِہٖ وَعَمِلَ لِمَا لَا بُدَّ لَہٗ وَلَا مَحِیْصَ عَنْہُ۔

دانا وہ ہے جس کی نظر آج بھی کل پر ہوتی ہے۔ وہ اپنے نفس کو آزاد رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس دن کے لیے عمل کرتا ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔

(۶۵) اِنَّ اَفْضَلَ النَّاسِ عِنْدَ اللہِ مَنْ اَحْیَا عَقْلَہٗ وَاَمَاتَ شَھْوَتَہٗ وَاَتْعَبَ نَفْسَہٗ لِصَلَاحِ اٰخِرَتِہٖ۔

اللہ کے نزدیک سب سے اچھا شخص وہ ہے جو اپنی عقل کو (علم و تقویٰ سے) زندہ رکھے اور اپنی (نفسانی) خواہشوں کو مار ڈالے اور اپنی آخرت کے لیے زحمتیں اٹھائے۔

(۶۶) اِذَا اَکْرَمَ اللہُ عَبْدًا اَشْغَلَہٗ بِمَحَبَّتِہٖ۔

جب اللہ اپنے کسی بندے پر کرم کرتا ہے تو اسے اپنی محبت میں مشغول رکھتا ہے۔

(۶۷) اِذَا سَاَلْتَ فَسْاَلْ تَفَقُّھًا وَلَا تَسْاَلْ تَعَنُّتًا فَاِنَّ الْجَاھِلَ الْمُتَعَلِّمَ شَبِیْہٌ بِالْعَالِمِ وَاِنَّ الْعَالِمَ الْمُتَعَنِّتَ شَبِیْہٌ بِالْجَاھِلِ۔

جب پوچھو تو سمجھنے کے لیے پوچھو نکتہ چینی کے لیے نہ پوچھو کیونکہ سیکھنے کا شوق رکھنے والا جاہل عالم

کی طرح ہوتا ہے اور نکتہ چینی کرنے والا عالم جاہل کی مانند ہوتا ہے۔

(۶۸) بَادِرُوا الْمَوْتَ وَغَمَرَاتِهِ وَمَهِّدُوا قَبْلَ حُلُولِهِ وَاَعِدُّوا لَهُ قَبْلَ نُزُولِهِ۔

موت اور اس کی تکلیفوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہو۔ موت آنے سے پہلے زاد راہ مہیا کرو اور اس کے آنے سے پہلے ہی (نیک اعمال کر کے) تیار ہو جاؤ۔

(۶۹) بِئْسَ الزَّادُ اِلَى الْمَعَادِ الْعُدْوَانُ عَلَى الْعِبَادِ۔

اللہ کے بندوں پر ظلم کرنا قیامت کے لیے بدترین توشہ ہے۔

(۷۰) تَدَبَّرُوا آيَاتِ الْقُرْآنِ وَاعْتَبِرُوا بِهِ فَاِنَّهُ اَبْلَغُ الْعِبَرِ۔

قرآن کی آیتوں میں غور وفکر کرو اور ان سے نصیحت حاصل کرو کیونکہ اس میں بہترین نصیحتیں ہیں۔

(۷۱) تَجَنَّبُوا الْبُخْلَ وَالنِّفَاقَ فَهُمَا مِنْ اَذَمِّ الْاَخْلَاقِ۔

بخل اور نفاق سے دور رہو کیونکہ یہ دونوں اخلاقی برائیاں ہیں۔

(۷۲) تَعَلَّمْ عِلْمَ مَنْ يَعْلَمُ وَ عَلِّمْ عِلْمَكَ مَنْ يَجْهَلُ فَاِذَا فَعَلْتَ ذَالِكَ عَلِمْتَ مَا جَهِلْتَ وَانْتَفَعْتَ بِمَا عَلِمْتَ۔

عالم کے علم سے فیض اٹھاؤ، اپنا علم نہ جاننے والوں کو سکھاؤ۔ اگر تم نے ایسا کیا تو جو تم نہیں جانتے وہ سیکھ جاؤ گے اور جو سکھایا ہے اس کا فائدہ اٹھاؤ گے۔

(۷۳) ثَمَرَةُ التَّقْوٰى سَعَادَةُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔

تقویٰ کا پھل دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے۔

(۷۴) ثَلَاثَةٌ هُنَّ زِينَةُ الْمُؤْمِنِ، تَقْوَى اللّٰهِ وَصِدْقُ الْحَدِيثِ وَاَدَاءُ الْاَمَانَةِ۔

تین چیزیں مومن کی زینت ہیں: اللہ کا تقویٰ، سچائی اور ادائے امانت۔

(۷۵) جَانِبُوا الْكِذْبَ فَاِنَّهُ مُجَانِبُ الْاِيْمَانِ۔

جھوٹ سے پرہیز کرو کیونکہ یہ ایمان سے دور کر دیتا ہے۔

(۷۶) جَالِسْ اَهْلَ الْوَرَعِ وَالْحِكْمَةِ وَاَكْثِرْ مُنَاقَشَتَهُمْ فَاِنَّكَ اِنْ كُنْتَ جَاهِلًا اَعْلَمُوكَ وَاِنْ كُنْتَ عَالِمًا اِزْدَدْتَ عِلْمًا۔

پارساؤں اور داناؤں کی صحبت میں بیٹھو اور ان سے بحث و گفتگو کرو تاکہ اگر تم کسی چیز کا علم نہیں رکھتے تو وہ تمھیں تعلیم دیں گے اور اگر تم علم رکھتے ہو تو تمہارا علم بڑھ جائے گا۔

(۷۷) حُسْنُ تَوَكُّلِ الْعَبْدِ عَلَى اللّٰهِ سُبْحَانَهُ عَلٰى قَدْرِ يَقِيْنِهٖ بِهٖ.
خداوند سبحان پر بندے کا توکل اس کے یقین کے مطابق ہوتا ہے۔

(۷۸) حُسْنُ الظَّنِّ اَنْ تُخْلِصَ الْعَمَلَ وَتَرْجُوَ مِنَ اللّٰهِ اَنْ يَعْفُوَ عَنِ الزَّلَلِ.
حسن ظن یہ ہے کہ اپنے عمل کو خالص بناؤ اور خدا سے امید رکھو کہ وہ تمہاری کوتاہیاں بخش دے۔

(۷۹) حُسْنُ الْخُلُقِ يُوْرِثُ الْمَحَبَّةَ وَيُؤَكِّدُ الْمَوَدَّةَ.
خوش اخلاقی محبت کو جنم دیتی ہے اور دوستی کو مضبوط کرتی ہے۔

(۸۰) حُبُّ الدُّنْيَا يُفْسِدُ الْعَقْلَ وَيُصِمُّ الْقَلْبَ عَنْ سِمَاعِ الْحِكْمَةِ وَيُوْجِبُ اَلِيْمَ الْعِقَابِ.
دنیا کی محبت عقل کو بگاڑ دیتی ہے اور دل کو حق بات سننے سے بہرہ بنا کر سخت عذاب کا مستحق بنا دیتی ہے۔

(۸۱) حَلَاوَةُ الظَّفَرِ تَمْحُوْ مَرَارَةَ الصَّبْرِ.
کامیابی کی مٹھاس صبر کی تلخی کو ختم کردیتی ہے۔

(۸۲) حَصِّلُوا الْاٰخِرَةَ بِتَرْكِ الدُّنْيَا وَلَا تُحَصِّلُوْا بِتَرْكِ الدِّيْنِ الدُّنْيَا.
دنیا کو ترک کرکے آخرت کماؤ لیکن دین کو چھوڑ کر دنیا مت کماؤ۔

(۸۳) حَاسِبُوْا اَنْفُسَكُمْ قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا وَوَازِنُوْهَا قَبْلَ اَنْ تُوَازَنُوْا.
اپنا محاسبہ کرو اس سے قبل کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے اور اپنے اعمال کو خود تولو اس سے پہلے کہ انھیں تولا جائے۔

(۸۴) خَيْرُ النَّاسِ مَنْ اَخْرَجَ الْحِرْصَ مِنْ قَلْبِهٖ وَعَصٰى هَوَاهُ فِيْ طَاعَةِ رَبِّهٖ.
بہترین انسان وہ ہے جو دل سے لالچ کو نکال دے اور اپنے پروردگار کی اطاعت میں اپنی خواہش نفس کی مخالفت کرے۔

(۸۵) خُذْ مِنْ قَلِيْلِ الدُّنْيَا مَا يَكْفِيْكَ وَدَعْ مِنْ كَثِيْرِهَا مَا يُطْغِيْكَ.
دنیا سے بس اتنا ہی لو جو تمہارے لیے کافی ہو۔ اس سے زیادہ کی خواہش جو تمھیں نافرمان بنا دے اسے چھوڑ دو۔

(۸۶) خَفْ رَبَّكَ وَارْجُ رَحْمَتَهٗ يُؤْمِنْكَ مِمَّا تَخَافُ وَيُنِلْكَ مَا رَجَوْتَ.
اپنے رب سے ڈرو اور اس سے رحمت کی امید رکھو تاکہ جس سے تمھیں ڈر ہے اس سے امان میں رکھے اور جس کی تمھیں امید ہے اس تک پہنچا دے۔

(۸۷) ذِكْرُ اللهِ مَسَرَّةُ كُلِّ مُتَّقٍ وَلَذَّةُ كُلِّ مُوْقِنٍ۔
اللہ کا ذکر ہر پرہیزگار کے دل کا سُرور اور ہر صاحب یقین کی لذت ہے۔

(۸۸) رَحِمَ اللهُ امْرَءً قَصَّرَ الْاَمَلَ وَبَادَرَ الْاَجَلَ وَاغْتَنَمَ الْمُهَلَ وَتَزَوَّدَ مِنَ الْعَمَلِ۔
خدا رحمت کرے ان لوگوں پر جو آرزوؤں کو مختصر رکھتے ہیں اور موت کی طرف بڑھتے ہیں، مہلت کو غنیمت جانتے ہیں اور آخرت کے لیے عمل کرتے ہیں۔

(۸۹) رَأْسُ الْاِيْمَانِ حُسْنُ الْخُلُقِ وَالتَّحَلِّيْ بِالصِّدْقِ۔
ایمان کا کمال حسن خلق اور سچ سے آراستہ ہونا ہے۔

(۹۰) رَدْعُ النَّفْسِ عَنِ الْهَوٰى هُوَ الْجِهَادُ الْاَكْبَرُ۔
نفس کو خواہشات سے دور رکھنا جہاد اکبر ہے۔

(۹۱) زَلَّةُ الْعَالِمِ كَانْكِسَارِ السَّفِيْنَةِ تَغْرَقُ وَيَغْرَقُ مَعَهَا غَيْرُهَا۔
عالم کی غلطی اس کشتی کی مانند ہے جو بیچ دریا میں ٹوٹ جائے۔ یہ کشتی اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے ڈوبتی ہے۔

(۹۲) زَادُ الْمَرْءِ اِلَى الْاٰخِرَةِ الْوَرَعُ وَالتُّقٰى۔
تقویٰ و پرہیزگاری آخرت کے لیے توشہ ہے۔

(۹۳) سُنَّةُ الْاَخْيَارِ لِيْنُ الْكَلَامِ وَاِفْشَاءُ السَّلَامِ۔
نیچی آواز میں بولنا اور اونچی آواز سے سلام کرنا نیک لوگوں کا شیوہ ہے۔

(۹۴) سُرُوْرُ الْمُؤْمِنِ بِطَاعَةِ رَبِّهٖ وَحُزْنُهٗ عَلٰى ذَنْبِهٖ۔
مومن کی خوشی اپنے رب کی اطاعت میں اور اس کا غم اپنے گناہوں پر ہوتا ہے۔

(۹۵) سَهَرُ اللَّيْلِ فِيْ طَاعَةِ اللهِ رَبِيْعُ الْاَوْلِيَاءِ وَرَوْضَةُ السُّعَدَاءِ۔
اللہ کی اطاعت میں شب بیداری دوستان خدا کی بہار اور خوش نصیبوں کا گلشن ہے۔

(۹۶) صُنْ اِيْمَانَكَ مِنَ الشَّكِّ فَاِنَّ الشَّكَّ يُفْسِدُ الْاِيْمَانَ كَمَا يُفْسِدُ الْمِلْحُ الْعَسَلَ۔
اپنے ایمان کو شک سے بچاؤ کیونکہ شک ایمان کو اسی طرح خراب کر دیتا ہے جس طرح نمک شہد کو خراب کرتا ہے۔

(۹۷) صَمْتٌ يُكْسِبُكَ الْوَقَارَ خَيْرٌ مِنْ كَلَامٍ يُكْسُوْكَ الْعَارَ۔
وہ خاموشی جو تمھیں وقار بخشے اس کلام سے بہتر ہے جو تمھیں ذلیل کر دے۔

(۹۸) طُوبىٰ لِمَنْ اَلْزَمَ نَفْسَهُ مَخَافَةَ رَبِّهٖ وَاَطَاعَهُ فِي السِّرِّ وَالْجَهْرِ۔

خوش نصیب ہے وہ جو پروردگار کے خوف سے اپنے نفس پر قابو رکھتا ہے اور خلوت وجلوت میں اس کی اطاعت کرتا ہے۔

(۹۹) طُوبىٰ لِمَنْ اَخْلَصَ لِلّٰهِ عَمَلَهُ وَعِلْمَهُ وَحُبَّهُ وَبُغْضَهُ وَاَخْذَهُ وَتَرْكَهُ وَكَلَامَهُ وَصَمْتَهُ۔

خوش بخت ہے وہ جو خالص اللہ کے لیے عمل کرے، علم حاصل کرے، محبت کرے، نفرت کرے، مواخذہ کرے، چھوڑ دے، بات کرے اور چپ رہے۔

(۱۰۰) طُوبىٰ لِمَنِ اسْتَشْعَرَ الْوَجَلَ وَ كَذَّبَ الْاَمَلَ وَتَجَنَّبَ الزَّلَلَ۔

خوش بخت ہے وہ جس نے خوف خدا کو شعار بنایا، آرزو کو سراب سمجھا اور لغزشوں سے دور رہا۔

(۱۰۱) طَاعَةُ الْهَوٰى تُفْسِدُ الْعَقْلَ۔

خواہشات کی پیروی عقل کو معطل کردیتی ہے۔

(۱۰۲) طُوْلُ الْقُنُوْتِ وَالسُّجُوْدِ يُنْجِيْ مِنْ عَذَابِ النَّارِ۔

قنوت اور سجود کو طول دینا عذاب جہنم سے بچاتا ہے۔

(۱۰۳) ظَلَمَ نَفْسَهُ مَنْ رَضِيَ بِدَارِ الْفَنَاءِ عِوَضًا عَنْ دَارِ الْبَقَاءِ۔

اس نے اپنے اوپر ظلم کیا جو دار بقاء کے بدلے دار فنا پر راضی ہوگیا۔

(۱۰۴) عِنْدَ حُضُوْرِ الشَّهَوَاتِ وَاللَّذَّاتِ يَتَبَيَّنُ وَرَعُ الْاَتْقِيَاءِ۔

خواہشوں اور لذتوں کے اسباب فراہم ہونے کے بعد ہی پارساؤں کی پارسائی معلوم ہوتی ہے۔

(۱۰۵) عَجِبْتُ لِمَنْ نَسِيَ الْمَوْتَ وَهُوَ يَرٰى مَنْ يَمُوْتُ۔

مجھے حیرت ہے اس انسان پر جس نے اپنی موت کو بھلا دیا حالانکہ وہ مرنے والوں کو برابر دیکھتا ہے

(۱۰۶) غُرِّيْ يَا دُنْيَا مَنْ جَهِلَ حِيَلَكِ وَخَفِيَ عَلَيْهِ حَبَائِلُ كَيْدِكِ۔

اے دنیا! اسے فریب دے جو تیرے مکر کو نہیں جانتا اور جس کی نظر سے تیرے مکر کے جال پوشیدہ ہیں۔

(۱۰۷) قَصِّرِ الْاَمَلَ فَاِنَّ الْعُمْرَ قَصِيْرٌ وَافْعَلِ الْخَيْرَ فَاِنَّ يَسِيْرَهُ كَثِيْرٌ۔

آرزو کو کم کردو کیونکہ عمر بہت مختصر ہے اور نیکی کرو کیونکہ معمولی نیکی بھی بہت بڑی شمار ہوتی ہے۔

(۱۰۸) كَمْ مِنْ لَذَّةٍ دَنِيَّةٍ مَنَعَتْ سَنِيَّ دَرَجَاتٍ۔

بسا اوقات بے حد معمولی لذتیں آدمی کو بلند درجات سے محروم کردیتی ہیں۔

(۱۰۹) كَيْفَ يُصْلِحُ غَيْرَهُ مَنْ لَمْ يُصْلِحْ نَفْسَهُ۔
وہ شخص دوسرے کی کیا اصلاح کرے گا جو خود اپنی اصلاح نہ کر سکے۔

(۱۱۰) كَفٰى بِالرَّجُلِ غَفْلَةً اَنْ يُضِيعَ عُمْرَهُ فِيمَا لَا يُنْجِيهِ۔
آدمی کی لاپروائی کے لیے یہی کافی ہے کہ اس نے اپنی عمر اس چیز میں ضائع کردی جو اسے نجات نہیں دلاسکتی۔

(۱۱۱) كُنْ بِالْمَعْرُوفِ آمِرًا وَعَنِ الْمُنْكَرِ نَاهِيًا وَبِالْخَيْرِ عَامِلًا وَلِلشَّرِّ مَانِعًا۔
(لوگوں کو) نیکی کا حکم دیتے رہو اور منکرات سے انھیں منع کرتے رہو اور خود بھی نیکی کے کام کرو اور برائی کی راہ میں رکاوٹ بنو۔

(۱۱۲) كَمَا اَنَّ الشَّمْسَ وَاللَّيْلَ لَا يَجْتَمِعَانِ كَذٰلِكَ حُبُّ اللّٰهِ وَحُبُّ الدُّنْيَا لَا يَجْتَمِعَانِ۔
جس طرح سورج اور رات ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے اسی طرح اللہ کی محبت اور دنیا کی چاہت ایک ساتھ اکٹھے نہیں ہوسکتیں۔

(۱۱۳) لِلْمُؤْمِنِ ثَلَاثُ عَلَامَاتٍ، اَلصِّدْقُ وَالْيَقِينُ وَقَصْرُ الْاَمَلِ۔
مومن کی تین نشانیاں ہیں: سچائی، یقین اور مختصر آرزو۔

(۱۱۴) لَنْ يَحُوزَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ۔
اپنے نفس سے جہاد کئے بغیر کوئی جنت میں نہیں جاسکتا۔

(۱۱۵) لَوْ اَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا عَلٰى عَبْدٍ رَتْقًا ثُمَّ اتَّقَى اللّٰهَ لَجَعَلَ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقُهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔
اگر کسی پر زمین و آسمان تنگ ہوجائیں پھر بھی وہ خدا سے ڈرتا ہو تو خدا اسے مشکل سے نکال دے گا اور وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہو۔

(۱۱۶) مَنْ تَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ سُبْحَانَهُ كَفٰى وَاسْتَغْنٰى۔
جو اللہ پر بھروسا کرتا ہے اللہ اس کیلئے کافی ہے اور وہ اس کو دوسروں سے بے نیاز بنا دیتا ہے۔

(۱۱۷) مَنْ اَكْثَرَ مِنْ ذِكْرِ الْمَوْتِ نَجَا مِنْ خِدَاعِ الدُّنْيَا۔
جو موت کو زیادہ یاد رکھتا ہے وہ دنیا کے فریب سے بچ جاتا ہے۔

(۱۱۸) يَنْبَغِي لِلْعَاقِلِ اَنْ يُكْثِرَ مِنْ صُحْبَةِ الْعُلَمَاءِ الْاَبْرَارِ وَيَجْتَنِبَ مُقَارَبَةَ الْاَشْرَارِ وَالْفُجَّارِ۔
عقل مند کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ اچھے علماء کی صحبت میں بیٹھے اور برے اور بدکار لوگوں

کی صحبت سے دور رہے۔

(۱۱۹) لَا يُدْرِكُ أَحَدٌ مَا يُرِيدُ مِنَ الْآخِرَةِ إِلَّا بِتَرْكِ مَا يَشْتَهِي مِنَ الدُّنْيَا۔
کوئی بھی اپنی خواہش کے مطابق آخرت میں فائدہ اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا جب تک دنیا کی من پسند چیزوں کو چھوڑ نہ دے۔

(۱۲۰) مَثَلُ الدُّنْيَا كَمَثَلِ الْحَيَّةِ لَيِّنٌ مَسُّهَا وَالسَّمُّ النَّاقِعُ فِي جَوْفِهَا، يَهْوِي إِلَيْهَا الْغِرُّ الْجَاهِلُ وَيَحْذَرُهَا ذُو اللُّبِّ الْعَاقِلُ۔
دنیا کی مثال سانپ جیسی ہے جو چھونے میں بے حد نرم ہوتا ہے مگر اس کے اندر زہر ہوتا ہے۔ فریب خوردہ جاہل اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور عقل مند اس سے دور رہتا ہے۔[۱]

---

۱۔ عالم دو ہیں۔ عالم دنیا اور عالم آخرت۔ دنیا جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے ادنیٰ عالم ہے اور آخرت عالم بالا ہے۔ یہ دونوں عالم ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ سکرات موت کے ساتھ ہی عالم آخرت کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ انسان اس دنیا میں رہ کر عالم آخرت کی اصلاح کرتا ہے جو تجسم اعمال کا عالم ہے بلکہ آخرت، دنیا کی اور دنیا، آخرت کی اصلاح کرتی ہے۔ یہ دنیا دار فنا ہے اور آخرت دار بقا ہے۔ پس ہمیں دنیا اور آخرت دونوں میں بھلائی کا خواہش مند ہونا چاہیے اور دائمی نعمتوں کو عارضی نعمتوں پر قربان نہیں کرنا چاہیے۔ جو لوگ اپنے دین کو کھیل تماشا سمجھتے ہیں ان کو دنیا کی زندگی دھوکے میں ڈال دیتی ہے۔ ہمیں ان لوگوں میں سے نہیں ہونا چاہیے جو صرف نعمات دنیا کے طالب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۰۰) کیونکہ طالب دنیا کے بارے میں قرآن کہتا ہے: مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ یعنی جو شخص اس دنیا کا طلبگار ہے ہم اسے جو چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں یہیں دیدیتے ہیں، پھر اس کے بعد اس کے لیے جہنم ہے۔ (سورۂ بنی اسرائیل: آیت ۱۸)
ہمیں ان لوگوں میں سے ہونا چاہیے جو کہتے ہیں: رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً (سورۂ بقرہ: ۲۰۱)
دین اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا جو مال اللہ نے تمہیں دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کرو اور دنیا میں بھی اپنا حصہ فراموش نہ کرو۔ خدا نے یہ دنیا ہمارے لیے بنائی ہے لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم یہاں خدا کی معرفت حاصل کریں، علم حاصل کریں، رزق حلال کمائیں، دوسرے انسانوں کے کام آئیں اور دنیا کو تسخیر اور تعمیر کر کے خوبصورت بنائیں اور یہاں تخریب کاری نہ کریں، فساد نہ پھیلائیں اور ظلم نہ کریں اور ایمان کے ساتھ عالم آخرت کے سفر پر رخصت ہوں اور اپنے غلط کاموں کی جو بھی تلافی کرنی ہے وہ یہاں کر لیں۔
امام علی علیہ السلام نے دنیا کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ "عالم آخرت کے تقابل میں" فرمایا ہے۔ آپ نے ہمیں یہ سمجھایا ہے کہ ہم اللہ کے بندے بن کر رہیں، دنیا کے بندے نہ بن جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی دنیا کو آباد کرنے کی فکر میں ہی گھلتے رہیں اور آخرت سے غافل ہو جائیں۔ یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ ہمیں اس میں اچھی کاشت کرنی چاہیے کیونکہ جو کچھ ہم یہاں بوئیں گے وہی وہاں کاٹیں گے۔

موت کو سمجھے ہے غافل اختتام زندگی ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

(رضوانی)

# (۳) حضرت علی علیہ السلام سے منسوب منظوم کلام

أَيَا مَنْ لَيْسَ مِنْكَ الْمُجِيْرُ ۔۔۔ بِعَفْوِكَ مِنْ عَذَابِكَ أَسْتَجِيْرُ
أَنَا الْعَبْدُ الْمُقِرُّ بِكُلِّ ذَنْبٍ ۔۔۔ وَ أَنْتَ السَّيِّدُ الصَّمَدُ الْغَفُوْرُ
فَإِنْ عَذَّبْتَنِيْ فَالذَّنْبُ مِنِّيْ ۔۔۔ وَإِنْ تَغْفِرْ فَأَنْتَ بِهٖ جَدِيْرُ

اے وہ ذات کہ تیرے سوا میرا کوئی ملجا و ماویٰ نہیں، تو مجھے اپنے عذاب سے بچا لے کہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔ میں وہ بندہ ہوں جو اپنے تمام گناہوں کا اقرار کرتا ہے اور تو وہ خدائے بزرگ ہے جو بڑا بے نیاز، بخشنے والا ہے۔ پس اگر تو مجھے عذاب دے تو یہ میرے گناہ کی وجہ سے ہوگا اور اگر تو مجھے بخش دے تو یہ تیرے شایان شان ہے۔

فَلَا تَجْزَعْ إِذَا أَعْسَرْتَ يَوْمًا ۔۔۔ فَقَدْ أَيْسَرْتَ فِيْ دَهْرٍ طَوِيْلٍ
وَلَا تَيْأَسْ فَإِنَّ الْيَأْسَ كُفْرٌ ۔۔۔ لَعَلَّ اللّٰهُ يُغْنِيْ عَنْ قَلِيْلٍ
وَلَا تَظُنَّنْ بِرَبِّكَ ظَنَّ سُوْءٍ ۔۔۔ فَإِنَّ اللّٰهَ أَوْلٰى بِالْجَمِيْلِ
رَأَيْتَ الْعُسْرَ يَتْبَعُهٗ يَسَارٌ ۔۔۔ وَ قَوْلُ اللّٰهِ أَصْدَقُ كُلِّ قِيْلٍ

اگر تجھے کبھی روز بد دیکھنا پڑے تو جزع فزع نہ کر کیونکہ تو نے مدت مدید اچھے دن بھی دیکھے ہیں۔ مایوس مت ہو کیونکہ مایوسی کفر ہے۔ کیا عجب کہ خدا تجھے عنقریب غنی کردے۔ اپنے رب سے بدگمان مت ہو کیونکہ اللہ بہت اچھا معاملہ کرنے والا ہے۔ تم نے تنگی کے دن تو دیکھ لیے، اس کے بعد اچھے دن بھی آنے والے ہیں اس لیے کہ خدا کا قول ہر قول سے زیادہ سچا ہے۔

نوٹ: إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اور وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا کی طرف اشارہ ہے۔

أَرْبَعَةٌ فِي النَّاسِ مَيَّزْتُهُمْ ۔۔۔ أَحْوَالُهُمْ مَكْشُوفَةٌ ظَاهِرَةٌ
فَوَاحِدٌ دُنْيَاهُ مَقْبُوضَةٌ ۔۔۔ تَتْبَعُهُ آخِرَةٌ فَاخِرَةٌ
وَ وَاحِدٌ دُنْيَاهُ مَحْمُودَةٌ ۔۔۔ لَيْسَ لَهُ مِنْ بَعْدِهَا آخِرَةٌ
وَ وَاحِدٌ فَازَ بِكِلْتَيْهِمَا ۔۔۔ قَدْ جَمَعَ الدُّنْيَا مَعَ الآخِرَةِ
وَ وَاحِدٌ مِنْ بَيْنِهِمْ ضَايِعٌ ۔۔۔ لَيْسَ لَهُ الدُّنْيَا وَلَا الْآخِرَةُ

میں نے چار قسم کے لوگ دیکھے ہیں جن کے حالات ظاہر و باہر ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کے لیے دنیا میں سختی مگر آخرت میں فراخی ہے۔ ایک وہ ہیں جن کی دنیا اچھی ہے مگر آخرت میں ان کے لیے کچھ نہیں۔ ایک وہ ہیں جو دنیا اور آخرت دونوں کو جمع کر کے کامیاب و کامران ہیں اور ایک وہ ہیں جو بربادی سے دوچار ہیں ان کی نہ دنیا اچھی ہے، نہ آخرت اچھی ہے۔

إِذَا عَاشَ امْرُءٌ سِتِّيْنَ حَوْلًا ۔۔۔ فَنِصْفُ الْعُمْرِ تَمْحَقُهُ اللَّيَالِي
وَنِصْفُ النِّصْفِ يَمْضِي لَيْسَ يَدْرِي ۔۔۔ لِغَفْلَتِهِ يَمِيْنًا عَنْ شِمَالِ
وَثُلْثُ النِّصْفِ آمَالٌ وَ حِرْصٌ ۔۔۔ وَ شُغْلٌ بِالْمَكَاسِبِ وَالْعِيَالِ
وَ بَاقِي الْعُمْرِ اَسْقَامٌ وَ شَيْبٌ ۔۔۔ وَهَمٌّ بِارْتِحَالٍ وَ انْتِقَالٍ
فَحُبُّ الْمَرْءِ طُوْلَ الْعُمْرِ جَهْلٌ ۔۔۔ وَ قِسْمَتُهُ عَلَى هٰذَا الْمِثَالِ

آدمی جب ساٹھ سال کا ہوجاتا ہے تو اس کی آدھی عمر راتیں نگل چکی ہوتی ہیں۔ اس کا لڑکپن یوں گزرتا ہے کہ وہ اپنے نفع و نقصان کو نہیں پہچانتا اور اس کی جوانی امیدوں، لالچوں، معاشی مشغلوں اور بال بچوں کی فکروں میں صرف ہوجاتی ہے اور اس کی باقی عمر کو بیماری، بڑھاپے اور رحلت و انتقال کا غم کھا جاتا ہے۔ پس آدمی کا لمبی عمر چاہنا نادانی ہے کیونکہ پوری عمر اسی طرح نکل جاتی ہے۔

صُنِ النَّفْسَ وَاحْمِلْهَا عَلَى مَا يُزِيْنُهَا
تَعِشْ سَالِمًا وَالْقَوْلُ فِيْكَ جَمِيْلٌ
وَاِنْ ضَاقَ رِزْقُ الْيَوْمِ فَاصْبِرْ اِلَى غَدٍ
عَسٰى نَكَبَاتُ الدَّهْرِ عَنْكَ تَزُوْلُ

يَعِزُّ غَنِيُّ النَّفْسِ إِنْ قَلَّ مَا لُهُ
وَيَغْلٰى غَنِيُّ الْمَالِ وَهُوَ ذَلِيْلٌ
وَلَا خَيْرَ فِيْ وُدِّ امْرِءٍ مُتَلَوِّنٍ
إِذَا الرِّيْحُ مَالَتْ مَالَ حَيْثُ يَمِيْلُ
جَوَادٌ إِذَا اسْتَغْنَيْتَ عَنْ أَخْذِ مَالِهٖ
وَعِنْدَ احْتِمَالِ الْفَقْرِ عَنْكَ بَخِيْلٌ
فَمَا أَكْثَرَ الْإِخْوَانَ حِيْنَ تَعُدُّهُمْ
وَلٰكِنَّهُمْ فِي النَّائِبَاتِ قَلِيْلٌ

اپنے نفس کو گناہوں سے بچاؤ اور اسے خوبیوں سے مزین کرو تاکہ تم خوشگوار زندگی گزارو اور اچھائی سے یاد کئے جاؤ۔ اگر تم آج تنگدست ہو تو ذرا صبر کرلو کہ جلد ہی تمہاری تنگدستی دور ہوجائے گی۔ دل کا سخی مال کم ہونے کے باوجود عزت پاتا ہے اور امیر مال زیادہ ہونے کے باوجود (اپنے بخل کی وجہ سے) رسوا ہوتا ہے۔ متلون مزاج شخص کی دوستی کچھ فائدہ نہیں دیتی کیونکہ وہ ادھر کو ہوجاتا ہے جدھر کی ہوا ہوتی ہے۔ یہ اس وقت سخی بنتا ہے جب تجھے اس کے مال کی ضرورت نہیں ہوتی اور اس وقت بخیل بن جاتا ہے جب تجھے تنگدست دیکھتا ہے۔ کہنے کو تو دوست بہت ہوتے ہیں مگر وقت پر کوئی کوئی کام آتا ہے۔

وَمَنْ كَرُمَتْ طَبَائِعُهٗ تَحَلّٰى بِآدَابٍ مُفَضَّلَةٍ حِسَانٍ
وَمَنْ قَلَّتْ مَطَامِعُهٗ تَغَطّٰى مِنَ الدُّنْيَا بِأَثْوَابِ الْأَمَانِ
فَإِنْ غَدَرَتْ بِكَ الْأَيَّامُ فَاصْبِرْ وَكُنْ بِاللهِ مَحْمُوْدَ الْمَعَانِيْ
وَلَا تَكُ سَاكِنًا فِيْ دَارِ ذُلٍّ فَإِنَّ الذُّلَّ يَقْرِنُ بِالْهَوَانِ
وَإِنْ أَوْلَاكَ ذُوْ كَرَمٍ جَمِيْلًا فَكُنْ بِالشُّكْرِ مُنْطَلِقَ اللِّسَانِ

شریف آدمی اپنے آپ کو ادب و اخلاق سے آراستہ کرتا ہے۔ جس آدمی میں طمع کم ہوتی ہے وہ دنیا میں امن چین سے رہتا ہے۔ اگر دنیا تجھ سے بے وفائی

کرے تو صبر کر اور خدا کے ساتھ اچھا تعلق استوار کر۔ گھٹیا جگھوں پر نہ رہو کیونکہ گھٹیا جگھوں میں رسوائی لازمی ہے۔ اگر کوئی صاحب کرم تم کو کچھ عطا کرے تو دل کھول کر اس کا شکریہ ادا کرو۔

وَكَمْ لِلّٰهِ مِنْ لُطْفٍ خَفِيٍّ — يَدِقُّ خَفَاهُ عَنْ فَهْمِ الزَّكِيِّ
وَكَمْ يُسْرٍ اَتٰى مِنْ بَعْدِ عُسْرٍ — وَفَرَّجَ كُرْبَةَ الْقَلْبِ الشَّجِيِّ
اِذَا ضَاقَتْ بِكَ الْاَحْوَالُ يَوْمًا — فَثِقْ بِالْوَاحِدِ الْفَرْدِ الْعَلِيِّ
تَوَسَّلْ بِالنَّبِيِّ فَكُلُّ خَطْبٍ — يَهُوْنُ اِذَا تُوُسِّلَ بِالنَّبِيِّ
وَلَا تَجْزَعْ اِذَا مَا نَابَ خَطْبٌ — فَكَمْ لِلّٰهِ مِنْ لُطْفٍ خَفِيٍّ

اللہ کی کتنی پوشیدہ عنایات ایسی ہیں جو ایک سمجھ دار آدمی کی سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ کتنی خوشیاں ایسی ہیں جو سختیوں کے بعد آتی ہیں اور غم زدہ کے دل پر چھائے غم کو زائل کر دیتی ہیں۔ اگر تم پر کبھی کڑا وقت آئے تو اس واحد و یکتا عظیم ذات پر بھروسا کرو۔ رسول خداؐ سے متوسل ہو جاؤ کہ بڑی سے بڑی مصیبت اور مشکل ان کے وسیلے سے آسان ہو جاتی ہے اور اگر کبھی کسی سخت مشکل کا سامنا ہو تو بے صبری نہ دکھاؤ کیونکہ بسا اوقات اللہ کی عنایات مخفی طریقے سے شامل حال ہوتی ہیں۔

تُؤَمِّلُ فِي الدُّنْيَا طَوِيْلًا وَلَا تَدْرِيْ — اِذَا جَنَّ لَيْلٌ هَلْ تَعِيْشُ اِلَى الْفَجْرِ
فَكَمْ مِنْ صَحِيْحٍ مَاتَ مِنْ غَيْرِ اٰفَةٍ — وَكَمْ مِنْ مَرِيْضٍ عَاشَ دَهْرًا اِلٰى دَهْرٍ
وَكَمْ مِنْ فَتًى يُمْسِيْ وَيُصْبِحُ اٰمِنًا — وَقَدْ نُسِجَتْ اَكْفَانُهٗ وَهُوَ لَا يَدْرِيْ

تو دنیا میں طولانی آرزوئیں لیے بیٹھا ہے حالانکہ تجھے نہیں معلوم کہ رات کے بعد جب صبح ہوگی تو تو زندہ بھی رہے گا؟ کتنے ہی تندرست لوگ بیماری کے بغیر مر گئے اور کتنے ہی لوگ سالہا سال تک بیمار ہونے کے باوجود زندہ ہیں۔ کتنے ہی جوان ایسے ہیں جو ہنسی خوشی دن گزار رہے ہیں حالانکہ ان کے کفن تیار ہو چکے ہیں اور وہ اس سے بے خبر ہیں۔

لَكَ الْحَمْدُ يَا ذَا الْجُودِ وَالْمَجْدِ وَالْعُلٰى تَبَارَكْتَ تُعْطِيْ مَنْ تَشَاءُ وَتَمْنَعُ
اِلٰهِيْ وَخَلَّاقِيْ وَحِرْزِيْ وَ مَوْئِلِيْ اِلَيْكَ لَدَى الْاِعْسَارِ وَالْيُسْرِ اَفْزَعُ
اِلٰهِيْ لَئِنْ جَلَّتْ وَجَمَّتْ خَطِيْئَتِيْ فَعَفْوُكَ عَنْ ذَنْبِيْ اَجَلُّ وَ اَوْسَعُ
اِلٰهِيْ تَرٰى حَالِيْ وَفَقْرِيْ وَفَاقَتِيْ وَاَنْتَ مُنَاجَاتِيْ الْخَفِيَّةَ تَسْمَعُ
اِلٰهِيْ اَجِرْنِيْ مِنْ عَذَابِكَ اِنَّنِيْ اَسِيْرٌ ذَلِيْلٌ خَائِفٌ لَكَ اَخْضَعُ
اِلٰهِيْ لَئِنْ عَذَّبْتَنِيْ اَلْفَ حِجَّةٍ فَحَبْلُ رَجَائِيْ مِنْكَ لَا يَتَقَطَّعُ
اِلٰهِيْ ذُنُوْبِيْ بَذَّتِ الطَّوْدَ وَاعْتَلَتْ وَصَفْحُكَ عَنْ ذَنْبِيْ اَجَلُّ وَ اَرْفَعُ
اِلٰهِيْ اَقِلْنِيْ عَثْرَتِيْ وَامْحُ حَوْبَتِيْ فَاِنِّيْ مُقِرٌّ خَائِفٌ مُتَضَرِّعٌ
اِلٰهِيْ لَئِنْ خَيَّبْتَنِيْ اَوْ طَرَدْتَنِيْ فَمَا حِيْلَتِيْ يَا رَبِّ اَمْ كَيْفَ اَصْنَعُ
اِلٰهِيْ حَلِيْفُ الْحُبِّ بِاللَّيْلِ سَاهِرٌ يُنَاجِيْ وَ يَدْعُوْ وَالْمُغَفَّلُ يَهْجَعُ
اِلٰهِيْ فَاَنْشُرْنِيْ عَلٰى دِيْنِ اَحْمَدَ مُنِيْبًا تَقِيًّا قَانِتًا لَكَ اَخْضَعُ
وَلَا تَحْرِمَنِّيْ يَا اِلٰهِيْ وَ سَيِّدِيْ شَفَاعَتَهُ الْكُبْرٰى فَذَاكَ الْمُشَفَّعُ
وَصَلِّ عَلَيْهِ مَا دَعَاكَ مُوَحِّدٌ وَنَاجَاكَ اَخْيَارٌ بِبَابِكَ رُكَّعُ

اے فیاض اور بزرگ و برتر خدا حمد صرف تجھ ہی کو زیبا ہے۔ تیری ذات بابرکت ہے، تو جسے چاہے عطا کرے اور جسے چاہے محروم رکھے۔ اے میرے معبود، اے میرے خالق، اے میرے نگہبان اور میرے ملجا و ماویٰ! میں ہر سختی و آسودگی میں تیری ہی پناہ چاہتا ہوں۔ اے میرے پروردگار! اگرچہ میری خطائیں بڑی اور بہت زیادہ ہیں مگر تیری بخشش میرے گناہوں سے بھی بڑھ کر اور زیادہ وسیع ہے۔ اے میرے مالک! تو میری حالت اور میرے فقر و فاقہ کو خوب جانتا ہے اور تو میری مخفی مناجات کو سنتا ہے۔ خدایا! مجھے اپنے عذاب سے اپنی پناہ میں رکھ کیونکہ میں تیرے قبضے میں ہوں، حقیر ہوں، تجھ سے ڈرتا ہوں اور تیرے سامنے جھکا ہوا ہوں۔ اے میرے معبود! اگر تو مجھے ہزار سال تک عذاب دے تب بھی تجھ سے میری امید کی ڈور نہ ٹوٹے گی۔ خدایا! میرے گناہ کا بوجھ بلند پہاڑوں سے بھی زیادہ ہے اور تیری بخشش میرے گناہوں سے بھی بڑی ہے۔ بار الہا! میری لغزشوں

سے درگزر فرما، میرے گناہ مٹا دے، میں اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہوں اور تجھ سے ڈرتا ہوں اور تیری بارگاہ میں گڑگڑاتا ہوں۔ اے میرے معبود! اگر تو نے مجھے مایوس کردیا اور اپنی بارگاہ سے دھتکار دیا تو میں کہاں جاؤں گا؟ میں کس سے لو لگاؤں گا؟ بار الہا! تیرا عاشق راتوں کو اٹھ اٹھ کر تجھ سے راز و نیاز کرتا ہے، تجھے پکارتا ہے جبکہ تجھ سے غافل سو رہا ہوتا ہے۔ اے میرے پروردگار! مجھے دین مصطفیؐ پر محشور فرمانا اس حال میں کہ میں تجھ سے رجوع کرنے والا، تجھ سے ڈرنے والا اور تیرا مطیع و فرمانبردار ہوں۔ اے خدا! اے میرے مالک! مجھے اپنے رسولؐ کی شفاعت سے ہرگز محروم نہ کرنا اس لیے کہ ان کی شفاعت کبریٰ ہی مقبول ہے۔ جب تک موحد تجھے پکارتے رہیں اور نیک بندے تجھ سے راز و نیاز کرتے رہیں اور رکوع کرنے والے تیرے سامنے جھکتے رہیں اس وقت تک ان پر درود و سلام ہو۔

لَیْسَ الْجَمَالُ بِأَثْوَابٍ تُزَیِّنُهَا ۔۔۔ اِنَّ الْجَمَالَ جَمَالُ الْعِلْمِ وَالْاَدَبِ
لَیْسَ الْیَتِیْمُ الَّذِیْ قَدْمَاتَ وَالِدُهٗ ۔۔۔ بَلِ الْیَتِیْمُ یَتِیْمُ الْعَقْلِ وَالْحَسَبِ

خوبصورتی یہ نہیں کہ زرق برق لباس سے جسم کو زینت دی جائے اصل خوبصورتی تو علم و ادب سے ہے۔ یتیم وہ نہیں جس کا باپ مر جائے بلکہ یتیم وہ ہے جو عقل و کردار سے محروم ہو۔

مُحَمَّدٌ النَّبِیُّ اَخِیْ وَ صِنْوِیْ ۔۔۔ وَ حَمْزَةُ سَیِّدُ الشُّهَدَاءِ عَمِّیْ
وَجَعْفَرٌ الَّذِیْ یُمْسِیْ وَیُضْحِیْ ۔۔۔ یَطِیْرُ مَعَ الْمَلَآئِکَةِ ابْنُ اُمِّیْ
وَبِنْتُ مُحَمَّدٍ سَکَنِیْ وعِرْسِیْ ۔۔۔ مَسُوْطٌ لَحْمُهَا بِدَمِیْ وَلَحْمِیْ
وَسِبْطَا اَحْمَدَ وَلَدَایَ مِنْهَا ۔۔۔ فَاَیُّکُمْ لَهُ سَهْمٌ کَسَهْمِیْ
سَبَقْتُکُمْ اِلَی الْاِسْلَامِ طُرًّا ۔۔۔ غُلَامًا مَا بَلَغْتُ اَوَانَ حُلُمِیْ
وَصَلَّیْتُ الصَّلَاةَ وَ کُنْتُ طِفْلًا ۔۔۔ مُقِرًّا بِالنَّبِیِّ فِیْ بَطْنِ اُمِّیْ
اَنَا الرَّجُلُ الَّذِیْ لَا تُنْکِرُوْهُ ۔۔۔ لِیَوْمِ کَرِیْهَةٍ اَوْ یَوْمَ سِلْمٍ
وَ اَوْجَبَ لِیْ وِلَایَتَهٗ عَلَیْکُمْ ۔۔۔ رَسُوْلُ اللّٰهِ یَوْمَ غَدِیْرِ خُمٍّ
فَوَیْلٌ ثُمَّ وَیْلٌ ثُمَّ وَیْلٌ ۔۔۔ لِمَنْ یَلْقَی الْاِلٰهَ غَدًا بِظُلْمِیْ

نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے بھائی اور ہم کفو ہیں نیز سید الشہداء حمزہؓ میرے چچا ہیں۔
فرشتوں کے ساتھ (بہشت میں) پرواز کرنے والے جعفرؓ میرے بھائی ہیں۔
بنت رسولؐ (فاطمہؑ) میری زوجہ ہیں جن کا گوشت اور خون میرے گوشت اور
خون میں رچا بسا ہے۔ فرزندان رسولؐ حضرت فاطمہؑ سے میرے بیٹے ہیں۔
پس تم میں سے کون میری برابری کرسکتا ہے؟ اسلام لانے میں مجھے تم سب پر
سبقت حاصل ہے حالانکہ میں اس وقت نوجوان تھا اور حد بلوغ کو نہیں پہنچا تھا۔
میں نے بچپن میں نماز پڑھی اور شکم مادر میں آنحضرتؐ کی نبوت کا اقرار کیا۔
میں وہ مرد ہوں جس کی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا چاہے وہ جنگ کا دن ہو
یا صلح کا۔ رسول خداؐ نے غدیر خم میں میری ولایت تم سب پر واجب قرار دی
تھی۔ پس وائے ہے، پھر وائے اور افسوس ہے اس شخص پر جو کل قیامت کے
دن اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس نے مجھ پر ظلم کیا ہوگا۔

مؤلف حضرت علیؑ مظہر کبریا کی جناب میں دست ادب جوڑ کر معذرت کرتے ہوئے اس
کتاب کو یہیں ختم کرتا ہے، اگرچہ مدح مولا کا حق ادا نہیں ہوسکا ہے۔
میں یہاں اپنی کم مائیگی کا اعترف کرتے ہوئے امید رکھتا ہوں کہ مولا اپنے لطف سے اس
ناچیز کاوش کو شرف قبولیت بخشیں گے اور مجھ عاصی کی معذرت قبول فرما کر مجھے اپنی شفاعت سے بہرہ مند
فرمائیں گے اس لیے کہ اپنی خطاؤں اور گناہوں کی کثرت کے باوجود میں اس حدیث نبویؐ "حُبُّ عَلِیٍّ
حَسَنَةٌ لَا تَضُرُّ مَعَهَا سَیِّئَةٌ" یعنی علیؑ کی محبت وہ نیکی ہے جس کے ساتھ گناہ نقصان نہیں پہنچا سکتا"
کے پیش نظر خود کو یہ مژدہ سنا سکتا ہے کہ خدا نے حضرت امیر المومنینؑ کو جو عظیم مقام و مرتبہ عطا فرمایا ہے
اس کی بنا پر آپ اپنے محبوں اور دوستوں کو لطف خاص سے محروم نہیں رکھیں گے۔

بہ ذرہ گر نظر لطف بوتراب کند
بہ آسمان رود و کار آفتاب کند

# کتابیات


۱— قرآن کریم

۲— نہج البلاغہ

الف — اصول کافی

امالی صدوق

ارشاد مفید

الغدیر

القصائد السبع العلویات

اثبات الوصیۃ

اعلام الوریٰ

افکار ام

ب — بحار الانوار

پ — پیغمبرؐ شناختہ شدہ

ت — تفسیر میزان

تفسیر نمونہ

تذکرہ ابن جوزی

تحفہ ناصری

ج — جامع الاخبار

خ — خصال صدوق

ذ — ذخائر العقبیٰ

ر — روضۃ الواعظین

ش — شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید

ش — شواہد التنزیل

شب ہائے پشاور

شیعہ در اسلام

شرح تجرید

ع — عیون اخبار الرضاؑ

غ — غایۃ المرام

ف — فصول المہمہ

فضائل الخمسہ

ق — قاموس الصحیفہ

ک — کشف الغمہ

کفایہ الطالب

کفایۃ الخصام

م — مناقب ابن مغازلی

مجالس السنیۃ

مقاتل الطالبین

منتخب التواریخ

مناقب ابن شہر آشوب

منتہی الآمال

ن — ناسخ التواریخ

و — وجوہ قرآن

ی — ینابیع المودۃ